انتخابِ بخاری شریف

عربی شرح
علامہ ابن ابی جمرہ مالکی اندلسیؒ
۶۹۹ھ

اردو ترجمہ وتشریحی فوائد
حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ
۱۳۹۴ھ

زیرِ نگرانی
حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۱۳۶۲ھ

(ترجمہ وتشریح)

تخریج احادیث

امام بخاری قدس اللہ سرہ العزیز ۲۵۶ھ

جلد دوم

ناشر ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور ۲ پاکستان
۷۳۲۴۷۸۵ - ۷۲۲۳۹۹۱ - ۷۳۵۳۳۵۵

بخاری شریف کی منتخب احادیث کا ترجمہ اور بے مثل تشریح

رحمۃ القدوس ترجمہ شرح بہجۃ النفوس

انتخاب بخاری شریف

(ترجمہ و تشریح)

تخریج احادیث

امام بخاری قدس اللہ سرہ العزیز ۲۵۶ھ

عربی شرح
علامہ ابن ابی جمرہ مالکی اندلسیؒ
۶۹۹ھ

اردو ترجمہ و تشریحی فوائد
حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رح
۱۳۹۴ھ

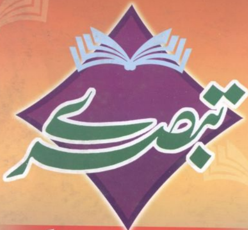
زیر نگرانی
حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ
۱۳۶۲ھ

حصہ دوم

احادیث شریفہ سے مسائل سلوک و تصوف، مسائل اخلاق و آداب اور مسائل فقہ کے استنباط پر وہ گرانمایہ کتاب جو ہر دور میں علماء، صوفیاء اور دیندار حضرات کی توجہ کا متفقہ طور پر مرکز رہی ہے۔ بخاری شریف کی منتخب احادیث کی بے نظیر شرح

ناشر

ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی ○ لاہور



مُتعدد کتابوں پر تحریر کیے گئے
تبصروں کا مجموعہ

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

ترتیب
مولانا محمد حنیف خالد

مکتبہ معارف القرآن کراچی

اِنتخابِ بخاری شریف

تالیف: علامہ ابنِ ابی جمرہ اندلسیؒ۔ اُردو ترجمہ وتشریحی فوائد: حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی۔ ناشر: ادارۂ اسلامیات ۱۹۰-انارکلی، لاہور۔ $\frac{۲۳\times۳۶}{۱۶}$ سائز کے ۶۵۶ صفحات۔ کتابت و طباعت متوسط، جلد نفیس، قیمت مجلد ڈائی دار: ۴۸ روپے

علامہ محمد بن ابی جمرہ رحمۃ اللہ علیہ ساتویں صدی ہجری میں اندلس کے معروف علماء اور متبعِ سنت صوفیاء میں سے ہیں۔ انہوں نے صحیح بخاری کی ایک شرح "بهجة النفوس" کے نام سے لکھی ہے جو بالکل اچھوتے اور نرالے انداز میں لکھی گئی ہے، اس شرح میں علامہ موصوف نے احادیث سے تصوف و احسان کے مسائل کا بڑے لطیف پیرائے میں استنباط کیا ہے، جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تصوف شریعت سے الگ چیز نہیں، بلکہ دین کا اہم جزء ہے، اور اس کا اصل ماخذ قرآن وسنت

ہی ہیں۔ علامہ ابنِ ابی جمرہ رحمہ اللہ کی اس کتاب میں احادیث کے جو اسرار و معارف، لطیف علمی نکات اور خاص طور پر سالکِ طریق کو جو ہدایات ملتی ہیں وہ اس قدر عظیم الشان اور گراں قدر ہیں کہ بعض اوقات ان پر رُوح وجد کرتی ہے، اور لطف یہ ہے کہ عام طور پر ان معارف و نکات میں تکلف اور آورد کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ بڑے بے ساختہ اور بے تکلف انداز میں احادیث سے مستنبط کئے گئے ہیں۔

حکیم الاُمت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ نے اللہ تعالیٰ نے اس دور میں دین کے تمام شعبوں، خاص طور پر تصوف و طریق کی تجدید کا کام لیا ہے، آپ کو علامہ ابنِ ابی جمرہؒ کی یہ کتاب ان خصوصیات کی بناء پر بہت پسند تھی، چنانچہ آپ کی خواہش تھی کہ اس کا اُردو ترجمہ ہوجائے، آپ کی خواہش کی تکمیل کی سعادت اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی قدس سرہٗ کے حصے میں لکھی تھی، چنانچہ آپ نے "رَحْمَةُ الْقُدُّوْس" کے نام سے اس کتاب کا ترجمہ فرمایا اور ترجمے کے ساتھ ساتھ اپنی طرف سے بھی جابجا فوائد کا اضافہ فرمایا، جو علمی اور تربیتی اعتبار سے بڑے گراں قدر مباحث پر مشتمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی قدس سرہٗ کو علم و فضل کا جو مقام بخشا تھا، اس دور میں اُس کی نظیر ملنی مشکل ہے، اور یہ کتاب حضرت موصوفؒ کے اسی مقام کی آئینہ دار ہے۔

ہندوستان میں ایک مرتبہ چھپنے کے بعد اب یہ کتاب نایاب ہوچکی تھی، اب ادارۂ اسلامیات لاہور نے اس کی اشاعت کا خصوصی اہتمام کر کے علمی پیاس رکھنے والوں پر بڑا احسان کیا ہے، اُمید ہے کہ انشاء اللہ اہلِ علم اور اہلِ طریق اس کی قدردانی کریں گے۔ (رجب المرجب ۱۴۰۱ھ)

پہلی بار عکسی طباعت ______ جنوری ١٩٨١ء

باہتمام ______ اشرف برادرز، لاہور

ناشر ______ ادارۂ اسلامیات، ١٩٠ انارکلی لاہور

طباعت ______ وفاق پریس۔ لاہور

قیمت مجلد ڈائی دار ______

— ملنے کے پتے —

ادارۂ اسلامیات ١٩٠- انارکلی لاہور

دارالاشاعت، اردو بازار کراچی ١

ادارۃ المعارف، ڈاکخانہ دارالعلوم کراچی نمبر ١٤

مکتبہ دارالعلوم، دارالعلوم کراچی نمبر ١٤

فہرست

رحمۃ القدوس (انتخاب بخاری) جلد دوم

حدیث

تخفیف الصلوٰۃ

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے کبھی کسی امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھی جس کی نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہلکی اور زیادہ کامل ہو اور بعض دفعہ آپ بچہ کے رونے کی آواز سن لیتے تو نماز کو ہلکی کر دیتے مبادا اس کی ماں پریشانی میں نہ پڑ جائے۔

تشریح ظاہر حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں تکمیل کے ساتھ تخفیف فرماتے تھے اور یہ کہ آپ غیر حق کی رعایت سے بھی نماز میں تخفیف کرتے تھے اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۵۱) درجہ کمال میں اکمل حالات کا اتباع کرنا چاہیئے اور ادنیٰ درجہ میں صرف صحت پر اکتفا نہ کیا جائے

حدیث میں (حضرات) صحابہ کے اہتمام (اتباع) کی دلیل ہے کہ وہ درجہ کمال میں تو اکمل حالات کا اتباع کرتے تھے اور درجہ صحت میں ادنیٰ پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ کچھ زیادتی کرتے تھے تاکہ درجہ کفایت سے کمی نہ رہ جائے (اور عمل برباد نہ ہو جائے) اور ادنیٰ درجہ میں کفایت کا تحقق یقینی طور پر اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اس پر کچھ تھوڑی سی زیادت نہ کی جائے بشرطیکہ زیادت شرعاً ممنوع نہ ہو جیسے وضو میں چار دفعہ اعضاء کو دھونا



ممنوع ہے یا وہ زیادت ایسی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی درجہ میں بھی عملاً ثابت نہ ہو تو اس سے بھی بچا جائیگا تاکہ بدعت میں مبتلا نہ ہوجائیں اور بدعت کی مذمت حدیثوں میں جس قدر آئی ہے وہ معلوم ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

من احدث فی امرنا ھذا ما لیس فیہ فھو ردٌّ

(جو شخص ہمارے اس امر میں یعنی دین میں ایسی بات ایجاد کرے جو اس میں نہیں ہے تو وہ رد ہے)

نیز آپ کا ارشاد ہے کل بدعۃ ضلالۃ (ہر بدعت گمراہی ہے) اور اس جیسی بہت سی حدیثیں ہیں)

اور اسی میں **نمازوں کے بعد صرف دُعا کیلئے مجتمع ہونا بدعت ہے** نمازوں کے بعد لوگوں کا دعا کے لئے مجتمع ہونا بھی داخل ہے پس یہ عمل اور جو اس کے مشابہ ہوں سب بدعت ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ کے بعد صحابہ و تابعین سے کہیں ثابت نہیں کہ انہوں نے (عبادت یا ثواب سمجھ کر) ایسا کیا ہو، اور اگر بلا عذر کے عبادت کو درجۂ کمال سے کم درجہ پر ادا کیا جائے تو جائز ہے مگر افضل وہی ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے بعد سلف صالح نے مداومت کی ہے۔

ف صوفیہ زمانہ کو اس مقام سے سبق لینا چاہئے کیونکہ وہ بکثرت بدعات میں مبتلا ہیں اور جب کہا جاتا ہے کہ یہ عمل بدعت ہے تو کہتے ہیں اس میں کیا خرابی ہے ہم تو نیک کام کرتے ہیں بُرا کام تو نہیں کرتے سو ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ نیک کام وہی ہے جس کا شریعت میں ثبوت ہو۔ دیکھو دعا کرنا نیک کام ہے لیکن نمازوں کے بعد مجتمع ہو کر دعا کرنا بدعت ہے کیونکہ اس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالح سے ثبوت نہیں پس اسی پر ان اعمال کو قیاس کر لیا جائے جن کو صوفیائے زمانہ نے نیک اعمال سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ مگر شریعت میں ان کا ثبوت نہیں، جیسے عرس مشائخ اور فاتحہ خوانی کے جلسے وغیرہ اور قوالی وسماع تو جس صورت سے آجکل ہوتا ہے وہ تو علاوہ بدعت ہونے کے بہت سی محرمات ومکروہات پر مشتمل ہے۔

ف بدعت وہ نیا کام ہے جس کا ثبوت شریعت میں نہ ہو اور اس کو دین یا ثواب سمجھ کر کیا جائے، اگر دین یا ثواب سمجھ کر نہ کیا جائے تو بدعت نہیں، پس ریل اور تار اور موٹر اور ہوائی جہاز اور قسم قسم کے لباس اور مطعومات ومشروبات کا استعمال بدعت نہیں کیونکہ ان کو ثواب یا عبادت یا دین سمجھ کر استعمال نہیں کیا جاتا، اسیطرح ذکر میں جہر اور خاص مقدار اور خاص طرز و وضع کی رعایت یا تسبیح ہاتھ میں رکھنا بھی بدعت نہیں کیونکہ ان چیزوں کو ثواب سمجھ کر نہیں کیا جاتا بلکہ بطور علاج وتدبیر کے اختیار کیا جاتا ہے، خوب سمجھ لو۔

ف مجتمع ہو کر دُعا کرنا جو بدعت ہے اس سے وہ اجتماع مراد ہے جو محض دعا کے لئے ہو پس نماز کے فوراً بعد جو دُعا کی جاتی ہے وہ بدعت نہیں کیونکہ اس میں دعا کے لئے اجتماع نہیں ہوتا بلکہ اجتماع تو نماز کے لئے ہوا تھا اسی حالت میں دعا بھی ہوگئی اور نماز کے بعد دعا کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قولاً وفعلاً ثابت ہے جیسا اعلاء السنن حصہ سوم میں بہت تفصیل کے ساتھ احادیث کثیرہ سے اس کا ثبوت دیا گیا ہے۔ پس نماز کے بعد سب لوگ تھوڑی دیر تک دُعا کرلیں تو یہ صورت سنت کے خلاف نہیں سنت کے خلاف یہ صورت ہے کہ جماعت کی نماز ختم ہوجانے کے بعد لوگ نوافل وسنن میں مشغول ہو جائیں گے اور نوافل وسنن سے فراغت کے بعد محض دعا کے لئے اجتماع ہو جس کو آجکل دعائے ثانیہ کہا جاتا ہے اور بلادِ سواحل ہند میں اس کا بڑا التزام ہے سو یہ اجتماع جو محض دعا کے لئے ہوتا ہے خالص بدخت ہے۔

(۱۵۲) نماز میں کسی حادثہ کی طرف التفات کرنا خشوع کے منافی نہیں حدیث سے معلوم ہوا کہ نماز پڑھتے ہوئے کوئی حادثہ پیش آجائے تو اسکی طرف التفات کرنا جائز ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

کا بچہ کی آواز کو سننا اور اس (کے سبب) میں غور کرنا ایسی شے کی طرف التفات تھا جو نماز سے خارج ہے (مگر اس کا تعلق نمازیوں سے تھا اس لئے اس کی طرف التفات فرمایا گیا) مگر یہ (شرط) ضرور ہے کہ التفات معمولی ہو یا جس سے نماز (کے ارکان وغیرہ) میں خلل نہ آئے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز (اس حالت میں بھی) سب سے کامل تر تھی اگر یہ التفات آپ کو نماز سے مشغول کر دیتا تو آپ نماز کو کامل طور پر نہ ادا کر سکتے۔

"قوله الوجه الثامن فيه دليل على أن الفكرة الى قوله ما اتمها"

(۱۵۳) حکم شرعی میں غور کرنا بھی منافی خشوع نہیں

حدیث سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت نماز کے اندر یا کسی اور عبادت میں مشغول ہوتے ہوئے حکم شرعی میں غور کرنا بھی جائز ہے بشرطیکہ عبادت کو باقی رکھ کر اس کے واجبات کو پورا کرتے ہوئے ایسا کرنا ممکن ہو مطلب یہ کہ سرسری طور پر غور کرنا جس سے نماز کے ارکان و واجبات میں خلل نہ آنے پائے جائز ہے یہ نہیں کہ نماز میں ہدایہ اور بخاری کے اشکالات کو حل کرنے لگے، اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بچہ کے رونے کی آواز سن کر نماز کو مختصر کر دیتے تھے حالانکہ عمل شروع کرنے کے وقت تطویل کا ارادہ تھا تو نماز کو مختصر کرنا بھی ایک عمل ہے جو حکم میں غور کرنے کا نتیجہ تھا پس یہاں چھ باتیں جمع ہو گئیں۔

(ایک تو) واقعہ کی طرف التفات

(دوسرے) حکم شرعی میں غور کرنا

(تیسرے) وہ عمل کرنا جو نماز میں ممکن تھا (یعنی نماز کو مختصر کر دینا)

(چوتھے) حق غیر (یعنی بچہ اور اس کی ماں کے حق کی رعایت)

(پانچویں) سد ذریعہ (کا اہتمام یعنی جس چیز سے فتنہ کا احتمال بھی ہو گو یقین نہ ہو اس کی پہلے ہی سے روک تھام کیونکہ بچہ کے رونے سے اس کی ماں کا پریشان ہونا لازم نہیں ممکن ہے کہ پریشانی پیش نہ آئے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے احتمال فتنہ کا بھی لحاظ فرمایا کہ احتیاط اسی کو مقتضی ہے اور اسی کا نام سد ذریعہ ہے جو اصول شرعیہ میں سے بڑی اصل ہے)

(چھٹے) قوی کو احکام میں ضعیف کے تابع کر دینا جبکہ دونوں کسی کام میں ساتھ ساتھ ہوں۔ اسی کی نظیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

سیروا بسیر اضعفکم — اپنے کمزوروں کی چال چلا کرو۔

قوله الوجه التاسع فيه دليل على جواز النظر في حكم من الاحكام الى قوله سيروا بسير اضعفكم

(۱۵۴) خیر میں توسط بھی سنت ہے

اس میں امت کے حال پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت و شفقت پر بھی دلالت ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا ہے (کہ بعض دفعہ تخفیف واختصار پر عمل کیا) تو ہوشیار محنت کرنے والا تو سنت کے اتباع کا پورا حصہ لے لیگا اور کمزور مسکین بھی اتباع سنت سے محروم نہ رہے گا وہ بھی کچھ حصہ لے لیگا اور تطویل واختصار کے درمیان بہت وسعت ہے اور خیر میں توسط (درجۂ اوسط اختیار کرنا) ہی سنت ہے۔

قوله الوجه العاشر فيه دليل على رحمته عليه السلام بامته الى قوله وتوسط في الخير التي هي السنة،

(۱۵۵) دلداری اور دلجوئی تمام احوال سے اعلیٰ وارفع ہے

اس میں صوفیہ کی بھی دلیل ہے جو دلداری اور دلجوئی کے بہت قائل ہیں اور وہ ان کے نزدیک تمام احوال سے اعلیٰ وارفع ہے۔ یہ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچہ کی ماں کی اور خود بچہ کی پریشانی کی رعایت فرمائی اور اس کے لئے نماز کو مختصر کر دیا اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان کی دلجوئی بھی عبادت ہے جس

کے لئے نماز کو مختصر کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس میں ایک قید ہے جس کو بزرگوں میں سے خاص ہی لوگ جانتے ہیں وہ یہ کہ دلداری اور دلجوئی اس کی اس حالت کو کم نہ کر دے جو اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے ریعنی دوسروں کی جوتیوں کی نگہداشت میں اپنی اشرفیوں کو برباد نہ کر دے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ مخلوق کی دلداری اور دلجوئی میں اتنا مبالغہ نہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کا وقت ہی نہ ملے ہر وقت لوگوں کی خاطر مدارات میں ہی لگا رہے بلکہ ایک وقت ایسا بھی ہونا چاہیے جس میں بجز اللہ تعالیٰ کے کسی پر توجہ نہ ہو، اس کی دلیل حدیث کا یہ لفظ ہے ولا اتم اکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کامل تر نماز کسی کی نہ تھی کیونکہ اختصار کے بعد درجہ کفایت میں بھی آپ کی عبادت ناقص نہ ہوتی تھی، اسی لئے ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ صوفی متبع سنت عجائب زمانہ سے ہے۔

صوفی متبع سنت عجائبات میں سے ہے

یعنی صوفی کا متبع سنت ہونا بہت عجیب ہے کیونکہ صوفی پر اکثر حالات مختلفہ کا ورود ہوتا ہے۔ کبھی تجلی صفات جلالیہ ہے کبھی تجلی صفات جمالیہ ہے اور جب ایک قسم کی تجلی ہوتی ہے تو غلبہ اسی کا ہوتا ہے اس وقت دوسرے صفات کا حق پوری طرح ادا نہیں ہوتا اگر اس وقت یہ شخص اتباع سنت میں پختہ رہے اور تمام صفات کا حق ادا کرتا رہے تو واقعی بڑا کمال ہے اس مثال میں غور کرو کہ نماز کی حالت کا مقتضا تو یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی پر توجہ نہ ہو اور امامت کا مقتضا یہ ہے کہ مقتدیوں کی پریشانی کا بھی لحاظ کیا جائے گا۔ اس حالت میں کوئی صوفی مغلوب الحال امام ہو تو وہ صرف نماز کا حق ادا کریگا۔ مقتدیوں کے حال پر التفات نہ کرے گا اور زاہد خشک امام ہو تو نماز میں ایسا اختصار کرے گا جس سے واجبات میں بھی خلل آجائے گا اور صوفی متبع سنت امام ہو تو نماز کو بھی کامل طور سے ادا کرے گا اللہ تعالیٰ کی طرف بھی متوجہ رہے گا اور مقتدیوں کی رعایت سے نماز کو بھی مختصر کرے گا اور دونوں قسم کے حقوق کی نگہبانی آسان کام نہیں اس لئے صوفی کا متبع سنت ہونا بہت عجیب ہے، اور جو صوفی ایسا ہو وہ اپنے وقت کا قطب اور عالم وجود کا تاج ہوگا اور یہ اللہ کا فضل ہے وہ جس کو چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم کو بھی وہ دولت عطا فرمائیں جو ان کو اپنے احسان سے عطا فرمائی ہے۔

قوله الوجه الحادی عشر فیه دلیل لاهل الصوفة الذین یقولون بجبر القلوب الی قواه من الله بفضله علینا بما من به علیهم بمنه

ف الحمد للہ کہ ہمارے اکابر حضرت مولانا گنگوھی قدس سرہ وحضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ وحضرت حکیم الامت دام مجدہم سب کے سب باوجود صوفی اور صاحب احوال رفیعہ ہونے کے بدرجۂ کمال متبع سنت تھے اور ہیں اور یہی ان کا وہ کمال ہے جس کی نظیر دوسری جگہ نہیں مل سکتی اور اسی وجہ سے ناواقف لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ حضرات تو نرے علماء ہیں صوفی نہیں کیونکہ عوام کے نزدیک صوفی وہی ہے جو مغلوب الحال ہو اور صوفی متبع سنت مغلوب الحال نہیں ہوتا بلکہ غالب علی الاحوال ہوتا ہے وہ ہر حالت میں اتباع سنت سے ایک قدم ہٹنا گوارہ نہیں کرتا، اسی لئے یہ حضرات اپنے وقت کے قطب الارشاد اور مجدد ہیں ؎

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق   ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

من الله تعالیٰ بفضله علینا بما من به علیهم بمنه

ف نماز میں تخفیف اور تطویل کی تحقیق

نماز کی تخفیف عموماً قراءت کو مختصر کرنے سے ہوتی ہے اور کبھی تمام ارکان میں اختصار کرنے سے ہوتی ہے بشرطیکہ ایسا اختصار نہ ہو جس سے ارکان میں خلل واقع ہو جائے ورنہ نماز ہی نہ ہوگی یا ناقص ہوگی اور حدیث میں تصریح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز باوجود تخفیف ہونے کے کامل و اکمل ہوتی تھی اس جگہ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی تخفیف صلوٰۃ کو آج کل کی تخفیف پر قیاس نہ کرنا چاہیے کیونکہ حضرات صحابہ اور سلف سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی رکعت شروع کرتے تو آدمی

بقیع تک جا کر واپس بھی ہو جاتا تھا اور آپ پہلی ہی رکعت میں ہوتے تھے۔ اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ صبح کی نماز میں بعض دفعہ سورۂ بقرہ دو رکعت میں پڑھتے تھے اور بعض صحابہ سے مروی ہے کہ انہوں نے سورۂ یوسف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے سن کر یاد کی تھی کیونکہ وہ اکثر صبح کی نماز میں اس کو پڑھتے تھے اور موطا (امام مالک) میں ام الفضل بنت الحارث سے روایت ہے کہ انہوں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے سورۂ والمرسلت سنی تو فرمایا بیٹا تم نے یہ سورت پڑھ کر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت یاد دلادی کیونکہ یہ آخری سورت ہے جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مغرب کی نماز میں سنی تھی (اس کے بعد میں نے حضور کی قرأت نہیں سنی) اس سے معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ کی عادت نماز میں تطویل قرأت تھی اور یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کیونکہ صحابہ سے زیادہ متبع سنت کون ہو سکتا ہے مگر اس تطویل کو وہ تخفیف فرماتے ہیں کیونکہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم قرآن کے عاشق تھے ان کو تطویل قرأت گراں نہ تھی البتہ اگر کوئی عارض پیش آجاتا مثلاً بچہ رونے لگتا اور کوئی حادثہ پیش آجاتا تو اس عادت مستمرہ کو چھوڑ کر قرأت میں تخفیف کردی جاتی تھی۔ پس تخفیف صلوۃ کا حاصل یہ ہوا کہ موقع اور وقت کے مناسب قرأت کی جائے۔ اگر حالت اطمینان اور سکون کی ہو تو قرأت طویل کی جائے اور اس میں بھی مقتدیوں کی حالت کی رعایت کی جائے کہ اتنی تطویل نہ ہو جو نمازیوں پر گراں گذرے اور اگر حالت بے اطمینانی اور پریشانی کی ہو تو اس حالت کے مناسب قرأت کی جائے۔ مگر کسی حالت میں بھی واجبات میں خلل نہ ڈالا جائے گا۔ دین کے سب کاموں میں قاعدہ یہی ہے کہ ہر عمل کو درجۂ کمال پر ادا کیا جائے۔ ادنیٰ درجہ پر بدون کسی عذر کے کفایت نہ کی جائے اور ادنیٰ درجہ پر کفایت کرنے میں بھی واجبات میں خلل نہ ڈالا جائے۔

حضرت مصنف فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنے وقت میں عالم مانا جاتا اور مقتدا تسلیم کیا جاتا تھا کہ وہ نماز میں بعض ارکان کے واجبات بھی پوری طرح ادا نہ کرتا تھا۔

فَاِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

افسوس علم بھی ضائع ہوگیا اور اس کی حقیقت بھی ناپید ہوگئی عمل بھی برباد ہوگیا اور اس کی تکمیل بھی جاتی رہی اسی لئے رزین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ لوگوں کو مکروہات میں اس بات نے مبتلا کیا ہے کہ انہوں نے الفاظ شرعیہ کو ان معانی پر محمول کرلیا جو پہلے زمانہ میں معروف نہ تھے۔ چنانچہ آج کل ہم نماز میں تخفیف کرتے ہیں تو حد جواز ہی سے نکل جاتے ہیں کیونکہ ہماری لمبی نماز بھی ادنیٰ درجہ سے زیادہ نہیں ہوتی تو جب اس میں کمی کی جائے گی تو لامحالہ حد جواز سے نکل جائیں گے۔ پس نماز کی تکمیل اور تخفیف کی حدود کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کی نظر تمام احادیث پر ہو اور حضرات فقہاء رضی اللہ عنہم نے کتب فقہ میں اس کو تفصیل کے ساتھ بیان فرمادیا ہے جس کو اتباع سنت کا شوق ہو اس کو کتب فقہیہ واجبات و فروض و سنن و مستحبات صلوۃ معلوم کر لینا چاہیئے تاکہ تخفیف کے وقت سنن و مستحبات میں اختصار کیا جاسکے واجبات و فروض میں خلل نہ ڈالا جائے۔

وھذا مما نبہ علیہ الشارح رحمہ اللہ فی الوجہ الاول والثانی فلیراجع

ف یہاں سے اُن صوفیوں کی غلطی بھی واضح ہوگئی جو ہر حالت میں اپنے معمول ہی پر جمے رہتے ہیں کسی حال میں اس کو ترک نہیں کرتے سفر میں بھی نماز لمبی کرتے ہیں خواہ قافلہ چلنے والا ہو یا ریل چھوٹنے والی ہو اور مقتدی وقت کی تنگی سے پریشان ہوں۔ مگر امام صاحب ہیں کہ طوال مفصل کو نہیں چھوڑ سکتے اور نماز کے بعد وظیفہ کو بھی

ضرور پورا کریں گے۔ ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ ایسا غلو شریعت میں ناپسندیدہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض دفعہ سفر میں قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس سے صبح کی نماز پڑھائی ہے حالانکہ صبح کی نماز میں آپ کی عادت تطویل قرات کی تھی مگر آپ نے ہمیشہ موقع اور وقت کے مناسب عمل کیا ہے جس سے کسی پر گرانی نہ ہو۔ خوب سمجھ لو۔



باب چہل و چہارم ۴۴

حدیث

اصل صلوٰۃ التراویح

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے مہینہ میں مسجد کے اندر ایک حجرہ سا بنوایا جو غالباً بوریہ کا تھا جس میں آپ نے چند راتوں میں نماز پڑھی تو آپ کی نماز کے ساتھ کچھ لوگوں نے صحابہ میں سے نماز پڑھی جب آپ کو اس کا علم ہوا تو آپ (نماز سے) بیٹھنے لگے (یعنی اس وقت نماز پڑھنا چھوڑ دیا) پھر آپ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ میں نے جو کچھ تم کو کرتے دیکھا میں اس کو سمجھ گیا ہوں (کہ تم کو میرے ساتھ نماز پڑھنے کا شوق ہے) سو اے لوگو! اپنے گھروں میں نماز پڑھا کرو کیونکہ انسان کی افضل نماز وہی ہے جو گھر میں ہو سوائے مکتوبہ (یعنی فرض نماز) کے۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ نفل نماز مسجد میں پڑھنا جائز ہے اور افضل یہ ہے کہ نفل نماز گھر میں پڑھے، اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۵۶) اسباب دلجمعی کا اہتمام کرنا چاہیئے

اس سے معلوم ہوا کہ مسجد میں حجرہ بنا لینا جائز ہے مگر شرط یہ ہے کہ عمارت کے طور پر نہ ہو نہ ایسی چیز سے بنا ہو جس کو بقاء و دوام ہو اس کی دلیل حدیث کا یہ لفظ ہے کہ آپ نے بوریہ کا حجرہ بنوایا تھا کیونکہ حجرہ تعمیر کرنے میں مسجد کی تغییر ہے اور مسجد وقف ہے اس کی تغییر جائز

نہیں، اور بوریہ یا کپڑے سے حجرہ بنانے میں مسجد اپنے حال پر رہے گی اس میں تغیر نہ ہوگا اور کپڑا وغیرہ ڈالنے سے خلوت قائم رہے گی اور عبادت اچھی طرح ہوگی کیونکہ اس سے عبادت میں دلجمعی زیادہ ہوگی (جو روح عبادت ہے) اور اس پر یہ علمی مسئلہ مرتب ہوا کہ انسان کو وہ اسباب اختیار کرنا چاہییں جن سے عبادت میں دل جمعی زیادہ ہو بشرطیکہ وہ اسباب بدعت (میں داخل) نہ ہوں ورنہ ممنوع ہوں گے کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ جل جلالہ قیامت کے دن صاحب بدعت سے فرمائیں گے اچھا اگر میں ان گناہوں کو بخش دوں جو میرے اور تیرے درمیان ہیں تو جن لوگوں کو تو نے گمراہ کیا ہے ان کے ساتھ کیا کروں ؟ (یعنی ان کا حق کیونکر معاف کر دوں اور یہ گناہ کیسے بخش دوں کہ تو نے اپنے ساتھ دوسروں کو بھی گمراہ کیا ہے کہ یہ گناہ تو متعدی ہے جس کے ساتھ حق العباد متعلق ہے اور حق العباد اس وقت تک معاف نہیں ہوتا جب تک بندے معاف نہ کریں اور وہاں اپنا حق کون چھوڑنے والا ہے . وہ تو سب اس کی جان کو آجائیں گے کہ تو نے ہم کو گمراہ کیا) ۔

قولہ الوجہ الاول جواز اتخاذ الحجرۃ فی المسجد الی قولہ فالذین اضللت کیف افعل بھم ۔

ف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں جو بوریہ کا حجرہ بنوایا تھا یہ زمانہ اعتکاف میں خلوت کے لئے تھا، چنانچہ اب بھی اعتکاف کرنے والے کپڑا لٹکا کر اپنے لئے جگہ مخصوص کر لیتے ہیں مگر جماعت کی نماز کے وقت ان کپڑوں کو اٹھا دینا چاہیئے تاکہ جماعت میں تنگی نہ ہو اور صفوف میں انقطاع نہ ہو ۔

اس حدیث میں صوفیہ کی خلوت نشینی کا ثبوت ہے کہ وہ بھی دل جمعی کے لئے خلوت اور چلہ کشی اختیار کرتے ہیں ۔

ف بدعت کی مذمت یہاں سے بدعت کا وبال بھی معلوم ہوا کہ اس میں صرف حق اللہ کی اضاعت نہیں بلکہ حق العباد کی بھی اضاعت ہے اور حق العباد کا وبال بہت سخت ہے پس صوفیہ مبتدعین کو عبرت حاصل کرنا چاہیئے اور سماع و عرس وغیرہ سے توبہ کرنا چاہیئے کہ عوام ان کو عبادت اور ثواب سمجھ کر کرتے ہیں اور صوفیہ نما اپنے قول و فعل سے ان بدعات کو رواج دے رہے ہیں ۔

وفقنا اللہ وایاکم لاتباع السنۃ السنیۃ فی الاعمال والاقوال کلھا الخفیۃ منھا والجلیۃ آمین

(۱۵۷) ایامِ محترمہ کی تعظیم کا طریقہ یہ ہے کہ ان میں عبادت زیادہ کی جائے

اس میں رمضان کی افضلیت کی بھی دلیل ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مہینوں میں سے اسی مہینہ کو اس عبادت کیساتھ مخصوص فرمایا ہے ۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ایام محترمہ اور مکانات محترمہ کی تعظیم کا طریقہ یہی ہے کہ انواع عبادت کے ذریعہ ان کی عظمت ظاہر کی جائے کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس مہینہ کی عظمت کو اسی طرح ظاہر فرمایا ہے کہ اس میں عبادات کو بڑھا دیا ۔

قولہ فی الوجہ الخامس فیہ دلیل علی افضلیۃ رمضان الی قولہ فی الوجہ السادس الا بزیادۃ فی التعبدات

ف حضرات صوفیہ کو رمضان کا اور جملہ ایام محترمہ کا جس قدر اہتمام ہے ظاہر ہے اور وہ بھی ان کی تعظیم عبادت میں زیادت سے ہی کرتے ہیں عوام کی طرح جلسے اور جلوس وغیرہ سے نہیں کرتے جیسا آجکل ۱۲ ربیع الاول کو عید میلاد منائی جاتی ہے کہ یہ سراسر بدعت ہے حضرات صوفیہ اس دن میں درود شریف کی کثرت کرتے ہیں بعضے روزہ بھی رکھتے ہیں ۔

(۱۵۸) تراویحِ رمضان کی اصل تعظیم شعائر اللہ ہے اس حدیث سے سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت بھی ظاہر ہوتی ہے کیونکہ جب آپ نے دیکھا کہ

اللہ تعالیٰ شانہ کو ان راتوں کی عظمت ظاہر کرنے کا اہتمام ہے کہ جبریل علیہ السلام رمضان کی ہر رات میں بحکم خداوندی آپ کے پاس قرآن کا دور کرنے کو تشریف لاتے تھے رمضان کے سوا کسی مہینہ میں وہ دور کے لئے نہ آتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے بھی اس کی تعظیم میں یہ زیادتی کی کہ اس مہینہ میں ایک خاص نماز بڑھادی جو دوسرے مہینوں میں نہیں بڑھائی اور اس کو عملاً امت پر ظاہر بھی کر دیا تاکہ وہ بھی آپ کی اقتدا کریں اسی کا نام تعظیم شعائر ہے جسکے متعلق حق تعالیٰ فرماتے ہیں

ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من التقوی القلوب

اور جو شعائر اللہ کی تعظیم کرے تو یہ تعظیم دلوں کے تقویٰ سے (ناشی) ہوتی ہے اور جتنا تقویٰ دلوں میں ہوگا اسی قدر فضیلت ہوگی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی متقی نہیں ہو سکتا پس آپ کی برابر شعائر اللہ کی تعظیم بھی کوئی نہیں کر سکتا، اور اس میں ایک صوفیانہ اشارہ بھی ہے وہ یہ کہ جو صاحب حال احکام کے اتباع میں پختہ ہوتا ہے وہ ہمیشہ

عارف کامل ہمیشہ تجلی میں رہتا ہے

تجلی اور مشاہدہ میں ہی رہتا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تلاوتِ قرآن کے وقت یہی حال تھا جب آپ رحمت کی آیت پر گذرتے اللہ تعالیٰ سے (رحمت کا) سوال کرتے اور جب عذاب کی آیت پر گذرتے (جسمیں کفار پر عذاب کا ذکر ہوتا) تو پناہ مانگتے اور جب ایسی آیت پر گذرتے جو اللہ تعالیٰ کی صفت پر دلالت کرتی ہے جیسے خالق ہونا قادر ہونا باعظمت ہونا تو اللہ کی پاکی بیان کرتے، غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس آیت پر گذرتے اسی حالت سے رنگ جاتے تھے جو اس آیت کے مخاطب کی حالت ہونا چاہیے اور وہی جواب دیتے جس کا ادب تقاضا کرتا اور اسی کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو تعلیم دی ہے چنانچہ جب آپ نے اُن کے سامنے سورۂ رحمٰن پڑھی اور وہ خاموش رہے تو آپ نے فرمایا تم وہ بات کیوں نہیں کہتے جو جنوں نے سورۂ

رحمٰن کو سُنتے ہوئے کہی تھی۔ صحابہ نے عرض کیا انہوں نے کیا کہا تھا فرمایا جب میں فبای آلاء ربکما تکذبان پڑھتا تھا (کہ تم اللہ کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے) تو وہ کہتے تھے لا بواحدۃ منہا یا ربنا کہ اے پروردگار ہم کسی نعمت کا بھی انکار نہیں کرتے۔ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حُسنِ تعلیم اور خوبی ارشاد کو پیشِ نظر رکھو تو بارگاہِ ربوبیت کا ادب اچھی طرح بجا لا سکو گے اگرچہ اللہ تعالیٰ کو بوجہ غنا اور جلال کے کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں (مگر بندہ کو تو اس کی ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ادب پوری طرح بجالائے کہ ایمان کی علامت یہی ہے اور ایمان کا نفع بندہ ہی کو پہنچے گا)

قولہ الوجہ السابع یوخذ منہ فضل سیدنا صلی اللہ علیہ وسلم الیٰ قولہ فی الوجہ الرابع عشر مع غنائہ عن الکل وجلالہ وانما قرنت بین الوجہ السابع والرابع عشر لکون الثانی مرتبا علی الاول عندی واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۱۲ مترجم

تراویح سُنت ہے، بدعت نہیں

یہاں سے معلوم ہوگیا کہ تراویح کی نماز رمضان میں باجماعت بدعت نہیں بلکہ سنت ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عملاً اس کا ثبوت مل چکا ہے پھر سُنت ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ رہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تراویح کی جماعت کو دیکھ کر نعمت البدعۃ ہٰذہ (یہ بدعت بہت اچھی ہے) فرمانا سو آپ نے لغت کے اعتبار سے اس کو بدعت فرمادیا ہے نہ کہ شرعاً کیونکہ حضرت عمرؓ نے صرف اتنی بات جدید کی تھی کہ لوگوں کو ایک امام پر جمع کر دیا تھا پہلے مختلف قاریوں کے پیچھے ایک ایک جماعت اقتدا کرتی تھی۔ غرض تراویح کی نماز باجماعت حضرت عمر کے اس فعل سے پہلے بھی قائم تھی۔ پھر اس کو شرعاً بدعت کیونکر کہا جا سکتا ہے البتہ یہ ہیئت اور صورت دیکھنے میں جدید تھی کہ سب لوگ ایک مسجد میں ایک ہی امام کے پیچھے تراویح پڑھیں تو لغت کے اعتبار سے اس کو بدعت کہنا صحیح تھا۔

دیا یہ کہ جب نوافل کا گھر میں پڑھنا افضل ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح کی یہ نماز مسجد میں کیوں پڑھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ نماز تراویح کا مسجد ہی میں پڑھنا افضل ہے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند راتوں کے بعد تراویح کی جماعت کو اس لئے ترک فرما دیا کہ دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ نماز تم پر فرض نہ ہو جائے پھر تم اس کو نباہ نہ سکو اور یہ اندیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جاتا رہا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے افضل پر عمل کیا اور تراویح کی نماز باجماعت اہتمام کے ساتھ مسجدوں میں قائم کی جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا ان کو معلوم ہو چکا تھا اور اس سے یہ فقہی مسئلہ معلوم ہوا کہ جب کسی فعل سے کسی خاص علت کی وجہ سے منع کیا جائے تو علت کے مرتفع ہو جانے سے ممانعت بھی زائل ہو جائے گی اور وہ فعل جائز ہو گا۔

وھذا مما نبہ علیہ الشارح فی الوجہ الثانی

(۱۵۸) بعض دفعہ مفضول افضل ہوجاتا ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض دفعہ مفضول افضل اور ادنیٰ کام اعلیٰ ہوجاتا ہے جب کوئی علت اس کو مرتفع کرنیوالی پائی جائے۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند راتوں کے بعد اس وقت کی عبادت کو موقوف فرما دیا حالانکہ اس وقت کی عبادت افضل تھی مگر چوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عبادت کو موقوف کرنا تعلیم کے لئے تھا اور تشریع احکام بہت بڑی عبادت ہے تو اس علت کے بڑھ جانے کی وجہ سے مفضول فاضل اور ادنیٰ عملا اعلیٰ ہوگیا۔

قولہ الوجہ العاشر فیہ دلیل علی ان المفضول قد یرجع فاضلا الی قولہ یرجع المفضول فاضلا

ف: بعض دفعہ مشائخ طریق بھی کسی خاص وجہ سے غیر افضل پر عمل کرتے ہیں جس سے ناقصین کو وہم ہوتا ہے کہ یہ کیسے بزرگ ہیں جو افضل پر عمل نہیں کرتے حالانکہ اگر وہ اس علت کو جان لیتے جس کی وجہ سے غیر افضل کو اختیار کیا گیا تھا تو معلوم ہوجاتا کہ اس وقت وہی افضل تھا۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر — گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

(۱۵۹) بقدر ضرورت دنیا حاصل کرنا جائز ہے

حدیث سے معلوم ہوا کہ بقدر ضرورت دنیا حاصل کرنا جائز ہے اور وہ آخرت کے لئے سامان کرنے میں معین بھی ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے فصلوا ایھا الناس فی بیوتکم اے لوگو اپنے گھروں میں نماز پڑھو۔ اگر گھر بنانا جائز نہ ہوتا تو حضور یہ نہ فرماتے کہ اپنے گھروں میں نماز پڑھو۔ گھروں کی اضافت صحابہ کی طرف فرمانا اس کو مقتضی ہے کہ صحابہ نے گھر بنا رکھے تھے اور گھر بنانا جائز ہے اور ان سے آخرت کے کاموں میں مدد ملتی ہے کیونکہ آدمی ان میں خلوت کیساتھ عبادت کرتا اور اپنے معبود سے مناجات کرتا ہے جس میں کوئی تشویش اور پریشانی مخل نہیں ہوتی (کیونکہ اپنے گھر کے برابر دوسری جگہ سکون واطمینان نہیں مل سکتا) اسی طرح اور حقیقی ضروریات بشریہ ہیں (جیسے ذرائع کسب و معاش و نکاح وغیرہ) اگر وہ شریعت کے موافق ہوں اور ان سے مقصود طاعات میں مدد ہو اور یہ قصد حالاً ہو محض زبانی دعویٰ نہ ہو تو وہ سب بھی حقیقت میں آخرت محمودہ میں داخل ہیں

قولہ الوجہ الخامس عشر فیہ دلیل علی جواز اخذ ما لا بد منہ من الدنیا الی قولہ فانہ فی الحقیقۃ کلہ اخرۃ محمودۃ۔

(۱۶۰) حالت کا اخفا ہی افضل واکمل ہے

اس میں اہل تصوف کی بھی دلیل ہے جو فرماتے ہیں کہ حالت کا اخفا ہی اکمل و افضل ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ انسان کی افضل نماز وہ ہے جو وہ اپنے گھر میں پڑھے بجز فرض نماز کے اور فرض کے بعد نوافل کا زیادہ کرنا ایمان میں زیادتی کا سبب ہے جیسا ابن ابی زید رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ایمان اعمال کی زیادتی سے زیادہ ہوتا ہے اور اعمال کی کمی

ے ناقص ہوتا ہے۔ غرض اعمال ہی سے ایمان میں زیادتی اور کمی ہوتی ہے اور ایمان کی زیادتی بہت بڑی حالت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس کا اخفا افضل ہے تو جو تفسیر ہم نے کی تھی وہ درست ہو گئی (کہ حالات کا اخفا ہی اکمل ہے) اور بعض بزرگوں کا ارشاد ہے کہ اپنے دل کو اسرار کا اور اپنے مولیٰ کا خزانہ بناؤ۔ شکایت کا خزانہ نہ بناؤ (یعنی اللہ کی تقدیر سے دل میں گرانی اور شکوہ نہ لاؤ۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوں اور ہم کو بھی وہ دولت عطا فرمائیں جس سے ان پر فضل ہوا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی رب نہیں نہ ان کے سوا کسی سے امید کی جا سکتی ہے (وہی فضل فرمائیں گے تو کام بنے گا) قوله الوجه التاسع عشر نبيه وسيل لاهل الصوفية الى قوله لا رب سواه ولا مرجو الا اياه

ف اہل اللہ فرائض کے سوا اپنے تمام اعمال واحوال کے اخفا کا اہتمام فرماتے ہیں اور جن سے اظہار ہوا ہے وہ یا غلبہ حال سے ہوا ہے یا کسی مصلحت سے تاکہ ان کے اصحاب ان اعمال واحوال میں ان کا اتباع کریں یا اما بنعمة ربك فحدث کا امتثال کرتے ہوئے تحدیث نعمت کے طور پر اظہار فرمایا ہے۔

صوفیۂ قلندریہ کو اخفاء حال کا اس درجہ اہتمام ہوتا ہے کہ وہ تکثیر نوافل کے بجائے ذکر خفی اور ذکر قلبی زیادہ کرتے ہیں جس کی اطلاع فرشتوں کو بھی نہیں ہوتی اور پہلے گذر چکا ہے کہ ذکر قلبی ذکر لسانی سے افضل ہے اور ذکر اللہ بہت بڑا عمل ہے۔

ولذكر الله اكبر ۱۲ مترجم

باب جیسل وپنجم

حدیث

جواز المشی فی الصلوٰۃ

ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس (نماز میں) اس وقت پہنچے جب آپ رکوع میں تھے تو انہوں نے صف میں ملنے سے پہلے ہی رکوع کر دیا۔ پھر (آہستہ آہستہ کھسک کر صف میں جا ملے نماز کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس واقعہ کو بیان کیا تو آپ نے فرمایا اللہ تم کو زیادہ شوق دے پھر ایسا نہ کرنا۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ نماز میں تھوڑا سا چلنا جائز ہے۔ اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۶۱) شوق کا زیادہ ہونا معین عبادت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے ارشاد زادك الله حرصا ولا تعد میں صحابی کے لئے زیادہ حرص و شوق کی دعا ہے جس کا مطلب ہے کہ اللہ تم کو اعلیٰ عبادات کی طلب میں کوشش کا زیادہ شوق دے کیونکہ اگر وہ اسی جگہ نماز پڑھ لیتے جہاں نیت باندھی تھی تو نماز درست ہو جاتی مگر صف اول کا درجہ بہت بلند ہے اور اس میں بھی وہ جگہ جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب ہو، زیادہ افضل ہے تو صحابی نے تمام صفوں سے افضل صف اور اس میں بھی سب سے زیادہ افضل جگہ لینی چاہی، اس سے یہ علمی

مسئلہ معلوم ہوا کہ شوق کا زیادہ ہونا ہی عبادات پر برانگیختہ کرتا ہے اور یہ دلیل ہے صوفیہ کی جو یہ فرماتے ہیں کہ **مردانِ طریق کو ہمت نے ہی آمادہ کیا ہے** مردوں کو ہمت ہی نے اعمال پر آمادہ کیا ہے۔ ابدان نے اور جسمانی قوت نے آمادہ نہیں کیا۔

قولہ الوجہ الثانی قولہ صلی اللہ علیہ وسلم زادک اللہ حرصا ولا تعد الی قولہ انما حملت الرجال الھمم لا الابدان

ف اس ہمت عالیہ کا اثر یہ ہے کہ اللہ والے بڑھاپے میں بھی جوانوں سے زیادہ کام کرتے ہیں جس کا اندازہ ان کے پاس بیٹھنے سے ہوتا ہے۔

(۱۶۲) کام سے پہلے اس کا اہتمام کرو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد لا تعد (پھر ایسا نہ کرنا) کا مطلب یہ ہے کہ پھر نماز میں اتنی دیر نہ کرنا کہ صف اول تک پہنچنے کے لئے نماز میں چلنے کی ضرورت ہو، اس سے یہ معلوم ہوا کہ تکمیل عمل کے لئے مستحب یہ ہے کہ کام شروع کرنے سے پہلے اس کا اہتمام کیا جائے مثل مشہور ہے قبل الرمی تراش السہام تیر اندازی سے پہلے تیروں کے پر لگائے جاتے ہیں۔

قولہ ولا تعد ای لا تعد للتاخیر الی قولہ فی الوجہ الثالث تراش السہام۔

(۱۶۳) بدون طلب کے بھی کسی کو دعا دینا جائز ہے حدیث میں یہ بھی ہے کہ کسی کو دعا دینا اگرچہ اس نے درخواست بھی نہ کی ہو جائز ہے جبکہ وہ دعا کا اہل ہو کیونکہ اس سے اس کام میں اعانت ہوگی جس میں وہ لگا ہوا ہے چنانچہ سیدنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرہ کو دعا دی حالانکہ انہوں نے درخواست نہ کی تھی کیونکہ آپ نے ان کے اندر آثار خیر ملاحظہ فرمائے تھے پھر آپ نے ان کو ایسی دعا

دی جو سراسر خیر تھی کہ خدا تم کو نیک اعمال کا زیادہ شوق دے یہ نہیں فرمایا کہ خدا کرے تم دوبارہ ایسا نہ کرو کیونکہ حضور کی ہر دعا مستجاب ہے، تو اس دعا میں یہ بھی اندیشہ تھا کہ وہ کسی وقت جماعت ہی سے رہ جاتے۔ اس پر یہ علمی مسئلہ مرتب ہوا کہ کسی کو کوئی دعا اپنے واسطے یا کسی کے واسطے اس وقت تک نہ کرنا چاہیئے جب تک یقین کے ساتھ یہ معلوم نہ ہو جائے کہ وہ سراسر خیر ہی خیر ہے۔

قولہ الوجہ الخامس یوخذ منہ الدعاء للشخص الی قولہ سواء کان لنفسہ او لغیرہ۔

(۱۶۴) دلجوئی اور دلداری کا ثبوت اس میں صوفیہ کی بھی دلیل ہے جو جبر قلوب کے قائل ہیں (یعنی دلداری خلق اور دلجوئی کو عبادت سمجھتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی کو دعا دی کیونکہ ان کے نزدیک سب سے بڑی خوشی یہی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو دعا دیں غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دیکھا کہ صحابی کا دل اس وجہ سے کہ اس نے اپنی رائے سے بغیر حکم شرعی معلوم کئے ایک عمل کر لیا شکستہ ہو رہا ہے تو آپ نے خوشخبری سنا کر اس کے دل کو جوڑ دیا۔

قولہ الوجہ السابع فیہ دلیل لاھل الصوفۃ الی قولہ وھو لا یعلم ما حکم الشرع فیہ۔

ف حضرات صوفیہ کو عمل شروع کرنے سے پہلے اس کا جس قدر اہتمام ہوتا ہے ظاہر ہے اسی طرح ان کی یہ بھی عادت ہے کہ اپنے دوستوں میں سے جس کو اہل سمجھتے ہیں دعاؤں سے نوازتے رہتے ہیں گو وہ درخواست بھی نہ کریں اور شکستہ دلوں کا جوڑنا تو ان کا خاص حصہ ہے ۱۲ مترجم

حدیث

وجوب توفیة ارکان الصلوٰۃ

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو ایک شخص مسجد میں داخل ہوا اس نے نماز پڑھی پھر آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دے کر فرمایا واپس جاؤ پھر نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔ اس نے پھر نماز پڑھی پھر آیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا آپ نے فرمایا واپس جاؤ پھر نماز پڑھو، کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔ تین بار اسی طرح ہوا تو اس نے عرض کیا قسم اس ذات کی جس نے آپ کو نبی برحق بنا کر بھیجا میں اس سے اچھی نماز پڑھنا نہیں جانتا مجھے آپ بتلا دیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو اللہ اکبر کہو، پھر تم کو جتنا قرآن یاد ہو اس میں سے جتنا آسان ہو پڑھو پھر رکوع کرو یہاں تک کہ رکوع میں اطمینان سے جھکے رہو پھر سر اٹھاؤ یہاں تک کہ سیدھے کھڑے ہو جاؤ پھر سجدہ کرو یہاں تک کہ اطمینان سے سجدہ میں رہو پھر سر اٹھاؤ یہاں تک کہ اطمینان سے بیٹھ جاؤ پھر سجدہ کرو یہاں تک کہ اطمینان سے سجدہ میں رہو پھر تمام نماز میں اسی طرح کرتے رہو۔

شرح ظاہر حدیث نماز کے جملہ ارکان قیام و رکوع وغیرہ کو پوری طرح بجالانے کو واجب کرتا ہے اور جو ایسا نہ کرے اس کی نماز

درست نہ ہوگی اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۶۵) عمل کا بار بار تکرار کرنا بدون تکمیل عمل کے بیکار ہے

حدیث سے معلوم ہوا کہ جب تک عمل کو اچھی طرح نہ کیا جائے بار بار دہرانے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا کیونکہ اس شخص نے تین مرتبہ نماز کو دہرایا اور ہر دفعہ حضور نے یہی فرمایا کہ واپس جاؤ نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔

قولہ الوجہ السابع فیہ دلیل علی ان تکرار العمل الی قولہ لم تصل ثلاثا۔

ف یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو نفلیں تو بہت پڑھتے ہیں مگر نماز میں بہت جلدی کرتے ہیں ارکان کو اطمینان سے ادا نہیں کرتے، ارکان کو اطمینان سے ادا کرنا جمہور علماء کے نزدیک فرض ہے اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے ۱۲ ظ

(۱۶۶) جب تک سوال نہ کیا جائے مسئلہ بتلانا واجب نہیں

اس میں ان لوگوں کی بھی دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ عالم کے ذمہ مسئلہ بتلانا اس وقت تک واجب نہیں جب تک اس سے سوال نہ کیا جائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت تک اس کو نہیں بتلایا جب تک اس نے یہ نہیں کہا کہ یا رسول اللہ مجھے بتلا دیجئے۔

قولہ الوجہ الثامن فیہ دلیل لمن یقول الی قولہ حتی قال فعلمنی

ف بعض حضرات صوفیہ کا معمول یہی ہے کہ جب تک ان سے دریافت نہ کیا جائے اس وقت تک خود مسئلہ نہیں بتلاتے۔ یہ حدیث ان کی حجت ہے۔

(۱۶۷) محض احتمال کی بنا پر حکم نہ لگانا چاہیئے

حدیث سے معلوم ہوا کہ امر محتمل پر کوئی حکم

نہ لگایا جائے جب تک اس کی حقیقت نہ معلوم ہو جائے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص پر نہ کوئی تنقید کی نہ اس کو ملامت کی بس یہی فرمایا کہ واپس جاؤ پھر نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی کیونکہ احتمال تھا کہ اس نے پوری طرح نماز کے ارکان کو اس لئے ادا نہ کیا ہو کہ دل کی پریشانی اور مشغولی کی وجہ سے ذہول ہو گیا یا جہل کی وجہ سے ایسا کیا ہو جیسا بعد میں اس نے ظاہر کیا غرض احتمال کی وجہ سے آپ نے اس سے زیادہ کچھ نہیں فرمایا کہ نماز کے صحیح نہ ہونے کی اس کو اطلاع کر دی۔

قوله الوجه التاسع يؤخذ منه ان لا يحكم بشئ محتمل الى قوله لم يزده عليه السلام على الاخبار بعدم الاجزاء شيئا

ف اس ادب کی رعایت صوفیہ کاملین ہی کرتے ہیں ورنہ لوگ عام طور سے احتمال ہی پر حکم لگا دیتے ہیں۔

(۱۶۸) عبادت میں مشغول ہونے والے کو دیکھنا جائز ہے

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عبادت میں مشغول ہونے والے کی طرف دیکھنا جائز ہے البتہ اگر اس کے سامنے بیٹھا ہو تو نہ دیکھے کیونکہ آگے بیٹھنے والا اگر سامنے سے دیکھے گا تو اس سے عبادت کرنے والے کو تشویش ہو گی (اس کا دل بٹے گا) علماء نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ اس حالت میں اس کی طرف سے منہ پھیر لے غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اس شخص سے یہ فرمایا کہ واپس جاؤ پھر نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی اس سے معلوم ہوا کہ جب تک وہ نماز پڑھتا رہا حضور اس کو دیکھتے رہے تھے اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ کو اس کی نماز کا حال معلوم نہ ہو سکتا۔

ہر ذمہ دار کو اپنے ماتحت لوگوں کے اعمال کی نگہداشت کرنا چاہیے

اس پر یہ علمی مسئلہ مرتب ہوا کہ ہر نگران کو ان لوگوں کی دینی حالت پر نظر رکھنا چاہیے جو اس کی نگرانی کے تحت میں ہیں کیونکہ ان کے متعلق اس سے باز پرس ہو گی اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عمال و حکام کے نام ایک خط میں لکھا تھا ان اهم امورکم عندی الصلوة مجھے تمہارے کاموں میں سب سے زیادہ نماز کا فکر ہے (کہ تم اس کی پوری پابندی کرتے ہو یا نہیں)

ف کسی معتبر کتاب میں میں نے دیکھا ہے جس کا نام یاد نہیں رہا غالباً کنز العمال میں دیکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ سے دریافت فرمایا کہ میں جب معتبر اہل شخص کو کوئی عہدہ دیتا ہوں تو کیا یہ کافی ہے کہ عہدہ دینے سے پہلے اس کی اہلیت لیاقت دیانت و امانت کی تحقیق کر لوں پھر میں سبکدوش ہوں یا مجھے عہدہ دینے کے بعد اس کے کام کی تحقیق بھی کرنا چاہیے کہ جیسا میرا گمان تھا وہ ویسا ہی ثابت ہوا یا اس کے متعلق میرا گمان غلط نکلا۔ سب نے جواب دیا کہ عہدہ دینے سے پہلے پوری طرح تحقیق کر لینا کافی ہے اس کے بعد آپ سبکدوش ہیں۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہ جواب صحیح نہیں بلکہ مجھے اس کے کام کی تحقیق بھی کرنا چاہیے کہ جیسا میرا گمان تھا اس نے اسی طرح کام کا حق ادا کیا یا میرا گمان اس کے متعلق غلط ثابت ہوا بدون اس کے میں سبکدوش نہ ہوں گا۔ محققین صوفیہ کا بھی یہی خیال ہے کہ جس کو کوئی خدمت سپرد کی جائے اس کے اعمال کی جانچ بھی کرنا چاہیے کہ جو خدمت اس کے سپرد کی گئی ہے وہ اس کا اہل ثابت ہوا یا نہیں۔

(۱۶۹) صحابہ میں تکلف اور تصنع نہ تھا

اس حدیث سے صحابہ کی فضیلت اور ان کی بے تکلفی بھی معلوم ہوئی کہ ان میں بناوٹ اور تصنع نام کو بھی نہ تھی چنانچہ ان صحابی نے بے تکلف کہہ دیا کہ والذی بعثك بالحق ما احسن غيره فعلمني قسم اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں اس سے اچھی نماز نہیں پڑھ سکتا آپ مجھے بتلا دیجئے، اس نے تواضع سے کام لیا اور صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ قسم سے کلام کو مؤکد کیا اور علماءُ

نے فرمایا ہے کہ طالب علم صرف دو وجہوں سے محروم رہتا ہے یا تکبر کی وجہ سے یا شرم کی وجہ سے کیونکہ دین میں تکبر یا شرم کا کام نہیں نہ حق بات کہنے میں نہ اس کے بتلانے میں نہ معلوم کرنے میں اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

نعم النساء نساء الانصار لم یمنعھن الحیاء ان یتفقھن فی الدین

انصار کی عورتیں بہت اچھی عورتیں ہیں ان کو مسائل دین کے دریافت کرنے میں حیا و شرم مانع نہیں ہوتی۔

قولہ الوجہ الثانی عشر فیہ دلیل علی فضل الصحابۃ الی قولہ ان یتفقھن فی الدین۔

(۱۷۰) نفس کشی کا ثبوت اور اس کا مطلب

اس میں صوفیہ کی بھی دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ نفس کو مارنا چاہیئے کیونکہ نفس کے عیوب ظاہر کر کے اس کو رسوا کرنا بھی موت ہے اور نفس کی موت ہی اسکی حیات ہے ؎

موت النفوس حیاتھا من احب ان یحیا یموت

نفسوں کا مرنا ہی ان کی زندگی ہے، جو زندہ رہنا چاہے اسے پہلے مرنا چاہیئے۔ قولہ الوجہ الثالث عشر فیہ دلیل لاھل الصوفۃ الی قولہ من احب ان یحیا یموت

ف نفس کا مارنا یا نفس کشی تصوف کی اصطلاح میں تکبر، دعوی، عجب، پندار، خود رائی و خود بینی زائل کرنے کا نام ہے جب تک یہ رذائل نفس کے اندر موجود ہیں وہ زندہ ہے جس دن ان سے پاک ہو گیا مردہ ہو گیا مگر اس موت کے بعد اسکو دوسری حیات عطا ہوتی ہے جو روحانی حیات ہے اور لازوال حیات ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

آزمودم عقل دور اندیش را[1] بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

[1] ای دعوی عقل ۱۲

یعنی اقرار جہالت خود کنم تا عقل حقیقی میسر شود ولنعم ما قال ؎

سالہا تو سنگ بودی دل خراش آزمودا یک زمانے خاک باش

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

ہر کجا رنجے دوا آنجا رود ہر کجا دردے شفا آنجا رود

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود

ہر کجا مشکل جواب آنجا رود



باب چہل و ہفتم

حدیث

ردّ الماموم علی الامام بالحمد فی الرفع

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم اللھم ربنا لک الحمد کہو کیونکہ جس کا قول فرشتوں کے قول سے مل جائے گا اس کے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ امام کے سمع اللہ لمن حمدہ کہنے کے وقت جس کی تحمید ملائکہ کے قول سے مل جائے گی اس کی مغفرت ہو جائے گی اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۷۱) جماعت کی نماز سب نمازوں سے افضل ہے حدیث میں اس کی دلیل ہے کہ جماعت کی نماز کو دوسری نمازوں پر فضیلت ہے کیونکہ ملائکہ تنہا نماز پڑھنے والے کے سمع اللہ لمن حمدہ کہنے پر آمین یا حمد کچھ نہیں کہتے بلکہ صرف امام کے لئے وہ ایسا کرتے ہیں کہ جب وہ سمع اللہ لمن حمدہ کہتا ہے تو وہ جواب دیتے ہیں اور اس مقام پر قوت کلام کا مدلول یہ ہے کہ اس وقت اللھم ربنا ولک الحمد کہنے کی پابندی کرنا چاہئے کیونکہ جب رسول اللہ نے اس کا ثواب بتلایا ہے تو گویا آپ بڑی تاکید کیساتھ یہ فرمارہے ہیں کہ اس سے غفلت نہ کرو اور اس کا پورا خیال رکھو۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز کے دوسرے ارکان پر اس رکن کو زیادہ شرف حاصل ہے کیونکہ اس رکن کے سوا اور کسی کے متعلق یہ نہیں آیا کہ ملائکہ اس میں آدمی کیساتھ موافقت کر کے شریک ہوتے ہیں ہاں سورۃ الحمد کے ختم پر بھی جب امام آمین کہتا ہے تو ملائکہ آمین کہتے ہیں جس سے اس سورت کی بھی فضیلت ثابت ہوئی کیونکہ ختم فاتحہ کے علاوہ اور کسی سورت کی قراءت کے لئے یہ نہیں آیا کہ ملائکہ اس پر آمین کہتے ہیں بہرحال امام کے سمع اللہ لمن حمدہ کہنے پر ملائکہ کا اللھم ربنا لک الحمد کہنا بتلاتا ہے کہ اس رکن کی عظمت دوسرے ارکان و اقوال سے زیادہ ہے

قولہ فی الوجہ الخامس فیہ دلیل علی فضل صلاۃ الجماعۃ الی قولہ فی الرابع علی تعظیمہا من بین الارکان والاقوال

ف صوفیہ متبعین سنت کو جماعت کا بہت زیادہ اہتمام ہوتا ہے ہم نے اپنے اکابر کو اسی قدم پر پایا ہے اور حضرات سلف صالحین کا بھی یہی طریقہ ہے مگر آجکل کے جاہل صوفیوں نے تصوف کو بدنام کر رکھا ہے وہ جماعت کا تو کیا اہتمام کرتے نماز کی بھی پوری پابندی نہیں کرتے نہ معلوم ان لوگوں نے تصوف کس چیز کا نام رکھ لیا ہے جو مخالف سنت کے ساتھ بھی جمع ہو سکتا ہے فلا حول ولا قوۃ الا باللہ

(۱۷۲) ترک حظوظ جملہ اعمال سے افضل ہے یہاں ایک صوفیانہ اشارہ بھی ہے کیونکہ ان حضرات نے جب یہ دیکھا کہ ملائکہ اللھم ربنا لک الحمد کہنے میں نمازیوں کے ساتھ اس لئے شریک ہوتے ہیں کہ رکوع میں بندہ کو صرف اپنے رب کی تعظیم کا حکم ہے قراءت اور دعا وغیرہ کی اجازت نہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی زبانی ارشاد فرمایا ہے کہ جس کو میرا ذکر مجھ سے مانگنے اور دعا کرنے سے روک دے میں اس کو مانگنے والوں سے بھی زیادہ دیتا ہوں اور اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر جب کہ نمازی اپنے رب کی تعظیم کر کے سر اٹھاتے ہیں اتنی بڑی خیر و برکت رکھ دی کہ فرشتے بھی ان کے ساتھ اللھم ربنا لک الحمد کہنے میں شریک ہوتے ہیں اور جس کا قول ان کے قول سے مل جائے

اس کی مغفرت ہو جاتی ہے اور اپنے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ مسلمانوں کو اسکی اطلاع دیدیں تاکہ وہ اس نعمت کی قدر کریں کیونکہ مغفرت سے بڑھ کر کوئی ثواب نہیں تو انہوں نے سمجھ لیا کہ اس اشارہ کا مقتضی یہ ہے کہ نفسانی خواہشوں کو چھوڑ دینا سب کاموں سے افضل ہے (چنانچہ اپنی ضروریات کے لئے دعا کرنا اور اللہ تعالیٰ سے مانگنا نفس کا تقاضا ہے مگر اللہ تعالیٰ مانگنے والوں سے زیادہ ان کو دیتے ہیں جو اللہ کی یاد میں مشغول ہو کر دعا سے رہ جاتے ہیں اس لئے انہوں نے اسی کو اختیار کیا اور تمام حظوظ نفس سے باہر ہو گئے اور رب جلیل (یعنی حق سبحانہ) کے ذکر میں مشغول ہو گئے جس کے ثمرہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بلند عزت سے نوازا کہ ان کا شرف اپنی کتاب محکم میں نازل فرمایا چنانچہ ارشاد ہے رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله وہ ایسے لوگ ہیں جن کو تجارت اور بیع اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتی ہے اور ارشاد ہے واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم بالغداة والعشي يريدون وجهه اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ رکھو جو اپنے رب کو صبح اور شام یاد کرتے ہیں صرف اسی کی ذات کا ارادہ کرتے ہوئے (کسی دنیوی غرض سے نہیں) اللہ تعالیٰ ہم کو بھی وہ بات سمجھا دیں جو ان کو سمجھائی ہے اور جملہ احوال میں ان کے ساتھ کر دیں اللہ کے سوا کوئی رب نہیں۔

وصلى الله على سيدنا محمد وآله وسلم تسليما، قوله في الوجه السادس وهنا اشارة صوفية مع الحكمة التي ذكرها في الوجه الخامس الى قوله لا رب سواه۔

باب چہل و ششم

حدیث

رؤیۃ المولیٰ عزوجل

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا ہم اپنے پروردگار کو قیامت کے دن دیکھیں گے؟ فرمایا کیا تم کو چودھویں رات میں چاند کے دیکھنے میں کچھ شبہ ہوتا ہے؟ جبکہ اس کے سامنے بادل بھی نہ ہو عرض کیا یا رسول اللہ نہیں، فرمایا کیا تم کو سورج کے دیکھنے میں شبہ ہے؟ جب کہ اس کے سامنے بادل نہ ہو، عرض کیا نہیں یا رسول اللہ! فرمایا تو تم اپنے پروردگار کو اسی طرح دیکھو گے، لوگ قیامت کے دن جمع کئے جائیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے جو جس چیز کی عبادت کرتا ہو اسی کے پیچھے چلا جائے، چنانچہ کچھ لوگ سورج کے پیچھے ہولیں گے کچھ چاند کے پیچھے ہولیں گے بعضے شیاطین کے ساتھ ہولیں گے اور یہ امت رہ جائے گی جن میں اس کے منافق بھی ہوں گے اللہ تعالیٰ اس امت کے پاس تشریف لائیں گے اور فرمائیں گے میں تمہارا رب ہوں تم میرے ساتھ آؤ، یہ امت کہے گی کہ ہم تو اپنی اسی جگہ پڑے رہیں گے یہاں تک کہ ہمارا رب تشریف لائے کیونکہ جب ہمارا رب آئیگا ہم اس کو پہچان لیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے پاس دوسری بار تشریف لائیں گے اور فرمائیں گے میں تمہارا رب ہوں تم میرے ساتھ چلو اس وقت مسلمان کہیں گے بیشک آپ ہمارے پروردگار ہیں تب اللہ تعالیٰ ان کو بلائیں گے اور جہنم کی پشت پر پل صراط قائم کیا جائے گا پس تمام رسولوں سے پہلے میں اپنی امت کو لیکر اس پر سے گذروں گا اور اس وقت رسولوں کے سوا کوئی بات نہ کر سکے گا رسولوں کا کلام اس وقت یہ ہوگا اللهم سلم سلم (اے اللہ سلامتی سے پار کر دے سلامتی سے پار کر دے) اور جہنم میں ایسے کانٹے ہوں گے جیسے سعدان کے کانٹے

سکتے ہیں تم نے سعدان کے کانٹے دیکھے ہیں صحابہ نے عرض کیا ہاں دیکھے ہیں، فرمایا وہ ایسے ہی ہوں گے مگر ان کی جسامت کی مقدار اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں کچھ لوگ اپنے اعمال کے سبب (ان کانٹوں کے ذریعہ جہنم کی طرف) کھینچے جائیں گے تو بعضے تو اپنے عمل کی وجہ سے ہلاکت کو پہنچ جائیں گے اور بعضوں کو ان کانٹوں سے خراش لگے گی پھر بچ جائیں گے، یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ جہنم والوں میں سے جن پر رحمت کرنا چاہیں گے رحمت کریں گے تو فرشتوں کو حکم دیں گے کہ جو اللہ کی عبادت کرنے والا (جہنم میں) ہو اس کو نکال لاؤ۔ فرشتے ان کو نکالیں گے اور فرشتے ان کو سجدہ کے نشانوں سے پہچانیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آگ کے اوپر سجدہ کے نشان کو کھانا حرام کر دیا ہے غرض وہ جہنم سے نکالے جائیں گے انسان کے تمام بدن کو آگ کھا لے گی مگر سجدہ کے نشان کو نہ کھا سکے گی۔ یہ لوگ جہنم سے جلے ہوئے نکلیں گے تو ان کے اوپر آب حیات ڈالا جائے گا جس سے وہ اس طرح اگیں گے جیسا سیلاب کے خس و خاشاک میں دانہ اگتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ بندوں کے درمیان فیصلے سے فارغ ہو جائیں گے اور صرف ایک شخص دوزخ اور جنت کے بیچ میں رہ جائیگا جو دوزخیوں میں سب کے پیچھے جنت میں جائیگا (جہنم سے نکلنے کے بعد) اس کا منہ دوزخ ہی کی طرف ہوگا تو وہ کہے گا اے پروردگار میرا منہ جہنم کی طرف سے ہٹا دے کہ مجھ کو اس کی بدبو نے پریشان کر دیا اور اس کی لپٹ نے پھونک دیا ہے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اگر تیری یہ فرمائش پوری کر دی گئی تو کیا اور تو نہیں مانگے گا؟ کہے گا نہیں آپ کی عزت کی قسم (میں اور کچھ نہ مانگوں گا) پھر وہ اللہ تعالیٰ سے بہت کچھ عہد و میثاق کریگا تو اللہ تعالیٰ اس کا منہ جہنم کی طرف سے ہٹا دیں گے جب وہ جنت کو اپنے سامنے دیکھے گا اور اس کی زینت اور آرائش پر نظر پڑیگی تو جب تک اللہ تعالیٰ چاہیں گے وہ خاموش رہے گا پھر ضبط نہ ہو سکے گا تو کہے گا اے رب مجھے جنت کے دروازے کے پاس پہنچا دیجئے، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کیا تو نے ابھی پختہ عہد نہ کیا تھا کہ اور کچھ نہ مانگوں گا تو وہ کہے گا اے رب میں ساری مخلوق میں سب سے زیادہ بدبخت نہیں رہوں گا تو فرمائیں گے اچھا اس کے بعد اور تو کچھ نہ مانگے گا؟ وہ کہے گا نہیں آپ کی عزت کی قسم اور کچھ نہ مانگوں گا پھر اس پر اللہ تعالیٰ کے سامنے بہت کچھ عہد و میثاق کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے دروازہ پر پہنچا دیں گے، دروازہ پر پہنچ کر جب وہ جنت کی رونق اور تازگی اور مسرت بخش منظر دیکھے گا تو جب تک اللہ تعالیٰ چاہیں گے خاموش رہے گا پھر کہے گا اے پروردگار مجھے جنت کے اندر پہنچا دیجئے، اللہ

عزوجل فرمائیں گے اے ابن آدم تو کیسا غدار ہے کیا تو نے ابھی پختہ عہد نہ کیا تھا کہ اور کچھ نہ مانگوں گا وہ عرض کریگا اے پروردگار اپنی ساری مخلوق میں مجھے ہی سب سے زیادہ محروم اور بدبخت نہ کیجئے اس بات پر اللہ تعالیٰ ہنس پڑیں گے (یعنی بہت خوش ہوں گے اللہ تعالیٰ کی ہنسی کو انسان اپنی ہنسی پر قیاس نہ کرے جو بے اختیار ہوا کرتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اضطرار سے پاک ہیں غرض) پھر اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں جانے کی اجازت دے دیں گے اور فرمائیں گے تمنا کر (اور جو مانگتا ہے مانگ) چنانچہ وہ اپنی تمنا بیان کرنا شروع کرے گا جب اس کی تمنا ختم ہو جائیگی تو حق تعالیٰ اس کو یاد دلائیں گے کہ یہ بھی مانگ یہ بھی مانگ یہاں تک کہ جب اس کی تمام آرزوئیں انتہا کو پہنچ جائیں گی تو حق تعالیٰ فرمائیں گے (جا) تیرے واسطے یہ بھی ہے اور اسی کی برابر اور بھی اور ابو سعید خدری کی روایت میں ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا کہ تیرے واسطے یہ بھی ہے اور اس کا دس گنا اور۔

شرح ظاہر حدیث میں اللہ تعالیٰ کی دیدار کی تحقیق ہے جو قیامت کے دن ہم کو نصیب ہوگا اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱-۲) حدیث سے معلوم ہوا کہ ادراکات حواس حق تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ اللہ عزوجل ان میں جو چاہتے ہیں جس طرح چاہتے ہیں (ادراک) پیدا فرماتے ہیں (یہ ضروری نہیں کہ حواس درست ہوں تو ادراک ہو ہی جائے) یہ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ مسلمانوں کے پاس آئیں گے (جیسا آنا ان کی شان کے لائق ہے) اور فرمائیں گے کہ میں تمہارا رب ہوں پھر باوجود رویت اور کلام کے ان کو حق تعالیٰ کی معرفت حاصل نہ ہوگی (وہ نہیں پہچانیں گے اور کہدیں گے کہ ہم تو اسی جگہ رہیں گے جب تک ہمارا رب آئے۔

حجاب ہماری طرف سے ہے حق تعالیٰ کی طرف سے نہیں

کیونکہ یہ حجاب خود بندوں کی طرف سے ہوگا (ان ہی کے حواس کا ادراک اس وقت صحیح نہ ہوگا) ہم اس کو بلا تشبیہ ایک مثال سے واضح کرتے ہیں اور اللہ کے لئے تو بڑی مثال ہے (ان کی شان کے لائق کون مثال بیان کر سکتا ہے) دیکھو آفتاب کی ٹکیا جب سامنے ہو اور کسی کمزور نگاہ والے سے کہا جائے کہ سورج کو دیکھو اور اس کو یہ بات معلوم ہے کہ جب آفتاب کے سامنے بادل نہ ہو تو وہ خوب روشن ہوتا ہے مگر اس وقت جو اس کو دیکھنا تو

نگاہ کمزور ہونے کی وجہ سے سورج میں سُرخ اور سبز اور زرد اور سیاہ دھاریاں نظر آئیں گی تو وہ بے ساختہ کہے گا کہ یہ تو وہ سورج نہیں جس کو میں پہچانتا ہوں (یہ تو نہ معلوم کیا چیز ہے) تو اس سے کہا جائیگا کہ (آفتاب تو وہی ہے مگر) تیرا ادراک صحیح نہیں وہ اس میں بحث کریگا تو اس سے کہا جائیگا کہ اپنی آنکھوں کا علاج کر کے پھر آ اور سورج کو دیکھ جب وہ اپنی آنکھوں کی دوا کر کے دوبارہ سورج کو دیکھے گا تو اس کو روشنی اور حُسن میں حالت کمال پر پائیگا اس وقت خود اقرار کریگا کہ واقعی پہلے جو حجاب نظاہر خود اس کی طرف سے تھا یہ حال ایک مخلوق کا دوسری مخلوق کے ساتھ ہے تو اس کی ذات کے ساتھ کیا حال ہوگا جس کی مثل کوئی چیز نہیں پس جتنے حجابات ہم کو پیش آتے ہیں وہ سب ہماری طرف سے ہیں جو قدرت اور حکمت الٰہیہ سے پیدا کئے گئے ہیں اس میں مومنین کے لئے بھی حجت ہے جو فرماتے ہیں کہ حجابات سب اُن کی طرف سے ہیں (اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہیں) جو ان حجابات سے پوری طرح نکل گیا وہی واصل اور عارف ہوگیا وہ اللہ تعالیٰ سے خطاب کرتا ہے اور اس سے خطاب کیا جاتا ہے - مشاہدہ کرتا ہے اور مشاہدہ کیا جاتا ہے لیکن عظمت اور کبریائی کے حدود کی رعایت کیساتھ قواعد شرعیہ اور اس تنزیہ کو محفوظ رکھ کر جو جلال الٰہی کے لائق ہے (پس جس کو ادب اور عظمت الٰہیہ اور قواعد شرعیہ کی مخالفت پر دیکھو سمجھ جاؤ کہ اس کو نہ وصول ہوا نہ معرفت حاصل ہوئی نہ مشاہدہ سے حصہ ملا بلکہ محجوب اور محروم ہے۔

قوله فی الوجه الثانی عشر قوله علیه السلام فیقولون هذا مکاننا الی قوله فی الوجه الثالث عشر بمقتضی القدرة والحکمة الربانیة۔

مومنین جو اوّل یہ کہیں گے کہ ہم اسی جگہ رہیں گے یہاں سے نہ ہٹیں گے یہاں تک کہ ہمارا (۱۷۴) پروردگار ہمارے پاس آئے - اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے سامنے اسی طرح تجلی فرمائیں جیسا دنیا میں ہم سے وعدہ کیا تھا۔

جیسا علم یہاں ہوگا ویسا ھی آخرت میں ہوگا

یہاں سے یہ علمی مسئلہ معلوم ہوا کہ جو حال تمہارے علم کا اس عالم میں ہے وھی حال تمہارا اس عالم میں ہوگا - اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جب قبر کے دو فرشتوں (منکر نکیر) کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے دریافت کیا کیا اس وقت میری عقل بھی ٹھکانے ہوگی؟

کہا گیا (ہاں) عقل تو ٹھکانے ہوگی انہوں نے کہا تو پھر مجھے ان کی پروا نہیں، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اُن کا علم اس وقت ایمان کے اعلیٰ درجہ پر ہوگا اس لئے انہوں نے فرمایا کہ جب مجھے اتنی عقل ہوگی جس سے میں ایمان کو سمجھ لوں تو پھر میں نجات پا جاؤں گا - اس میں کچھ شک نہیں، اندیشہ اگر تھا تو حالت کے بدلنے کا کہ مرنے کے بعد کہیں عقل ھی خبط نہ ہوجائے جب یہ نہیں تو پھر اندیشہ کچھ نہیں عقل سلامت رہے تو انشاء اللہ ہر سوال کا جواب آسان ہے)

قیامت میں تجلی بقدر معرفت ہوگی

اس لئے اہل معرفت اور علماء شریعت نے فرمایا ہے کہ وہاں دار کرامت میں تجلی اسی تفاوت سے ہوگی جتنا دنیا میں لوگوں کی معرفت اور اجلال و تعظیم میں تفاوت ہے اور مومنین کے اس قول کا کہ جب ہمارا رب آئے گا ہم اس کو پہچان لیں گے - مطلب یہ کہ جب وہ ہمارے سامنے اپنے آپ کو ظاہر کریں گے تو ہم پہچان لیں گے، کیونکہ مسلمان وہاں بھی (اور یہاں بھی) اس بات کو جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت بہت بڑی ہے وہ جو چاہتے ہیں اور جس طرح چاہتے ہیں کر سکتے ہیں (تو قدرت سے کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ تجلی فرمائیں اور بندوں کو اس تجلی اور دیدار کا تحمل بھی عطا فرمادیں)

یہاں ایک سوال ہے کہ یہ جواب سب لوگ یک زبان ہوکر دیں گے یا خاص خاص اہل معرفت جواب دیں گے؟ اور اُن ہی سے خطاب کیا جائیگا دوسرے لوگ ان کے تابع ہوں گے؟ جیسا دنیا میں بھی ہوتا ہے کہ جماعت میں سے جب بعض لوگ بولتے (اور باقی خاموش رہتے ہیں) تو محاورہ عرب میں کہا جاتا ہے کہ جماعت نے یوں کہا (جماعت کی طرف کسی بات کی نسبت کرنے میں سب کا بولنا ضروری نہیں دونوں صورتیں محتمل ہیں اور قدرت سے یہ بھی بعید نہیں کہ وہاں عامی کو بھی حسن جواب اور حسن ادب عطا ہوجائے جیسا یہاں اہل معرفت کو عطا ہوا ہے اور اس میں بڑی بشارت ہے، کہ ایمان کی سلامتی کی خبر دی گئی اور بتلا دیا گیا کہ ایمان کیسی دولت ہے کتنا بڑا فضل ہوگا کہ اس بندہ کو باوجودیکہ وہ جیسا حقیر ہے معلوم ہے اپنے مولیٰ جلیل اللہ تعالیٰ شانہ سے خطاب اور گفتگو کا شرف عطا ہوگا حالانکہ ان کی شان استغنا و جلال جیسی کچھ ہے ظاہر ہے۔

اسی واسطے ایک عابدہ سے منقول ہے کہ وہ موت کے نام سے بہت خوش ہوتی تھیں اور فرمایا کرتی تھیں کیا اللہ تعالیٰ مجھ سے خطاب فرمائیں گے اور دھمکا کر یوں نہ فرمائیں گے اے نالائق بندی تو نے ایسا کیا

اور ویسا کیا بس یہی میرا بڑا مطلوب ہے، عارف شیرازی نے خوب کہا ہے ؎

بدم گفتی وخورسندم عفاک اللہ نکو گفتی — جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

عاشق کو محبوب کی دشنام میں بھی وہ لذت آتی ہے جو دوسروں کو تعظیم و تکریم میں بھی حاصل نہیں ہوتی

رزقنا اللہ و ایاکم حب اللہ وحب رسولہ وسقانا من شراب حبہ آمین

اور یہ جو فرمایا کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہولیں گے اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرف جانے کا حکم ہوگا اس طرف ہولیں گے اور یہی مومنوں اور منافقوں میں امتیاز کا موقعہ ہوگا چنانچہ منافقین سے کہا جائیگا کہ پیچھے لوٹو وہ پیچھے کو پھریں گے تو ان کے اور مسلمانوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی کردی جائے گی جیسا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے فضرب بینھم بسور ایسا ہی ایک اور حدیث میں بھی آیا ہے۔

قولہ الوجہ الرابع عشر قولہ ھذا مکاننا الی قولہ فی حدیث غیر ھذا

(۱۷۵) امتحان کے وقت حقیقت واضح ہوتی ہے

اس سے یہ علمی مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ امتحان کے وقت تمام حقائق کی حقیقت واضح ہوجاتی ہے چنانچہ منافقوں کو بطور امتحان ہی کہا جائیگا کہ پیچھے پھر کر دیکھو اور نور حاصل کرو وہ بیوقوف پیچھے مڑکر دیکھنے لگیں گے اسی وقت ان کے اور مسلمانوں کے درمیان دیوار کھڑی ہوجائیگی۔

اپنے ایمان کی حالت کو ٹٹولتا رہنا چاہیئے

اور اس پر یہ فائدہ مرتب ہوا کہ انسان ہمیشہ اپنے ایمان کی حالت کو ٹٹولتا رہے تاکہ اس کو معلوم ہوجائے کہ وہ کس جماعت میں سے ہے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا اپنے نفس سے محاسبہ کرتے رہو قبل اس کے کہ تم سے قیامت میں حساب لیا جائے، اور تاکہ تم کو معلوم ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ عدل پر مبنی ہے۔ اور جو کچھ انہوں نے ہم کو حکم دیا ہے سب حق ہے اور فیصلہ بدلتا نہیں پس اپنے نفس کو مہمل نہ چھوڑو اور نجات کی طمع اسباب نجات کی ضد سے نہ کرو کہ یہ عین حماقت ہے۔ قولہ الوجہ الخامس عشر فیہ من الفقہ انہ عند الاختیار یتبین حقیقۃ الحقائق الی قولہ فھو عین الحمق۔

فـ عارف رومی نے اسی مضمون کو اس عنوان سے بیان فرمایا ہے ؎

جان جملہ علمہا این ست داین — کہ بدانی من کیم در یوم دین

علم حقیقی کی تعریف

تمام علوم کی جان یہ ہے کہ تم کو یہ معلوم ہوجائے کہ میں قیامت میں کون ہوں، مومن ہوں یا منافق، مطیع ہوں یا عاصی۔ اس بات کے معلوم ہونے کا طریقہ یہاں بتلادیا گیا ہے کہ اپنے ایمان کی حالت کو ٹٹولتے رہو اپنے نفس سے محاسبہ کرتے رہو اس کو مہمل نہ چھوڑو جو شخص اپنے نفس کی نگہداشت رکھتا ہے اس کو اپنا اصلی حال معلوم ہوجاتا ہے جو نگہداشت سے غافل رہتا ہے وہ دھوکہ میں رہتا ہے۔

(۱۷۶) قیامت میں بھی قبول دعاء کی امید ہے

حدیث میں اس امر کی دلیل ہے کہ قیامت کے دن بھی قبول دعاء کی امید ہے اور اس سے خیر حاصل ہونے کی توقع ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرات رسل کرام (انبیاء) علیہم الصلوٰۃ والسلام پل صراط پر گذرتے ہوئے اللھم سلم سلم کی دعا نہ کرتے۔

قولہ الوجہ الثالث والعشرون فیہ دلیل علی ان الدعاء الی قولہ لما کانت الرسل یدعون

(۱۷۷) دعا میں اللھم کا صیغہ افضل ہے

حدیث سے دعا کی اس صورت کی فضیلت بھی معلوم ہوئی کہ اللھم کیساتھ انبیاء دعا کریں گے اگر اس طرح دعا کرنا افضل نہ ہوتا تو انبیاء علیہم السلام اس عظیم الشان موقعہ میں اس کو اختیار نہ کرتے (بلکہ اس سے افضل کو اختیار کرتے) کہا گیا ہے کہ اللھم کے معنے یہ ہیں کہ اے اللہ میں آپ سے ان تمام ناموں کیساتھ سوال کرتا ہوں جن کے ذریعہ سے آپ سے سوال کیا جاتا ہے۔

قولہ الوجہ الرابع والعشرون فیہ دلیل علی فضیلۃ ھذہ الصفۃ الی قولہ بجمیع ما سئلت بہ

فـ سلامتی اور نجات کی دعا سب سے افضل ہے

نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سلامتی اور نجات کی دعا سب ہی دعاؤں سے بڑھ کر ہے کیونکہ حضرات انبیاء علیہم السلام اس ہولناک موقعہ میں صرف سلامتی کی دعاء کریں گے اگر اس سے بڑھ کر کوئی دعا ہوتی تو اس موقعہ میں اس کو اختیار کرتے

اس لئے حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو سوال عافیت سب دعاؤں سے زیادہ محبوب ہے۔

اللھم انی اسئلک العفو والعافیۃ فی الدنیا والاخرۃ

(۱۷۸) کسی مسلمان کو رحمت الٰہی سے مایوس نہیں کرنا چاہیئے

حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص اہل ایمان میں سے ہو خواہ کسی حالت میں ہو اس کو یقینی طور پر ارحم الراحمین کی رحمت سے نا امید نہیں کیا جا سکتا۔ شاید وہ ان لوگوں میں سے ہو جن کے لئے خیر مقدر ہو چکی ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

انہ لا ییأس من روح اللّٰہ الا القوم الکافرون

اللہ تعالیٰ کی عطا سے کافروں کے سوا کوئی نا امید نہیں ہوتا

منقول ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہے اور خلفاء سے حساب لیا گیا پھر ان کو دائیں طرف جانے کا حکم دیا گیا (جو علامت ہے جنتی ہونے کی اصحاب الیمین اہل جنت ہی ہیں) یہاں تک کہ ان کی نوبت آئی اور ان سے بھی حساب ہوا پھر ان کو بھی دائیں طرف جانے کا حکم ہوا، وہ فرشتوں کے ساتھ چل رہے تھے کہ راستہ میں ایک لاش پڑی ہوئی ملی انہوں نے فرشتوں سے پوچھا یہ کون ہے، (فرشتوں نے کہا اسی سے پوچھ لو وہ خود بتلا دے گا کہ میں کون ہوں) تو آپ نے پیر سے اس کو ٹھوکر لگائی اور پوچھا تو کون ہے؟ کہا میں حجاج بن یوسف ہوں۔ پوچھا اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ کہا ہر مقتول کے عوض مجھے قتل کیا (پھر زندہ کیا) اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کے عوض مجھے ستر دفعہ قتل کیا جا چکا ہے اور اب میں اسی چیز کی امید رکھتا ہوں جس کی اہل توحید کو امید ہوا کرتی ہے (یعنی مجھے امید ہے کہ جن لوگوں پر میں نے ظلم کیا تھا ان کا بدلہ لے لینے کے بعد اللہ تعالیٰ میری مغفرت فرما دیں گے اور جنت میں پہنچا دیں گے)

قولہ الوجہ التاسع والعشرون فیہ دلیل علی ان من کان من اھل الایمان الی قولہ وانا انتظر ما ینتظرہ الموحدون۔

ف حضرات صوفیہ کا یہ خاص مذاق ہے کہ وہ کسی مسلمان کو رحمت الٰہی سے مایوس نہیں کرتے خواہ کیسا ہی گنہگار ہو۔ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار علماء سے فرمایا کہ تم یہ کیا کفر کے فتوے لگاتے ہو کہ فلاں کافر ہے اور فلاں کافر ہے خدا کی قسم قیامت کے دن تم دیکھو گے کہ بعضے ایسے لوگوں کی مغفرت ہو رہی ہے جو دنیا میں پورے کافر سمجھے جاتے تھے پھر فرمایا اس کا مضائقہ نہیں کہ دھمکانے کے لئے انتظام کے طور پر کسی کو کافر کہہ دیا جائے (جیسا حدیث میں تارک صلوٰۃ کو کافر کہا گیا ہے) مگر یہ مت سمجھو کہ جس پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا ہے وہ سچ مچ کافر ہو گیا۔ الغرض کسی مسلمان کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہ کرنا چاہیئے مولانا فرماتے ہیں ؎

کوئے نومیدی مرو کامیدہاست | سوئے تاریکی مرو خورشیدہاست

(۱۷۹) نار بالذات محرق نہیں ہے

اس میں مذہب اہل سنت کی دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ نار بالذات (خود) محرق نہیں بلکہ جلانے کی صفت اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے اس میں آتی ہے اگر وہ بالذات محرق ہوتی تو ملائکہ وغیرہ سب کو جلا دیتی ہے (حالانکہ فرشتوں پر اس کا کچھ بھی اثر نہ ہوگا) اور سجدہ کے مقامات کو بھی جلا دیتی جیسا تمام بدن کو جلائے گی (حالانکہ جہنم کی آگ سجدہ کے مقامات کو نہیں جلا سکتی) غرض تحریق کے تجزیہ سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ جلانا جو آگ کی صفت ہے اس کی علت محض اس کی ذات کا وجود نہیں بلکہ یہ صفت اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے اس میں پیدا ہوتی ہے۔

یہاں چند سوالات ہیں کہ ایک یہ کہ مقامات سجدہ کی بابت جو فرمایا ہے کہ آگ ان کو نہ کھائے گی۔ یہ ہر مومن کے لئے عام ہے؟ خواہ اس نے کبھی سجدہ کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ جواب یہ ہے کہ اگر ہم اس کو عموم پر محمول کریں تو لفظ کو اس کے موضوع اور معنی سے نکال دیں گے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ملائکہ مسلمانوں کو سجدہ کے اثر اور نشان سے پہچانیں گے اور لغۃً شی کا اثر وہی ہے جس پر شی کا مرور اور ظہور ہوا ہو تو جس نے کبھی سجدہ نہیں کیا اس کی پیشانی میں سجدہ کا اثر لغۃً نہیں ہو سکتا خصوصاً جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ہے۔ بین المؤمن والکافر ترک الصلوٰۃ مومن اور کافر میں امتیاز نماز کے پڑھنے اور ترک کرنے سے ہے پس اگر مسلمان نماز پڑھ لے تو اس کو کافر سے امتیاز حاصل ہو گیا اور اس کے جسم میں نماز کا کچھ اثر پیدا ہو جائے گا مگر ہماری گفتگو تو اس شخص کے متعلق ہے جس نے بالکل نماز نہیں پڑھی نہ ایک نہ زیادہ کہ ان کے مقامات سجود کو آگ کھائے گی یا نہیں؟ تو ظاہر یہ ہے کہ جب اس کے

جسم میں نماز کو کوئی اثر اور نشان نہیں ہے تو اس کے مقامات سجود کو آگ کھا سکتی ہے۔

تارک صلوٰة کی حالت زیادہ خطرناک ہے

اس توجیہ پر تارک صلوٰة کی حالت زیادہ خطرناک ہے کیونکہ اس کے متعلق اندیشہ ہے کہ موت کے وقت ایمان سلب ہو جائے اور اگر ایمان پر خاتمہ ہو بھی گیا تو یہ اندیشہ ہے کہ وہ ان مسلمانوں کیساتھ جہنم سے نہ نکالا جائے (جن کو سجدہ کے نشان سے ملائکہ پہچانیں گے) کیونکہ اس کے پاس یہ علامت نہیں ہے۔

اور اگر کہا جائے کہ یہاں ایک حدیث ہمارے اس بیان کے معارض ہے اور وہ جبریل کا قول ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا من مات من امتک یشہد ان لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ قال وان فعل کذا وکذا قال وان فعل کذا وکذا (جو شخص آپ کی امت میں سے اس حالت میں مرے کہ وہ لا الٰہ الا اللہ و محمد رسول اللہ) کی شہادت (زبان و دل سے) دیتا ہو وہ جنت میں داخل ہو جائیگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگرچہ اس نے ایسا ایسا گناہ بھی کیا ہو کہا اگرچہ اس نے ایسا ایسا (گناہ) بھی کیا ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تارک صلوٰة پر بڑا اندیشہ ہے موت کے وقت کہ ایمان سلب نہ ہو جائے، اور اگر وہ شہادت کا اقرار کرتا ہوا دل سے اس کو مانتا ہوا مرا تو اندیشہ یہ ہے کہ ان لوگوں کیساتھ جہنم سے نہ نکلے گا جو علامت والے ہیں بلکہ اس قبضہ کے ساتھ نکلے گا جو اللہ تعالیٰ مٹھی بھر کر نکالیں گے جیسا حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء و صالحین کی شفاعت کے بعد جبکہ یہ حضرات سفارش کر کے گنہگار مسلمانوں کو جہنم سے نکالیں گے اور جہنم میں ان کے نزدیک وہی لوگ رہ جائیں گے جن کو قرآن نے دوزخ میں قید کیا ہے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جملہ انبیاء و اولیاء کے نزدیک کوئی مومن جہنم میں نہ رہا ہوگا صرف کفار و مشرکین ہی رہ گئے ہوں گے) اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائیں گے رسولوں نے شفاعت کر لی انبیاء نے شفاعت کر لی ملائکہ نے شفاعت کر لی علماء نے شفاعت کر لی اب ارحم الراحمین کی شفاعت کی باری ہے۔ پھر اللہ عزوجل جہنم میں سے ایک مٹھی بھر کر نکالیں گے (اور اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ ان کا مٹھی بھرنا کیونکر ہوگا اور اس کی مقدار کیا ہوگی؟) تو اس

مٹھی میں وہ سب لوگ نکل آئیں گے جن کو قرآن کے قانون نے انبیاء و علماء کے نزدیک جہنم میں قید کیا تھا تو یہ لوگ بھی جو کبھی نماز کے پاس نہ گئے تھے) ان ہی کے ساتھ نکلیں گے اور ان سب کا بیان اپنی جگہ پر اسی کتاب میں آئے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ فی الوجہ التاسع عشر وھنا دلیل لمذھب اھل السنۃ الی قولہ من داخل الکتاب انشاء اللہ تعالیٰ۔

ف کافر و مشرک کی مغفرت نہ ہوگی اور جن لوگوں کو انبیاء و اولیاء جہنم میں چھوڑ دیں گے پھر اللہ تعالیٰ نکالیں گے وہ در حقیقت مومن ہونگے مگر ان کا ایمان ضعیف ہوگا

قانون قرآن نے حقیقتاً جن لوگوں کو جہنم میں قید کیا ہوگا وہ تو کافر و مشرک ہی ہوں گے کیونکہ قانون قرآن یہی ہے ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذلک لمن یشاء اور ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ بھی جہنم سے نہ نکالیں گے مگر بعض لوگوں کا ایمان اتنا ضعیف اور مخفی ہوگا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور جملہ انبیاء و اولیاء ان کو کافر و مشرک سمجھ کر جہنم میں چھوڑ دیں گے اور اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ اب ہمارے علم میں ان لوگوں کے سوا جہنم میں کوئی نہیں رہا جن کو قانون قرآن نے قید کیا ہے اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے علم کامل اور رحمت کاملہ کا اظہار فرمائیں گے اور بہت سی مخلوق کو جہنم سے نکال کر بتلا دیں گے کہ ان کو رسولوں نے انبیاء نے ملائکہ نے اولیاء نے کافر سمجھ کر جہنم میں چھوڑ دیا تھا مگر مجھے ان کے ایمان کا حال معلوم ہے یہ مومن تھے کافر و مشرک نہ تھے مگر ایمان اس قدر کمزور تھا کہ تمام اصحاب فراست ان کے ایمان کو نہ پہچان سکے یہاں سے معلوم ہوا کہ علم غیب محیط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخرت میں بھی نہ ہوگا۔

علم غیب اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے

علم غیب محیط اللہ تعالیٰ کی صفت خاصہ ہے قل لا یعلم من فی السموات والارض الغیب الا اللہ اور علم غیر محیط کو علم غیب کہنا صحیح نہیں۔

ف اللہ تعالیٰ کے برابر کوئی بھی رحیم و کریم نہیں

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے برابر کوئی بھی رحیم و کریم نہیں چنانچہ یہ بیشمار مخلوق تمام انبیاء و رسل و اولیاء کی نظر عنایت و رحمت سے محروم رہے گی مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کی دستگیری کریگی، یہاں سے ان جاہلوں کی حماقت ظاہر ہو گئی جو اللہ تعالیٰ کو تو جبار و قہار ہی سمجھتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور پیران پیر کو رحیم و کریم سمجھ کر نعوذ باللہ خدا سے بھی بڑھا دیتے ہیں جیسا بعض اہل بدعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم غیب اور مختار کل قرار دیتے اور پیران پیر کی دستگیری پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں نعوذ باللہ من ضلالة البدعة و نسأله کمال اتباع السنة اللهم اجعلنا من عبادك المتقين الغر المحجلين آمین

(۱۸۰) فضیلت عبادت

حدیث میں عبادت کی فضیلت کی بھی دلیل ہے کہ باوجود استحقاق عذاب کے یہ مواضع سجود عذاب سے محفوظ رہیں گے یہاں ایک صوفیانہ اشارہ ہے وہ یہ کہ جب صوفیہ نے اس حدیث سے یہ معلوم کیا کہ مواضع عبادت کی بڑی عزت و حرمت ہے کہ آگ ان کو نہ جلا سکے گی نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی انسان کے پیٹ میں جہاد فی سبیل اللہ کا غبار اور جہنم کا دھواں جمع نہ ہو سکے گا یہاں تک کہ دودھ تھن میں واپس ہو جائے یعنی جیسا یہ دشوار ہے ایسا ہی یہ بھی ناممکن ہے کہ جس پیٹ میں جہاد کا غبار ہو اس میں جہنم کا دھواں پہنچ جائے۔ اور اسی مطلب میں اور بھی بہت سی احادیث ہیں تو صوفیہ نے اپنے دلوں کو اور بدن کو اور تمام اعضاء کو عبادت ہی میں مشغول کر دیا جس سے اس وعدہ جمیل کے مطابق وہ دونوں جہان میں بلند مرتبہ کے مستحق ہو گئے رغبت کرنے والوں کو اس میں رغبت کرنا چاہیئے۔ قوله الوجه الثلاثون فيه دليل على فضل العبادة الى قوله وفى ذلك فليتنافس المتنافسون۔

ف پس زبان کو بھی عبادت میں مشغول رکھو اور دل کو بھی اور سانس کو بھی اور تمام اعضاء کو بھی جس کا طریقہ علماء و اولیاء کے بتلانے سے معلوم ہوگا۔

قبول دُعا کی قوی امید رکھنا چاہیئے

حدیث سے معلوم ہوا کہ دعاء کے قبول ہونے کی قوی امید رکھنا چاہیئے اگرچہ دعا کرنیوالا اس کا اہل نہ ہو کیونکہ یہ شخص جس کا حال بیان ہو رہا ہے صحیح طور سے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ جہنمی ہو گا اور جو شخص جہنمی ہو اس کا مردود ہونا یقینی ہے (مقبول ہوتا تو جہنم میں کیوں جاتا) پھر بھی حق تعالیٰ اس پر اپنا فضل فرمائیں گے اور اپنی رحمت اس پر مبذول فرمائیں گے (اس کی دُعا اور درخواست کو قبول فرمائیں گے) تو جو شخص ابھی احتمال ہی کے درجہ میں ہے کہ جنتی ہوگا یا جہنمی اس کا کیا حال ہونا چاہیئے یقیناً اس کو قبول دعا کی بہت زیادہ امید رکھنا چاہیئے کیونکہ اس دار (دنیا) میں تو سب لوگوں کی حالت سعادت اور شقاوت دونوں کو محتمل ہے تو ان کو ارحم الراحمین کی رحمت کی بہت زیادہ امید رکھنا چاہیئے۔

قوله الوجه الثامن والثلاثون فيه دليل على قوة الرجاء الى قوله فهو اقوى رجاء فى رحمة ارحم الراحمين۔

ف حضرات صوفیہ کا یہ خاص مذاق ہے وہ دعا کی اجابت سے ناامید نہیں ہوتے بعض اہل اللہ بعض امور کے لئے تئیس سال تک برابر دعا کرتے رہے ۲۳ سال کے بعد اجابت کا ظہور ہوا ان کو اجابت دعا کا یقین تھا اس لئے برابر دعا میں لگے رہے، مگر عام لوگوں کی عادت یہ ہے کہ چند روز دعا کر کے جب قبول کے آثار نہیں دیکھتے گھبرا کر دعا چھوڑ دیتے ہیں اور یوں سمجھ لیتے ہیں کہ ہم قبول دعا کے اہل نہیں ان کو یہاں سے سبق لینا چاہیئے کہ یہ شخص جو سب سے آخر میں جہنم سے نکلے گا یقیناً اپنے کو مردود سمجھتا ہوگا مگر پھر بھی قبول دعا سے ناامید نہ ہوگا دعا کریگا اور اس کی دعا قبول بھی ہوگی مسلمانوں نے جہاں اپنی کامیابی کے دوسرے طریقوں سے تغافل برتا ہے افسوس ہے کہ وہ دعا جیسی سہل چیز سے بھی تغافل برت رہے ہیں اگر کم از کم ہر مسلمان عزت اسلام و مسلمین اور غلبۂ اسلام کے لئے دعا ہی کرتا رہے اور برابر اس میں لگا رہے تو انشاء اللہ کچھ دنوں کے بعد آثار قبول نظر آجائیں گے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

(۱۸۲) قبول دعا طریقہ جاننے پر بھی موقوف نہیں

حدیث میں قبول دعا کی قوی امید ہونے کی ایک اور دلیل بھی ہے کہ ایسے شخص کی دعا بھی

قبول ہو جاتی ہے جس کو دعا کا طریقہ بھی معلوم نہیں اور ادعیہ (ماثورہ) کی خبر بھی نہیں چنانچہ اس شخص نے ادعیہ (ماثورہ) میں سے کوئی دعا استعمال نہیں کی بس ایک حاجت کی درخواست کی اور اپنی تکلیف کی شکایت کی کہ اے اللہ میرا چہرہ جہنم کی طرف سے پھیر دیجئے اور اپنی حالت عرض کر دی (جہنم کی آگ نے مجھے پھونک دیا ہے اور اسکی بدبو نے دماغ پریشان کر دیا ہے اس کی اسی درخواست پر اجابت مرتب ہو گئی اور تکلیف دور کر دی گئی۔ میں ایک دفعہ ایک بزرگ کے پاس گیا تو ان کو بلند آواز سے یہ کہتے ہوئے سنا ارحمنی والسلام مجھ پر رحم کر دیجئے بس اور کچھ نہیں وہ اپنی حالت میں مستغرق تھے اور اسی لفظ کو بار بار کہہ رہے تھے میں نے کہا کہ یہ کیسی دعا اور درخواست ہے فرمایا مجھے نہ چھیڑو میں نے دنیا میں اور اس کی بلاؤں اور پریشانیوں میں غور کیا آخرت میں اور اس کی تکالیف و مصائب میں تامل کیا تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا مانگوں اور کس کس چیز کو شمار کر سکوں اس لئے میں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ مجھ پر رحم کر دیجئے بس اور کچھ نہیں۔ میں نے اسی وقت اس کلام کی حلاوت اپنے دل میں محسوس کی اور اب تک حلاوت محسوس کرتا ہوں جب بھی ان کی یہ بات یاد آجاتی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ شخص اپنی حالت میں سچا ہے تو میں نے کہا تم نے جو کچھ کیا بہتر کیا چنانچہ وہ اچھی حالت میں زندہ رہے پھر موت کے وقت ان کو شہادت نصیب ہوئی اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان کی دعا قبول فرمالی ہے۔

کیونکہ زندگی کی ایک ساعت میں ان کو اپنے مولا کی ساتھ سچا تعلق نصیب ہوگیا تھا ۔

صدق و اخلاص حاصل کرو

بس ہے اپنا ایک نالہ بھی اگر پہنچے وہاں   گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ و فریاد ہم

ایک نالہ بھی اگر وہاں قبول ہو جاوے اور قبول ہوتا ہے خلوص سے تو وہی کام بنانے کے لئے بس ہے خلوص کی کوشش میں لگے رہو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و احسان سے یہ دولت ہمیں عطا فرمائیں آمین اور اس مضمون کی تقویت جس کو ہم بیان کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔

قل یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً انہ ھو الغفور الرحیم

فرما دیجئے اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر بڑے نافرمانی کر کے ظلم کیا ہے تم اللہ کی

رحمت سے ناامید نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ سب گناہوں کو بخش سکتا ہے۔ یقیناً وہی بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

قولہ الوجہ التاسع وانشاء اللہ تؤن فیہ دلیل آخر علی قوۃ الرجاء الی قولہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً

ف حضرات فقہا اور صوفیہ دونوں نے فرمایا ہے کہ اگرچہ دعا میں ادعیہ ماثورہ کا اختیار کرنا افضل ہے مگر اس کی پابندی کی ضرورت نہیں اگر کسی وقت کسی بات کے لئے اپنی زبان میں اپنے محاورہ میں دعا کرنے کو دل چاہے تو بے تکلف جس لفظ سے چاہے دعا کرے بس اتنی بات کی رعایت رہے کہ حرام چیز کی دعا نہ ہو اور حدود سے تجاوز نہ ہو۔

(۱۸۳) اصل نعمت مولا کی توجہ و التفات اور اس کا خطاب و جواب ہے

حدیث کے اس لفظ میں نیقول لا وعزتک وہ بندہ کہے گا نہیں قسم آپ کی عزت کی میں اس کے سوا کچھ نہ مانگوں گا۔ ایک صوفیانہ اشارہ ہے وہ یہ کہ فرحت اور خوشی کے غلبہ میں یہ شخص جلدی سے قسم کھائے گا، پھر صوفیہ کے مذاق پر تو اس خوشی کا منشا لذت خطاب ہے محض حاجت کا پورا ہونا نہیں کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ جو شخص صرف حاجت کے پورا ہونے ہی کو نعمت سمجھتا ہے وہ محجوب ہے، بلکہ اصل نعمت مولیٰ کی توجہ و التفات اور اس کا جواب و خطاب ہے اور اہل حجاب کہتے ہیں کہ یہاں اس شخص کی خوشی کا منشا حاجت کا پورا ہونا ہے اس لئے وہ جلدی سے قسم کھائے گا۔ مگر انہوں نے اس شخص کو بھی اپنی طرح محجوب سمجھ لیا ہے حالانکہ جس کو اللہ تعالیٰ سے خطاب و جواب کی دولت عطا ہو گئی وہ محجوب نہیں رہتا بلکہ واصل بن جاتا ہے اور واصل کو اصل فرحت محبوب کے خطاب سے ہوتی ہے۔

ف یہاں سے معلوم ہوا کہ جس شخص کو کچھ بھی دولت ایمان عطا ہوئی ہے وہ کسی نہ کسی وقت وصول سے کامیاب ہوگا چنانچہ یہ مسلمان جو سب سے پیچھے جہنم سے نکلے گا ظاہر ہے کہ سب سے ادنیٰ درجہ میں ہوگا مگر دولت ایمان سے کامیاب تھا اس لئے وصول سے سرفراز ہوا گو سب کے بعد ہی سہی اللہ تعالیٰ سے کلام و سلام اور سوال و جواب اور رضا ہی کا نام تو وصول ہے ہاں وصول کے درجات ہیں کسی کو اعلیٰ درجہ حاصل ہے کسی کو ادنیٰ مگر کوئی مومن وصول سے محروم نہ رہے گا یہی وہ ولایت عامہ ہے جو ہر مسلمان کو حاصل ہے

اللّٰہ ولی الذین آمنو یخرجھم من الظلمت الی النور اور یہی معنے اس حدیث کے ہیں۔ لا الٰہ الا اللّٰہ لیس لھا دون اللّٰہ حجاب واللّٰہ تعالیٰ اعلم، اور یہاں سے معلوم ہوا کہ ایمان کتنی بڑی دولت ہے مسلمانوں کو اس دولت کی قدر کرنا اور اس کی حفاظت میں کوشش کرنا چاہیے کہ آجکل اس دولت پر ڈاکہ ڈالنے والے بھی بہت پیدا ہو رہے ہیں۔

(۱۸۴) حرص و طمع انسان کی جبلت ہے

حدیث کا یہ مضمون کہ وہ شخص خاموش رہے گا جب تک اللہ تعالیٰ چاہیں گے پھر کہے گا اے رب مجھے جنت کے دروازہ تک پہنچا دیجیے، حق تعالیٰ فرمائیں گے کیا تو نے عہد و میثاق نہ دیا تھا کہ اور کچھ نہ مانگوں گا، بتلاتا ہے کہ انسان بالطبع حریص واقع ہوا ہے چنانچہ جب وہ بلا سے بچا دیا گیا اور راحت کا منظر دیکھنے لگا تو اس سے صبر نہ کر سکا کیونکہ طمع اس کی طبیعت ہے۔ اب غلبۂ طمع کی وجہ سے وہ سارے عہد و وعدے بھول گیا اور راحت کے نزدیک پہنچنے کی درخواست کرنے لگا جو کہ جنت کا دروازہ ہے کہ شاید وہاں پہنچنا نصیب ہو جائے۔

ناقص اپنے نقصان ہی کے موافق مانگا کرتا ہے

اور یہاں سے معلوم ہوا کہ ضعیف اپنے ضعف کے موافق ہی درخواست کیا کرتا ہے چنانچہ اس شخص نے اولاً یہ درخواست کی کہ جہنم کے قرب سے بچا دیا جاوے اور بعد میں جو درخواست اس نے کی ابتداء میں اس کی جرأت نہ کر سکا کیونکہ وہ اپنے کو اس سے زیادہ کا اہل نہ سمجھتا تھا، اور اگر وہ یہ دیکھ لیتا کہ میں کس سے مانگ رہا ہوں تو پہلے ہی وہ مانگ لیتا جو اخیر میں طلب کیا

ناامیدی کے وقت نفس تھوڑے پر بھی قناعت کر لیتا ہے

یہاں سے بھی یہ معلوم ہوا کہ ناامیدی کے وقت نفس تھوڑے پر بھی قناعت کر لیتا ہے چنانچہ اس شخص نے اپنے عمل ناقص کی وجہ سے (دفعۃً) جنت میں پہنچنے کی طمع نہیں کی صرف اتنی امید کی کہ جہنم سے بچا دیا جائے کیونکہ اس سے زیادہ کی اس کو امید نہ تھی، اسی لئے صوفیہ نے فرمایا ہے کہ نفس کو مباحات سے بالکل روک دو خواہ ضروری ہوں یا غیر ضروری کہ اسی طرح تم اس کی ساتھ بقدر ضرورت مباحات پر صلح کر سکتے ہیں اور جب بالکل روک دینے کے بعد تھوڑی سی اجازت اس کو دیدی جائے گی تو وہ

خوش بھی ہو جائیگا مثلاً چند اوقات کے لئے کھانے سے ایکدم اس کو روک دو تو پھر چند لقموں پر اس سے صلح کر سکو گے جن سے کمر سیدھی ہو جائے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ابن آدم کو چند لقمے کافی ہیں جو اس کی کمر کو سیدھا کر دیں حسب ابن آدم لقیمات یقمن صلبہ اور اگر نفس اپنی طمع پر قائم رہا اور مجاہدہ سے اس کو نہ دبایا گیا، تو وہ ساری دنیا لیکر بھی قناعت نہ کرے گا۔ چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے لوان لابن آدم وادیین من ذھب لا بتغی لھما ثالثا۔ اگر ابن آدم کے پاس سونے کے بھرے ہوئے دو جنگل بھی ہوں تو وہ ان کے ساتھ تیسرے کی طلب کریگا اور اہل تحقیق نے فرمایا ہے۔

من لم یرض بالیسیر فھو اسیر

جو تھوڑے سے راضی نہ ہو وہ (نفس کا) قیدی ہے

قولہ فی الوجہ الثانی والاربعین قولہ سکت ماشاء اللّٰہ ان یسکت الی قولہ فی الوجہ الرابع والعشرین من لم یرض بالیسیر فھو اسیر۔

ف عارف طالب دنیا نہیں ہوتا

نہ اس طریق کا پہلا قدم ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ دل سے دنیا کی محبت اور طلب نکل جائے عارف طالب دنیا نہیں ہوتا طالب آخرت ہوتا ہے اور بقدر ضرورت کسب دنیا زہد کے خلاف نہیں بلکہ مامور بہ ہے اور بلا طلب کے زیادہ مل جائے تو اس کا لے لینا بھی زہد کے خلاف نہیں کیونکہ صحابہ میں بعض اغنیاء بھی تھے جن کے پاس ضرورت سے زیادہ مال تھا مگر وہ طالب دنیا نہ تھے خدا تعالیٰ نے عطا فرمایا تو انہوں نے اس کو قبول کر لیا اور مصارف خیر میں خرچ کیا کما جاء فی الحدیث عن ایوب علیہ السلام حین امطر علیہ جراد من ذھب فجعل یحثوہ فی ثوبہ وقال لہ ربہ الم اغنک عن ھذا قال بلی یارب ولکن لا غنی بی عن برکتک واللّٰہ تعالیٰ اعلم ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا

ف مجاہدہ کے ارکان

مجاہدہ کے چار ارکان جو صوفیہ نے بیان فرمائے ہیں ۱۔ تقلیل طعام

۲۔ تقلیل منام

۳۔ تقلیل کلام

۴۔ تقلیل اختلاط مع الانام

ان میں سے نمبر اول و دوم آجکل تعلیم میں متروک ہیں کیونکہ لوگوں کے قوی خود ہی ضعیف ہیں کھانا، سونا کم کرنے سے ضعف زیادہ ہوجاتا ہے اور انسان ناکارہ ہوجاتا ہے بس کھانے میں اتنا مجاہدہ بس ہے کہ تھوڑی سی بھوک رکھ کر کھایا کرے پوری طرح شکم سیر نہ ہوا کرے اور شام کو پانی کم پیا کرے۔ نیند کے متعلق اتنا مجاہدہ کافی ہے کہ چھ گھنٹے سے زیادہ نہ سویا کرے اس سے کمی کرنا دماغ کو مضر ہے۔

البتہ تقلیل کلام اور تقلیل اختلاط کی اس زمانہ میں پہلے سے بھی زیادہ ضرورت ہے اس لئے محققین طریق ان دونوں مجاہدوں پر آجکل زیادہ زور دیتے ہیں کیونکہ زیادہ گناہ زبان سے آنکھ سے کان سے ہوتے ہیں اور ان کا یہی طریق ہے کہ بلا ضرورت بات نہ کی جائے اور سب سے الگ رہا جائے بلا ضرورت لوگوں سے نہ ملا جائے۔

(۱۸۵) اللہ تعالیٰ کے کمال لطف کا بیان

اس میں اللہ تعالیٰ کے کمال لطف پر بھی دلالت ہے کہ وہ بنی آدم کے ساتھ کس قدر مہربانی کا معاملہ فرماتے اور ان کے عذروں کو کیسا قبول فرماتے ہیں کیونکہ وہ ان کے ضعف کو جانتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اولاً اس شخص کے سب دعدے اور عہد قبول فرمالئے اور اس کی ایک درخواست پوری بھی کردی حالانکہ وہ خوب جانتے تھے کہ یہ شخص جنت اور اس کی راحت کو دیکھ کر صبر نہ کرسکے گا۔ اور یقیناً اپنے عہد اور وعدہ کو توڑے گا پھر بھی اس کے وعدے اور عہد کو قبول فرماتے رہے اسی کی نظیر حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے

وھو الذی یقبل التوبۃ عن عبادہ ویعفو عن السیّاٰت ویعلم ما تفعلون ○

وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا اور ان کے گناہوں سے درگذر کرتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم کروگے۔

قبول توبہ کی خبر دینے کے بعد ویعلم ما تفعلون بڑھانے میں ایک لطیف نکتہ ہے

ورنہ بظاہر یہاں اس کی ضرورت نہ تھی کیونکہ قرآن میں یہ مضمون بہت جگہ آچکا ہے کہ اللہ عزوجل ہمارے اعمال سے باخبر ہیں اور یہ تو شرط ایمان ہے کہ اس کا یقین رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارے تمام اعمال دفتر کا علم ہے۔ مگر یہاں اس کو اس لئے بڑھایا گیا ہے کہ توبہ کرنے والوں میں سے بعض تو اپنی توبہ پر قائم رہتے ہیں اور بعضے اس کو توڑ دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کون توبہ پر قائم رہے گا اور کون اس کو توڑنے کا مسکن باین ہمہ وہ سب کی توبہ قبول کرلیتے ہیں اور بڑے درجہ میں قبول کرتے ہیں، سب کو توبہ کا ثواب عطا فرماتے ہیں اور ہر توبہ کرنے والے کی مدح بھی فرماتے ہیں (گو وہ بعد میں توبہ کو توڑ ہی دے) اس کے متعلق وہ حدیث کافی (دلیل) ہے جو بنی اسرائیل کے ایک شخص کے متعلق وارد ہوئی ہے کہ وہ گناہ کرتا پھرتا تھا پھر توبہ کرتا تھا پھر گناہ کرتا پھر توبہ کرتا تھا یہاں تک کہ ملائکہ نے عرض کیا اے پروردگار! آپ اس بندہ کو نہیں دیکھتے کہ یہ کیا مسخرہ پن کررہا ہے کہ گناہ کرتا ہے پھر توبہ کرتا ہے (گناہ کرتا ہے پھر توبہ کرتا ہے توبہ کے بعد بھی گناہ سے باز نہیں آتا) حق تعالیٰ جل جلالہ نے فرمایا اے فرشتو! کیا تم میرے بندے کی اس بات کو نہیں دیکھتے کہ وہ جانتا ہے کہ اس کا ایک پروردگار ہے جو گناہ پر مواخذہ کرتا اور توبہ کو قبول کرتا ہے، قسم ہے میری عزت کی میں ہمیشہ اس کی توبہ قبول کرتا رہوں گا جب تک بھی وہ توبہ کرتا رہے گا۔ سبحان اللہ کیا لطف وکرم ہے ؎

اے خدا قربان احسانت شوم	وہ چہ احسان است قربانت شوم

قال السعدی ؎

وگر خشم گیرد بکردار زشت	چو باز آمدی ماجرا در نوشت

وقال الآخر حاکیا عن ربہ ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ	گر کافر وگبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست	صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

المؤمن التواب یبقی لہ فضلۃ من عملہ یدخل بھا الجنۃ

ہمیشہ توبہ کرنیوالے مؤمن کے پاس کچھ نہ کچھ عمل کا فرد رہتا ہے جس کی وجہ سے

وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔

قولہ الوجہ الخامس والاربعون فیہ دلیل علی لطف اللہ عزوجل ببنی آدم الی قولہ یدخل بھا الجنۃ

(۱۸۶) انسان اپنی بھلائی کے لئے ہر ممکن سے ممکن حیلہ کو کام میں لاتا ہے

یہاں سے معلوم ہوا کہ انسان اپنی بھلائی کے واسطے کیسے کیسے حیلے کرتا ہے چنانچہ اس شخص نے اول تو یہ درخواست کی کہ جہنم سے دور کر دیا جائے کہ شاید اس طرح کچھ تھوڑا سا لگاؤ نیک بندوں کے ساتھ حاصل ہو جائے (جب یہ درخواست پوری ہو گئی تو آگے بڑھا) یہ تو خدائے علیم و خبیر کے ساتھ انسان کا دقیق حیلہ ہے دوسروں کے ساتھ اس کا کیا حال ہوگا اسی لئے آخری درخواست پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہنس پڑیں گے۔

ہر شخص کی جتنی عقل و تدبیر دنیا میں ہے، وہ آخرت میں بھی باقی رہے گی

اور یہاں سے معلوم ہوا کہ انسان کی جتنی عقل اور فکر اور تدبیر دنیا میں ہوگی وہ آخرت میں بھی باقی رہے گی کیونکہ وہ اسی حالت میں اٹھایا جائے گا جو یہاں اس کی حالت تھی جس کی دلیل یہ لطیف حیلہ ہے (جو اس شخص سے صادر ہوگا) نیز حدیثوں میں جو روح و نفس کا مناظرہ مذکور ہے (وہ بھی اس کی دلیل ہے) اور اس کے سوا اور بھی بہت احادیث اس باب میں وارد ہیں۔

قولہ الوجہ السادس والاربعون فیہ دلیل علی کثرۃ تخیل بنی آدم الی قولہ فی الوجہ السابع والاربعین وغیر ذلک من الاحادیث مما یشبہ ذلک

(۱۸۷) جس کو جس عمل سے فتح باب اور کامیابی ہو رہی ہو اس کو لگا رہے

حدیث کا یہ لفظ کہ اخیر میں حق تعالیٰ فرمائیں گے ویحک یا ابن آدم ما اغدرک اے ابن آدم! تیرا ناس ہو تو بہت ہی غدار ہے۔ یہ پہلے سے زیادہ سخت ہے کیونکہ اس نے

تین دفعہ عہد شکنی کی تھی (بار بار عہد کو توڑ چکا تھا) مگر وہ بھی اپنی ایک بات پر کتاب کے جواب میں بار بار اس پر زیادتی بھی نہیں کی اور کمی بھی نہیں کی وہ یہی کہتا رہا اے رب لا تجعلنی اشقی خلقک خداوندا اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ بدقسمت مجھے ہی نہ بنا۔ کیونکہ جب یہ بات اس سے پہلی بار قبول کر لی گئی اور دوسری بار بھی اور جو کچھ اس نے مانگا تھا اس کی وجہ سے ملتا بھی رہا تو وہ اسی بات پر جما رہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے من رزق من باب فلیلزمہ جس کو کسی دروازہ سے روزی مل رہی ہو اس کو لگا رہے تو اس شخص نے اس حکم کی تعمیل آخرت میں کی اگر دنیا میں اس پر عمل کر لیتا تو اس کو اس قسم کی ضرورت ہی واقع نہ ہوتی۔

قولہ فی الوجہ السابع والاربعین فیقول اللہ ویحک یا ابن آدم الی قولہ ما احتاج الی ھذا

(۱۸۸) کسی شخص کو کسی وصف سے اس وقت تک موصوف کیا جائے جب تک کم از کم تین بار اس کا ظہور نہ ہو

اور تیسری بار میں حق تعالیٰ کا اسے ما اغدرک سے خطاب فرمانا بتلاتا ہے کہ کسی شخص کی طرف کسی وصف کی نسبت اس وقت تک کی جائے جب تک اس سے بار بار اس کا ظہور نہ ہوا اور تکرار کا کم از کم عدد تین ہے جس کے بعد کسی وصف کی نسبت اس کی طرف ہو سکتی ہے کیونکہ پہلی بار اور دوسری بار میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ غلطی اور بھول چوک ہو گئی ہو یا ایک بار غلطی ہوئی ہو دوسری بار بھول چوک ہوئی ہو اور تیسری بار عموماً قصد ہی سے عمل ہوتا ہے اس وقت یہ بات محقق ہو گی کہ اس سے پہلے بھی قصد موجود تھا خواہ عمل صالح کا قصد ہو یا اور کچھ ہو کیونکہ حق تعالیٰ نے اس شخص کو تیسری دفعہ سے پہلے غدار نہیں فرمایا۔

ف یہ قاعدہ اوصاف ذمیمہ سے متعلق ہے اور اوصاف حمیدہ میں ایک دفعہ کے عدد سے بھی نسبت جائز ہے ۱۲

غدر انسان کی جبلت ہے

یہاں ایک لطیف اشارہ ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے تیسری دفعہ میں جو اس کو ابن آدم کہہ کر خطاب فرمایا تو اس میں ....

بتلایا گیا ہے کہ انسان میں بے وفائی اصل ہے۔ یہی وصف اسمیں غالب ہے مگر جس کو حق تعالیٰ بچائیں وہی اس سے بچتا ہے۔

تزکیۂ اخلاق محض فضل سے ہوتا ہے

اور تزکیۂ اخلاق فضل کے واسطہ سے ہوتا ہے۔

ولولا فضل اللہ علیکم ورحمتہ ما زکی منکم من احد ابدا

اگر تم پر اللہ کا فضل نہ ہوتا اور اس کی رحمت تو تم میں سے کوئی بھی کبھی پاک نہ ہوسکتا

ان النفس لامارۃ بالسوء الا ما رحم ربی

اور نفس تو بدی ہی کا حکم کرنے والا ہے مگر جس پر اللہ تعالیٰ رحم فرمادیں

اور ابن آدم کہنے میں توبیخ کے ساتھ ایک خاص لطف بھی ہے کیونکہ کریم کی دھمکی کثرت عطا کا پتہ دیتی ہے (کریم جب کسی کو دھمکاتا ہے تو اس کو مالا مال بھی کردیتا ہے) اور بخیل کی دھمکی یہ بتلاتی ہے کہ کچھ بھی نہ دے گا اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ قیامت کے دن مومن سے بہت چھپا کر حساب لیں گے کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی ترجمان نہ ہوگا اس وقت حق تعالیٰ فرمائیں گے میرے بندے تو نے ایسا کیا تھا ویسا کیا تھا بندہ اپنے مولیٰ کے سامنے ان سب کا اعتراف کرے گا حتیٰ کہ وہ سمجھ جائے گا کہ بس میں تو کثرت گناہ کی وجہ سے ہلاک ہوا تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے دنیا میں بھی تیرے ان عیبوں کو لوگوں سے چھپایا ہے اور آج بھی تیرے لئے ان کو بخشتا ہوں تم نے دیکھا کہ کریم کی دھمکی کا انجام کیسا عجیب ہوا کہ جب غلام کو ہلاکت کا یقین ہوگیا فوراً کرم شروع ہوگیا اور اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو یاد نہ دلائیں اور بدون حساب کتاب کے ہی اپنی رحمت سے بخش دیں اور فرشتوں سے یوں فرمادیں۔

جنت بھی محض فضل سے ملیگی

کہ میرے بندے کو محض میری رحمت کی بنا پر جنت میں لیجاؤ تو انسان کی اس سے پوری تسلی نہ ہوگی اس کے دل میں یہ کھٹکا رہے گا کہ محض رحمت سے تو نہیں بلکہ کچھ اپنے عمل سے بھی جنت کا مستحق ہوا ہوں جیسا بنی اسرائیل میں ایک شخص کا قصہ (آثار میں) آتا ہے کہ وہ ایک جزیرہ میں رہتا تھا جو سمندر کے بیچ میں دنیا سے الگ تھا اس کے پاس وہاں کوئی آدمی نہ تھا وہ تنہا اللہ کی عبادت میں مشغول رہتا اور کسی وقت عبادت میں سستی نہ کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس جزیرہ میں اس کے واسطے ایک انار کا درخت پیدا کردیا تھا جس پر روزانہ ایک ہی انار پیدا ہوتا اور ایک ہی دن میں بڑھتا اور پک جاتا جسے یہ عابد کھالیا کرتا تھا اور پانی کا ایک چشمہ بھی اس کے واسطے جاری کردیا گیا تھا جس سے سیراب ہوتا تھا ایسے حال پر وہ پانچ سو برس تک زندہ رہا پھر اس نے حق تعالیٰ سے درخواست کی کہ سجدہ کی حالت میں اس کی روح قبض کی جائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ تحفہ بھی اس کو عطا فرمادیا اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عابد کے متعلق ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن اس کو لایا جائے گا تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائیں گے کہ میرے اس بندہ کو محض میری رحمت کی بنا پر جنت میں لیجاؤ اس پر وہ بولے گا نہیں اے رب بلکہ میرے عمل کی وجہ سے؟

پس اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیں گے کہ اس سے صرف بینائی کی نعمت کا تو حساب لو کہ اس کا شکریہ ادا کیا یا نہیں؟ ملائکہ حساب کریں گے تو پانچ سو برس کی عبادت اس ایک نعمت کا شکر ادا کرنے کے لئے بھی کافی نہ ہوگی اس کے سوا اور نعمتوں کا کیا ذکر وہ تو سب ویسی کی ویسی ہی رہ جائیں گے ان کا حق تو کچھ بھی ادا نہ ہوگا، اس وقت وہ عابد عرض کرے گا اے رب مجھے جنت میں اپنی رحمت سے پہنچا دیجئے، حق تعالیٰ فرمائیں گے (ہاں ہاں) تو تو بہت اچھا بندہ تھا (فرشتو!) میرے بندے کو میری رحمت کی وجہ سے جنت میں لے جاؤ تو جب اس سے گناہوں کا اقرار لے لیا اس وقت اس کے لئے چند در چند خوشیاں جمع ہوگئیں ایک خوشی گناہوں کی مغفرت کی، ایک خوشی پردہ پوشی کی کہ اس کو رسوا نہیں کیا گیا۔ ایک خوشی اس راحت کی جو جنت میں پہنچ کر اسے عطا کی گئی اس طرح اس کے پاس بہت سی نعمتیں جمع ہوگئیں تو وہ منعم سے پوری طرح راضی ہوگیا اور یہ بھی منعم کی طرف سے بڑا انعام ہے کہ

ع۔ سبحان اللہ جب بندہ کو اپنے عمل کا ہیچ ہونا مشاہد ہوگیا۔ اب اللہ تعالیٰ اسکے عمل کی تعریف فرمارہے ہیں کہ تو تو بہت اچھے عمل کرتا تھا۔ یہ سب شانِ کرم اور یہ ہے رحمت و فضل ۱۲۔

منعم علیہ کو انعام کی حقیقت اور عظمت سے خبردار کردے تاکہ اس کو پوری مسرت اور لذت حاصل ہو۔ الا یعلم من خلق وھو اللطیف الخبیر کیا جس نے پیدا کیا ہے وہ بھی (بندہ پروری) نہ جانے گا حالانکہ وہ بڑا باریک بین اور بڑا باخبر ہے۔ اسی طرح یہاں جب اللہ تعالیٰ نے اس آخری جنتی پر اپنے فضل سے یہ انعام کرنا چاہا کہ عزت کے گھر یعنی جنت میں اس کو پہنچائیں تو پہلے اس کو بہت دھمکایا اور اس سے اقرار کرایا کہ وہ بڑا غلام ہے اس کی طبیعت میں بھی غدر ہے اور باتوں میں بھی دنیا میں بھی غداری سے کام لیتا تھا اور آخرت میں بھی اس سے باز نہ آیا دونوں جگہ غدر کو لئے ساتھ لئے رہا جب اس نے اپنی خطا کا اقرار کر لیا تو محض رحمت سے جنت میں بھیج دیا جس سے اس کو بے انتہا خوشی اور چند در چند لذتیں حاصل ہوئیں)

قولہ فی الوجہ السابع والاربعین وکونہ عزوجل نوادھنالک ما اعذرلک الی

قولہ فی الوجہ الثامن والاربعین ومستصبا فی السائرین

ف یہ جو فرمایا گیا کہ تزکیہ اخلاق اور دخول جنت محض فضل سے ہوگا اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے لئے عمل اور کوشش کی ضرورت نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ عمل اور کوشش کے بعد بھی جس کو یہ دولت حاصل ہوجائے وہ اس کو اپنی کوشش کا ثمرہ نہ سمجھے بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل سمجھے جس کو اللہ تعالیٰ اس دولت کے لئے عمل کی توفیق دے دیں سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ اس پر اپنا فضل کرنا چاہتے ہیں ورنہ انسان کا نفس تو بدی کی طرف ہی جاتا ہے۔

(۱۸۹) **اللہ تعالیٰ کے فضل کی حرص کرنا چاہیے** حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ جل جلالہ کے فضل کی امید اور طمع رکھنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ اپنی نعمت و رحمت کا مرتبہ یاد دلایا ہے کہ وہاں اس کے گناہوں کو معاف فرمائیں گے اور اپنے فضل سے ان پر پردہ ڈالیں گے اور جو کچھ ہو چکا اس سے درگذر کریں گے۔ پس تم بھی اس فضل کو محض فضل ہی کی وجہ سے اپنے ساتھ رکھو اور کسی وقت ان سے نظر قطع نہ کرو تاکہ یہ بات صحیح طور پر تم کو معلوم ہوجائے کہ نعمت اور انعام محض اللہ کے فضل ہی سے ہوگا اور یہ کیونکہ یا اس کا سبب ہدایت ہے یا عفو و درگذر ہے یا دونوں مجموعہ۔ اور یہ سبب فضل ہی تو ہے جس پر بھی وہ کرنا چاہیں اور جس طرح چاہیں کوئی ان سے سوال نہیں کرسکتا کہ ایسا کیوں کیا؟

امید کو ہر دم اپنے ساتھ رکھو اور امید کی شان کو اپنے ساتھ رکھنا ہر دم اللہ سے امیدوار رہنا اگرچہ اللہ کی طرف سے کیسا ہی معاملہ دیکھے یہی ایمان کی علامت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

لا ییئس من روح اللہ الا القوم الکافرون

خدا کی عطا سے ان لوگوں کے سوا جو کافر ہیں اور کوئی ناامید نہیں ہوتا

چنانچہ اس شخص میں جس کا قصہ حدیث میں ہے یہ صفت دجا باقی تھی اس کو اللہ سے ہر حال میں امید تھی اس سے اس کو پوری سعادت اور کامیابی حاصل ہوگئی کہ جنت میں پہنچ گیا۔ اللہ تعالیٰ ہم کو بھی یہ نعمت بلا مشقت کے عطا فرمادیں وہی کارساز ہیں اور لائق حمد اور یہ جو فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ اخیر میں اس کی بات پر ہنس پڑیں گے سو اللہ تعالیٰ کا ہنسنا ہمارے ہنسنے کے مشابہ نہیں جس کا منشا خفت و اضطراب ہوتا ہے کہ کسی چیز کو دیکھ کر یا کسی بات کو سن کر طبیعت ہلکی ہوتی اور ہنسنے کے لئے بیتاب ہوجاتی ہے بلکہ اس میں اس معاملہ کی طرف اشارہ ہے جو بادشاہو سے ہنسی کے موقعہ پر صادر ہوتا ہے کہ جس کی بات سے وہ ہنستے ہیں اس پر بہت احسان کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہیں کہ ان کی صفات مخلوقات کی صفات کے مشابہ ہوں مگر ہم سے اسی طرح خطاب کیا جاتا ہے جیسا اپنی عادت اور عرف کی بنا پر ہم بولتے اور سمجھتے ہیں اور یہ جو فرمایا کہ حق تعالیٰ اس سے فرمائیں گے مانگ کیا مانگتا ہے تو وہ اپنی تمنا بیان کرے گا یہاں تک کہ اس کی تمنائیں ختم ہوجائیں گی، سو تم خود اندازہ کرلو کہ ایک ہمارا یا حرص و طمع کی تمنا کیا کچھ ہوگی جس نے بڑی خیر کو یعنی جنت کو کھلی آنکھوں دیکھ لیا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ اس سے یہ کہنے والا کہ مانگ کیا مانگتا ہے، بڑا غنی اور بہت ہی کریم ہے اس کے بعد حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ تجھ کو یہ بھی دیا اور اتنا ہی اور، یعنی تمنا سے دو چند اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے ذلک لک وعشرۃ امثالہ کہ تجھ کو یہ بھی دیا اور اس کا دس گنا اور یہ ہے اس کے کرم کی شان جس کا کوئی مثل نہیں پس اصل عطا بھی اسی کے فضل سے ہے اور زیادتی بھی اسی کے فضل سے ہے مگر چونکہ اصل عطا میں بندہ کا بھی کوئی وصف مل گیا ہے خواہ عبادت یا

باب چہل ونہم ۴۹

حدیث

جواز الدعا فی الصلوٰۃ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا مجھے کوئی دعا بتلا دیجئے جس سے نماز میں دعا کیا کروں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یوں کہا کرو۔

اللھم انی ظلمت نفسی ظلما کثیرا ولا یغفر الذنوب الا انت فاغفرلی مغفرۃ من عندک وارحمنی انک انت الغفور الرحیم

اے اللہ میں نے اپنی جان پر بہت ظلم کیا ہے اور آپ کے سوا گناہوں کو کوئی نہیں بخش سکتا تو مجھے اپنے پاس سے مغفرت عطا کیجئے اور مجھ پر رحم فرمائیے کیونکہ آپ ہی غفور رحیم ہیں۔

شرح ظاہر حدیث سے نماز میں دعا کا جائز ہونا اور اس دعا کا افضل ہونا معلوم ہوا ہے اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۹۱) بزرگوں سے تعلیم کی طلب کرنا چاہئے گو طالب صاحب معرفت بھی ہو

حدیث سے معلوم ہوا کہ بزرگوں کی تعلیم کی درخواست کرنا چاہئے اگرچہ طالب کو ایک گونہ معرفت پہلے سے حاصل ہو کیونکہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے کوئی دعا بتلا دیجئے حالانکہ یہ بات معلوم ہے کہ ان کو دعاؤں کی معرفت اس قدر تھی کہ صحابہ میں دوسروں کو نہ تھی ایک تو اس لئے کہ وہ فصاحت سے متانت تھے دوسرے ان کا ایمان قوی تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں زیادہ رہے تھے مگر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت زیادہ لینی چاہی اس لئے حضور سے درخواست کی کہ آپ مجھے کوئی دعا بتلا دیجئے رہا یہ سوال کہ انہوں نے یہ کیوں کہا کہ کوئی دعا ایسی بتلا دیجئے جو نماز میں کیا کروں، اطلاق کیساتھ درخواست کیوں نہیں کی تو اس کا جواب یہ ہے کہ شارع علیہ السلام نے نماز میں دعا کرنے کی خاص طور پر ترغیب دی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اقرب ما یکون العبد من اللہ اذا کان فی الصلوٰۃ واقرب ما یکون فی الصلوٰۃ اذا کان ساجدا و بطنہ جائع فاکثروا فیہ الدعاء فقمین ان یستجاب لکم الی حقیق

بندہ کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ قرب اس وقت ہوتا ہے جب کہ نماز میں ہو اور نماز میں زیادہ قرب اس وقت ہوتا ہے جبکہ سجدہ میں ہو اور اس کا پیٹ خالی ہو بھوک لگ رہی ہو پس تم سجدہ میں دعا زیادہ کیا کرو وہ اس لائق ہے کہ قبول کر لی جائے اس لئے ابوبکر صدیق نے یہ فرمایا کہ مجھے ایسی دعا بتلا دیجئے جو نماز میں کیا کروں۔

قولہ الوجہ الاول طلب التعلیم من الفاضل الی قولہ ای حقیق۔

ف حدیث کا یہ لفظ وبطنہ جائع صوفیہ کی اس تعلیم کی دلیل ہے کہ ذکر و شغل کے لئے ایسا وقت تجویز کرنا چاہئے جبکہ پیٹ خالی ہو یعنی نہ تو بہت بھرا ہوا ہو کہ سستی پیدا ہو نہ اتنا خالی ہو کہ بھوک سے بے تاب ہو کیونکہ ایسی حالت میں شارع نے کھانے کو نماز سے مقدم کرنے کا امر کیا ہے کما مر

حدیث سے یہ علمی مسئلہ بھی

(۱۹۲) عبادت میں اعلیٰ درجہ پر نظر کرنا چاہئے

معلوم ہوا کہ انسان کو عبادت میں درجۂ اعلیٰ پر نظر کرنا اور قاعدۂ شرعیہ کے موافق اس کے اسباب حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہئے چنانچہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دعا کا اعلیٰ درجہ حاصل کرنے کی کوشش کی اگرچہ ایک حدیث میں اوپر گذر چکا ہے کہ دعا میں یہ بھی جائز ہے کہ اپنی حاجت ہی مانگے

اس سے بھی کامیابی کی امید ہے اور ادعیہ ماثورہ کی پابندی لازم نہیں ہے مگر افضل یہ ہے کہ اسباب رحمت میں سے اعلیٰ وارفع کو اختیار کیا جائے الفاظ میں بھی اوقات میں بھی مکان میں بھی اصول شریعت سے یہ سب باتیں معلوم ہو چکی ہیں اور اس بارہ میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد فاذا فرغت فانصب والی ربک فارغب کا اشارہ ہی بہت کافی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جب تم فارغ ہو جاؤ تو کھڑے ہو جاؤ اور اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو جاؤ کیونکہ اس میں جن امور کا ذکر ہے وہ سب کے سب امید قبول دعا کے اسباب میں سے ہیں کیونکہ مخلوق کے مشاغل سے فارغ حاصل ہونا حضور قلب اور اخلاص حاصل ہونے کے اسباب میں سے بڑا سبب ہے اور رغبت و توجہ سے دوام تذلیل حاصل ہوتا اور بار بار ایسے الفاظ اختیار کرنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے جو رحم لانے والے ہوں اور انتصاب سے مراد نماز پڑھنا ہے جو تمام طاعتوں کو مقتضی ہے کیونکہ وہ سب سے اعلیٰ ہے جب اعلیٰ طاعت کا امر کیا گیا تو دوسری اس کے ضمن میں خود ہی آ گئی ہیں۔

قولہ الوجہ الثانی یترتب علی ھذا من الفقہ ان ینظر المرأ فی عبادتہ الی الارفع الی قولہ فخیرۃ فی الضمنی

(۱۹۳) دُعا کی حقیقت اور اس کے درجات

یہاں ایک سوال ہے کہ اللھم انی ظلمت نفسی الخ کو حضرت صدیق کی درخواست سے کیا تعلق ہے کیونکہ ادعیہ شرعیہ میں متعارف طریقہ یہ ہے کہ ایسے الفاظ ہوں جن کے ضمن میں کوئی شے کا یا صفات جلیلہ میں سے کسی صفت کا اسماء الٰہیہ میں کسی اسم کا احترام ظاہر کیا جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

و للہ الاسماء الحسنیٰ فادعوہ بھا

اللہ کے لئے اچھے اچھے نام ہیں تو تم ان کے وسیلہ سے اللہ سے دعا کرو

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

ان اسم اللہ الاعظم ما دعا بہ احد الا اجیب دعاءہ

کے اللہ کا اسم اعظم کے وسیلہ سے جو دعا بھی کوئی کرے ضرور قبول کی جاتی ہے

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اذا سألتم اللہ فاسئلوہ بجاھی فان جاھی عند اللہ عظیم[ع] جب تم اللہ سے سوال کرو تو میری جاہ کے وسیلہ سے دعا کرو کیونکہ اللہ کے نزدیک میری جاہ بہت بڑی ہے۔ اس معنی میں آثار بہت ہیں اور دعائیں بھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں بہت ہیں۔

جواب چند وجوہ سے ہے، اوّل یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صدیق کا مقصود سمجھ گئے تھے کہ وہ ایسی دعا معلوم کرنا چاہتے تھے جو بالیقین قبول ہو جائے اور حکمت شرعیہ کے موافق اس سے دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی نصیب ہو تو حضور نے ان کو عجیب اشارہ میں جواب دیا گویا آپ یوں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی حق حتمی طور پر واجب نہیں ہے کہ کسی دعا کو ضرور قبول ہی کر لیا کریں، بلکہ یہ تو محض استغنا ہیں جن سے جس کو چاہتے ہیں کامیاب کر دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں محروم کر دیتے ہیں جیسے کلیاً کرتے ہیں محض اپنی طرف سے اپنے فضل سے کامیاب کرتے ہیں اس کی دعا یا عمل کا دخل اس میں برائے نام ہوتا ہے حقیقت میں کچھ نہیں ہوتا، پس سب سے بڑی چیز کو جو کہ مغفرت ہے اصل حقیقی سے مانگنا چاہئے جو کہ فضل خداوندی ہے اس کے سوا کسی اور چیز سے اپنے خیال کو وابستہ نہ کرنا چاہئے، اور یہ ایسا ہے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات شریف کے متعلق فرمایا ہے

لن یدخل احد اعملہ الجنۃ، قالوا ولا انت یا رسول اللہ قال ولا انا الا ان یتغمدنی اللہ بفضل رحمتہ

کسی کو اس کا عمل جنت میں نہ پہنچائے گا۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ اور آپ کو بھی نہیں؟ فرمایا مجھے بھی نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے فضل و رحمت سے ڈھانپ لیں (تو فضل سے جنت

ع اس حدیث کی صحت کی مجھے تحقیق نہیں نہ اس وقت کتابیں پاس ہیں کہ تحقیق کر سکوں کہ یہ مضمون بحالت سفر لکھ رہا ہوں کسی محقق عالم سے تحقیق کر لی جائے ۱۲ ظ

میں پہنچوں گا) حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی یہ نشانِ حکمت لیکر آئے ہیں (آپ ہی کے واسطہ سے سب کو معرفت نصیب ہوئی عبادت کا طریقہ معلوم ہوا) اور اسی کے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے۔

خمس صلوات افترضهن الله على عباده فمن جاء
بهن لم ينتقص منهن شيئا استخفافا بحقهن فان الله
جاعل له يوم القيمة عهدا ان يدخله الجنة۔

پانچ نمازیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض کی ہیں جو ان کو اسطرح بجالایا کہ ان میں کچھ کمی نہیں[عہ] کی ان کے حق کو ہلکا اور حقیر[عہ] سمجھ کر تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے لئے اس بات کا عہد اور ذمہ لینے والے ہیں کہ اس کو جنت میں داخل کردیں گے اور یہ حدیث بظاہر پہلی حدیث کے معارض ہے کیونکہ اسمیں دخولِ جنت کا سبب محض فضل کو بتلایا گیا ہے اور اس میں اعمال کو بتلایا گیا ہے سو ان دونوں حدیثوں میں تطبیق اس طرح ہے کہ اعمال پر نجات کا وعدہ مقام عوام (کے لحاظ سے) ہے اور یہ بھی سچا وعدہ ہے جس کو ان کے لئے پورا کیا جائیگا (چنانچہ ارشاد ہے) ومن اوفی بعهده من الله فاستبشروا ببیعکم الذی بایعتم به اور جو تم میں سے اپنے عہد کو جو اس نے اللہ سے کیا ہے پورا کردے تو تم کو اس سودے سے خوش ہونا چاہیئے جو تم نے اللہ کیساتھ کیا ہے) اور یہ خلاصی بظاہر عمل کو باقی رکھنے اور اسکی پابندی کرنے سے اعمال کے موافق ہوگی حکمت حکیم کی رعایت کے سبب اور حقیقی نجات محض فضل سے متعلق ہے یہ خواص کا مقام ہے جیسے سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام خواص میں اخص الخواص ہیں اسیطرح جو لوگ قیامت تک اخلاص کیساتھ آپ کی پیروی کرنیوالے ہیں اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی خواص میں

عہ یعنی ارکان و واجبات میں خلل نہیں ڈالا۔ اچھی طرح سب کو بجالایا ۱۲

عہ اور اگر دل میں تو نماز کی عزت و حرمت ہے مگر ظاہر میں سستی سے نماز میں خلل رہ جاتا ہے تو امید ہے کہ یہ کمی نوافل سے پوری کردی جائیگی ۱۲

سے ہیں اور کیوں نہ ہوں جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارہ میں فرمایا ہے کہ ابوبکر تم پر زیادہ نماز روزہ کی وجہ سے فوقیت نہیں لے گئے بلکہ اس چیز کی وجہ سے فوقیت لے گئے ہیں جو ان کے دل میں جمی ہوئی ہے (یعنی ایمان و تصدیق کامل) اور جس مقصد کو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طلب کیا تھا وہ عوام کا مقام تھا تو گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دعا کے ضمن میں ان سے فرماتے ہیں کہ تم ان لوگوں میں ہو جن کا یہ مقام نہیں (جس کو تم نے طلب کیا ہے) بلکہ ہم تم کو تمہارے درجہ کے موافق جواب دیتے ہیں جو کہ خواص کا مقام ہے جو شریعت اور حقیقت دونوں کو جمع کرتے ہیں تو شریعت کا مقتضا تو یہ ہے کہ اعمال اور دعا وغیرہ کی پابندی کی جائے اور اسکو نجات کا سبب سمجھا جائیگا اور حقیقت یہ ہے کہ دنیا جہان کی تمام بھلائیوں کو محض فضل پر مرتب سمجھے اور کسی شئے کو سبب نہ سمجھے) یہاں سے یہ علمی مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ ہر شخص کو اسکے حال کے موافق جواب دیا جائیگا گو وہ اسکے خلاف درخواست بھی کرے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

انزلوا الناس على منازلهم — لوگوں کو ان کے درجوں پر رکھا کرو۔

یہ ارشاد عام ہے (گفتگو اور سوال و جواب کو بھی اور عملی برتاؤ کو بھی)

دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ نے حضرت صدیق کو یہ تعلیم دی کہ اپنے مقصد کو مولیٰ عزوجل کے پاس سے طلب کریں کیونکہ جب وہ اللہ عزوجل کے پاس سے بلا واسطہ عبد کے جو کہ محل نقص ہے طلب کیا جائیگا تو بہت کامل ہوگا، پھر اس درخواست کو دو بزرگ ناموں یعنی غفور و رحیم کے ذکر سے کامیاب کردیا گیا جن میں سے ایک کا مقتضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جب سوال کیا جاتا ہے وہ عطا فرماتے ہیں اور (اس دعا میں بھی یہی درخواست ہے کہ اپنے پاس سے (مغفرت و رحمت) عطا فرمائیں تو مطلوب کی تحصیل میں یہ صورت زیادہ موثر ہے اور دوسرا اسم کا مقتضی مغفرت ہے اور جس کی مغفرت ہوگئی اس پر رحمت ہوگئی اور جس پر رحمت ہوگئی اس کی مغفرت بھی ہوگئی۔

نیز یہاں ایک اور احتمال بھی ہے وہ یہ کہ دعا کا قبول ہونا مشیت الٰہیہ پر موقوف ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ بل اياه تدعون فيكشف ما تدعون اليه ان شاء

بلکہ تم اللہ ہی کو پکارتے رہو پھر وہ اگر چاہتے ہیں اس مصیبت کو دور کر دیتے ہیں جس کے لئے اللہ کو پکارتے ہو)۔ تو اللہ تعالیٰ نے اجابت کی دعا کی قید لگائی ہے قطعی وعدہ نہیں کیا، اور مضطر کے بارہ میں ارشاد ہے (امن یجیب المضطر اذا دعاہ (زیادہ بہتر ہے) جو مضطر کی دعا قبول کرتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے) یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مضطر کی دعا کا قبول کرنا اپنے ذمہ وعدۂ جمیل سے لازم کر لیا ہے اور اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر وعدہ کو وفا کرنیوالا کون ہے؟ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق کو دعا کی صورت سے ہٹا کر جو خوف و رجاء کے درمیان ہوتی ہے حالت مضطر کی طرف منتقل کر دیا جسمیں اجابت کا ذمہ لیا گیا ہے، اور اضطرار کی حقیقت اس لفظ سے ظاہر ہوتی ہے۔ ظلمت نفسی ظلما کثیرا (کہ میں نے اپنی جان پر بہت ظلم کیا ہے) یعنی میرے پاس اس ظلم کے دفع کرنے کا کوئی حیلہ نہیں اور یہ (غایت) احتیاج کی حالت ہے (پھر فرمایا ہے ولا یغفر الذنوب الا انت اور آپ کے سوا گناہوں کی مغفرت کوئی نہیں کر سکتا یہ غایت اضطرار کی حالت ہے) کیونکہ جو شخص ان اسباب پر بھی قدرت نہ رکھتا ہو جو گناہوں کی مغفرت کرا سکیں وہ پورا مضطر ہے کیونکہ اگر کسی کے پاس بڑے بڑے گناہ ہوں اور ان کے ساتھ ایسی چیزیں بھی بہت ہوں جو گناہوں کا کفارہ ہو سکیں تو وہ یوں نہیں کہا کرتا اغفرلی مغفرۃ من عندک کہ مجھے اپنے پاس سے مغفرت عطا کیجئے کہ میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جو مغفرت کا سبب بن سکے، تو ان دو لفظوں کے مضمون میں احتیاج محض (اور اضطرار حقیقی) کی حقیقت متحقق ہو گئی۔ دل میں اور بھی باتیں ہیں اور تم خود سمجھ دار ہو (سمجھ جاؤ) میرے باپ ماں ان دونوں پر فدا ہوں کیسے اچھے معلم تھے اور کیسے اچھے متعلم۔ ان کے آثار کیسے عمدہ ہیں اور ان کے باطن کیسے منور اور ان کے احوال کس قدر بلند۔ اللہ تعالیٰ ہم پر بھی اپنے فضل سے ان دونوں حضرات کی برکتیں بار بار نازل فرمائیں۔ قولہ الوجہ الثالث قولہ علیہ السلام قال قل اللھم انی ظلمت نفسی الخ ھنا بحث الی قولہ اعاد اللہ علینا من برکاتھا بمنہ

ف یہاں سے معلوم ہوا کہ دعا میں غایت احتیاج اور غایت اضطرار کی حالت اختیار کرنا چاہیئے کہ صورت بھی مضطر کی سی ہو الفاظ بھی افتقار و اضطرار کے مناسب ہوں محض سوال اور درخواست کے الفاظ پر کفایت نہ کی جائے اور یہ دولت اہل اللہ کی صحبت ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ ففی ذلک فلیتنافس المتنافسون

(۱۹۴) نفس ہر شر کا منبع ہے پس ہر حال میں اپنے کو خطاوار سمجھو،

یہاں ایک اور سوال ہے وہ یہ کہ حضرت صدیق کا دعا میں یہ کہنا ظلمت نفسی ظلما کثیرا (کہ میں نے اپنی جان پر بہت ظلم کیا ہے) حقیقت پر محمول ہے یا مجاز پر؟ اگر مجاز ہے تو یہ بات محال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سبب مغفرت کی تعلیم کرتے ہوئے مجاز کا استعمال کریں اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی مقام طلب و رغبت میں اللہ تعالیٰ کو مجاز سے خطاب نہیں کر سکتے۔ پس اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ اس کو حقیقت پر محمول کیا جائے۔ اب اگر یہ حقیقت ہے تو وہ کون سا گناہ ہے؟ کیونکہ اسلام سے پہلے جو کچھ تھا اس پر تو مواخذہ نہیں اور اسلام کے بعد تو وہ سب کے سردار اور خیر میں مقتدا ہیں پھر یہ گناہ کیسا؟ (جس کے متعلق کہا گیا ہے ظلمت نفسی ظلما کثیرا) اس کا جواب وہ ہے جو پہلے ایک حدیث میں یا ابن آدم کی شرح میں گذر چکا ہے کہ انسان کی اصل طبعی حالت بیوفائی (اور غدر) ہے۔ (یہی ہمارے اندر غالب ہے) مگر جس کو اللہ اس سے محفوظ کر دے) پس دنیا و آخرت میں جو خیر بھی (ہم کو حاصل ہے یا ہوتی) ہے وہ محض اللہ جل جلالہ کے فضل سے ہے خواہ اس طرح کہ ایسے اعمال کی ہم کو ہدایت کی جن کو حکمت الٰہیہ نے حصول خیر کا سبب بنایا ہے (یہ عوام کا مقام ہے) یا محض عفو و فضل سے بدون کسی عمل وغیرہ کے سبب کے (اور یہ خواص کا ذوق ہے) ہمارے اس قول کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے

وما بکم من نعمۃ فمن اللہ تمہارے پاس جو نعمت بھی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے

ولولا فضل اللہ علیکم ورحمۃ ما زکی منکم من احد ابدا

اور اگر تم پر اللہ کا فضل و رحمت نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی بھی کبھی پاک نہ ہوتا

نیز ارشاد ہے:

ان النفس لامارۃ بالسوء الا ما رحم ربی کہ نفس تو برائی ہی کا امر

کرنیوالا ہے مگر جس پر اللہ کا رحم ہو جائے۔

تو نبی صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق رضی اللہ عنہ کو متنبہ فرمایا کہ اصل کا اقرار کریں جس حالت پر نفس کو فطرۃً بنایا گیا ہے اس کا اعتراف کریں یہی سچی حقیقت ہے اور اس کے بعد خیر تام کو جو مغفرت و رحمت ہے اصل حقیقی سے یعنی غفور رحیم سے طلب کریں (اپنی کسی شئے کو مغفرت و رحمت کا سبب نہ سمجھیں) اسی لئے بعض اہل خیر نے فرمایا ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز بڑی ہو سکتی ہے خواہ ظاہراً یا باطناً بجز نفس کے کہ وہ اہل حقیقت و معرفت کے نزدیک کبھی بڑا نہیں ہو سکتا بلکہ جس قدر ان کی معرفت بڑھتی ہے اسی قدر نفس کی ذلت و حقارت ان کی نظر میں بڑھتی جاتی ہے۔ یہ حدیث اس قول کی صحت پر شاہد ہے کیونکہ جب وہ شخص جو صدق و تصدیق کے انتہائی مقام پر پہنچا ہوا ہے اس انتہا کے بعد بھی اتنے بڑے اعتراف کی طرف لوٹایا گیا ہے جس کا ابھی بیان ہوا تو کیا اس کی نظر میں نفس کی کچھ بھی قدر باقی رہ گئی ہو گی معاذ اللہ ہرگز نہیں۔ پس جس کو خلاص اور اخلاص کی طلب ہو اس کو ان کے راستہ پر چلنا اور نفس کو مٹانا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو بھی اپنے فضل سے ان کے سلسلہ میں داخل فرمائیں (آمین)

قوله الوجه الرابع هنا بحث في قول هذا السند ظلمت نفسي الى قوله ضمناً الله في سلكهم بمنه

ق سچ ہے خودی کو مٹا دو خدا سے مل جاؤ گے دع نفسك و تعالیٰ ؎

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست ۔ تو خود حجاب خودی حافظ از میان برخیز

تو در گم شو وصال این ست و بس ۔ گم شدن گم کن کمال این ست و بس

مگر یہ دولت محض الفاظ یاد کرنے سے حاصل نہیں ہوتی کاملین کی صحبت سے حاصل ہوتی ہے۔ رزقنا اللہ وایاکم ذلك بمنه و فضله آمین

باب ۵۰ پنجاہ

حدیث

رفع الصوت بالذكر بعد الصلوٰة

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بلند آواز سے ذکر کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا جس وقت لوگ فرض نماز سے فارغ ہو کر واپس ہوتے۔

شرح ظاہر حدیث کا مدلول یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب لوگ فرض نماز سے فارغ ہوتے تو ذکر کی آواز سنی جاتی تھی اس پر چند وجوہ سے کلام ہے

۱۹۵ نمازوں کے بعد ذکر جہر کی تحقیق صحابہ رضی اللہ عنہم میں اہل صفہ تو بلا حاجت ضروریہ کے مسجد سے نکلتے ہی نہ تھے بلکہ ہمیشہ مسجد ہی میں رہتے تھے اور بعض صحابہ دوسری نماز کے انتظار میں مسجد کے اندر بیٹھے رہتے تھے کیونکہ اس میں ثواب ہے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے

فذلكم الرباط فذلكم الرباط ثلاثا

یہی حدود کی محافظت ہے یہی حدود کی محافظت ہے یہی حدود کی محافظت ہے

تین بار اس قول کو دہرایا۔ پس اب اس حدیث کو عموم پر محمول نہیں کر سکتے (یعنی یہ نہیں کہہ سکتے کہ سب صحابہ نماز کے بعد گھروں کو واپس ہو جاتے تھے۔ بلکہ خصوص پر محمول کیا جائیگا جس کو حدیث ذوالیدین میں اس لفظ سے بیان کیا گیا ہے خرج السرعان کہ جلدی کرنیوالے مسجد سے نکل گئے اور یہ وہ تھے جن کو ضروری کام ہوتے تھے وہ نماز کے بعد ذکر کرتے ہوئے مسجد سے

نکلتے تھے تاکہ ان سے کوئی مستحب فوت نہ ہو جائے کیونکہ نماز کے بعد ذکر کرنے کی فضیلت وارد ہے۔ غرض یہ حضرات اپنی ضرورتوں کے لئے جلدی مسجد سے نکل جاتے اور جلدی کی وجہ سے باآواز بلند ذکر کرتے تھے کیونکہ مسجد سے باہر اگر کوئی آہستہ ذکر کرے تو ممکن ہے کوئی اس سے بات کرنے لگے اور اس کو باتوں میں مشغول کر کے ذکر سے محروم کر دے اور حضرات صحابہ سب کے سب مستحبات کی پوری پابندی کرتے تھے (اس پابندی کی وجہ سے ہی مسجد کے باہر بلند آواز سے ذکر کرتے تھے) تو اگر اس علت کی وجہ سے جہر کیا جائے تو اس وقت جہر افضل ہوگا مفضول نہ ہوگا گو فی نفسہٖ ذکر خفی افضل ہے) کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ ذکر خفی ذکر جلی سے ستر درجہ افضل ہے، یہ اس وقت ہے جبکہ دونوں علت سے خالی ہوں کیونکہ جہر میں بعض دفعہ ریا بھی داخل ہو جاتی ہے لیکن اگر اس غرض سے جہر کیا جائے کہ جہر نہ کیا جائے تو ذکر بالکل ہی فوت ہو جائیگا تو اس وقت جہر افضل ہوگا، اور ممکن ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر خفی کی فضیلت اس لئے بیان فرمائی ہو تاکہ لوگ جہر پر دوام نہ کر لیں جیسا راوی حدیث نے بیان کیا ہے (اور جہر پر ہمیشہ دوام نہیں ہو سکتا بعض دفعہ جہر سے دوسروں کو تشویش ہوتی یا سونیوالوں کو تکلیف ہوتی ہے) اور ممکن ہے یہ جہر کرنیوالے وہ لوگ ہوں جو ابھی اسلام لائے تھے ان کو جہر سے منع نہیں کیا گیا کیونکہ ان کو ذکر سے مانوس کرنا اور ایمان کی محبت ان کے دل میں ڈالنا مقصود تھا اور دوسروں کو افضل کی خبر دے دی گئی تاکہ جہاں تک ممکن ہو افضل پر عمل کریں اور بعض کے جہر پر سکوت کیا گیا تاکہ جواز پر دلالت ہو جائے۔ غرض اس میں مبتدیوں اور معذوروں کے لئے ایک نمونہ ہے پس دین آسان ہے۔

رہی اس ذکر کی کیفیت میں گفتگو، سو اسمیں چند احتمالات ہیں ایک وہ جو ابھی بیان جاری کیا گیا کہ (جہر کا منشا یہ تھا کہ نمازوں کے بعد جو ذکر ماثور ہے وہ فوت نہ ہو جائے) یعنی ۳۳ بار سبحان اللہ ۳۳ بار الحمد للہ ۳۳ بار اللہ اکبر اور سو پورا کرنے کے لئے ایک بار لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شیء قدیر اور یہ بھی احتمال ہے کہ مراد وہ ذکر ہو جو مسجد سے نکلنے کے وقت ماثور ہے کہ مسجد سے

نکلتے ہوئے بایاں پیر پہلے نکالے اور کہے اللھم افتح لی ابواب فضلک کہ اس وقت یہی سنت ہے اور یہ احتمال زیادہ ظاہر ہے اور اس صورت میں حدیث اپنے ظاہر پر رہے گی (کہ انصراف سے مراد مسجد سے گھر کی طرف لوٹنا ہے نماز سے فارغ ہونا مراد نہیں۔ پس حدیث سے نماز کے بعد معاً ذکر جہر کا ثبوت نہیں ہو سکتا جیسا اہل بدعت کا معمول ہے) اور اس ذکر کے اظہار و اعلان کا فائدہ یہ ہوگا کہ ناواقف لوگ بھی اس سنت سے واقف ہو جائیں گے اور جس کا دل کسی ضروری فکر میں مشغول ہو وہ بھی ذکر کو سن کر متنبہ ہو جاوے (اگر مشغولی کی وجہ سے بھول گیا ہو تو اس سنت کو یاد کر کے بجالائے) تو جہر کرنے والے کو ذکر کا ثواب دو طرح سے حاصل ہوگا ایک تو خود اپنے ذکر کی وجہ سے دوسرے نفع متعدی کی وجہ سے (کہ اسکے ذکر کو سنکر دوسرے بھی اس سنت کو بجالائے) کیونکہ اس نے اسی قصد سے جہر کیا تھا کہ دوسروں کو تعلیم دے اور ان کے دل میں یہ بات ڈالدے (کہ اس وقت سنت یہ ہے جو میں نے ادا کی) جیسا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا جب آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ تم رات کو قرأت میں بلند آواز کیوں کرتے ہو کہا میں سونیوالوں کو بیدار کرنا چاہتا ہوں اور شیطان کو بھگانا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جواب کو پسند کیا اور فرمایا کسی قدر آواز پست کر دیا کرو اور صحابہ رضی اللہ عنہم سب ہی ایسے تھے کہ وہ کوئی عمل بدون نیت صالحہ اور کتاب و سنت کی روشنی کے نہیں کرتے تھے (پس جو حضرات مسجد سے نکلتے ہوئے اللھم افتح لنا ابواب فضلک بلند آواز سے کہتے تھے، ان کے جہر کا منشا بھی نیت صالحہ تھی)

اور اس سے یہ علمی مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ عمل سے پہلے نیت درست کرنا چاہئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے خیر العمل ما تقدمته النیة بہترین عمل وہ ہے جس سے پہلے نیت (صالحہ) ہو۔

ایک عمل میں چند نیتیں جمع کرنے کی تحقیق

اور اگر کسی عمل میں خیر کی بہت سی

نیتیں جمع ہو سکیں تو سب کو جمع کر لینا چاہئے کیونکہ اس سے ثواب بڑھ جائے گا مگر شرط یہ ہے کہ وہ عمل واجب فرض نہ ہو کیونکہ اگر واجب ہوا اور اس کی نیت کے ساتھ کسی اور عمل کی نیت بھی ملا دی گئی تو اس صورت میں علماء کا اختلاف ہے کہ فرض ادا ہوگا یا نہیں یا دونوں ادا ہو جائیں گے یا ان میں سے ادنیٰ ادا ہوگا یا اعلیٰ یہ چار قول ہیں مگر قران حج وعمرہ کی صورت مستثنیٰ ہے کہ وہاں ایک عمل کا دونوں کے لئے کافی ہو جانا متفق علیہ ہے (یعنی ایک ہی احرام دونوں کے لئے کافی ہو جاتا ہے) بشرطیکہ بعد میں ازالہ دم بھی کی جائے (یعنی ہدی ذبح کی جائے) جیسا کتب فروع میں مذکور ہے۔

پس فرض میں تنہا اسی کی نیت کی جائے (کسی اور عمل کی نیت اس کے ساتھ شامل نہ کی جائے) تاکہ خلاف سے خروج ہو جائے اور فرض ذمہ سے (بالیقین) ادا ہو جائے۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ حدیث میں فرض نماز سے مراد خاص صبح کی نماز ہو اس احتمال کی تائید کہ یہ حدیث نماز صبح کے ساتھ مخصوص ہے اس سے ہوتی ہے کہ جب ایک لفظ کو اطلاق اور تقیید کے ساتھ ذکر کیا جائے تو مطلق کو مقید پر محمول کیا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ مخصوص کیا جاتا ہے (اور دوسری احادیث میں یہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز سے فارغ ہو کر حضرات صحابہ کی طرف متوجہ ہوتے اور دریافت فرماتے تھے کہ تم میں سے کسی نے آج رات کوئی خواب دیکھا ہے اگر کسی نے خواب دیکھا ہوتا بیان کرتا اور آپ جو کچھ اللہ نے چاہا اس کے جواب میں فرماتے اور طلوع شمس تک صحابہ سے باتیں کرتے رہتے تھے اور آپ کی باتیں ذکر ہی ہوتی تھیں۔ اگر حدیث کا محمل یہ ہے تو اس وقت سے لے کر آج تک عمل اسی پر ہے کیونکہ آج بھی عموماً نماز سے فارغ ہو کر جب مسجد سے نکلتے ہیں تو لوگ بلند آواز سے ذکر کرتے ہیں کیونکہ اس وقت راستہ میں خلوت ہوتی ہے بجز ان لوگوں کے جو نماز پڑھ کر نکلتے ہیں راستوں میں کوئی نہیں ہوتا اور نمازی بھی ایک دم سے نہیں نکلتے بلکہ متفرق طور پر مسجد سے نکلتے ہیں

اور قلوب اس وقت منور ہوتے اور ذکر سے راحت پاتے ہیں، اور سلف کے گھر بھی قد آدم سے کچھ ہی اونچے ہوتے تھے تو گھروں میں سے بھی ذکر کی آواز سنی جاتی تھی گھر میں رہنے والے اسوقت بیدار ہوتے اور کسی عذر کی وجہ سے گھر میں مقید ہوتے تھے آج لوگوں کے ذکر کی آواز (گھروں میں سے) اس لئے سنی نہیں جا سکتی کہ عمارتیں بلند ہیں اور لوگوں پر نیند اور غفلت کا غلبہ ہے۔ پس عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی اس خبر کا مطلب یہ ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس وقت بھی بلند آواز سے ذکر کرنا ذکر خفی سے مفضول اور کمتر ہے کیونکہ جب آدمی راستہ میں اکیلا ہو تو اس وقت راستہ اور گھر برابر ہے دونوں میں کچھ فرق نہیں (اور گھر میں بلند آواز سے ذکر کرنا ذکر خفی کے برابر ہے کہ اسمیں ریا کا اندیشہ نہیں)

نیز اس پر بھی تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ اس وقت ذکر میں مشغول ہونا مؤکد اور ضروری ہے اس میں رغبت کرنا چاہئے کیونکہ اس وقت ذکر میں مشغول ہونے سے رزق میں ترقی ہوتی ہے کیونکہ رزق طلوع فجر سے طلوع شمس تک کے درمیان تقسیم ہوتا ہے تو جو شخص اس وقت کسی عبادت میں مشغول رہے گا اس کا رزق بہت وسیع ہوگا جیسا حدیث میں آیا ہے۔ اور اس دلیل پر یہ علمی مسئلہ مرتب ہوا کہ جو طاعت زیادت رزق کا سبب ہو اس میں مشغول ہونا اولیٰ ہے کیونکہ اس سے دنیا وآخرت کی خیر حاصل ہوگی، اس کے متعلق بہت سے آثار وارد ہیں اور اسی لئے اہل صفہ طلب رزق کا اہتمام بہت کم کرتے تھے کیونکہ ان کو اس حدیث پر اور اس کے امثال پر پورا یقین تھا تو وہ دونوں جہان میں بوجہ کامیاب تھےؔ، مگر یہاں ایک شرط ہے کہ طاعت میں خالص اللہ کے واسطے مشغول ہوا جائے رزق کے واسطے مشغول نہ ہوا جائے کیونکہ اگر رزق کے واسطے طاعت میں مشغولی ہوگی تو نہ دنیا ملے گی نہ آخرت

ؔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اہل صفہ کو فتوحات اسلامیہ کی وسعت کے بعد بڑے بڑے مناصب بھی عطا فرمائے اور بیت المال کے وظائف بھی اور یہ سب کچھ بلا طلب وسعی کے ان کو حاصل ہوا ۱۲ ظ

اسی معنی میں کہا گیا ہے

ان الخیر بالطاعات منوط و صاحبہا بالبرکات موصوف
والمعاصی صاحبہا ممقوت و دارا ہ بالبلایا محفوفتان

خیر طاعات کے ساتھ بندھی ہوئی ہے اور صاحب طاعات برکات سے موصوف ہے اور گناہ والا مقت و غضب میں مبتلا ہے اور اسکی دنیا و آخرت دونوں کی دونوں بلاؤں سے گھری ہوئی ہیں۔

نیز کہا گیا ہے۔

دارالک بالطاعات مرتجان وانقارالسوء بہا معروف

تیرے دونوں گھر دنیا و آخرت طاعات ہی سے نفع مند ہوں گے اور طاعات کے ذریعہ مصیبت سے بچنا (سب کو) معلوم ہے۔ یہ بحث تو اس وقت ہے جبکہ ذکر سے مراد وہ ہو جو مسجد سے نکلتے ہوئے مشروع ہے اور اگر انصراف سے مراد نماز سے فارغ ہونا ہے (مسجد سے نکلنا مراد نہیں) تو اس وقت یہ گفتگو نہ ہوگی بلکہ دوسری تاویل ہوگی جو آگے آتی ہے۔ ابن بطال رحمہ اللہ نے شرح بخاری میں اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ احتمال یہ بھی ہے کہ نمازوں کے بعد یہ ذکر جہر دشمن کے شہروں پر حملہ اور جہاد کی حالت میں ہو تو اگر حدیث کا یہ محمل ہے تو اب بھی عمل اسی کے موافق ہے کیونکہ سنت یہ ہے کہ مجاہدین نماز سے فارغ ہو کر پانچوں وقت بلند آواز سے ذکر (یعنی تکبیر) کہا کریں تاکہ دشمن کے دلوں پر رعب غالب ہو جائے اور اگر اس پر محمول نہیں تو یہ حدیث بالاجماع منسوخ ہے اور اجماع کے لئے کسی حجت کی ضرورت نہیں (کیونکہ وہ خود مستقل حجت ہے)

قولہ الوجہ الثانی ان اہل الصفۃ الیٰ قولہ والاجماع لا یحتج علیہ

ف اس تمام تقریر کا حاصل یہ ہے کہ نمازوں کے بعد معاً ذکر جہر بدعت ہے جیسا بعض مبتدعین کا معمول ہے کہ ہر نماز کے بعد یا فجر و عصر کے بعد تین بار لا الٰہ الا اللہ ضرب و جہر کے ساتھ کہتے اور تین بار حق حق حق کہتے ہیں اور عبداللہ بن عباس کی یہ حدیث ان کی حجت نہیں ہو سکتی کیونکہ اسمیں بہت سے احتمالات ہیں جن کا ذکر گذر چکا اور اگر اس کو ظاہر پر رکھا جائے تو وہ اجماع سے منسوخ ہے۔ فقہائے امت صحابہ و تابعین کا اجماع ہو چکا ہے کہ نمازوں کے بعد بجز جہاد وغیرہ یا تکبیرات ایام تشریق کے ذکر جہر مشروع نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالحق والصواب۔

ف یہاں سے معلوم ہوا کہ جو وظائف و اذکار دنیوی مقاصد کے لئے پڑھے جاتے ہیں ان میں ثواب نہیں جبکہ مقصود دنیا ہو، ثواب اس وقت ہے جب محض طاعت و رضائے حق کے لئے ان کو بجا لائے پھر دنیوی مقاصد اس کے غلام ہو کر خود ہی آجاتے ہیں ان کو مقصود نہ بنانا چاہیئے۔

باب پنجاہ ویکم

حدیث

کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ تم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی چیز کا نگہبان اور ذمہ دار ہے اور اس سے اسکی رعیت کے متعلق باز پرس کی جائیگی امام بھی نگہبان اور ذمہ دار ہے اس سے اسکی رعیت کے متعلق سوال کیا جائیگا اور مرد اپنے گھر والوں کا نگہبان اور ذمہ دار ہے اس سے ان کے متعلق باز پرس کی جائے گی عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان اور ذمہ دار ہے اس سے اس کے متعلق سوال کیا جائیگا۔ خادم اپنے آقا کے مال کا نگہبان اور ذمہ دار ہے اس سے اس کے متعلق سوال کیا جائیگا۔ راوی نے کہا مجھے گمان ہوتا ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ مرد اپنے باپ کے مال کا نگہبان اور ذمہ دار ہے اس سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا غرض تم میں سے ہر شخص کسی نہ کسی چیز کا نگہبان اور ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اس کی ذمہ داری کے متعلق باز پرس ہوگی۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ جو شخص جس چیز کا نگہبان اور ذمہ دار ہے اس سے اس کے متعلق باز پرس ہوگی۔ اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱) یہ ذمہ داری ان ہی امور میں منحصر ہے جنکا ذکر حدیث میں ہے یا دیگر امور کیطرف بھی متعدی ہے۔ اگر ہم علت سمجھنے کے قائل ہوں تو جہاں علت موجود پائیں گے حکم کو متعدی کردیں گے اور حدیث میں جن چیزوں کا خاص طور پر ذکر ہے اس کو قلیل سے کثیر پر تنبیہ کرنے کے باب سے سمجھا جائیگا کیونکہ علت سب جگہ امانت اور نگہبانی ہے اور قواعد شریعت اس بارہ میں بہت ہیں جو اس (تعدیہ) پر صراحتہً یا ضمناً دلالت کرتے ہیں، پس بیان حدیث کا فائدہ یہ ہے کہ ان امور پر متنبہ کیا جائے جن کا ذکر یہاں ہے کہ یہ فائدہ ایک معقول فائدہ ہے کیونکہ لوگ عام طور پر راعی اور ذمہ دار صرف خلیفہ اور سلطان ہی کو سمجھتے ہیں اس کو سوا جن لوگوں کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی ذمہ دار نہیں سمجھتے چنانچہ مرد کہتا ہے کہ میرے گھر والے میرے واسطے مباح ہیں میرا اوپر ان کا کچھ حق نہیں بجز نفقہ (روٹی کپڑے) وغیرہ کے جو عادۃً مرد کے ذمہ ہوتا ہے اور اس سے صرف نفقہ کے متعلق باز پرس ہوگی، یہ نہیں سوچتا کہ اس کے ذمہ اس سے زیادہ بھی کچھ حق ہے اسی طرح بیٹا کہتا ہے کہ میرے باپ کا مال میرا مال ہے مجھ پر اسکی باز پرس کیا ہے بلکہ وہی میرا اوپر حاکم ہے (جو کچھ باز پرس ہوگی باپ سے ہوگی)، بیوی بھی یہی کہتی ہے غلام بھی یہی سمجھتا ہے اور اس جہالت کے درمیان حقوق ضائع ہوجاتے ہیں جن کی باز پرس ہوگی مگر لوگ ان حقوق کو غفلت میں برباد کرتے ہیں، پس اس پر تنبیہ کردی گئی تاکہ ان لوگوں کی پوری خیرخواہی ہوجائے جو کسی ذمہ داری کے تحت میں ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب ذمہ داروں سے زیادہ اپنی ذمہ داری کو ادا کرنیوالے ہیں (اس لئے آپ نے تنبیہ فرمائی) بقیہ امانات اور ذمہ داریوں پر یہی مثالیں دلالت کررہی ہیں (ان ہی پر سب کو قیاس کیا جائیگا) چنانچہ سب سے بڑی ذمہ داری تو اس کی ہے جس کے لئے اطاعت وانقیاد کی بیعت کی جاتی ہے (مراد خلیفہ اور سلطان ہے) اس پر تو حدیث عبادہ بن الصامت میں گفتگو گزر چکی ہے اس کے بعد جن لوگوں کا ذکر ہے ان کے متعلق اس وقت کچھ بیان کیا جائیگا۔

جتنا اللہ تعالیٰ منت ذوب گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

والرجل راع فی اھلہ و مسئول عن رعیتہ

مرد اپنے گھر والوں کا نگہبان اور حاکم اور ذمہ دار ہے اس سے اس رعیت کے متعلق باز پرس ہوگی۔

یہاں اھل کا لفظ مبہم ہے تو اس سے کیا مراد ہے؟ کیونکہ اہل کا اطلاق کبھی زوجہ پر آتا ہے جیسا اسامہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قصۂ افک میں کہا تھا

اھلك یا رسول اللہ لا اعلم الا خیرا

یا رسول اللہ وہ آپ کی بی بی ہیں میں تو بھلائی کے سوا ان کے بارہ میں کچھ نہیں جانتا۔ (مراد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تھیں)

اور یہ بھی احتمال ہے کہ اہل سے مراد وہ ہوں جن کا نفقہ مرد کے ذمہ شرعاً واجب ہوتا ہے جیسا نوح علیہ السلام نے فرمایا ہے۔ ان ابنی من اھلی کہ میرا بیٹا بھی میرے اہل میں (داخل) ہے اور جیسا اللہ تعالیٰ شانہ نے ایوب علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا ہے ووھبنا لہ اھلہ و مثلھم معھم ہم نے ایوب علیہ السلام کو ان کے گھر والے عطا کر دیئے۔ اور ان کے مثل بھی ان کے ساتھ یہاں اہل سے مراد بیوی بچے سب ہیں۔ نیز غلام بھی اہل میں داخل ہے کیونکہ وہ بھی منجملہ رعیت کے ہے جیسی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے متعلق ھو من اھل البیت کہ وہ اہل بیت میں سے ہے حالانکہ وہ غلام (آزاد شدہ) تھے۔ نیز غلام کے لئے اپنی سیدہ کی زینت (ظاہرہ وجہ و کفین) کی طرف نظر کرنا مباح ہے جیسا محارم کے لئے مباح ہے چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ او ما ملکت ایمانھن

حدیث میں دونوں احتمال ہیں (کہ اہل سے صرف بیوی مراد ہے یا سب گھر والے مراد ہوں)

مگر ظاہر یہ ہے کہ اس کو عموم پر رکھا جائے کیونکہ فائدہ اس صورت میں عام و تام ہوگا نیز اس لئے بھی عموم پر رکھنا اولیٰ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کے اخیر میں فرمایا ہے والرجل راع فی مال ابیہ کہ آدمی اپنے باپ کے مال کا بھی نگہبان اور ذمہ دار ہے اور یہ نہیں فرمایا کہ باپ اپنے بیٹے کے مال کا نگہبان اور ذمہ دار ہے کیونکہ بیٹا اہل میں داخل ہو چکا ہے اسی طرح یہ نہیں فرمایا کہ آدمی اپنے غلام اور بیوی کا نگہبان ہے اور ذمہ دار ہے کیونکہ غلام اور بیوی بھی اہل میں آ چکے ہاں بیٹے اور غلام اور بیوی کی ذمہ داری کو آپ نے بیان فرما دیا تاکہ ہم کو معلوم ہو جائے کہ جس طرح گھر کے مالک سے ان کے متعلق باز پرس ہوگی ان سے بھی بقدر خصوصیت (و تعلق) کے باز پرس ہوگی جیسا آگے بتلایا جائیگا

پس مرد کے ذمہ بیوی بچوں اور غلاموں کے جو حقوق واجب ہیں ان میں سے بعض تو وہ ہیں جو سب لوگوں کو خواہ عالم ہوں یا جاہل معلوم ہیں جیسے نفقہ کپڑا اور دینے کا گھر اس میں تو کچھ خفا نہیں، مگر یہ کل میں سے بعض ہے، کیونکہ اس کے علاوہ اس کے ذمہ یہ بھی واجب ہے کہ ان کے دین کی حفاظت کرے ان کو دین پر ابھارتا رہے فرض پر بھی مستحبات پر بھی، ہر ایک پر اس کے درجہ کے موافق ترغیب دے اور یہ حق نفقہ اور لباس سے بھی زیادہ مؤکد ہے کیونکہ نفقہ اور لباس تو تنگدستی کی حالت میں ساقط بھی ہو جاتا ہے اور دین کی طرف رہبری اور اس کی تعلیم کسی حال بھی ساقط نہیں ہوتی اور ظاہر ہے کہ جو حق کبھی ساقط نہ ہو وہ اس حق سے زیادہ مؤکد اور ضروری ہے جو کسی وقت ساقط ہو جائے۔

مگر چونکہ لوگوں نے حکام کو نفقہ اور کپڑا اور دیگر امور دنیویہ ہی کے متعلق فیصلہ کرتے دیکھا ہے ان کے سوا کسی اور بات کو ذمہ داروں کے اوپر لازم کرتے ہوئے نہیں دیکھا تو وہ یہ سمجھ گئے کہ بس حق واجب وہی ہے جس کو حکام اپنے فیصلوں میں لازم کرتے ہیں اس کے سوا کچھ واجب نہیں۔

اور جو لوگ اہل علم اور اہل خیر سمجھے جاتے ہیں ان کی بڑی دوڑ یہ ہے کہ

نفقہ و لباس کے علاوہ جو حقوق دینیہ ہیں وہ مستحب کی قسم سے ہیں اگر ان کو ادا کریں تو ثواب ہے نہ ادا کریں تو گنہگار نہ ہوں گے حالانکہ یہ بھی جہل محض ہے اور بالکل غلط ہے کتاب سنت اور اقوال آئمہ میں اس کے غلط ہونے کی دلیل موجود ہے۔ کتاب کی دلالت کے لئے تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کافی ہے۔

یاایھا الذین آمنوا قوا انفسکم و اھلیکم نارا

اے ایمان والو! اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم سے بچاؤ

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وأمُرْ أهْلَكَ بالصلوة واصطبر علیها

اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کرو اور خود بھی اسکی پابندی کرو

رہی حدیث، سو روایات میں وارد ہے کہ جس شخص کی اولاد بالغ ہو جائے اور وہ ان کے نکاح وغیرہ کے بارہ میں کوتاہی کرے یہاں تک کہ وہ اس کوتاہی کی وجہ سے کسی محذور (گناہ) میں مبتلا ہو جائیں تو اس پر بھی اتنا ہی گناہ ہوگا جتنا ان پر ہوگا۔ نیز نماز کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

مروھم بها لسبع واضربوھم علیها لعشر

بچوں کو نماز کا حکم کرو جب سات سال کے ہوں اور نماز کے ترک پر ان کو مارو جب دس سال کے ہوں۔

اور یہ حکم صرف نماز ہی کے واسطے نہیں بلکہ نماز کا ذکر اعلیٰ سے ادنیٰ پر تنبیہ کیلئے ہے رہے اقوال ائمہ تو ابن ابی زید نے اپنے رسالہ وغیرہ میں بیان کیا ہے کہ بچوں کو نماز کے لئے مارا جائے جب دس کے ہوں جیسا حدیث میں آیا ہے اسی طرح دوسرے واجبات و فرائض میں بھی کوتاہی کریں تو سزا دینا چاہیئے۔

علماء نے اس مسئلہ میں بھی اختلاف کیا ہے کہ ولی اپنے ماتحت نابالغ بچوں کو نیک کاموں کی ہدایت کرے اور ان پر مجبور کرے تو ان اعمال کا ثواب کس کو ملے گا۔ اس میں تین قول ہیں ایک یہ کہ ثواب ولی کو ملے گا دوسرا یہ کہ ثواب بچہ کو ملیگا

کیونکہ عمل تو اسی نے کیا ہے۔ تیسرا یہ کہ دونوں کو ثواب ہوگا۔ یہی قول صحیح ہے جس کی دلیل سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب حج وداع میں ایک عورت نے اپنے ہودج میں سے ایک بچہ کو نکال کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ کیا اس بچہ کا بھی حج ہو سکتا ہے آپ نے فرمایا ہاں اور تجھے ثواب ملیگا (مترجم کہتا ہے کہ اس حدیث سے دوسرے قول کی تو نفی ہو گئی مگر پہلے قول کی نفی نہیں ہوئی بلکہ بظاہر اس کی تائید ہے اور تیسرے قول کی تائید اسمیں نہیں)

اور غلاموں کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر باندی زنا کرے اس کو سزائے تازیانہ دو پھر زنا کرے تو سزائے تازیانہ دو اگر تیسری یا چوتھی دفعہ پھر زنا کرے تو اس کو بیچ دو اگرچہ ایک ہی رسی کے عوض بیچو۔ اسی کے مثل وہ حدیث ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ بعض لوگ ان کی زمین میں ان کے پاس ہی رہتے تھے، ایک دن حضرت عائشہ نے اسی زمین میں ان خطوط کے نشانات دیکھے جن پر چوسر کھیلی جاتی ہے تو آپ نے ان لوگوں کے اخراج کا حکم دے دیا اگر اس حرکت سے باز نہ آئیں۔ اسی بناء پر علماء نے فرمایا ہے کہ اپنی چیز ایسے شخص کو کرایہ پر دینا جائز نہیں جس کے متعلق معلوم ہو کہ وہ اس میں کوئی حرام کام کرے گا۔ اسکی تائید حق تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔

ولا تکرھوا فتیاتکم علی البغاء

کہ اپنی باندیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو (ان کے ذمہ اتنا خراج نہ لگاؤ جس کے ادا کرنے کے لئے وہ زنا پر مجبور ہوں)

تو جیسے یہ حرام ہے کہ باندیوں کو زنا کے لئے کرایہ پر دیا جائے اور اس کی اجرت لینا حرام ہے اسی طرح دوسرے مال کو بھی حرام کام کے لئے کرایہ پر دینا اور اس کرایہ کو اپنے کام میں لانا حرام ہے۔ شراب بیچنے والے کو اپنی دکان کرایہ پر دینا یا اپنے مکان کو جواء کھیلنے کے لئے یا مندر بنانے کیلئے کرایہ پر دینا و علیٰ ہذا القیاس

ہمارے اس قول کی تقویت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس خط سے بھی ہوتی ہے جو آپ نے اپنے عمال وحکام کے نام لکھا تھا

ان اھم امورکم عندی الصلوٰۃ من حفظھا وحافظ علیھا حفظ دینہ و من ضیعھا فھو لماسواھا اضیع

مجھے تمہارے سب کاموں میں زیادہ فکر نماز کی ہے جو شخص نماز کی حفاظت کرے اور اس کی پابندی کرے وہ اپنے دین کو محفوظ کریگا اور جو نماز کو ضائع کرتا ہے وہ اس کے سوا (دوسرے کاموں) کو زیادہ ضائع کرنے والا ہوگا۔

(ان سب نصوص سے یہ بات ثابت ہے کہ انسان پر اپنے اہل وعیال کا صرف نفقہ ہی واجب نہیں بلکہ ان کے دین کی حفاظت بھی لازم ہے)

اس باب میں یعنی ان حقوق کے بارہ میں جو مرد پر اپنے اہل وعیال کے متعلق واجب ہیں قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ جو اعمال خود مرد پر واجب ہیں ان پر اپنے اہل وعیال کو عامل بنانا بھی واجب ہے اگر وہ بالغ ہوں تب تو وجوب اپنی حقیقت پر ہے بجز ان اعمال کے جو شریعت نے ان سے ساقط کردیئے ہیں جیسے جمعہ عورتوں اور غلاموں سے ساقط ہے۔ چنانچہ کتب فقہ میں دلیل شرعی کے ساتھ یہ مسئلہ مذکور ہے اور اگر بالغ نہ ہوں تو وجوب حقیقی نہیں بلکہ لغیرہ ہے یعنی نابالغوں کو احکام ضروریہ کی تعلیم دینا اور عادت ڈلوانا واجب ہے گو پابند بنانا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے اور جو اعمال خود مرد پر واجب نہیں بلکہ مستحب ہیں ان کا اہل و عیال کو عامل بنانا بھی مستحب ہے مگر ان کو یہ بھی بتلا دینا چاہیئے کہ یہ اعمال مستحب ہیں جیسا خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کا نماز میں صفوں کے برابر کرنے کے متعلق معمول تھا کہ اول خطبہ میں بیان کردیتے تھے کہ صفوں کا برابر کرنا واجبات میں سے نہیں (بلکہ مکملات صلوٰۃ سے ہے اور سنت ہے) پھر کچھ آدمیوں کو صفیں برابر کرنے پر مقرر کرتے جو لوگوں کو اس پر مجبور کرتے تھے اور

حضرات خلفاء اس وقت تک نماز شروع نہ کرتے جب تک وہ لوگ اطلاع نہ دیتے کہ صفیں برابر ہوگئی ہیں، اس کے متعلق پوری تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ غرض اعمال مستحبہ میں بھی اہل وعیال سے مسامحت نہ کرنا چاہیئے۔

اب ہم تم کو بتلاتے ہیں کہ حکام صرف نفقہ اور کپڑا وغیرہ ہی میں فیصلہ کیوں کرتے ہیں جس سے لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ بس یہی چیزیں مرد کے ذمہ لازم ہیں۔ دین کی اور باتوں میں فیصلہ کیوں نہیں کرتے۔ سو اس کی وجہ یہ ہے کہ حکام ان ہی حقوق کا فیصلہ کرتے ہیں جن کے متعلق ان کی طرف مرافعہ کیا جائے اور جن حقوق کا مرافعہ نہ کیا جائیگا ان کا فیصلہ نہ کریں گے، دیکھو اگر کسی شخص کے مقابلہ میں تمہارے پاس تین یا چار حجتیں ہوں، پھر تم ایک ہی حجت سے اس پر مطالبہ (قائم) کرو تو حاکم ایک حجت ہی سے تمہارے حق میں فیصلہ کردے گا اس کے ذمہ یہ لازم نہیں کہ بقیہ حجتوں سے جن کو تم نے ظاہر نہیں کیا نہ ان کا مطالبہ کیا تمہارے لئے فیصلہ دے اسی طرح یہاں سمجھو کہ رعیت کے کچھ حقوق دینی بھی راعی کے ذمہ ہوتے ہیں جن کو وہ ادا نہیں کرتا (مثلاً نماز کی پابندی کرانا، زکوٰۃ اور روزہ کی تاکید کرنا، ان کے اخلاق وعادات کی اصلاح کا اہتمام کرنا) مگر ان حقوق کا ادا نہ کرنا رعیت کی خواہش نفس کے موافق ہے اس لئے وہ اس سے خوش ہے کہ راعی نے ان حقوق کو ادا نہیں کیا تو وہ حکام کے سامنے بھی ان حقوق کا ذکر نہیں کرتے یا اس لئے کہ رعیت کو اس بات کا علم ہی نہیں کہ ہمارے کچھ دینی حقوق بھی ہیں یا علم تو ہے مگر وہ اس سے خوش ہے کہ راعی نے ان حقوق کو ادا نہیں کیا اور اس سے اعمال شرعیہ کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ بعض دفعہ ایسے راعی سے محبت کی جاتی ہے کیونکہ وہ خواہش نفس کے موافق ہے اور دوسرے حقوق جو حظ دنیا کی قبیل سے راعی

کے ذمہ ہیں جیسے کھانا کپڑا وغیرہ ان کا چھوڑنا رعیت کو گوارا نہیں وہ راعی سے ان حقوق کو طلب کرتی ہے (جب وہ طلب کے بعد بھی توجہ نہیں کرتا تو حکام کی طرف مرافعہ کی حاجت ہوتی ہے۔ چنانچہ جب بکثرت ان حقوق کا مطالبہ اور مرافعہ ہونے لگا تو ان حقوق کا راعی کے ذمہ واجب ہونا مشہور و معلوم ہوگیا اور دوسرے حقوق یعنی حقوق دینیہ کے طالب بھی کم ہیں ان کے ادا کرنے والے بھی کم ہیں جاننے والے بھی کم ہیں تو وہ ایسے ادپرے ہوگئے کہ گویا ان کا بیان کرنے والا اور بتلانے والا دین میں کوئی بدعت ایجاد کر رہا ہے۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون دین میں کیسا رخنہ پیدا ہوگیا ہے کہ اس کے نشانات ہی بدل گئے اس پر عمل کرنے والے ہی جاتے رہے، معاملہ یہاں تک حد سے بڑھ گیا کہ جب کسی کو دیکھا جاتا ہے کہ اپنے گھر والوں کو واجبات دین کا امر کر رہا یا دین کے معاملہ میں ان پر سختی کر رہا ہے تو اس کو دھمکایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ میاں جانے بھی دو ابھی تو یہ بچہ ہے جب تمہاری عمر پر آوے گا خود عمل کرے گا۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ دین دو ہیں، ایک بچوں کا دین، ایک بڑوں کا دین اللہ تعالیٰ سلف پر رحم فرماوے۔ ان کا یہ طرز تھا ان کے یہاں بچوں اور بڑوں کا سب کا ایک ہی دین تھا۔

میرے ایک شیخ نے اپنے ایک شیخ کا واقعہ مجھ سے بیان کیا کہ وہ اپنے شاگرد کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کا چھوٹا بچہ مکتب سے آیا اور کہنے لگا کہ میں نے اپنی تختی یاد کر لی ہے اب میں بیٹھا رہوں یا کھیل کو چلا جاؤں؟ شیخ نے اس کا کچھ جواب نہ دیا بچہ نے بار بار اپنے سوال کا اعادہ کیا، مگر وہ خاموش ہی رہے، شاگرد نے عرض کیا کہ آپ بچہ سے کیوں نہیں کہہ دیتے کہ جاؤ کھیلو، کیا بچوں کے لئے کھیل مشروع نہیں؟ یہ تو ان کی صحت کے لئے مفید ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ تم یہ چاہتے ہو کہ میرے نامۂ اعمال میں

اذہب فالعب (جاؤ کھیلو) لکھا جائے، میں تو ایسا نہ کروں گا اور اگر وہ خود کھیلنے لگے گا تو اس کو منع بھی نہ کروں گا کیونکہ بچوں کے لئے بقدر ضرورت لہو و لعب کی اجازت ہے۔ سو دیکھو سلف کے یہاں تربیت کا کیا طریقہ تھا اور نامۂ اعمال میں اپنی باتوں کے درج ہونے پر وہ کیسی احتیاط کرتے تھے۔

یہ تو ان امور کے متعلق کلام تھا جو دین میں مشروع ہیں اور جو امور نفس کے لئے مباح کر دیئے گئے ہیں تو ان کو اہل و عیال کی خاطر چھوڑ دینا مستحب و مندوب ہے جب تک دین میں کوئی مفسدہ نہ پیدا ہو، اسی طرح جو معاملات (لین دین میل ملاپ کی قسم سے) ان کے درمیان باہم ہوا کرتے ہیں۔ ان میں بھی مستحب یہ ہے کہ ان معاملات کی ترغیب دی جائے مگر سختی نہ کی جائے تاکہ ان کو مکارم اخلاق کی عادت ہو کہ یہی سنت ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔

ہمارے اس قول کی دلیل یہ ہے کہ اہل و عیال کے واسطے اپنے حظ نفس کو چھوڑ دینا مرد کے حق میں مستحب ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

المؤمن یاکل بشھوۃ عیالہٗ

مومن اپنے گھر والوں کی خواہش سے کھایا کرتا ہے

یعنی جس چیز کو ان کا دل چاہتا ہے وہی کھاتا ہے اپنی خواہش کے موافق فرمائش نہیں کرتا پھر اگرچہ کسی وقت اسکو اشتہا نہ ہو مگر گھر والوں کی خاطر سے کچھ کھا لیتا ہے تاکہ اس کے نہ کھانے سے وہ بھی کھانا نہ چھوڑ دیں تو دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل و عیال کی خاطر اپنی خواہش کے چھوڑ دینے کو کمال ایمان کی علامت بتایا ہے کیونکہ اگر وہ اپنی خواہش

سے کھایا کرے جب بھی ایمان سے تو خارج نہ ہو گا کہ یہ بھی فی نفسہٖ مباح ہے اور جس کام کا کرنا ایمان سے خارج نہ کرے اس کا چھوڑنا کمال ایمان ہو گا اور اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلیٰ سے ادنیٰ پر تنبیہہ فرمائی ہے کیونکہ کھانا جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے اس بدن کی حیات موقوف رکھی ہے وہ رات دن میں ہمیشہ ضرور بھی ہوتا ہے اور اپنی خواہش و رغبت کے ساتھ کھانا اطباء کے قول پر صلاح بدن کے لئے زیادہ مفید بھی ہے اور سنت نبویہ نے بھی رعایت طب کو مشروع کیا ہے حتیٰ کہ اطباء حاذقین نے فرمایا ہے کہ جو کھانا بعض اوقات بدن کو مضر ہوتا ہے وہ بھی اگر رغبت سے کھا لیا جائے تو نقصان نہیں کرتا بایں ہمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل وعیال کی خاطر اپنے مرغوب کھانے کو چھوڑ دینا ایمان کامل کی علامت قرار دیا ہے کیونکہ اس صورت میں وہ اپنے دین کی صلاح کو صلاح بدن پر ترجیح دیتا ہے تو یہ اسی باب سے ہے جس پر ہم نے اشارہ کیا ہے کہ اس میں اعلیٰ ادنیٰ پر تنبیہہ کی گئی ہے کہ مؤمن کامل جب کھانے میں جو دنیا کی نعمتوں میں سب سے اعلیٰ ہے اہل وعیال کی رغبت کو مقدم کرتا ہے تو معمولی باتوں میں تو ضرور اس کا لحاظ کرے گا۔

اور یہ جو ہم نے شرط لگائی ہے کہ یہ رعایت اس وقت کی جائز ہے جبکہ اس سے دین کا ضرر نہ ہو اس کی مثال جماع ہے کہ اگر مرد کو جماع کی خواہش ہو اور اس کے ترک سے دین میں خلل کا اندیشہ ہو تو اگرچہ بیوی کو اس وقت رغبت نہ ہو پھر بھی مرد کو اپنی رغبت کو مقدم کرنا چاہیئے۔ بیوی کی رغبت کا انتظار نہ کرے اسی لئے شریعت نے نشوز زوجہ کے وقت جبکہ وہ اپنے بلا عذر شرعی جماع سے انکار کرے نفقہ بند کرنے کی اجازت دی ہے حالانکہ نفقہ شوہر کے ذمہ واجب ہے۔ جیسا اوپر گذر چکا نیز بیوی کے مارنے پیٹنے کی بھی اجازت دی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

واللاتی تخافون نشوزھن فعظوھن واھجروھن فی المضاجع واضربوھن فان اطعنکم فلا تبغوا علیھن سبیلا

(ترجمہ) اور جن عورتوں کی طرف سے تم کو نشوز (نافرمانی) کا خطرہ ہو (اول) ان کو نصیحت کرو اور (پھر) ان کو خواب گاہ میں الگ کر دو اور (اس پر بھی باز نہ آئیں تو) ان کو سزائے ضرب دو اس کے بعد اگر وہ تمہاری اطاعت کرنے لگیں تو (تم بھی ان کے موافق ہو جاؤ اور خواہ مخواہ ستانے کے لئے) ان پر راستہ نہ ڈھونڈو۔

اس باب میں حدیثیں بھی بہت ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جماع کے بارہ میں مرد کو اپنا حق بیوی سے پوری طرح وصول کر لینا جائز ہے (خواہ اس کو رغبت ہو یا نہ ہو) کیونکہ ایسا نہ کرنے میں اس کے دین پر بڑے فساد کا خطرہ ہے تو یہاں بھی پہلی صورت کے مقابلہ میں اعلیٰ سے ادنیٰ پر تنبیہہ کی گئی ہے۔ تم شریعت کے اس عجیب نظام کو دیکھو جب تم اسمیں غور کرو گے (حیرت میں رہ جاؤ گے) کہ اگر دین میں خلل کا اندیشہ نہ ہو تو شریعت نے مسلمانوں کو اپنے حظ نفس کے چھوڑنے کی کیسی ترغیب دی ہے (کہ کھانے تک میں اپنی رغبت کو اہل وعیال کی رغبت کے تابع کرنے کا حکم دیا) اور اگر کسی رغبت کے چھوڑنے سے دین میں خلل کا اندیشہ ہو تو اس کا پورا کرنا مستحب ہے بلکہ ضروری اور واجب ہو جاتا ہے کیونکہ جس چیز سے روکنا واجب کو ساقط کر دیتا ہو (جیسا یہاں بیوی کا شوہر کو جماع سے روکنا نفقہ واجبہ کو ساقط کر دیتا ہے) تو اس کا حاصل کرنا

واجب ہے اور اگر اس کے حاصل کرنے کے لئے ممنوع کو بھی جائز کردیا جائے تو اس کی تحصیل اور زیادہ مؤکد ہوجاتی ہے (جیسا یہاں یہی صورت ہے) کیونکہ مرد کا اپنی بیوی کو مارنا بدون نشوز کے ممنوع ہے مگر نشوز کے بعد مارنا جائز ہے تو رغبت جماع کو پورا کرنا بہت بڑی عبادت ہوگئی اسی پر (شریعت کے تمام نظام کو) قیاس کرلو۔

اس گفتگو سے یہ علمی مسئلہ بطور نتیجہ کے معلوم ہوا کہ دین اور صلاح دین اصل مقصود ہے اس کے سوا جو کچھ ہے وہ تبعاً مقصود ہے بشرطیکہ اس سے دین میں کوئی خلل واقع نہ ہو اور اس کا مآل ایسے مباح کی طرف بھی نہ ہو جس کا کرنا اور چھوڑنا برابر ہے (کیونکہ مباح کسی درجہ میں مقصود نہیں نہ اصالتاً نہ تبعاً) اور یہی دلیل ہے طریق صوفیہ کے ترجیح کی کیونکہ ان کے طریق کی بنا ترک حظوظ نفس اور تحمل اذیت اور ترک اذیت (مسلم) اور (مسلمانوں کا) دل خوش کرنے پر ہے (اور ان امور کا عبادت ہونا ظاہر ہے غرض صوفیہ نہ مباحات میں تکثیر کرتے ہیں نہ ایسے اعمال کے پاس جاتے ہیں جن سے دین میں خلل کا اندیشہ ہوا ہے) اپنے نفس کے ساتھ تو ان کا معاملہ یہ ہے کہ اسکی خواہشوں کو پورا نہیں کرتے اور اس کو خوش کرنے کے لئے کسی کو اذیت نہیں پہنچاتے اور دوسروں کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ ان کی اذیت کا تحمل کرتے اور ہر مسلمان کا دل خوش کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک صوفی کے متعلق منقول ہے کہ ان سے ایک شخص ملا اور دریافت کرنے لگا کہ آپ کس حال میں ہیں ؟ فرمایا کہ مشوش اور پریشان ہوں یا اور کوئی لفظ اسی کے معنیٰ میں فرمایا۔ جب وہ چلا گیا تو خدام نے عرض کیا کہ حضرت آپ نے یہ بات کیوں کہی ؟ (بظاہر تو آپ پریشان معلوم نہیں ہوتے) فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ اس کو مجھ سے تعلق ہے تو میں نے اس کا دل خوش کرنا چاہا (اگر میں اپنی راحت کا اظہار کرتا اس کو خوشی نہ ہوتی) اسی وقت کوئی فقیہ صاحب تشریف لے آئے (انہوں نے یہ واقعہ سنا تو) کہنے لگے یہ کیا واہیات ہے تم نے جھوٹ بول کر اس کا دل خوش کیا یہ تو جائز نہ تھا۔ تم نے جس نیکی کا قصد کیا اس سے بدتر گناہ میں مبتلا ہوگئے۔

کسی نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا کہ بتلاؤ کیا یہ دونوں یعنی بزرگ صوفی اور ان سے بغض رکھنے والا مسلمان نہیں ہیں ؟ کہا بیشک مسلمان ہیں اس نے کہا پھر جب ایک مسلمان دوسرے سے ناحق بغض رکھے اور جس سے بغض کیا جارہا ہے وہ سچا مسلمان ہے تو کیا اس کو اپنے بھائی مسلمان کی اس حالت سے رنج نہ ہوگا کہ ناحق بغض کی وجہ سے اس کا ایمان ناقص ہو رہا ہے۔ کیونکہ مومن کو اپنے بھائی مسلمان کی ہر اس حالت سے تکلیف پہنچتی ہے جو خود اس کو پیش آتی تو تکلیف ہوتی تو جیسا اس کو اپنے ایمان کے ناقص ہونے سے تشویش ہوتی ہے ایسے ہی اپنے بھائی کے نقص ایمان سے تکلیف ہوتی ہے پس جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب اس جواب میں کذب کہاں ہوا ؟ بلکہ اس بزرگ نے اپنی حالت اور مخاطب کی حالت کے موافق سچا جواب دیا ہے۔ یہ سب جوابوں سے جواب بہتر ہے مگر اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کو علم حال اور علم رسمی دونوں سے حصہ ملا ہو ورنہ ایک میں مقلد ہوگا (خواہ فقیہ کا مقلد ہو یا صوفی کا جو فقیہ کا مقلد ہوگا صوفی کو برا کہے گا جو صوفی کا مقلد ہوگا فقیہ کو برا کہے گا اور جس کو فقہ ظاہر اور فقہ حال دونوں سے حصہ ملا ہوگا وہ کسی کا مقلد نہ ہوگا بلکہ محقق ہوگا اور کسی کو برا نہ کہے گا۔

ہمارے اس قول کی کہ اصل مقصود دین ہے اس کے سوا جو کچھ ہے تبعاً مقصود ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اشارہ سے بھی تائید ہوتی ہے کہ

لان یؤدب احد ولدہ خیرلہ من أن یتصدق
بصاع من طعام

کوئی شخص اپنی اولاد کو تادیب کرے یہ اس سے بہتر ہے کہ ایک صاع[ع] غلہ صدقہ کرے۔

کیونکہ اولاد کے ساتھ قلبی تعلق ہوتا ہے جیسا حدیث میں وارد ہے الولد مبخلۃ ومجبنۃ اولاد بخل اور بزدلی کا سبب ہے، یعنی ان دو مذموم خصلتوں کے بڑھانے میں اولاد بڑا سبب ہے، کیونکہ اس کی محبت مال کے خرچ کرنے سے مانع ہوتی ہے وہ سمجھتا ہے کہ میرا بیٹا میرے مال کا زیادہ مستحق ہے پھر غریبوں پر کیوں صدقہ کروں اور جب جہاد میں جاتا ہے تو دل اولاد میں لگا رہتا ہے اور واپسی کا مشتاق ہوتا ہے جس سے بزدلی اور بھاگنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ غالب حالت یہی ہے اور حدیث میں لوگوں کی غالب حالت ہی کو بتلایا گیا ہے (شاذ و نادر ایسے مخلص بھی ہوتے ہیں جو اولاد کو اللہ کے حوالہ کرکے میدان جہاد میں بے فکر ہو کر جاتے ہیں جیسا حضرات صحابہ و تابعین کی حالت تاریخ سے معلوم ہو چکی ہے) اور مال سے بھی قلب کو تعلق ہوتا ہے مگر اولاد کے ساتھ تعلق زیادہ ہوتا ہے اور جس بات سے اولاد کو تکلیف ہوتی ہے اس سے باپ کے دل کو تکلیف ہوتی ہے۔ اسی لئے اولاد کی تادیب اور تنبیہ جس سے اس کے دل کو تکلیف پہنچتی ہے ایک صاع صدقہ سے بڑھ کر ہے کیونکہ یہ نفس پر زیادہ شاق ہے (صدقہ اتنا شاق نہیں) یہاں شاید کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ ایک صاع کی تحدید سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر ایک صاع سے زیادہ صدقہ کرے تو وہ تادیب اولاد سے کمتر نہ ہوگا بلکہ اس سے بڑھ کر ہوگا۔

ع صاع شرعی ہندوستانی وزن سے چار سیر کے قریب ہوتا ہے ۱۲ ظ

تو اگر کوئی اپنی اولاد کو تادیب و تنبیہ نہ کرے بلکہ دو صاع غلہ خیرات کر دیا کرے تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔ جواب یہ ہے کہ حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ غلہ کی مقدار بڑھا کر تادیب اولاد کو کم کر سکتا ہے بلکہ مقصود تفاضل اعمال کا بیان ہے کہ اولاد کی ادنیٰ تنبیہ و تادیب صدقہ کی ادنیٰ مقدار سے بڑھ کر ہے کیوں (بچوں کو شرعی سزا معمولی طریقہ سے ہوتی ہے جیسے ایک تازیانہ یا کان مل دینا یا ایک طمانچہ) اور کفارات مشروعہ کی ادنیٰ مقدار ایک مد[ع] ہے چنانچہ حدیث میں ہے من لکل مسکین پس (حاصل یہ ہوا کہ) اولاد کی تادیب و تنبیہ کا ادنیٰ درجہ صدقہ مشروعہ کے ادنیٰ درجے سے بڑھا ہوا ہے اور شریعت نے صدقہ کی ادنیٰ مقدار جو مقرر کی ہے اس سے انسان کو پوری راحت حاصل ہو جاتی ہے یعنی وہ اتنی مقدار ہے جس سے عام طور پر ہر شخص کا پیٹ بھر جاتا ہے اور جب انسان کا پیٹ بھر جائے تو اسکی تمام خواہشیں اور ساری منفعتیں اور سب قوتیں مجتمع ہو جاتی ہیں اب وہ پوری طرح اپنے مقاصد کے حاصل کرنے پر قادر ہو جاتا ہے تو گویا کسی کا پیٹ بھر دینا اس کو زندہ کر دینا ہے اور (مرتے ہوئے آدمی کو) زندہ کرنا جیسا قیمتی کام ہے شرعاً و طبعاً معلوم ہے، پس شریعت نے اس ادنیٰ تکلیف کو جو اولاد کی تادیب شرعی سے (باپ کے دل کو) ہوتی ہے۔ سب سے بڑے عمل یعنی احیاء نفس سے بھی بلند تر قرار دیا ہے کیونکہ یہ نفس پر زیادہ شاق ہے صدقہ میں اس قدر تکلیف دل کو نہیں پہنچتی جیسی اولاد کو سزا دینے میں پہنچتی ہے اس تقریر سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہو گیا کہ علوم میں سب سے افضل احکام الٰہی میں اسرار حکمت کو سمجھنا ہے کیونکہ اس سے ایمان قوی ہوتا ہے اور اس سے نفس کے مقابلہ

ع مد صاع کا چوتھائی ہے اور کفارات کی ادنیٰ مقدار ایک مد ہونا مالکیہ کا مذہب ہے حنفیہ کے نزدیک نصف صاع ادنیٰ مقدار ہے ۱۲ ظ

میں مدد ملتی ہے اس کی تائید حق تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے۔

ومن احسن من اللہ حکما لقوم یوقنون

اللہ سے بہتر حکم کرنے والا کون ہے ان لوگوں
کے لئے جو یقین رکھتے ہیں۔

کیونکہ غالب احوال میں یقین صرف نظر اور فہم اور تدبر ہی سے حاصل ہوتا ہے اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے یقین حاصل کرو کیونکہ میں بھی اس کو حاصل کرتا ہوں۔

نیز باپ پر واجب ہے کہ اولاد کے ساتھ ایسا معاملہ کرے جس سے ان کو باپ کے حقوق واجبہ ادا کرنے میں مدد ملے جس کی دلیل یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک صحابی حاضر ہوئے جنہوں نے اپنے ایک بیٹے کو کوئی چیز ھبہ کی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ھبہ پر گواہ کرنا چاہتے تھے تو حضور نے اُن سے پوچھا۔ اس بیٹے کے سوا تمہارے اور بھی اولاد ہے؟ کہا ہاں۔ فرمایا کیا تم نے ان سب کو بھی اس کے برابر دیا ہے؟ کہا نہیں۔ فرمایا کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری خدمت گذاری میں سب کے سب برابر رہیں؟ کہا ہاں۔ فرمایا تو پھر تم بھی ان کے درمیان برابری کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اشارہ میں غور کرو

اتحب ان یکونو لک فی البر سواء

کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری خدمت گذاری میں سب کے سب برابر ہوں؟

اس جملہ میں اس امر پر تعریض ہے کہ تمہارا فعل تو اس مطلوب کا منافی ہے (جب تم اولاد سے خدمت گذاری میں مساوات کے طالب ہو تو خود مساوات کیوں نہیں کرتے تم کو بھی ان کے ساتھ مساوات وعدل کا برتاؤ کرنا چاہیئے) غرض اس حدیث میں باپ کو ترغیب دی گئی ہے کہ اولاد کی ساتھ ایسا معاملہ کرے جس سے ان کو خدمت گذاری میں مدد ملے (اس کی خدمت کا جذبہ ان کے دل میں پیدا ہو)۔

اسی کی نظیر یہ واقعہ بھی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ حضور سے آپ کی ازواج نے دریافت فرمایا کہ آپ ہم میں سے کس کو محبوب رکھتے ہیں۔ فرمایا اس سوال کا جواب دوسرے وقت دیا جائے گا پھر آپ نے ہر ایک بی بی کو دوسروں سے چھپا کر ایک ایک دینار دیا اور ہر ایک کو تاکید کردی کہ اس کی اطلاع کسی کو نہ ہونے پائے۔ پھر دوسرے وقت آپ سے وہی سوال کیا گیا کہ آپ کو سب بیبیوں میں کون سی زیادہ محبوب ہے تو فرمایا دینار والی زیادہ محبوب ہے، تو دیکھو حضور نے سب کو خوش کردیا اور کسی کے دل میں ذرا بھی ملال و پریشانی کا اثر نہ ہوا کیونکہ ہر بی بی کا خیال تھا کہ دینار والی میں ہی ہوں اور کوئی نہیں۔ پس ہر مرد کو اپنی چند بیبیوں کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرنا چاہیئے کہ ہر ایک یہ سمجھے کہ مجھ سے زیادہ محبت ہے۔ کیونکہ اس سے حسن معاشرت میں مدد ملتی ہے اور حسن معاشرت بیبیوں کا حق ہے کہ ان کی بہتری اسی میں ہے۔ اگر بیبیوں کے ساتھ حسن معاشرت کا معاملہ نہ ہو تو ان کی دنیا و آخرت دونوں برباد ہو جائیں گی۔ یہ تو اولاد و ازواج کے متعلق حسن معاشرت کا حکم تھا۔ رہے غلام تو ان کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا برتاؤ یہ تھا کہ بعض دفعہ آپ غلام کے ساتھ آٹا پیستے تھے اور فرماتے تھے کہ ان کی طاقت سے زیادہ کام نہ لو۔ نیز آپ نے فرمایا ہے کہ جب تمہارا خادم کھانا لیکر آئے تو اس کو اپنے ساتھ کھلاؤ اور اگر اپنے ساتھ نہ بٹھلاؤ تو اس کو اپنے خاص کھانے میں سے ایک دو لقمہ ہی دے دو۔ اس کے متعلق مفصل کلام اپنے موقعہ پر آئے گا۔ کیونکہ اس طرح برتاؤ کرنے سے غلام کو آقا کی خدمت کا جذبہ پیدا ہوگا اور اس کے مال کو اپنا مال سمجھ کر اس کی حفاظت کرے گا۔

اسی کی نظیر واقعہ ہے جو حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ سے
منقول ہے کہ وہ اپنی خلافت کے زمانہ میں ایک رات کچھ لکھ رہے تھے بعض
درباری بھی آپ کے پاس تھے کہ چراغ کا تیل ختم ہوگیا اور لکھنے کا کام باقی تھا
آپ کا غلام اس وقت سوگیا تھا۔ ایک درباری نے عرض کیا کہ غلام کو جگا دیا
جائے تاکہ چراغ میں تیل ڈال دے فرمایا نہیں وہ ابھی سویا ہے کچی نیند
میں جگا دینے سے اس کو تکلیف ہوگی اس کے بعد آپ خود اٹھے اور چراغ میں
تیل ڈالا اور اپنی جگہ واپس آکر پھر لکھنے لگے اور فرمایا کہ جب میں تیل ڈالنے
کو اٹھا تھا اس وقت بھی عمر تھا لوٹ کر آیا تو اب بھی عمر ہی ہوں (تیل ڈالنے
کے لئے اٹھنے سے میں کچھ بدل نہیں گیا) اگر ہم اس قسم کے واقعات کا سلف
صالحین کی تاریخ میں تتبع کریں تو بہت واقعات ملیں گے مگر سمجھنے
والے کے لئے یہ تھوڑا بھی بہت ہے۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

والمرأۃ راعیۃ فی بیت زوجھا و مسئولۃ عن رعیتھا

عورت اپنے شوہر کے گھر کی ذمہ دار اور نگہبان ہے اور اس سے
اس ذمہ داری کے متعلق باز پرس کی جائے گی۔

اس فصاحت و اعجاز کلام میں تو غور کرو کیسا واضح اور مقصود کو پوری طرح
ادا کرنے والا ہے۔ کیونکہ عورت کو شوہر کے ان ہی حالات و معاملات سے
سابقہ پڑتا ہے جو گھر کے اندر ہوتے ہیں تو اس کو گھر سے باہر کے حالات کا
مکلف نہیں کیا گیا کیونکہ ان تک اس کی پوری دسترس نہیں ہوتی۔ اس جملہ
میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ عورت کو گھر کے اندر پردہ میں رہنا چاہئے اگر
عورتوں کے لئے مردوں کی طرح بے پردہ باہر رہنا جائز ہوتا تو ان کی ذمہ داری
کو گھر کے ساتھ خاص نہ کیا جاتا اور گھر کے اندر جو امور عورت کے ذمہ واجب
ہیں ان کی تفصیل دوسری حدیثوں میں مذکور ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کا ارشاد ہے۔

ولکم علیھن ان لا یدخلن احدا دورکم ولا یوطئن
فرشکم غیرکم الا باذنکم

تمہارا حق عورتوں کے ذمہ یہ ہے کہ تمہارے گھروں میں کسی کو بدون
تمہاری اجازت کے داخل نہ ہونے دیں اور تمہارے بستروں میں بدون تمہاری
اجازت کے کسی غیر کو قدم نہ رکھنے دیں۔

نیز آپ کا ارشاد ہے

تحفظ المرأۃ زوجھا فی نفسھا و مالہ

عورت کو شوہر کی حرمت و ناموس کی حفاظت کرنا چاہئے اپنی ذات میں بھی
اور اس کے مال میں بھی۔

یعنی اپنی عصمت و آبرو کی حفاظت کرے اور شوہر کے مال کو فضول کاموں
میں نہ اڑائے۔ یہ تو اس کے ذمہ واجب ہے اور مستحب کا بیان رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کے اس ارشاد میں ہے۔

جہاد المرأۃ حسن التبعل

عورت کا جہاد شوہر داری کی خوبی ہے۔

یعنی شوہر داری کے حق کو اچھی طرح ادا کرنا اور جہاد دو قسم پر ہے واجب
اور مستحب، اسی طرح شوہر داری کی خوبی دو قسم پر ہے اس کا جو حصہ اپنی ذات
کی حفاظت اور شوہر کے مال کی نگہبانی وغیرہ سے متعلق ہے وہ تو واجب ہے
اور جو حصہ اپنی زینت و آرائش سے شوہر کو خوش کرنے کے لئے اور اس کی
ذات و آبرو کی زیادہ نگہداشت وغیرہ سے متعلق ہے وہ مستحب ہے۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

والخادم راع فی مال سیدہ

اور غلام اپنے آقا کے مال کا نگہبان (ذمہ دار) ہے۔

اس ترتیب عجیب میں بھی غور کرو چونکہ غلام دستور عام کے مطابق آقا کے مال کے سوا اور کسی چیز میں تصرف کا مالک نہیں نہ کچھ بگاڑ سکتا ہے، نہ سنوار سکتا ہے اس لئے کہا گیا کہ اس سے متعلق مال کے بازپرس ہوگی کیونکہ غالب یہی ہے کہ مال غلام کی امانت و حفاظت میں رکھا جاتا ہے اگر اس کے سوا کوئی اور چیز بھی اس کی ذمہ داری میں دی گئی ہو تو اس میں بھی حق امانت ادا کرنا اس کے ذمہ واجب ہے کیونکہ حدیث کے الفاظ لوگوں کی عام عادت پر مبنی ہیں۔ اسی طرح بیوی کے بارے میں بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر شوہر نے امور خانہ داری کے علاوہ کسی اور تصرف کا بھی اس کو مالک کر دیا ہو تو اس کے ذمہ اس کی حفاظت بھی لازم ہے کہ پوری طرح حق امانت ادا کرے یہاں تک کہ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ عورت کے ذمہ لازم ہے کہ شوہر کو گھر کی ہر زیادتی کمی سے باخبر کرتی رہے کیونکہ شوہر سے شریعت کا مطالبہ ہے کہ گھر والوں کی اچھی طرح نگہداشت کرے تو جب عورت اس کو تمام کلیات و جزئیات سے خبردار کرتی رہے گی اسی کے موافق اس کی طرف سے نگہداشت ہوگی جس کا نفع سب کو پہنچے گا اور اس طرح شوہر کو ان کے حقوق کی ادائیگی میں آسانی رہے گی

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

والرجل راع فی مال ابیہ

اور مرد اپنے باپ کے مال کا نگہبان اور ذمہ دار ہے

رجل یعنی مرد کا اطلاق بالغ پر ہی ہوتا ہے نابالغ پر نہیں ہوتا تو یہاں بھی بالغ ہی مراد ہے کیونکہ بالغ ہی احکام کا مکلف ہوتا ہے اسی وقت اس سے سوال اور بازپرس کا موقع ہوتا ہے نابالغ سے بازپرس نہیں ہوتی کیونکہ وہ مکلف نہیں دوسرے وہ خود ہی ماں کی پرورش اور ذمہ داری میں ہوتا ہے یا جس کے حوالہ باپ نے کر دیا ہو تو اس وقت دوسروں سے اسکے متعلق بازپرس ہوگی۔ بہرحال بالغ لڑکے پر واجب ہے کہ اپنے باپ کے مال کی حفاظت کرے اور بدون اجازت کے اس میں سے کچھ نہ لے اس عجیب تنبیہ پر غور کرو کیونکہ بیٹے کے دل میں یہ خیال آسکتا ہے کہ باپ کا مال تو ایک دن میرے ہی پاس آنے والا ہے تو اس کے بارہ میں میرا اور دوسروں کا حکم یکساں نہیں ہے بلکہ مجھے باپ کے مال میں تصرف کا حق ہے تو شارع علیہ السلام نے تنبیہ فرمادی کہ اس وقت یعنی جب تک باپ زندہ ہے وہ غیروں ہی کے مثل ہے اس کو اسی طرح تصرف جائز ہے جس طرح غیروں کو جائز ہے کہ بلا اجازت کچھ نہیں لے سکتا اگرچہ یہ مال بعد میں بیٹے ہی کا ہو جائے گا مگر بعد کی خبر کسے ہے کیا عجب ہے کہ بیٹا ہی باپ کے سامنے فوت ہو جائے اور اسی لئے اگر بیٹا باپ کا مال چرا لے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا مگر اسمیں کچھ تفصیل مذکور ہے جو کتب فقہ میں مذکور ہے اور باپ اگر بیٹے کا مال چرا لے تو اس کا ہاتھ کسی حال میں نہ کاٹا جائیگا کیونکہ بیٹے کا باپ کے مال میں اس وقت کچھ حق نہیں بجز مقدار نفقہ کے جو اس کے لئے مقرر کر دیا گیا ہو بشرطیکہ باپ کے ذمہ اس کا نفقہ اس وقت واجب ہو ورنہ بالغ ہونے کے بعد باپ کے ذمہ اولاد کا نفقہ واجب نہیں مگر یہ کہ وہ اپاہج ہو کمانے کے قابل نہ ہو وغیرہ وغیرہ اور مال کا لفظ تمام اموال کو شامل ہے جن کو عرفاً مال سمجھا جاتا ہے۔ نقد اور چاندی سونے کے ساتھ خاص نہیں پس اولاد کو باپ کے تمام اموال کی حفاظت لازم ہے۔ کسی مال میں بھی بدون اجازت کے تصرف نہ کرنا چاہیئے اور ان سب کے لئے یعنی بیٹے اور خادم اور زوجہ کے لئے مستحب ہے کہ ان کاموں کے اندر بھی جو ان کے ذمہ لازم نہیں مرد کی مدد کریں اسکی راحت کا اہتمام کریں اور جو مصالح ان کو معلوم ہوں ان پر ادب اور تمیز کے ساتھ اس کو متنبہ کریں کیونکہ غالب حالت یہ ہے کہ گھر کی چیزوں کو زیادہ تر یہی برتتے اور استعمال کرتے ہیں تو ان جزئیات کا جو وقتاً فوقتاً پیش آتی رہتی ہیں ان کو ہی زیادہ علم ہو سکتا ہے اور ان پر

جو مصالح مرتب ہوتی ہیں ان کو بھی یہی زیادہ جانتے ہیں اور اس کا ضابطہ یہ ہے کہ اگر گھر کو اپنا گھر سمجھیں جس طرح اپنے گھر کی ضروریات اور مصالح پر نظر ہوتی ہے اسی طرح باپ اور شوہر اور مالک کے گھر کی ضروریات اور مصالح پر نظر کرنا چاہیئے کیونکہ امانت کی حقیقت یہی ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

حتی یحب لاخیہ المؤمن ما یحب لنفسہ

کوئی شخص مومن کامل نہ ہوگا جب تک اپنے بھائی مسلمان کیلئے وہی نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد اجانب کے متعلق ہے تو یہ اقارب بدرجۂ اولیٰ اس کے مخاطب ہیں۔

اس جگہ ایک صوفیانہ گفتگو بھی ہے، وہ یہ کہ بندے سب کے سب حقیقت میں امانت دار ہیں اور مال سب سے بڑے مولیٰ حق تعالیٰ شانہ کا ہے۔ پس اپنے نفس کی نگہداشت کرو کہ دعویٰ نہ کرنے پائے اور امانت کو پوری طرح ادا کرنا ہے، بندگی کے اوصاف سے متصف ہو ربوبیت کے اوصاف سے متصف نہ ہو کر نرے دعوے سے اپنی ملک ثابت کرنے لگو مالا بجہ درحقیقت

مالک ہر شے خدا است　　　این امانت چند روزہ نزد ماست

پس حقیقت کو فراموش کر کے ملک مجازی پر مغرور ہونا اور دعوے ملک سے تجر میں مبتلا ہو جانا عاقل کا کام نہیں۔ یہیں سے سعید بنا ہے جو سعید بنا اور بدبخت بنا ہے جو بدبخت بنا، جنہوں نے اللہ کو مالک سمجھا اور اپنے کو امین وہ سعید ہو گئے اور جنہوں نے خدا کی ملکیت کو ذہن سے نکال دیا اپنے کو مالک سمجھ بیٹھے وہ بدبخت ہو گئے، بخل کا بڑا سبب یہی ہے کہ انسان مال کو اپنا مملوک اور خدا کے احکام کو ایک قسم کا تاوان اور بار سمجھتا ہے اسی لئے زکوٰۃ اور حج میں روپیہ ختم کرتے ہوئے جان نکلتی ہے اگر دل میں یہ بات اچھی طرح راسخ ہو جائے کہ مال و متاع جو کچھ ہمارے پاس ہے حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا ہے جس کے ہم محافظ و امین بنائے گئے ہیں تاکہ حکم الٰہی کے موافق اس کو خرچ کریں تو واجبات شرعیہ میں مال خرچ کرتے ہوئے دل میں تنگی کے بجائے بشاشت و فرحت پیدا ہوگی اور حظوظ نفس میں خرچ کرتے ہوئے دل تنگ ہوگا کہ نہ معلوم یہ خرچ مالک کو پسند ہے یا نہیں۔

ایک بزرگ اپنی اولاد سے فرمایا کرتے تھے کہ تم ایک کام کر لو تو کامیاب ہو جاؤ ان کا رعب بہت تھا اس لئے کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ اسکی تفصیل دریافت کر لیں کئی دن تک بار بار وہ اسی بات کو دہراتے رہے اس سے زیادہ کچھ نہ کہتے۔ یہاں تک کہ ایک نے جرأت کر کے دریافت کیا کہ وہ کونسا کام ہے؟ فرمایا بندگی کے طریق میں داخل ہو جاؤ بس تم کو سب سے بڑی کامیابی حاصل ہو جائیگی۔ کہا گیا بندگی کی حقیقت کیا ہے؟ فرمایا دعویٰ اور اغراض کو ترک کر دینا اور پوری طرح حکم کو تسلیم کرنا اور بجا لانا، واقعی انہوں نے بہت اچھی تعلیم دی مختصر لفظوں میں بہت بڑا علم ظاہر کیا اللہ تعالیٰ ہم کو بھی اپنا سچا بندہ بنا دے۔ بمنہ لارب سواہ قولہ فی الوجہ الثالث والرجل راع فی اہلہ مسئول عن رعیتہ الی قولہ فی الوجہ الخامس جعلنا اللہ عبیدا لہ حقا بمنہ لارب سواہ،

ف: اس حدیث کی شرح سے معلوم ہوا ہوگا کہ حسن معاشرت بھی دین کا بڑا جزو ہے جس کی طرف اس حدیث میں متوجہ کیا گیا ہے افسوس ہے کہ اسکی طرف آج کل بہت کم توجہ دی جاتی ہے عام طور پر حسن معاشرت کو دین سے خارج سمجھا جاتا ہے اور تصوف سے تو اس کا کچھ تعلق ہی نہیں مانا جاتا چنانچہ عام طور سے صوفی اس کو سمجھا جاتا ہے جس کو نہ بیوی سے تعلق ہو نہ بچوں سے نہ ماں باپ کی پرواہ ہو نہ اعزہ و اقارب کی حالانکہ حدیث میں ہر شخص کو ذمہ دار و نگہبان قرار دیا گیا ہے جس کے ذمہ

اپنے متعلقین کے حقوق کی نگہداشت فرض ہے اور ان حقوق کی نگہداشت ہی حقیقت میں اصل تصوف ہے کیونکہ یہ سب حقوق اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے ہیں اور اللہ کے حقوق کا ادا کرنا ہی تصوف ہے خدا کا حق صرف عبادات ہی پر منحصر نہیں بلکہ انسان کے تمام احوال و متعلقات پر حاوی ہے اگر کوئی محض عبادت اور ذکر کا حق ادا کرے اور ان حقوق کو ادا نہ کرے جو بیوی بچوں باپ ماں بھائی بہنوں اور قرابت داروں پڑوسیوں وغیرہ کے لئے حق تعالیٰ نے واجب کئے ہیں تو یقیناً اس کو صوفی نہ کہا جاوے گا اگر کسی کو ان حقوق کے ادا کی ہمت نہ ہو اسے نکاح نہ کرنا چاہیئے، بستی میں رہنا بھی نہ چاہیئے، سب سے الگ کسی پہاڑ یا جنگل میں رہنا چاہیئے بشرطیکہ والدین اسی طرح دوسرے قرابت داروں میں سے کسی کا نفقہ اس کے ذمہ شرعاً واجب ہو یا واجب ہو اور اس نے ان کو بقدر نفقہ جائداد وغیرہ دیدی ہو یا انہوں نے اپنے حق سے اس کو سبکدوش کر دیا ہو کیونکہ عزلت و خلوت بھی ہر شخص کو جائز نہیں صرف اسی کو جائز ہے جس کے ذمہ اہل حقوق کے حقوق واجب ہوں خوب سمجھ لو۔

باب پنجاہ و دوم ۵۲

حدیث

التبکیر والتبرید بالصلوٰۃ

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے تھے کہ جب سخت سردی ہوتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس نماز کو اول پڑھتے اور جب سخت گرمی ہوتی تو اس نماز کو ٹھنڈے وقت میں پڑھتے تھے۔ مراد جمعہ کی نماز ہے۔

شرح ظاہر حدیث تو یہ ہے کہ سردی کی نماز میں جمعہ اور ظہر کی نماز اول وقت پڑھنا چاہیئے اور گرمی کے زمانہ میں دیر سے پڑھنا چاہیئے۔ اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۹۷) **اسباب تشویش کو زائل کرنا چاہیئے** اس نماز کو سردی میں اول وقت اور گرمی میں دیر سے پڑھنے میں کیا حکمت ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ یہ حکم تعبدی ہے قیاس و عقل کو اس میں دخل نہیں تو گفتگو کی ضرورت نہیں اور اگر کہا جائے کہ یہ حکم معقول المعنی ہے جس میں قیاس و عقل کو دخل ہے تو اس میں حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو مومنین کے لئے سراپا رحمت بنا کر بھیجا ہے چنانچہ آپ کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ بالمؤمنین رؤف رحیم کہ آپ مؤمنین پر بہت شفقت کرنے والے بڑے مہربان ہیں تو جس چیز میں مسلمانوں کو ذرا بھی اذیت اور تشویش ہوتی تھی آپ اس کو زائل کر دیا کرتے تھے چونکہ سخت سردی سے ان کو تکلیف ہوتی تھی خصوصاً اصحاب صفہ کو کیونکہ ان کی اور ان کے سوا دوسرے صحابہ میں سے بھی بعض کی غالب حالت یہ تھی کہ ان کے پاس کپڑے کم تھے تو آپ جمعہ اور ظہر کی نماز سویرے پڑھتے تھے کہ دیر سے پڑھنے میں ان کو سردی سے تکلیف ہوتی تھی اور سردی کا عذر بہت سخت ہے جیسا دوپہر کی گرمی کا عذر بھی سخت ہے اسی لئے گرمی میں آپ اس نماز کو دیر سے پڑھتے تھے، کیونکہ گرمی سے بھی بہت تکلیف ہوتی ہے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ جس چیز سے انسان کو نماز میں تشویش و پریشانی ہو اس کو زائل کر دینا چاہیئے کہ اس سے نماز اچھی طرح ادا ہوتی ہے۔ تشویش کے ساتھ نہ خشوع ہو سکتا ہے نہ حضور قلب۔

عبادت میں خشوع اور حضور قلب سب سے بڑا مطلوب ہے،

اور نماز میں نمازی سے جن امور کا مطالبہ کیا گیا ہے ان میں یہی دو چیزیں سب سے بڑی ہیں۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

لا یصلی أحدکم وھو یدافع الاخبثین

کوئی شخص اس حالت میں نماز نہ پڑھے کہ وہ پیشاب یا پاخانہ کو دبا دیتا ہو۔

کیونکہ اس حالت میں خشوع اور حضور قلب نصیب نہ ہوگا۔ ساری توجہ پیشاب پاخانہ کے دبانے میں صرف ہوگی۔

قولہ فی الوجہ الثانی ھنا بحث وھو ما الحکمۃ فی التبکیر بھا الی قولہ فی الوجہ الثالث لا یصلی احدکم وھو یدافع الاخبثین

(۱۹۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع جملہ امور میں کیا جائے عبادات میں بھی عادات میں بھی

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین میں اپنی رائے اور فہم سے بھی بعض امور مشروع کرتے تھے اور اس پر بھی امت کو اسی طرح عمل کرنا واجب ہے جیسا وحی ظاہر پر یہ اس سے سمجھا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نماز کو مقدم کیا ہے کبھی مؤخر اور یہ نہیں بتلایا کہ آپ نے وحی نازل ہونے کی وجہ سے ایسا کیا ہے حالانکہ آپ جب کوئی کام یا کوئی امر وحی سے کرتے تھے تو پہلے اس کی خبر دے دیا کرتے تھے کہ مجھ پر اس معاملہ میں یہ وحی نازل ہوئی ہے۔ اس میں ان لوگوں کی دلیل ہے جو قول خداوندی لتحکم بین الناس بما اراک اللہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ بما اراک اللہ کے عموم میں وہ تمام امور مراد ہیں جو آپ کے دل میں بطور خاطر کے آتے یا آپ ان کو مصلحت سمجھتے۔ اگرچہ ان کے متعلق وحی نازل نہ ہوتی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبادت کے طور پر جو کچھ بھی کرتے تھے وہ سب وحی کے قبیل سے ہے خواہ بواسطہ ہو کہ فرشتہ اس حکم کو لے کر آیا ہو یا وحی الہام کے ذریعہ بلا واسطہ ہو۔

اتباع سنت ہی افضل اعمال ہے

اسی لئے اہل توفیق و اہل تحقیق کا اس پر اتفاق ہے کہ ہر کام میں اتباع سنت افضل اعمال ہے اور یہی تقرب خداوندی کا بڑا ذریعہ ہے۔ اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس

ارشاد سے ہوتی ہے۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ

فرما دیجئے کہ اے لوگو اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو یا محبت الٰہی کی دولت حاصل کرنا چاہتے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تم سے محبت کریں گے۔

اس میں مطلقاً اتباع کا حکم ہے یہ نہیں کہا گیا کہ جن امور کے متعلق صراحتہً وحی نازل ہوئی ہو ان میں ہی میرا اتباع کرو پس حضور کی سنت کا اتباع ہر حال میں موجب قرب اور سبب محبوبیت ہے خواہ آپ نے وحی کے بعد عمل کیا ہو یا اپنی رائے سے عمل کیا ہو کیونکہ آپ کی رائے بھی اللہ تعالیٰ کی تقریر کے بعد وحی میں داخل ہے۔

قولہ الوجہ الخامس فیہ دلیل علی ان سیدنا صلی اللہ علیہ وسلم یشرع من الامور فی الدین الیٰ قولہ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ

ف کسی نے ہمارے اکابر میں ایک بزرگ سے جن کا نام یاد نہیں رہا سوال کیا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ کے سلسلہ میں ذاکرین شاغلین کو جلدی کامیابی کیوں ہوتی ہے۔ دوسرے سلسلہ والوں کو اتنی جلدی کامیابی نہیں ہوتی فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت حاجی صاحب کے سلسلہ میں اتباع سنت کا اہتمام زیادہ ہے اور اتباع سنت کا خاصہ ہے کہ اس سے جذب الٰہی جلد ہوتا ہے اھ کیونکہ متبع سنت محبوب حق بن جاتا ہے جیسا ارشاد ہے قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ اور محبت کے لئے جذب لازم ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو جذب کیا جاتا ہے اور نسبت باطنہ اسی قدر جلد حاصل ہوتی ہے جس قدر جلد جذب غیبی عطا ہو جائے اور یہ دولت اتباع سنت سے جلدی حاصل ہوتی ہے اتباع سنت کے ساتھ عمل قلیل

بھی کافی ہو جاتا ہے اور بدون اتباع سنت کے بڑے بڑے مجاہدے بھی بیکار ہو جاتے ہیں خوب سمجھ لو۔

ہم نے اپنے اکابر کو دیکھا ہے کہ بعض کو انہوں نے صرف بارہ تسبیح کی تعلیم دی بعض کو صرف دو سو بار لا الہ الا اللہ اور دو ہزار مرتبہ اللہ اللہ کی تعلیم دی بعض کو صرف پانچ سو مرتبہ لا الہ الا اللہ کا ذکر بتلایا اور بحمد اللہ اسی عمل قلیل سے یہ لوگ کامیاب اور جلد نسبت مع اللہ کی دولت سے مالا مال ہو گئے کیونکہ ذکر کے ساتھ ان کو اتباع سنت کی بھی تعلیم دی جاتی ہے کہ وضو اور استنجا اور نماز کے تمام آداب سنت کے موافق بجا لائیں نشست و برخاست بیداری اور نیند میں ادعیہ ماثورہ کی پابندی کریں جو اوقات مختلفہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں مسلمانوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آئیں ہر مسلمان کی عزت و حرمت کو اپنی عزت و حرمت سے زیادہ سمجھیں دل آزاری اور دل شکنی سے پرہیز کریں جملہ اہل حقوق کے حقوق ادا کریں اور جو ادا نہ ہو سکیں ان سے معافی طلب کریں نماز روزہ وغیرہ اور جو واجبات و فرائض قضا ہو گئے ہیں ان کو ادا کریں کسی کا قرض ادا نہ کیا ہو اس کو جلد ادا کریں وغیرہ وغیرہ نماز با جماعت ادا کریں اس کا اہتمام کریں کہ تکبیر اولیٰ فوت نہ ہونے پائے، اگر کبھی عذر کی وجہ سے مسجد میں نہ جا سکیں تو گھر پر گھر والوں کے ساتھ ہی جماعت سے نماز پڑھیں اسی طرح جملہ اعمال میں اتباع سنت کا پورا اہتمام کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اتباع سنت کے اہتمام کی وجہ سے اس شخص کو دوام ذکر کی توفیق ہو جاتی ہے ہر وقت سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد دل میں تازہ رہتی اور یہی دھن رہتی ہے کہ اس وقت اور اس حالت کے متعلق آپ کی سنت کیا ہے؟ جب اس طرح ذکر رسول دل پر غالب ہو گیا تو محبت رسول کا بھی دل پر غلبہ ہوتا ہے اور محبت رسول کا وسیلہ محبت و معرفت الٰہیہ ہونا ظاہر ہے، اس کے بعد تھوڑا سا ذکر

نفی اثبات اور ذکر اسم ذات بھی حصول نسبت مع اللہ کے لئے کافی ہوجاتا ہے جس کے ساتھ کبھی ذکر پاس انفاس کا اضافہ بھی کردیا جاتا ہے، کبھی ذکر قلبی بتلا دیا جاتا ہے کبھی کوئی مراقبہ حسب حال تجویز کردیا جاتا ہے زیادہ مجاہدات و ریاضات کی ضرورت نہیں ہوتی۔

(۱۹۹) نماز میں فراغ قلب مطلوب ہے

حدیث میں اسکی بھی دلیل ہے کہ نماز میں دل کا یکسو و فارغ کرنا مطلوب ہے کیونکہ وہ اللہ عزوجل کا گھر ہے۔ یہ اضافت تشریفیا ایسی ہے جیسا کعبہ کو بیت اللہ کہا جاتا ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ مکان سے پاک ہیں مطلب یہ ہے کہ مومن کا دل اللہ کے انوار و تجلیات کا محل ہے۔ یہ اس سے مفہوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سردی اور گرمی کی شدت کا لحاظ فرماتے تھے جو یقیناً دل تک بھی پہنچتی اور اس میں تشویش پیدا کرتی ہے۔ یہاں تک کہ آدمی اس میں مشغول ہوکر اس کام سے رہ جاتا ہے جس کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح جو چیز بھی مشغول اور مشوش کرنے والی ہو خواہ کسی قسم کی ہو اسکی ساتھ یہی معاملہ کرنا چاہئے۔

دنیا سے زیادہ موجب تشویش کوئی چیز نہیں

اسی لئے اہل توفیق تو دنیا ہی سے الگ ہوگئے کیونکہ ان سے زیادہ موجب تشویش کوئی چیز نہیں اسی وجہ سے انہوں نے نفسانی خواہشوں اور مناصب حکومت کی طلب کو بھی بالائے طاق رکھ دیا کیونکہ یہ بھی بڑی تشویش کا باعث ہیں۔

اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے

یا ایہا الذین آمنوا لا تقربوا الصلوۃ وانتم سکاریٰ

اے ایمان والو! تم نماز کے قریب مت جاؤ اس حالت میں کہ تم نشہ سے مست ہو۔

اہل توفیق نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے سکاریٰ من حب الدنیا کہ حب دنیا کے نشہ سے مست ہوکر نماز کے قریب نہ جاؤ۔ بلکہ اس نشہ کو دور کرکے نماز شروع کرو۔

علم اعتبار اور تفسیر بالرائے میں فرق

اور یہ تفسیر بطور علم اعتبار کے ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کے مدلول حقیقی کے ساتھ بطور قیاس کے دوسری چیز کو بھی شامل کیا جاتا ہے چنانچہ یہاں مدلول حقیقی تو یہ ہے کہ شراب کے نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھنا چاہئے اہل توفیق نے حب دنیا کے نشہ کو بھی مدلول حقیقی کے ساتھ قیاساً شامل کردیا کیونکہ یہ نشہ بھی نماز میں حضور قلب سے مانع ہے جیسا شراب کا نشہ مانع ہے، پس صوفیہ کا علم اعتبار زنادقہ اور باطنیہ کی تفسیر بالرائے سے بالکل جدا ہے کیونکہ وہ لوگ تو قرآن کے مدلول حقیقی کی نفی کرکے دوسرا مدلول اپنی طرف سے بیان کرتے ہیں اور یہ سراسر قرآن کی تحریف ہے جو حرام اور قریب بکفر ہے اور صوفیہ مدلول حقیقی کی نفی نہیں کرتے بلکہ اس کو باقی رکھ کر دوسری اشیاء کو قیاساً اس کے ساتھ شامل کرتے ہیں جیسا فقہا قیاس سے اصل قرآنی کے ساتھ بہت سی فروع کو ملحق کیا کرتے ہیں۔ خوب سمجھ لو۔

قولہ الوجہ السادس فیہ دلیل علی ان المطلوب فی الصلوۃ اخلاء القلب الی قولہ سکاریٰ من حب الدنیا۔

(۲۰۰) تشویش قلیل کی پرواہ نہ کی جائے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ

تشویش قلیل ہو تو اس کی پرواہ نہ کی جائیگی کیونکہ اس سے بجز خواص کے کون بچا ہوا ہے اور خواص تو تھوڑے ہی ہیں۔ یہ اس سے مفہوم ہوا کہ صحابی نے سردی اور گرمی کو شدت سے موصوف کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سردی اور گرمی کی شدت میں نماز کو مقدم یا مؤخر کرتے تھے تھوڑی سی گرمی یا سردی میں ایسا نہ کرتے تھے تو جب گرمی یا سردی زیادہ نہ ہو بلکہ قلیل ہو اس وقت بھی کچھ تکلیف تو ضرور ہوتی ہے کیونکہ طبیعت بشریت کمزور ہی بنائی گئی ہے اور کمزور پر قدرتی طور سے ہر چیز کا اثر ہوتا ہے مگر قدر قلیل تکلیف یا تاثر کا اعتبار نہیں کیا گیا۔ اسی لئے علماء نے فرمایا ہے کہ اگر پیشاب پاخانہ کا دباؤ تھوڑا ہو جس سے خشوع فوت نہ ہو تو نماز بلا کراہت جائز ہے۔

قوله الوجه السابع فيه دليل على انه اذا كان
التشويش يسيرا لايبالى به الى قوله فالصلوة جائزة

ف یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو گئی جو ذکر و شغل کے لئے دل کی پوری یکسوئی کے طالب رہا کرتے ہیں اور جب تک پوری یکسوئی حاصل نہ ہو ذکر و شغل ہی کو ترک کئے رہتے ہیں ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ پوری یکسوئی بجز خواص کے کسی کو حاصل نہیں ہوتی تھوڑی بہت پریشانی ہر شخص کو رہا کرتی ہے اس کے دفع کا انتظار کرنا اور اس انتظار میں کام کو موقوف رکھنا عمر کو ضائع و برباد کرنا ہے بلکہ فراغ قلب کا صحیح راستہ یہ ہے کہ پریشانی کی حالت ہی میں ذکر اللہ و اعمال و طاعات میں مشغول ہو جائے اس کی برکت ہی سے جلد فراغ قلب حاصل ہو جائے گا۔ مولانا فرماتے ہیں

؎

گر گریزی بر امید راحتے ہم ازاں جا پیشت آید آفتے
ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

(۱-۱) مصلحت عامہ کی رعایت مصلحت خاصہ سے مقدم ہے

حدیث سے مصلحت عامہ کی رعایت کا امر بھی معلوم ہوا کیونکہ یہ گرمی اور سردی کی شدت کا لحاظ اسی لئے کیا گیا کہ بعض لوگ اس کلفت کا تحمل نہیں کر سکتے یا کم کر سکتے ہیں ورنہ بالیقین بعض ایسے بھی ہیں جو اس کا تحمل کر سکتے ہیں بلکہ اس سے خوش ہوتے ہیں کیونکہ اس میں ان کو ثواب ملتا ہے کہ عبادت میں ثواب بقدر تعب ہی کے ہوتا ہے اور تعب سے اس لئے ثواب ملتا ہے کہ تعب کے ساتھ عبادت کرنا مجاہدہ ہے۔ اسی لئے بعض متعبدین گرمی کے زمانہ میں اپنی نماز کا معمول گھر کے اندر ادا کرتے ہیں اور جاڑے میں گھر کی چھت پر تاکہ مجاہدہ کا ثواب ملے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں ۔

والذين جاهدوا فينا لنهدينهم سبلنا
اور جو لوگ ہمارے واسطے مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستوں
کی ہدایت کر دیتے ہیں۔

اس پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان خواص کی رعایت نہیں کی بلکہ عام لوگوں کی رعایت کر کے سب کو ایک ہی طریق پر چلایا اور بعض کا ثواب اس لئے کم کر دیا کہ دوسروں کی نماز ہی اس تشویش کی وجہ سے نہ ہوتی جو گرمی یا سردی کی شدت سے ان کو پہنچتی یا ان کو کوئی ایسا مرض لاحق ہو جاتا جو بہت سی نمازوں کی جماعت میں آنے سے مانع ہو جاتا۔ مگر مصلحت عامہ کی رعایت میں یہ شرط ہے کہ دو فریق میں سے ایک کی رعایت کرنے سے دوسرے فریق کے دین میں خلل واقع نہ ہو چنانچہ یہاں ایسا ہی ہے کہ ایک فریق کے زیادہ ثواب کو اس وقت کم کیا گیا جبکہ اس کا فرض پوری طرح ادا ہو گیا۔ ایک کی

رعایت سے دوسرے کے فرض کو ناقص نہیں کیا گیا۔

قولہ الوجہ الثامن فیہ دلیل علی الامر بالنظر
لمصلحۃ العامۃ الی قولہ بعد ما کمل لہ فرضہ

ف تعب برداشت کرنا مطلقاً مجاہدہ نہیں بلکہ اس میں تفصیل ہے

حضرت شارح کے کلام سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک مطلقاً تعب برداشت کرنا مجاہدہ اور موجب زیادت اجر ہے مگر محققین کے نزدیک یہ حکم مطلق نہیں بلکہ مقاصد کے ساتھ مخصوص ہے قالہ سیدی حکیم الامت دام مجدہ طرق و وسائل میں بلا ضرورت قصداً تعب برداشت کرنا نہ مجاہدہ ہے نہ موجب اجر مثلاً کنواں نزدیک ہے اور دریا دور ہے کنویں کے پانی سے وضو کرنے میں تعب نہیں اور دریا پر جا کر وضو کرنے میں تعب ہے تو کنویں کو چھوڑ کر دریا پر جانا مجاہدہ اور موجب ثواب نہ ہوگا۔ ہاں اگر کنویں کی پاکی ناپاکی پر شبہ ہو تو اس وقت بے شک دریا سے وضو کرنے میں زیادہ ثواب ہوگا کیونکہ اس صورت میں تحمل تعب بلا وجہ نہیں بلکہ معقول وجہ سے ہے اسی طرح اگر مسجد کے حمام میں سردی کے زمانہ میں گرم پانی موجود ہو اور حوض میں ٹھنڈا پانی بھی موجود ہے تو گرم پانی چھوڑ کر حوض سے وضو کرنا مجاہدہ اور ثواب نہیں کہ بلا وجہ نفس کو تکلیف دینا ہے، البتہ اگر گرم پانی موجود نہ ہو اہتمام کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے مگر اس اہتمام میں نماز باجماعت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہے تو اس حالت میں ٹھنڈے پانی سے وضو اور غسل کرنا مجاہدہ ہے جس سے ثواب زیادہ ملے گا بشرطیکہ ٹھنڈے پانی سے بیمار پڑ جانے کا اندیشہ نہ ہو یہ تو وسائل اور طرق میں تعب برداشت کرنے کا حکم تھا اور مقاصد میں تعب برداشت کرنا مطلقاً موجب ثواب ہے مثلاً نماز کو طویل قرأت اور طویل رکوع و سجود سے ادا کرنا ہر حال میں مجاہدہ اور باعث ثواب ہے جبکہ تنہا نماز پڑھ رہا ہو کیونکہ جماعت میں امام کو تخفیف صلوۃ کا حکم ہے۔ اسی طرح فرض نماز کو جماعت سے ادا کرنا مجاہدہ اور موجب اجر ہے گو جماعت سے ادا کرنے میں تعب ہوتا ہو بشرطیکہ تعب تحمل سے زیادہ نہ ہو اور دوسروں کی پریشانی کا سبب بھی نہ ہو کیونکہ یہ امور مقاصد میں سے ہیں طرق و وسائل میں سے نہیں۔ اب سمجھو کہ حنفیہ کے نزدیک نماز کو اول وقت میں ادا کرنا مقاصد میں سے نہیں بلکہ مباحات میں سے ہے پس محض نفس کو تعب میں ڈالنے کے لئے گرمی کے موسم میں اول وقت ظہر کی نماز ادا کرنا مجاہدہ یا موجب اجر نہ ہوگا کہ بلا وجہ تعب برداشت کرنے کا نام مجاہدہ نہیں البتہ جن علماء کے نزدیک ہر نماز کو اول وقت میں ادا کرنا افضل ہے جیسا شافعیہ کا مذہب مشہور ہے ان کے نزدیک گرمی کے موسم میں ظہر کی نماز کا اول وقت میں ادا کرنا مجاہدہ ہوگا۔ پس اگر مالکیہ کا مذہب اس باب میں شافعیہ کے موافق ہے جب تو شارح کا کلام اہل تحقیق کے موافق ہے اور اگر ان کا مذہب اس باب میں حنفیہ کے موافق ہے تو یہ کلام اہل تحقیق کے خلاف ہے اور جب حنفیہ کے نزدیک گرمی کے زمانہ میں ظہر کی نماز ٹھنڈے وقت پڑھنا ہی افضل ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نماز کو مؤخر کرکے کسی کا ثواب کم نہیں کیا بلکہ سب کے ثواب کو زیادہ ہی کیا ہے کیونکہ اس صورت میں اگر کوئی اپنے نفس کو تعب میں ڈالنے کے لئے ظہر کی نماز اول وقت میں پڑھنا چاہے تو حنفیہ اس کے فعل کو مجاہدہ میں داخل نہ کریں گے نہ زیادت ثواب کا سبب سمجھیں گے فافہم، واللہ تعالیٰ اعلم۔

اسی طرح بعض متعبدین کا گرمی کے زمانہ میں گھر کے اندر اور سردی

میں کھلی چھت پر نماز پڑھنا بھی مجاہدہ موجب ثواب نہیں کیونکہ وسائل میں بلا ضرورت تعب برداشت کرنا مجاہدہ نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بطور علاج کے ایسا کیا ہوگا ثواب کی نیت سے نہ کیا ہوگا۔

(۱۰۲) مستحبات کا اسی قدر اہتمام کیا جائے جس سے دوسروں کے فرض میں خلل واقع نہ ہو

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عبادت میں قدر واجب سے زائد مستحبات وغیرہ کو اس وقت اختیار کیا جائے گا جبکہ اس سے دوسروں کے فرض میں نقصان نہ آئے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری تقریر کے موافق بعض حضرات کو زیادہ ثواب سے اسی وجہ سے محروم کیا تھا کہ سخت گرمی میں نماز پڑھنے سے دوسروں کے فرض میں نقصان آتا تھا۔

قولہ الوجہ التاسع فیہ دلیل علی انہ لا یؤخذ

مازاد علی الواجب الی قولہ الا من اجل نقص فرض الغیر

ف۔ بعض لوگ اپنے معمولات و وظائف کے ایسے پابند ہوتے ہیں کہ رفقاء کی پریشانی کی بھی پروا نہیں کرتے مثلاً سفر میں ریل کے وقت کی بھی رعایت نہیں کرتے۔ ریل چھوٹے یا ملے وہ بدون وظیفہ پورا کئے نہیں رہتے تو اگر ایسا شخص تنہا سفر کر رہا ہو اس کو اختیار ہے اور اگر رفقاء کے ساتھ سفر کر رہا ہو تو ان کی رعایت اپنے معمولات کی رعایت سے مقدم ہے کیونکہ ریل چھوٹ جانے سے سب کو پریشانی ہوگی اور پریشانی سے ان کے فرائض میں خلل واقع ہوگا نماز میں دل جمعی فوت ہو جائے گی اور اجنبی جگہ قیام کرنے سے کھانے پینے سونے میں بھی تکلیف ہوگی۔

جماعت میں سب سے زیادہ کمزور کی رعایت کرنا چاہیے

یہاں سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سیروا بسیر اضعفکم (سب سے زیادہ کمزور کی چال چلا کرو) سفر ہی کیساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر موقع کے لئے عام ہے چنانچہ یہ حدیث بھی اسی قبیل سے ہے کہ جب بعض لوگ گرمی کی تکلیف برداشت نہ کر سکے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کے ساتھ کمزوروں جیسا معاملہ کر کے تخفیف کو اختیار فرمایا اس سے یہ فقہی مسئلہ بھی مستنبط ہوا کہ امام کو اپنی جماعت کے حال پر نظر کرنا چاہیئے اگر ان میں کوئی کمزور یا بیمار یا ضرورت مند ہو تو نماز میں تخفیف کرے کہ اس وقت یہی سنت ہے اور اگر سب قوی (تندرست) معلوم ہوں ایمان میں بھی بدن میں بھی تو ان کے ساتھ افضل طریقہ یعنی عزیمت کو اختیار کرے اور نماز کے جملہ ارکان طویل کر دے۔ غرض ہر شخص کو جس کے متعلق کسی قسم کی ذمہ داری ہو ادنیٰ یا اعلیٰ مناسب یہ ہے کہ اپنے متعلقین کے لئے تمام امور میں چھوٹے ہوں یا بڑے، معمولی ہوں یا غیر معمولی اس حالت پر نظر رکھے جو ان کو آسان ہو اور اس میں بھی کمال مطلوب ہے، ایسی آسانی مطلوب نہیں جس سے کمال فوت ہو جائے۔ اور یہ بات فقہ حال سے میسر آسکتی ہے رفقیہ النفس ہی اس کی رعایت پوری کر سکتا ہے اور فقہ حال جملہ انواع فقہ سے افضل و انفع ہے۔

فقہ حال فقہ کی اعلیٰ قسم ہے

جیسا فقہ نے فرمایا ہے کیونکہ فقہ حال کی حقیقت نورِ فقہ ہے جو فقہ کا خلاصہ ہے اور مغز و روح ہے جیسا نحوی کیلئے تصوف کیونکہ نحو سے مقصود قرآن و حدیث کو صحت کے ساتھ پڑھنا

اور سمجھنا ہے اور پڑھنے سے مقصود عمل ہے اور عمل میں درجۂ کمال مطلوب ہوتا ہے اور تکمیل علم و عمل ہی کا نام تصوف ہے پس تصوف نحو کا خلاصہ اور مغز ہوا صوفیہ کی اصطلاح میں فقہ حال کو مراقبہ اور نگہداشت کہتے ہیں کیونکہ فقیہ الحال ہر وقت اللہ تعالیٰ کے حکم کی نگہداشت کرتا ہے۔

ایک فقیہ الحال کی حکایت

چنانچہ میں نے ایک فقیہ کے متعلق جو واقعی فقیہ تھے سنا ہے کہ جب ان سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تھوڑی دیر سکوت کر کے جواب دیا کرتے اس کی وجہ ان سے پوچھی گئی تو فرمایا میں (اول اس پر غور کرتا ہوں کہ میرے لئے اس وقت کیا مناسب ہے؟ جواب دینا یا عذر کر دینا) اس کے بعد جو مناسب ہوتا ہے اس کے موافق عمل کرتا ہوں، دیکھو ان بزرگ نے فقہ عام، فقہ حال اور مراقبہ تینوں کو کس طرح جمع کر کے دکھا دیا۔ کیونکہ فقہ عام کا مقتضا یہ تھا کہ وقت کا حق ادا کیا جائے۔ مراقبہ کا مقتضا یہ تھا کہ غفلت سے بات نہ کی جائے بلکہ عظمت حق پیش نظر رہے ان بزرگ نے ہر سوال کے بعد تھوڑی دیر سکوت کر کے جواب دینے کی عادت ڈال کر تینوں کو جمع کر لیا۔ درحقیقت فقہا اور علماء یہ حضرات ہیں۔ علماء ظاہر میں جو اہل انصاف ہیں وہ بھی ان کی عظمت و جلالت کا اعتراف کرتے ہیں۔

ایک عالم اور صوفی کی حکایت

چنانچہ میں نے ایک بابرکت صوفی کو دیکھا کہ ایک دن ایک بڑے عالم فقیہ جو فتوی کے لئے مرجع خاص و عام تھے ان سے ملنے آئے اور وہ واقعی فتوی دینے کے اہل تھے مگر سلطنت کے مشیر بھی تھے بادشاہ ان کی عظمت و فضیلت کی وجہ سے بعض اہم معاملات میں ان سے

مشورہ کیا کرتا تھا۔ الغرض یہ عالم فقیہ درویش سے ملنے آئے اور ان سے باتیں کیں پھر اپنے لئے دعا کی درخواست کی کیونکہ ان کی عادت تھی کہ درویشوں کیساتھ تواضع سے پیش آتے اور ان کی دعا کی درخواست کیا کرتے تھے ان بزرگ نے فرمایا بلکہ مناسب یہ ہے کہ آپ میرے لئے دعا کریں کیونکہ آپ مسلمانوں کے علماء و فقہا سے ہیں۔ درویش کا یہ کہنا تھا کہ وہ عالم بے خود ہو گئے زار زار رونے لگے اتنا روئے کہ جان نکلنے کو ہو گئی۔ بار بار یہ کہتے تھے کیا مجھ جیسا آدمی بھی علماء میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

عالم کس وقت عالم ہوتا ہے

حالانکہ عالم بخدا اس وقت تک عالم نہیں ہو سکتا جب تک اس کا ہر سانس اللہ کیساتھ اللہ کے لئے نہ نکلے اور ہم تو بس دین کے ساتھ کھیل رہے ہیں اور کچھ نہیں، مجھے اس عالم کی دینداری سے جو پہلے سے معلوم تھی بہت کچھ امید تھی مگر اس دن کی حالت اور اعتراف و خضوع سے قوی امید ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس کی بدولت آخرت میں مقربین کے درجوں میں بلند فرمائیں گے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے فضل سے وہیں پہنچا دیں کہ ان کے سوا کوئی رب نہیں۔

قولہ الوجہ العاشر فیہ دلیل علی ان قولہ صلی اللہ علیہ وسلم سیروا السیر اضعفکم الی قولہ لا رب سواہ

باب پنجاہ وسوم ۵۳

حدیث

تحیۃ المسجد والامام یخطب

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص جمعہ کے دن اس وقت آیا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے تو آپ نے اس سے فرمایا اے فلاں! کیا تو نے نماز پڑھ لی ہے؟ کہا نہیں! فرمایا کھڑا ہو جا اور نماز پڑھ۔ ایک صحیح روایت میں ہے قال قم فارکع رکعتین وتجوز فیہما، فرمایا کھڑا ہو جا اور دو رکعتیں اختصار کے ساتھ پڑھ لے۔

شرح

خطبہ کیوقت تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم

بظاہر حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جمعہ کے دن خطبے کے وقت تحیۃ المسجد پڑھنا جائز ہے مگر مالکیہ حنفیہ اس سے منع کرتے ہیں کیونکہ دوسری حدیث میں ہے کہ ایک شخص جمعہ کے دن خطبہ کیوقت لوگوں کی گردنوں کو پھلانگتا ہوا مسجد نبوی میں آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا اجلس فقد آذیت، بیٹھ جاؤ تم نے لوگوں کو اذیت دی آپ نے اس کو تحیۃ المسجد کا امر نہیں فرمایا اور حدیث جابر میں جو کہ زیر بحث ہے اس امر کی تصریح نہیں کہ یہ خطبہ نماز جمعہ کا خطبہ تھا (صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ جمعہ کے دن میں تھا) سو ممکن ہے کہ جمعہ کے دن حضور نے کسی اور سبب سے فجر یا عصر کے بعد خطبہ دیا ہو۔ کیونکہ آپ کی عادت تھی کہ جب کوئی مہم درپیش ہوتی لوگوں کو جمع کرانے اور خطبہ دیا کرتے تھے۔ اس احتمال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شخص مذکور سے دریافت فرمایا کیا تو نے نماز پڑھ لی؟ اس نے کہا نہیں تو اگر یہ خطبہ نماز جمعہ کا خطبہ ہوتا تو اس سوال کا موقع نہ تھا کیونکہ جمعہ کی نماز کا وقت بالاتفاق خطبہ کے بعد ہے اس سے پہلے نہیں (اور تحیۃ المسجد واجب یا فرض نہیں جو اس کو دریافت کیا جاتا۔ پس اہل ظاہر کا اسی حدیث سے تحیۃ المسجد کے وجوب پر استدلال کرنا صحیح نہیں کیونکہ یہ تو خود محتمل محتاج بیان ہے) پس ظاہر یہ ہے کہ یہ خطبہ نماز فجر یا عصر کے بعد کسی ضرورت سے تھا اور شخص مذکور مسجد میں داخل ہوتے ہی خطبہ سننے بیٹھ گیا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے بیٹھنے سے شبہ ہوا کہ یہ یا تو فرض نماز پڑھ چکا ہے یا اس کا خیال یہ ہے کہ ابھی تک مسجد میں جماعت نہیں ہوئی خطبے کے بعد نماز ہوگی تو آپ نے دریافت فرمایا کیا تو نے نماز پڑھ لی جب اس نے کہا نہیں فرمایا اٹھو نماز پڑھ لو، یعنی مسجد میں جماعت ہو چکی ہے تم اس خیال میں نہ رہو کہ خطبے کے بعد نماز ہوگی اور چونکہ بعض روایات میں تصریح ہے کہ آپ نے اس کو دو رکعت پڑھنے کا امر دیا اس لئے ظاہر یہ ہے کہ یہ خطبہ نماز فجر کے بعد تھا۔ عصر کے بعد ہوتا تو چار رکعت پڑھنے کا امر فرماتے اور شاید وقت تنگ ہو گیا ہو گا اس لئے صرف دو فرض

پڑھنے کا اور ان میں بھی اختصار کرنے کا حکم دیا واللہ تعالیٰ اعلم مگر مسلم نے اس حدیث کو بایں الفاظ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

من دخل یوم الجمعۃ والامام یخطب فلیرکع رکعتین خفیفتین

جو شخص جمعہ کے دن ایسے وقت آئے گا کہ امام خطبہ دے رہا ہو تو دو رکعتیں ہلکی ہلکی پڑھ لے۔

اور اگر یہ حدیث صحیح ہے[ع] تو بلاشک اس باب میں صریح ہے جسمیں کسی تاویل کا احتمال نہیں۔ اسی وجہ سے مذہب مالک میں اس حدیث کے موافق ایک قول یہ بھی ہے کہ جو شخص جمعہ کے دن خطبہ کے وقت آئے اس کو دو رکعتیں جلدی جلدی پڑھ لینا چاہیئے۔

پس ہم نے اول جو بات کہی ہے وہی حدیث کا ظاہر مفہوم ہے اور دوسری حدیث سے اس کا معارضہ محض متقدمین کے ادب سے ذکر کر دیا گیا کہ انہوں نے دوسری حدیث کو اس کا معارض[ع] بتلایا ہے۔

ع مسلم اور بخاری کی حدیث کے متعلق شارح کا یہ فرمانا کہ اگر یہ صحیح ہے الخ۔ کو واضح کر رہا ہے کہ ان دونوں کتابوں کا صحیح ہونا غالب اور مجموعہ کے اعتبار سے ہے جس میں ایک دو حدیثوں کا ضعیف ہونا کچھ مضر اور قادح نہیں چنانچہ اس حدیث میں دارقطنی نے کلام کیا ہے کہ تمام رواۃ نے اسکو بصورت واقعہ روایت کیا ہے قول عام کی صورت میں بجز ایک راوی کے کسی نے روایت نہیں کیا پس اصول حدیث کے لحاظ سے یہ حدیث ان الفاظ سے شاذ میں داخل ہے ملاحظہ ہو مقدمہ فتح الباری واعلاء السنن اور حدیث شاذ کو صحیح میں شمار نہیں کیا جاتا واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ ظ

ع ورنہ حقیقت میں وہ اسکی معارض نہیں کیونکہ جو لوگ خطبہ کے وقت (باقی اگلے صفحہ پر)

فضیلت سلف کا انکار محض جہل وغباوت ہے

کیونکہ ان کو ہمارے اوپر فضیلت حاصل ہے جس سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں اس کا انکار کرنا محض اپنی غباوت وجہالت کا ثبوت دینا ہے اگرچہ کسی وقت کسی مسئلہ میں متاخر پر بھی ایسی بات منکشف ہو جاتی ہے جو متقدمین پر منکشف نہیں ہوئی مگر اس سے ان کی جلالت منصب وعظمت شان میں کچھ خلل واقع نہیں ہوتا کیونکہ یہ تو محض مولیٰ کریم کی ایک عطا ہے جس سے وہ متاخرین کی اشک شوئی کر دیتے ہیں۔

متاخرین پر بعض علوم کے منکشف ہونے کی حکمت جو سلف پر منکشف نہیں ہوئے

کہ متاخر ہونے کیوجہ سے جوان کا دل شکستہ تھا بعض علوم کے انکشافات سے اس کو جوڑ دیا جاتا ہے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

فلعل بعض من یبلغہ ان یکون اوعی لہ من بعض من سمعہ

کہ شاید بعضے وہ جن کو بعد میں میری حدیث پہنچے گی بعضے سننے والوں سے زیادہ سمجھنے والے ہوں۔

غرض متاخرین کے لئے بھی کچھ حصہ رکھ دیا گیا گو زیادہ حصہ متقدمین ہی کا ہے (اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اس طرح کتاب اللہ اور حدیث نبوی

(حاشیہ صفحہ گذشتہ سے آگے) تحیۃ المسجد کو جائز کہتے ہیں وہ اس کو واجب تو نہیں کہتے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرے شخص کو تحیۃ المسجد کا امر نہ فرمانا اور تخطی رقاب کی وجہ سے جلوس کا حکم دینا عدم جواز تحیۃ المسجد بحالت خطبہ کی دلیل نہیں غایت ما فی الباب عدم وجوب کی دلیل ہوگی جس سے ظاہریہ پر حجت قائم کی جاسکتی ہے شافعیہ پر قائم نہیں کی جاسکتی واللہ اعلم ۱۲ ظ

کے عجائب ہمیشہ باقی رہیں گے ان کے فوائد قیامت تک ختم نہ ہوں گے، ایک فائدہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے قلوب ہر زمانہ میں فتاح علیم کے فضل کی بارشوں کے منتظر رہیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

واتقوا اللہ و یعلمکم اللہ

اللہ سے ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ تم کو خود تعلیم دیں گے

جس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ سے علوم وہبیہ عطا ہوتے ہیں ؎

بینی اندر خود علوم انبیاءؑ بے کتاب بے معید و اوستا

اگر سارے فائدے اور تمام علوم ختم ہو چکے ہوتے تو متاخرین کو اس آیت کے خطاب اور ان احادیث کے معانی سے کچھ بھی فائدہ نہ ہوتا حالانکہ قرآن کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لا تنقضی عجائبہ اس کے عجائب ختم نہیں ہو سکتے ولا یخلق علی کثرۃ الترداد۔ اور بار بار پڑھنے پڑھانے سے کہنہ بھی نہیں ہوتا بلکہ ہر دفعہ ہر وقت تازہ کلام معلوم ہوتا ہے

متاخرین کی وہی تحقیق معتبر ہے جو اجماع سلف کے خلاف نہ ہو

مگر اس جگہ یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ متاخرین پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ فتح و کشف ہوگا وہ اجماع متقدمین کے خلاف نہیں ہو سکتا اگر ایسا ہوا تو اس کو فتح و کشف من اللہ نہ کہا جائیگا بلکہ ابتلاء میں شمار کیا جائے گا۔ بس متاخرین کے علوم کا حاصل یہ ہے کہ یا تو وہ کسی قول ضعیف کو قوی کر دیتے ہیں یا کسی مسئلہ کو متقدمین نے اجماع سے طے کیا تھا متاخرین کو اس کی دلیل کتاب و سنت میں معلوم ہو جاتی ہے یا وہ کسی مسئلہ شرعیہ پر سے اشکال کو حجت قویہ کے ساتھ رفع کر دیتے ہیں جس سے متقدمین نے تعرض نہ کیا تھا خواہ اس لئے کہ ان کے نزدیک اشکال کی کچھ اہمیت نہ تھی کیونکہ شاذ و نادر ہی کسی کو وہ اشکال پیش آتا تھا یا قوت ایمان کی وجہ سے ان کی نظر میں وہ اشکال اشکال ہی نہ تھا بعد میں بوجہ ضعف ایمان اور قلت فہم کے وہ اشکال پہاڑ بن گیا جس کو متاخرین میں سے کسی نے حجت قویہ سے دفع کر دیا اس پر کسی جاہل کا اپنے جہل کی وجہ سے یہ گمان کرنا کہ اس نے ایسی بات کہی ہے جس کی نظیر متقدمین نہیں پیش کر سکے سراسر علم اور علماء سے ناواقفیت کی دلیل ہے جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں۔ اگر متاخرین میں سے کسی کو قواعد شرح کے اقتضاء سے کوئی ایسی بات معلوم ہو جو تمام متقدمین کے خلاف ہے تو اسے اپنے کو متہم سمجھنا چاہیئے نہ متقدمین کو متہم سمجھنے کا اسے حق نہیں کیونکہ ان کی فہم

متاخرین کی فہم سلف کے سامنے یقیناً ناقص ہے

خواہ کتنی ہی کامل ہو پھر بھی یقیناً متقدمین کے مقابلہ میں ناقص ہے۔ دو وجہ سے ایک تو حدیث کی تصریح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم

تمام قرون میں سب سے بہتر قرن میرا ہے پھر وہ جو اس کے بعد ہے پھر وہ جو اس کے بعد ہے۔

اور ظاہر ہے کہ مراد دین کے اعتبار سے خیریت ہے اور دین نام ہے مجموعہ علم و عمل کا۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم و عمل میں متقدمین سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔ پھر اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ متقدمین کا عمل ہمارے زمانہ والوں کے عمل سے زیادہ مستحکم اور پختہ تھا اور اس میں بھی شک نہیں کہ عمل علم کا ثمرہ ہے اور ظاہر ہے کہ جب دو درختوں میں ایک کا پھل اچھا اور زیادہ ہو اور دوسرے کا خراب اور کم ہو تو جس کا پھل عمدہ اور زیادہ ہوگا یقیناً وہ دوسرے سے افضل ہوگا یہ ایسی بدیہی بات ہے جس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا بشرطیکہ اسے بصیرت و عقل سے کچھ حصہ ملا ہو قولہ ظاہر الحدیث یدل علی جواز تحیۃ المسجد الی قولہ فی الوجہ الرابع عند من لہ بصیرۃ وعقل۔

ف۔ اس حدیث کی شرح میں شارح علیہ الرحمۃ نے تصوف کا کوئی مسئلہ بیان نہیں فرمایا مگر متقدمین اور متاخرین کے علوم میں جو فرق بتلایا ہے اور سلف صالح کے ادب و تعظیم کی جس قدر تاکید کی ہے اس کے جاننے کی صوفیہ اور علماء سبھی کو ضرورت ہے اس لئے اس کا ترجمہ کر دیا گیا یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہو گئی جو سلف کی شان میں گستاخی کرتے ہیں اور اپنی علمی یا کشفی تحقیقات کو ان کے علوم سے افضل سمجھتے ہیں ان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ علم وہی معتبر ہے جو عمل محکم کا ثمرہ ہو۔

جس کا عمل مستحکم نہیں اس کا علم بھی مستحکم نہیں

جس کا عمل محکم نہیں اس کا علم بھی مستحکم نہیں اور جس کا علم مستحکم نہیں اسے اپنی تحقیقات کو تحقیقات کہنا زیبا نہیں کمال علم تقویٰ سے حاصل ہوتا ہے واتقوا اللہ ویعلمکم اللہ اور آجکل ویسا تقویٰ کہاں جیسا سلف میں تھا، آجکل یا تو تقویٰ ہی نہیں وہ درد کا معاملہ ہے یا تقویٰ ہے تو اپنے سوا کسی کو متقی نہیں سمجھتے خالص اور صحیح تقویٰ بہت ہی کم ہے اس حالت میں کسی کا اپنے کو محقق یا مجتہد سمجھنا جہالت نہیں تو اور کیا ہے۔

ف عطائے حق کا دروازہ بند نہیں

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عطائے الٰہی کا دروازہ بند نہیں بعض دفعہ اللہ تعالیٰ متاخرین پر وہ علوم منکشف فرما دیتے ہیں جو متقدمین پر منکشف نہیں ہوئے مگر یہ بھی متقدمین ہی کی اتباع کا ثمرہ ہے اگر متاخرین ان کا اتباع نہ کرتے علم کا دروازہ ان کے لئے مفتوح نہ ہوتا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ متاخرین کی علمی یا کشفی تحقیقات اس وقت قابل قبول ہیں جب کہ اجماع سلف کے خلاف نہ ہوں اگر وہ اجماع سلف کے خلاف کوئی تحقیق بیان کریں گے رد کر دی جائے گی اس کو تحقیق علمی نہ کہا جائے گا بلکہ جہل مرکب اور تلبیس ابلیس میں شمار کیا جائیگا۔

سورۃ الفیل کی ایک نئی تفسیر اور اس کا رد

اس کی ایک تازہ نظیر وہ تحقیق ہے جو سورۃ الفیل کی تفسیر میں ابھی ابھی ایک نئے مفسر نے بیان کیا ہے کہ ترمیہم بحجارۃ من سجیل، طیراً کی صفت نہیں نہ ترمی صیغہ مونث غائب بلکہ یہ علیحدہ مستقل جملہ ہے اور ترمی واحد مذکر حاضر ہے جسمیں قریش کو خطاب کیا گیا ہے جیسا الم ترکیف فعل ربک میں بھی قریش ہی کو خطاب ہے پس سورت کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خرق عادت کے طور پر ہاتھی والوں کے لشکر پر پرندوں کی فوج بھیج دی تھی جن کے پنجوں اور چونچوں میں کنکر کی پتھریاں تھیں پرندوں نے یہ پتھریاں ہاتھی والوں پر برسائیں تو ان کا بھرکس نکل گیا بلکہ مطلب ہے کہ ابرہہ قریش کا دشمن تھا وہ مکہ پر اپنی لشکر کشی کو مکہ والوں سے چھپانا چاہتا تھا مگر یہ راز مخفی نہ رہ سکا کیونکہ قاعدہ ہے کہ لاش خور پرندے جنگی لشکروں کے ساتھ اس امید پر ہو لیا کرتے ہیں کہ اب ہم کو آذوقہ ملیگا۔ الم یجعل کیدہم فی تضلیل کا یہ مطلب ہوا کہ لاش خور پرندوں کو دیکھ کر مکہ والے لشکر کی آمد سے خبردار ہو گئے اور زمین کی مخفی تدبیر کا راز آسمان کے پرندوں نے کھول دیا قریش مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے ان کے پاس سوا پتھروں اور کنکروں کے اور کیا تھا قریش نے پتھر برسانے شروع کئے یہ پتھراؤ ایسا عجیب غریب تھا کہ اس کے سامنے ابرہہ کے لشکر والوں کی ڈھالیں بھی بیکار ہو گئیں اور وہ ان پتھروں کا جواب تیر بازی سے دینا بھی بھول گئے دم کے دم میں تمام لشکر کا گھوڑوں ہاتھیوں سمیت بھرکس نکل گیا نہ کوئی نام لیوا رہا نہ پانی دیوا۔ یہ واقعہ اللہ تعالیٰ نے قریش کو یاد دلا کر بتایا ہے کہ تم اسلام لانے میں یہ اندیشہ نہ کرو کہ ارد گرد کی طاقتیں تم پر ہجوم کر آئیں گی اور تم کو کچل ڈالیں گی کیونکہ کل ہی کا واقعہ ہے

کہ تم نے ابرہہ کے لشکر پر ایسا پتھراؤ کیا کہ اس کا بھرکس نکال دیا تھا بس تمہارا یہ پتھراؤ سلامت رہے پھر تم کو کسی طاقت کا کیا اندیشہ؟

دیکھا آپ نے آج کل کے نئے مفسروں کی تحقیقات کو واقعی وہ قرآن میں ایسی موشگافیاں کرتے ہیں کہ سلف کے فرشتوں کو بھی ان کی ہوا نہ لگی ہو ان بیچاروں کو ایسی نئی تحقیق کہاں سوجھ سکتی تھی کہ قریش کے پتھراؤ سے بھی لشکروں کا ہاتھیوں سمیت صفایا ہو سکتا ہے پھر نہ معلوم قریش اپنے اس پتھراؤ کو ابرہہ کے بعد کسی اور لشکر کے مقابلہ میں استعمال کر کے کیوں نہ کامیاب ہوئے۔ اور ابرہہ کے لشکر کیساتھ والے یہ لاش خور پرندے بھی فتح مکہ کے وقت کہاں مر گئے تھے کہ مکہ والوں کو لشکر مدینہ کا اس وقت تک علم نہ ہوا جب تک وہ بالکل محصور نہ ہو گئے، نہ خیبر کے یہودیوں کو ان لاش خوروں نے لشکر اسلام کی آمد سے خبردار کیا کہ صبح کو اسلامی لشکر خیبر میں داخل ہوا اور بستی والے جالی کدال لے کر جنگل جانے کا ارادہ کر رہے تھے دفعتہً سامنے سے لشکر کو دیکھا تو محمد والخمیس کہتے ہوئے قلعے کی طرف بھاگے۔

اس مفسر کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ قرآن کی تفسیر نہیں بلکہ اپنے جہل کی تعبیر ہے اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ متاخرین کی تحقیقات وہی قبول کی جا سکتی ہے جو اجماع سلف کے خلاف نہ ہوں اور سورۃ الفیل کی یہ جدید تفسیر اجماع سلف کے بالکل خلاف ہے آج تک کسی صحابی یا تابعی یا تبع تابعی یا معتبر مفسر سے بہ سند معتبر یہ تفسیر منقول نہیں دیکھی گئی کہ ترمیہم "طیراً" کی صفت نہیں بلکہ صیغہ واحد مذکر حاضر ہے اور اس کے مخاطب قریش یا اہل مکہ ہیں اور نہ تاریخ سے اس کا ثبوت مل سکتا ہے کہ لاش خور پرندے بھی

ہی سے ابرہہ کے لشکر کے ساتھ ہو لیئے تھے نہ اس کا کوئی ثبوت ہے کہ ابرہہ نے اپنی لشکر کشی کو مخفی رکھنے کی کوشش کی تھی جس کا راز فاش کرنے کے لیئے لاش خور پرندوں کو لشکر کے ساتھ چلنے کی ضرورت تھی نہ اس کا کوئی ثبوت ہے کہ قریش نے ابرہہ کے لشکر کا سنگباری کے ساتھ مقابلہ کیا تھا اور اپنے پتھراؤ سے ہاتھیوں سمیت تمام فوج کا ستھراؤ کر دیا تھا نہ اس کا کوئی ثبوت ہے کہ قریش کو اسلام سے یہ اندیشہ مانع تھا کہ ارد گرد کی طاقتیں ان پر ہجوم کر دیں گی۔ تقلید آباء و موت اصنام مانع اسلام نہ تھی اس مفسر نے کس طرح اپنی طرف سے بلا دلیل مقدمات بنا کر کھڑے کیئے اور خود ساختہ بنیاد پر کلام الٰہی کی تفسیر کی عمارت قائم کرنے کی بیہودہ کوشش کی ہے پس یہ تفسیر جس طرح اجماع سلف کے خلاف ہے اسی طرح تاریخ کے بھی خلاف ہے اس جگہ زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں اجمالی اشارہ کر دیا گیا تاکہ ناظرین آجکل کی ایسی نئی نئی تفسیروں سے ہوشیار رہیں ان کو علامہ ابن ابی جمرہ کا یہ ارشاد ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ متاخرین کی وہی تحقیقات معتبر ہیں جو اجماع سلف کیخلاف نہ ہوں اس کلیہ کو نصب العین بنانے کے بعد کسی محقق کی نئی تحقیقات سے ان کے ایمان کو ضرر نہ ہوگا۔

ف شیخ کو طالبین کی نگہداشت کرنا چاہیئے

اس حدیث سے تصوف کا یہ مسئلہ مستنبط ہو سکتا ہے کہ شیخ کو اپنے مریدوں شاگردوں کے احوال کی نگہداشت کرنا چاہیئے اگر کسی کے متعلق یہ شبہ ہو کہ اس نے کسی فرض یا واجب یا سنت میں کوتاہی کی ہے تو اول اس سے دریافت کیا جائے اگر وہ اقرار کرے تو اس کو ادائے

فرض و واجب وغیرہ میں تعجیل کی تاکید کی جائے۔

ف تفحص احوال کیلئے سلسلۂ کلام قطع کرنا جائز ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شیخ کو تفحص احوال کیلئے اپنی گفتگو اور تقریر یا خطبہ کے سلسلہ کو قطع کر کے اس شخص کیطرف متوجہ ہونا جس سے کہ متعلق تقصیر کا شبہ ہوا ہے جائز ہے مگر تفحص و تحقیق میں نرمی سے کام لینا اور خود صاحب معاملہ سے معاملہ کی تحقیق کرنا چاہیئے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس واقعہ میں ثابت ہے واللہ تعالیٰ اعلم

۵۴
باب پنجاہ وچہارم

حدیث

دعاء رسول صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک سال لوگوں کو قحط کا سامنا ہوا تو ایک اعرابی جمعہ کے دن جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے کھڑا ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ مال تباہ و برباد ہو گیا اور اہل و عیال بھوکے ہو گئے آپ اللہ تعالیٰ سے ہمارے لئے دعا کیجئے تو آپ نے خطبہ ہی میں اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اس وقت آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نظر نہ آتا تھا پس قسم ہے اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے حضور نے ابھی تک اپنے دونوں ہاتھ پست نہیں کئے تھے کہ بادل پہاڑوں کی طرح اٹھا، آپ ممبر سے نیچے نہیں اترے تھے کہ میں نے بارش کے قطرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک سے ٹپکتے ہوئے دیکھا اتنی بارش ہوئی کہ مسجد کی چھت ٹپکنے لگی، اس دن میں برابر بارش ہوتی رہی پھر اس سے اگلے دن بھی اور اس کے بعد والے دن میں بھی، اس کے بعد بھی دوسرے جمعہ تک بارش کا سلسلہ بند نہ ہوا، پھر وہی اعرابی یا اور کوئی دوسرے جمعہ کے خطبہ میں کھڑا ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ مال غرق ہو گیا عمارتیں گرنے

لگیں ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے تو حضورؐ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور فرمایا اے اللہ ہمارے ارد گرد بارش ہو اور ہمارے اوپر نہ ہو پھر اپنے ہاتھ سے جس طرف بادل کو اشارہ کیا اس طرف سے کھل گیا اور مدینہ مثل چاک گریبان کے ہو گیا کہ مدینہ کے اندر آسمان کھلا ہوا تھا اور چاروں طرف بادل گھرا ہوا تھا مہینہ بھر تک جنگل بارش کے پانی سے بہتا رہا اور جس سمت سے بھی کوئی آتا تھا بارش کی خبر لاتا تھا۔

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ امام سے خطبہ کے درمیان کسی ضروری امر کے لئے گفتگو کرنا جائز ہے اور امام اس کا جواب بھی دے سکتا ہے اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۰۴) حدیث سے معلوم ہوا کہ مشکلات حوادث میں مقبولان الٰہی سے دعا کی درخواست کرنا چاہیئے اور طلب دعا سے پہلے اپنا حال بھی بیان کرنا چاہیئے جیسا اس اعرابی نے کیا کہ اول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہوا کیونکہ بالاجماع آپ سب مقبولان الٰہی سے افضل ہیں آپ کی زندگی میں آپ کے سوا مہمات میں کسی کی طرف بھی رجوع نہ کیا جاتا تھا۔ اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بارش کی احتیاج کے وقت جب استسقاً کے لئے بستی سے باہر نکلتے تو حضرت عباسؓ سے فرماتے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تو حضور کے واسطہ سے بارش کی دعا کیا کرتے تھے اب آپ کے وسیلہ سے دعا کریں گے کیونکہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں اور سب سے قریب تر ہیں پھر اعرابی نے طلب دعا سے پہلے پریشانی کا حال بیان کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر انکار نہیں فرمایا اس میں حکمت یہ ہے کہ جب تم دین دار سے اپنی پریشانی بیان کرو گے اس کا دل تمہارے واسطے پگھل جائیگا وہ دل سے دعا کرے گا اور ایسے مبارک دل کے پسیجنے اور دل لگا کر دعا کرنے ہی سے رحمت اور قبول

دعا کی امید کی جاتی ہے۔

قوله الوجه الثانى فيه طلب الدعاء ممن فيه اهلية للقبول الى قوله فى الوجه الثالث وعند تلك الرقة وجمع ذلك الخاطر المبارك ترجى الرحمة والاجابة

(۱۰۵) امر خلاف عادت کبھی رحمت ہوتا ہے کبھی نقمت اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی امر کا خلاف عادت ہونا کبھی رحمت پر دلالت کرتا ہے کبھی اس کے خلاف پر، چنانچہ بارش کا وقت پر نہ ہونا جس کا انجام ہلاکت اموال ہو یہ بھی تغیر عادت ہے اور یہ تغیر نقمت ہے بعض روایات میں آیا ہے اذا بغض اللّٰہ قوماً امطر صیفهم واضحی شتاءهم جب اللہ تعالیٰ کسی قوم سے نفرت کرتے ہیں گرمی کے زمانہ میں ان پر بارش کرتے ہیں اور جاڑے برسات میں آسمان صاف رکھتے ہیں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے ساتھ ساتھ فوراً بادل کا اٹھنا اور بارش ہو جانا یہ بھی خرق عادت ہے مگر یہ تغیر رحمت ہے

قوله الوجه العاشر فيه دليل على ان تغيير العادة قد تكون دالة على رحمة اوغيرها الى قوله الا انها تغيير رحمة۔

ف نزول بلا میں گناہوں کو کسطرح دخل ہے

افسوس آجکل بعض لوگ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ گناہوں کی وجہ سے بھی بلائیں نازل ہو سکتی ہیں ان کے نزدیک بارش ہونے یا نہ ہونے کا سبب بس وہی ہے جو سائنس نے بتلا دیا ہے مگر ان سے کوئی پوچھے کہ سائنس نے اس کا بھی کوئی سبب بتلایا ہے کہ جب ہمیشہ برسات اور جاڑے

ہی میں بارش ہوا کرتی ہے تو کسی سال اس قاعدہ کیخلاف گرمی کے زمانہ میں کیوں ہوتی اور جاڑے برسات میں کیوں نہیں ہوتی؟ اس عادت مستمرہ کے بدلنے کا بھی تو سبب کوئی ہونا چاہیئے سائنس اس جگہ خاموش ہے شریعت نے اس مشکل کو حل کردیا ہے کہ عادت مستمرہ کے بدلنے کا سبب لوگوں کی شامت اعمال ہے۔

ولو انہم آمنو واتقوا لفتحنا علیہم برکات من السماء والارض ولکن کذبوا فاخذناہم بما کانوا یکسبون۔

آج سے ستر اسی سال پہلے اسی ہندوستان میں لوگوں کو عام طور پر عفت پاکدامنی سچائی دیانت داری امانت بزرگوں کے احترام علماء کی عزت کا اہتمام تھا بے حیائی، بے شرمی، جھوٹ، دغابازی سے نفرت تھی دلوں میں خدا کا خوف بزرگوں کا لحاظ تھا علانیہ فحش کا بازار گرم نہ تھا تو وہ لوگ ان بیماریوں کا نام بھی نہ جانتے تھے جن میں آج کل ہندوستان کا ہر نوجوان مبتلا ہے جس طرح ان کا ایمان قوی تھا بدن بھی قوی تھا صحت بنی ہوئی تھی وقت پر بارش ہوتی تھی۔ پیداوار کی کثرت تھی بے فکری کا زمانہ تھا، اب ہمارے اعمال خراب ہو گئے ہر طرف سینما بائسکوپ کی وجہ سے فحش کو ترقی ہے سودی لین دین کی کثرت ہے علانیہ حرام کاری ہوتی ہے تو نہ وہ بے فکری رہی نہ وہ راحت جس کو دیکھو پریشان و حیران، جدھر نظر اٹھاؤ ادھر ہی ایک بلائے بے درماں، بیماریاں ایسی آتی ہیں جن کا کبھی نام نہ سنا تھا لڑائیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک کبھی اسکی نظیر زمانہ کی آنکھوں نے نہ دیکھی تھی، یہ شامت اعمال نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا سائنس اس خوفناک بارش کا بھی کوئی سبب بتلائے گی جو بموں اور گولوں کی صورت میں آسمان سے برستی اور دم کے دم میں لاکھوں آدمیوں کو مردہ اور خوبصورت و مستحکم اور مضبوط شہروں کو تہ و بالا بنا دیتی ہے کہ یہ کون سی مانسون سے پیدا ہوئی ہے؟ اس بارش کا مانسون سمندر کی بھاپ سے نہیں اٹھا بلکہ قلوب نفوس کی بھاپ سے بنتا اور مخلوق کے گناہوں کے سبب برستا ہے۔ نعوذ باللہ من الفتن ما ظہر منہا وما بطن

حدیث سے معلوم ہوا کہ دعا ہر خیر کے لئے بہت بڑا وسیلہ ہے

(۱۰۶) دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے کتنی جلدی فائدہ ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

من الہم الدعاء فقد فتح علیہ ابواب الخیر

جس کے دل میں دعا ڈال دی گئی (یعنی دعا سے جس کو رغبت اور شوق پیدا ہو گیا) اس پر خیر کے دروازے کھول دیئے گئے۔

اسی لئے حضرات صوفیہ فرماتے ہیں کہ دعا خود عین خیر ہے، (یعنی دعا خود اپنی ذات سے مطلوب مقصود ہے قضا حاجت کے لئے مطلوب نہیں) قضاء حاجت تو تبعاً مطلوب ہے کیونکہ دعا کی حقیقت (مولائے جلیل اللہ تعالیٰ) سے مناجات کرنا اور اس کی طرف اپنی احتیاج ظاہر کرنا ہے اور یہ عبودیت کا خلعت ہے جس سے بڑھ کر بندہ کے لئے کوئی بھی خلعت نہیں، اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کافی دلیل ہے۔

ان عبادی لیس لک علیہم سلطان

اے ابلیس! میرے بندوں پر تیرا کچھ قابو نہیں۔

دیکھو ان حضرات کو یہ شرف بلند اور اتنی بڑی حفاظت اسی عجیب صورت سے تو حاصل ہوئی جو کہ صفت عبودیت ہے اس کی ضد کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد سن لو۔

وان الکافرین لا مولیٰ لہم

کافروں کا کوئی مددگار نہیں (جو ان کو شیطان کے پھندوں سے نکالے)

قوله الوجه الثانی عشر فیه دلیل علیٰ ان الدعاء
من اکبر وسائل الخیر الیٰ قوله وان الکافرین
لا مولیٰ لھم۔

ف شاید کسی کے دل میں اس جگہ یہ سوال پیدا ہو کہ کافر بھی تو
اللہ کے بندے ہیں پھر وہ اللہ کی موالات سے کیوں محروم ہیں۔

جواب یہ ہے کہ ہاں بندے تو ہیں مگر ایسے بندے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان
کو اپنی طرف منسوب کر کے عبادی میرے بندے کہنا پسند نہیں فرماتے
اور بندہ حقیقت میں وہ ہے جس کو آقا خوش ہو کر اپنا غلام کہے ؎

وہ اگر کہہ دے مجھے اپنا غلام   سب سے پیارا نام ہو میرا یہی

کافروں کو اللہ تعالیٰ اپنا غلام تو کیا فرماتے آدمی بھی کہنا پسند نہیں فرماتے

اولٰئک کالانعام بل ھم اضل

کیونکہ آدمی حقیقت میں وہ ہے جو آدم علیہ السلام کے طریقہ پر ہو جو ان کے
طریقہ عبودیت کے خلاف کفر و بغاوت حق میں مبتلا ہے وہ آدمی
کہلانے کا مستحق نہیں ؎

ایں کہ می بینی خلاف آدم اند   نیستند آدم غلاف آدم اند

ف یہاں سے معلوم ہوا کہ دعا بذات خود مطلوب ہے کہ قضاء حاجت کے
واسطے مطلوب نہیں بلکہ قضاء حاجت تبعاً مطلوب ہے، پس جن لوگوں کو
یہ دیکھنا ہو کہ دعا کیونکر قبول ہوتی ہے وہ اس پر عمل کر کے دیکھیں
یعنی دعا کو بذات خود مطلوب بنائیں۔

(۱۰۷) شفیع کی عظمت کے موافق عطا ہوا کرتی ہے

حدیث سے معلوم ہوا کہ شفاعت کرنیوالے کی عزت و عظمت کے موافق
اللہ کی طرف سے عطا ہوا کرتی ہے چونکہ اس واقعہ میں شفاعت کرنے

والے سردار دو جہان تھے (صلی اللہ علیہ وسلم) تو بارش کا سلسلہ متواتر
بندھ گیا۔ یہاں تک کہ لوگوں کی مراد اچھی طرح پوری ہو گئی اسی لئے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

ائمتکم شفعاءکم فانظروا بمن تستشفعون

تمہارے امام (جو تم کو نمازیں پڑھاتے ہیں) تمہارے شفیع ہیں
پس دیکھ لیا کرو کہ تم کس کو شفیع بناتے ہو یعنی یہ دیکھ لیا کرو کہ وہ اس
قابل بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی شفاعت قبول فرمالیں مطلب یہ کہ اس
کے ظاہر و باطن کی تحقیق کر لو کہ شریعت کے موافق ہے یا نہیں واللہ اعلم

اس میں صوفیہ کی بھی دلیل ہے کیونکہ وہ فرماتے ہیں

قدم محبوبک عند مطلوبک تجد مرغوبک
مطلوب کے سامنے اپنے محبوب کو آگے بڑھاؤ تو مرغوب کو پالوگے

محبوب چیز کی قربانی سے مطلوب کو پاؤ گے

یعنی محبوب چیز کی قربانی کرو تو مطلوب کو پالوگے۔ لن تنالوا
البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون کیونکہ محبوب چیز کی قربانی ضرور قبول
ہوتی ہے جیسا آیت کا قرآنیہ کا مدلول ہے واللہ اعلم۔

اس جگہ ایک سوال ہے وہ یہ کہ دونوں جمعوں میں دعا کی درخواست
کے لئے یہ دو اعرابی یا ایک اعرابی ہی کیوں کھڑا ہوا حضرات صحابہ اور خلفاء
میں سے کوئی کیوں نہ کھڑا ہوا؟

جواب یہ ہے کہ حضرات خلفاء اور صحابہ کا مقام رضا و تسلیم ہے اور
سائل کا مقام فقر و مسکنت ہے۔ پس درخواست دعا کے لئے وہی اٹھا
جس کا یہ مقام تھا اس اجمال کی تفصیل ایک حکایت کے ضمن میں
معلوم ہو گی۔

ایک بزرگ مجذوب کی حکایت

ایک دفعہ جزیرہ اندلس میں قحط پڑا تو لوگ ایک مجذوب بزرگ کے پاس گئے ان سے درخواست کی کہ نماز استسقار کیلئے آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں ان کی عادت یہ تھی کہ ایک بانس پر بچوں کی طرح سوار ہو کر چلتے تھے تاکہ لوگ بیوقوف سمجھیں اور احمق سمجھ کر ایذا نہ دیں چنانچہ اسی شان سے وہ ان کے ساتھ ہو لئے اور راستہ میں شاہی باغ تھا تو آپ شاہی باغ کے پاس پہنچے اور بڑے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا باغ کا داروغہ جلدی سے گھبرا کر باہر آیا اور کہا کیا بات ہے فرمایا باغ میں جتنے درخت ہیں سب میں پانی دے مالی نے کہا آپ بھی عجیب بیہودہ گو ہیں میں اپنے باغ کی حالت کو اچھی طرح جانتا ہوں جب پانی دینے کی ضرورت ہوگی خود پانی دے دوں گا تمہارے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ بزرگ نے لوگوں کی طرف رُخ پھیرا اور فرمایا تم نے اس کی بات سُنی؟ جب یہ ادنیٰ مخلوق اپنے باغ کی ضرورت کو دوسروں سے زیادہ جانتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ اپنی زمین کی ضرورت کو نہیں جانتے؟ وہ بھی اپنے باغ کی حالت کو خوب جانتا ہے تو تم نے مجھے اپنے ساتھ لے کر اس کے سوا کچھ نہیں چاہا کہ مجھے اللہ کے سامنے ذلیل کرو جیسا اس مالی کے سامنے ذلیل ہوا۔ پھر اپنے بانس پر سوار ہو کر الٹے لوٹ گئے اور لوگوں کو چھوڑ کر چل دیئے مگر اس تسلیم و رضا کا یہ ثمرہ ملا کہ لوگ اپنے گھروں کو لوٹنے نہ پائے تھے کہ بارش سے سیراب ہو گئے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام تسلیم و رضا میں سب سے اعلیٰ تھا مگر اسی کے ساتھ آپ ہر شخص سے اس کے حال کے موافق معاملہ فرماتے تھے کمزوروں کی دلجوئی فرماتے ان کی درخواست پر دعا کر دیتے قوی کو اس کے حال پر رکھتے اور متوسط سے لطف کا معاملہ فرماتے اور یہ معاملہ سرتاپا اللہ کی طرف سے اپنے بندوں پر رحمت ہی رحمت ہے تاکہ اس مبارک راستہ میں قوی اور ضعیف متوسط سب ہی چلنے لگیں اور ان میں سے ہر شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا متبع ہے بشرطیکہ ہر ایک کو حقیقت یا شریعت سے اپنا حصہ معلوم ہو کہ اس کا حصہ کہاں ہے اور اس کے شرائط و آداب کیا ہیں؟ یہاں دنیا میں تو بڑا فائدہ یہی ہے کہ انسان کو یہ معلوم ہو جائے کہ میرا حصہ حقیقت میں ہے یا شریعت میں اور جس میں بھی حصہ ہے اسکے شرائط و آداب کی اس کو خبر ہو اس سے آگے جو کچھ ملیگا آخرت میں ملے گا کہ دار الجزار وہی ہے دنیا دار العمل ہے دار الجزار نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان میں سے کرے جن کو اپنے فضل سے اس فائدہ عظمیٰ کے ساتھ سرفراز فرمایا ہے۔

قولہ فی الوجہ الثالث عشر فیہ دلیل علی ان الاعطار یکون علی قدر حرمۃ الشفیع الی قولہ فی الوجہ الخامس عشر جعلنا الیہ ممن من بہا علیہ بمنہ

ف دعا مقام رضا و تسلیم کے منافی نہیں منافات جب ہوتی ہے کہ دعا بذات خود مطلوب نہ ہو بلکہ قضاء حاجت مطلوب ہو اور اگر دعا خود اس لئے مطلوب ہو کہ اس میں اللہ تعالیٰ سے مناجات ہے اپنے عجز و نیاز کا اظہار ہے اور دل سے اس پر راضی ہو کہ حاجت پوری ہو یا نہ ہو دعا کو نہ چھوڑوں گا اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے راضی رہوں گا تو یہ دعا عین رضا و تسلیم ہے پس بعض بزرگوں کے واقعات سے جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دعا کو تسلیم و رضا کے خلاف سمجھ کر چھوڑ دیا تھا یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ دعا واقع میں رضا و تسلیم کے خلاف ہے بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ یا تو وہ بزرگ غلبۂ حال کی وجہ سے دعا کو مقام رضا کے ساتھ جمع نہ کر سکے یا یہ کہ گو ان دونوں میں منافات نہیں مگر مقام رضا و تسلیم کی یہ خاصیت ہے کہ جب اس کا غلبہ ہوتا ہے دعا چھوٹ ہی جاتی ہے۔ اعتدال کے بعد پھر عود کر آتی ہے۔ خوب سمجھ لو۔

(۱۰۸) حدیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا بہت بڑا معجزہ معلوم ہُوا کہ بادل آپ کے لیے مسخر کر دیا گیا تھا کہ جس طرف اُنگلی سے اشارہ کرتے اُس طرف سے بادل کُھل جاتا۔ کیونکہ زبان سے تو آپ حق تعالیٰ سے دُعا کر رہے تھے بادل کو (زبان سے کچھ نہیں کہا اُس کی طرف) تو اشارہ ہی کیا تھا۔ پس اگر بادل کو آپ کی اطاعت کا حکم نہ دیا گیا ہوتا تو وہ آپ کے اشارہ کی تعمیل نہ کرتا۔ کیونکہ بادل بھی جیسا حدیث میں آیا ہے مامور ہے جہاں جاتا ہے جتنی دیر رہتا ہے جس جگہ رہتا ہے (حکم سے رہتا ہے) اور اس میں ایک لطیف اشارہ ہے کہ بادل تو باوجود اس قدر بعد کے اشارہ کو بھی سمجھ لیتا ہے۔

محروم القسمت کو نصیحت سے بجائے نفع کے نقصان ہوتا ہے

اور محروم (القسمت) دل کا بہرا نصیحتوں کے دُر بے بہا سُن کر بھی متنبہ نہیں ہوتا کلا بل ران علی قلوبھم (کچھ نہیں بلکہ اُن کے دلوں پر زنگ لگ گیا ہے جس کے لیے سعادت (کے راستہ) میں کوئی قدم (مقدر نہیں یا جس کے لیے ازل میں سعادت (مقدر) نہیں۔ اس کے لیے ساری نصیحتیں نقصان ہی (بن جاتی) ہیں۔

قوله فی الوجه التاسع فیه دلیل علی عظم معجزته علیه السلام الی قوله من لم یکن له فی القدم[عه] سعادة فکل موعظة علیه خران۔

ف ۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف میں جلدی نہ کرنا چاہیئے۔ اگر نفع

عه اما الترجمة الاولیٰ فمبنیة علی ان اصل العبارة من لم یکن له فی السعادة قدم الخ بفتح القاف وصحفه الکاتب الی قوله من لم یکن له فی القدم سعادة ۔ والترجمة الثانیة مبنیة علی کون القدم بکسر القاف بمعنی الازل ولکن الظاهر هو الاول لقلة استعمال القدم بمعنی الازل فی کلام المصنفین۔ واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ ظ۔

کی اُمید غالب ہو تو نصیحت کی جائے ورنہ خاموشی اختیار کی جائے۔ کیونکہ بعض لوگوں کو نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اُلٹا شریعت ہی کو بُرا کہنے لگتے ہیں۔

(۱۰۹) فوائد صُحبت اور اُس کے شرائط

یہاں ایک اور اشارہ بھی ہے کہ قرب (اور جوار) کی برکت نے زمین کو رحمت سے مالا مال کر دیا۔ حالانکہ وہ جماد (محض) ہے تو جاندار کو (بالخصوص انسان کو برکت صحبت سے) کیا کچھ فائدہ ہوگا؟ (خود ہی سمجھ لو) چنانچہ اسی مجاورت (اور صحبت) سے ابوطالب کو برکت حاصل ہوئی کہ دوزخیوں میں سب سے کم عذاب اُن پر ہے حالانکہ اُنھوں نے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم) کا اتباع نہیں کیا تھا (مگر حضورؐ کے ساتھ رہے۔ آپ کی صُحبت سے مشرف ہُوئے تو برکت سے محروم نہ رہے) لیکن مجاورت (اور صحبت) کے متعلق یہ امر قابل تنبیہ ہے کہ اگر اُس سے اہلِ ایمان کو کسی قدر منفعت اور مدد پہنچتی ہو تو اس کو کچھ برکت حاصل ہوگی۔ اور اگر زیادہ منفعت و مدد پہنچے تو برکت کے ساتھ اُس کو عظمت و حرمت بھی حاصل ہوگی۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مدینہ کے قرب و جوار کی زمین کو ہر طرف بارہ میل تک حرم مکّہ کی طرح حرم بنا دیا ہے۔ کہ نہ اُس کا شکار مارا جائے نہ اس کا درخت کاٹا جائے۔ یہ حُرمت (اس زمین کو) اُن ہی لوگوں کی وجہ سے تو حاصل ہُوئی جو اس زمین کے بسنے والے تھے (چونکہ اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی مجاورت اور صُحبت کے ساتھ آپ کی نصرت میں بھی حصہ لیا تھا آپ کا اتباع بھی کیا تھا تو اُن کے احترام کا یہ اثر ہُوا کہ اُن کی زمین بھی محترم ہو گئی) پس یہ قرب (اس زمین کے لیے) ایسا ہی ہے جیسا عاقل مخاطب کے لیے اتباع (کہ جیسا وہ بوجہ اتباع کے محترم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ زمین بوجہ قرب اہلِ اتباع کے محترم ہو گئی) کیونکہ مخلوق میں ہر نوع کو اُس کی حالت کے مناسب نفع حاصل ہوتا ہے (پس زمین کو صلحاء کی مجاورت سے یہ نفع ہُوا کہ اُس کو حرم بنا دیا گیا) جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ صحبت کی نسبت (اور مقدار) ہی

کے موافق خیر حاصل ہوتی ہے۔ جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اُس سے دوسرے کو شر نہ پہنچے تو اسی لیے حدیث میں آیا ہے ھم القوم لا یشقی بھم جلیسھم۔ یہ ایسے لوگ ہیں جن کے پاس بیٹھنے والا محروم نہیں رہتا اور اگر مجاورت (اور صحبت اس طرح نہ ہو بلکہ) اس کے خلاف ہو (کہ جس کی صحبت میں رہتا ہے اُس کو ایذاء پہنچاتا ہے) تو معاملہ برعکس ہوگا (کہ صُحبت سے بجائے نفع کے ضرر پہنچے گا) اسی لیے اہلِ تحقیق نے فرمایا ہے کہ انسان محقق (عارف کامل) کی مثال آگ جیسی ہے کہ جو شخص احتیاط کے ساتھ اُسے کام میں لائے گا۔ اُس سے مختلف قسم کے منافع حاصل کرے گا۔ جیسا حق تعالےٰ نے فرمایا ہے: متاعا للمقوین علماء نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آگ کو اہلِ حاجت کے لیے فائدہ کی چیز بنایا ہے اور جو شخص بے احتیاطی کے ساتھ اس کو استعمال کرے گا نقصان اُٹھائے گا۔

یہی حال انسان محقق کا ہے جو اسے پہچان لے اور ادب کے ساتھ اُس کی صُحبت میں رہے وہ اُس سے بہت کچھ منافع حاصل کرے گا اور جو (پہچاننے کے بعد) اُس کو تحقیر کرے گا اُس کو (بجائے نفع کے) ضرر لاحق ہوگا اگرچہ محقق (عارف) نے اُس کو ضرر دینے کا قصد بھی نہ کیا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی غیرت کو اُس کے لیے جوش آتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں من اٰذی لی ولیا فقد اٰذنی بالمحاربۃ (جس نے میرے ولی کو ایذا دی اُس نے مجھے اعلانِ جنگ دیا ہے

"اللھم انا نعوذ بک من سخطک وسخط اولیائک ونعوذ بک من الحور بعد الکور ومن العمی بعد الھدی ونسئلک ان تجعل عاقبۃ امورنا رشدا برحمتک یا ارحم الراحمین) قولہ وھنا اشارۃ وھی ان برکۃ الجوار افادت الارض الرحمۃ الی قولہ فقد اٰذنی بالمحاربۃ"

ف - ایذا دینا ہر مُسلمان کو بلکہ ہر حیوان کو حرام ہے جبکہ بلا وجہ ایذا دی جائے اور اولیاء وصلحاء کو ایذاء دینا زیادہ حرام ہے کہ گویا خدا کا مقابلہ ہے۔ پھر ایذاء کے بھی درجے ہیں۔ ایک یہ کہ عمل سے بلا وجہ ایذاء دی جائے کہ عملاً اُن کے ساتھ گستاخی اور بدتہذیبی کا معاملہ کیا جائے۔ ایک یہ کہ زبان سے بلا وجہ اُن کو بُرا بھلا کہا جائے۔ یہ دونوں صُورتیں ہر حال میں موجب وبال ہیں۔ ایک یہ کہ اُن کو بُرا تو نہ کہا جائے، نہ گستاخی کا برتاؤ کیا جائے۔ لیکن ان کی ولایت اور کمالات کا انکار کیا جائے۔ یہ تیسری صورت صرف اُس شخص کے حق میں موجب وبال ہے جو اُن کے ولایت وکمالات سے واقف ہے۔ ناواقف کو اس سے ضرر نہ ہوگا۔ کیونکہ ولی کی ولایت کا ماننا یا اُس سے واقف ہونا فرض یا واجب نہیں اور اسلم یہ ہے کہ جس شخص کی ولایت کا بہت سے عقلاء اور صلحاء وعُلماء کو اعتقاد ہو اُس کی ولایت سے انکار نہ کیا جائے گو تم کو بذاتِ خود اُس کی تحقیق نہ ہو۔ کیونکہ غیر ولی سے حُسنِ ظن مذموم نہیں اور ولی سے بدظن ہونا بُرا ہے تو بلا ضرورت ایسے شخص کی ولایت سے انکار کیوں کیا جائے جس کی ولایت کو بہت سے عقلاء اور صلحاء وعلماء تسلیم کرتے ہیں۔

علامات ولایت

رہا یہ کہ کسی کی ولایت کی تحقیق خود کیونکر کی جائے؟ تو اگر یہ طالب تحقیق عامی ہے جب تو اُس کو عقلاء اور صلحاء وعلماء کی تقلید سے کام لینا چاہیئے اور اگر اُس کو کچھ نورِ بصیرت حاصل ہے تو چند روز اُس کی صحبت میں رہ کر یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس شخص کی طرف دُنیا داروں کا میلان زیادہ ہے یا دین داروں کا۔ اس کی باتیں دُنیا کے متعلق زیادہ ہوتی ہیں یا دین کے۔ اس کے پاس بیٹھنے سے دل دُنیا کی طرف راغب ہوتا ہے یا آخرت کی طرف۔ گُناہوں سے نفرت اور نیک کاموں کی رغبت اُس کے پاس بیٹھنے سے زیادہ ہوتی ہے یا نہیں۔ فرائض ونوافل واذکار میں وہ اپنے معمولات کا پابند ہے یا نہیں؟ اور زیادہ وقت اُس کا اللہ کی یاد میں گزرتا ہے یا دُنیا کے قصّوں میں۔ اگر چند روز اُس کے پاس رہنے سے یہ اندازہ ہو کہ اس شخص پر اللہ کی یاد، اللہ ورسول کی محبت غالب ہے۔ زیادہ اوقات اسی تذکرہ میں گُزرتے ہیں اور اسکے اقوال وافعال واحوال سُنتِ نبویہ کے موافق ہیں تو سمجھ لیا جائے کہ وہ اللہ کا ولی ہے جس کو ایذا دینا اللہ تعالےٰ کو اعلانِ جنگ دینا ہے ؎

نورِ حق ظاہر بود اندر ولی — نیک بین باشی اگر اہل دلی

حدیث

صلوٰۃ النوافل قبل الفرائض و بعدھا

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ظہر سے پہلے دو رکعتیں پڑھتے تھے اور اُس کے بعد دو رکعتیں اور مغرب کے بعد اپنے گھر میں دو رکعتیں پڑھتے تھے اور عشاء کے بعد دو رکعتیں اور جمعہ کے بعد نماز نہ پڑھتے۔ یہاں تک کہ (گھر کی طرف) لوٹ جاتے پھر (گھر میں) دو رکعتیں پڑھتے۔

شرح ظاہر حدیث تین احکام پر دال ہے ۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ظہر سے پہلے اور ظہر کے بعد مسجد میں نماز پڑھتے تھے ۲۔ مغرب کے بعد مسجد میں نماز نہ پڑھتے تھے بلکہ اپنے گھر میں دو رکعتیں پڑھتے تھے ۳۔ جمعہ کے دن نماز جمعہ سے پہلے اور پیچھے مسجد میں نماز نہ پڑھتے تھے جمعہ سے فارغ ہو کر اپنے گھر میں دو رکعتیں پڑھتے تھے اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۱۰) یہاں دو سوال ہیں (۱) یہ کہ راوی نے صبح اور عصر کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ ان دونوں کا کیا حکم ہے؟ (ان کے آگے یا پیچھے نفل نماز ہے یا نہیں؟)
(۲) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم سے نفل نماز کی جو صفت (اور کیفیت یہاں) منقول ہے یہ تعبد (محض) ہے جس کی علت عقل سے معلوم نہیں ہو سکتی یا قیاسی حکم ہے جس کی علت

عقل میں آسکتی ہے۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ فجر و عصر کا گو یہاں ذکر نہیں مگر دوسری روایات میں موجود ہے۔ کیونکہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ بعد (طلوع) فجر کے بجز فجر کی دو سنتوں کے (نفل) نماز نہیں۔ اس باب میں اور بھی بہت احادیث ہیں۔ نیز یہ بھی وارد ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ان دو رکعتوں میں تخفیف کرتے تھے اور تخفیف کی علت بھی (بعض روایات میں) مذکور ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم عصر سے پہلے دو رکعتیں پڑھتے تھے۔ اس باب میں بھی بہت احادیث ہیں۔ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ تعبّد (محض) ہے جب تو گفتگو ہی (کی ضرورت) نہیں اور اگر یہ حکم کسی حکمت پر مبنی ہے تو وہ حکمت واللہ اعلم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس میں (عملاً اپنی اُمّت کو) خدمت (اور عبدیت) میں ترقی کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ جیسا ضمام (بن ثعلبہ) کو (قولاً) اسی کی ہدایت فرمائی تھی جبکہ اُس نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا میرے ذمّے (ان فرائض کے علاوہ) کچھ اور بھی ہے۔ فرمایا نہیں مگر یہ کہ تم اپنی خوشی سے (کچھ نفل ادا) کرو

تعلیم عملی زبانی تعلیم سے زیادہ مؤثر ہے تو جس چیز کی آپ نے قول سے ترغیب دی تھی اُسی کی اپنے عمل سے ترغیب دی۔ کیونکہ آپ کی عملی تعلیم زیادہ مؤثر ہوتی تھی اور (قاعدہ بھی یہی ہے کہ) احکام کی پختگی عمل سے ہی زیادہ کامل ہوتی ہے۔ اگرچہ قول بھی اس کے لیے کافی ہے جیسا شریعت (کے اصول) سے بارہا معلوم ہو چکا ہے۔ اور (حکمت نوافل کے بیان میں) یہ توجیہ بہت عمدہ ہے۔

جس کام کا دوسروں کو امر کرو خود بھی اُس پر عمل کرو یہاں سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ انسان جس نیک کام کا دوسروں کو امر کرے یا ترغیب دے اُس پر

خود بھی عمل کرنا چاہیئے۔ یہاں تک کہ قال کے ساتھ وہ اس کا حال بن جائے تاکہ حق تعالیٰ کے اس ارشاد کے تحت میں داخل نہ ہو (جس میں سخت وعید ہے)۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝

"اے ایمان والو! تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔ اللہ کے نزدیک یہ بات بہت بُری ہے کہ ایسی بات کہو جو کرتے نہیں ہو"

(ہر چند کہ یہ آیت دعویٰ کے متعلق ہے، امر بالمعروف کے متعلق نہیں۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ ایسا دعویٰ نہ کرنا چاہیئے جس کو پُورا نہ کیا جائے اور یہ بات سیاق سے بھی ظاہر ہے اور شانِ نزول سے بھی معلوم ہے۔ مگر آیت کے ظاہری الفاظ مطلق قول پر دال ہیں جس میں دعویٰ اور امر بالمعروف دونوں داخل معلوم ہوتے ہیں۔ پس امر بالمعروف میں بھی اس کا لحاظ کرنا چاہیئے کہ جس بات کا دوسروں کو امر کیا جائے خود بھی اس پر عمل کیا جائے اور بہر حال میں آیت کا یہ مطلب نہیں کہ بے عمل دوسروں کو نصیحت نہ کرے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ناصح کو بے عمل نہ ہونا چاہیئے) اسی لیے بعض اہلِ حال نے فرمایا ہے کہ فقیہ الکلام اور فقیہ الحال کو قیامت کی ہوائیں چلنے اور دُنیا کا بادل پھٹنے کے وقت معلوم ہوگا کہ ان دونوں میں اس میدان کا شہسوار کون ہے؟ (اُس وقت حقیقت پر سے پردہ اُٹھ جائے گا اور معلوم ہوگا کہ محض وعظ کہنا۔ کتابوں کا پڑھنا پڑھانا اور مسائل کا حل کرنا کارآمد نہیں بلکہ احکام پر عمل کرنے اور اُس کو حال بنانے کی ضرورت تھی۔

نوافل کے مشروع ہونے کی حکمت

اور جب ہم نوافل کے مجموعی عدد پر نظر کرتے ہیں تو اس حکمت (مذکورہ) کی ساتھ ہمارے سامنے ایک اور حقیقت آجاتی ہے جو بہت ہی لطیف ہے اور اہلِ ہمت کی خصلتوں میں سے (عجیب خصلت) ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن نمازوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے (بطور نفل کے) زیادہ کیا ہے

تتبع آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ (اُن کا مجموعہ) چوالیس ۴۴ رکعتیں ہیں اور ایک رکعت وتر کی (ان کے علاوہ) ہے تو کل پینتالیس ۴۵ رکعتیں ہوئیں۔ ان کو پانچ فرض نمازوں کے ساتھ ملایا جائے تو پچاس ۵۰ نمازیں پُوری ہوں گی اور یہی وہ اصلی عدد ہے جو اوّلاً فرض ہُوا تھا۔ جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت پر شفقت کر کے تخفیف کی درخواست کی تھی (تو پچاس سے پانچ رہ گئیں) لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات بابرکات کے حق میں درجۂ کمال کو اختیار فرمایا کہ اصلی فرض کو ہی پورا فرماتے تھے تاکہ ارشادِ خداوندی اَلَّذِیْ وَفّٰی عہ (کی تعمیل) میں آپ کا قدم راسخ ہو جائے۔ جیسے موسیٰ علیہ السّلام نے (شعیب علیہ السّلام سے) فرمایا تھا اَیَّمَا الْاَجَلَیْنِ قَضَیْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَیَّ کہ ان دونوں مدتوں میں سے جس مُدت کو بھی میں پُورا کر دوں یعنی آٹھ سال کی مُدت یا دس سال کی مُدت تو مجھ پر کوئی الزام نہ ہوگا) پھر آپ نے دونوں میں سے بڑی مُدت کو پُورا کیا کیونکہ انبیاء و رسل صلوٰت اللہ وسلامہ علیہم اجمعین (بہت) بلند ہمت والے ہیں اور کیوں نہ ہوں وہ تو مخلوق کے بہتروں سے بھی بہترین (اُن کا طریقہ یہی ہے کہ اعلیٰ و افضل و اکمل کو اختیار فرماتے ہیں) اب ہمیں ان چوالیس ۴۴ رکعتوں کے بتلانے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ دو رکعتیں تو (سُنت) فجر کی ہیں اور بارہ رکعتیں چاشت کی ہیں۔ جیسا احادیث سے معلوم ہوتا ہے اور زوال (آفتاب) کے وقت عہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اوّلاً نماز سے منع

عہ پوری آیت وَاِبْرَاھِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰی ہے جس میں حضرت ابراہیمؑ کی حق تعالیٰ نے مدح فرمائی ہے کہ اُنھوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو پُوری طرح ادا کر دیا تھا۔ ۱۲ ظ

عہ فی الاصل وعند الزوال بقدر ما کان ینھی عن الصلوٰۃ فی ذلک الوقت ثم رجع علیہ السلام فصلی فیہ اربعا الخ وفیہ تصحیف والصحیح عندی بعد ما کان ینھی عن الصلوٰۃ الخ ولم یظہر لی وجہ قولہ ثم رجع علیہ السلام فان الرجوع یدل علی النسخ ولیس ذلک من النسخ فی شیٔ فانہ صلی اللہ علیہ وسلم انما نھی عن الصلوٰۃ عند الاستواء وھذا النھی باق علی حالہ وصلی اربعا بعد الزوال حین تزول الشمس عن کبد السماء ولم ینہ عن الصلوٰۃ بعد الزوال قط فافھم۔ ۱۲ ظ

فرماتے تھے۔ پھر آپ نے (زوال کے بعد) چار رکعتیں پڑھی ہیں۔ غالب گمان اس (نماز) کی تحقیق عدد میں یہی ہے اور ظہر سے پہلے دو رکعتیں، ظہر کے بعد دو رکعتیں، عصر سے پہلے دو رکعتیں، مغرب کے بعد دو رکعتیں، تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں، عشاء کے بعد دو رکعتیں اور اگر صلوٰۃ فی الزوال کی دو رکعتیں ہوں (چار نہ ہوں جیسا اُوپر بتلایا گیا) تو چوالیس کا عدد پُورا کرنے کے لیے وہ دو رکعتیں شمار کر لی جائیں جو حضرت عائشہ رضؓ کی ایک روایت میں وارد ہیں کہ آپ اپنے بستر پر دو رکعتیں پڑھنے کے بعد سویا کرتے تھے اور قیام اللیل (یعنی تہجد) کی بارہ رکعتیں اور وتر کی ایک رکعت (مترجم کہتا ہے کہ فی الزوال کی دو رکعتیں مان کر پینتالیس کا عدد پُورا نہیں ہوتا بلکہ فی الزوال کی چار مان کر بھی بستر پر سونے کے وقت کی دو رکعتیں ملانے سے یہ عدد پُورا ہو گا۔ جیسا شمار کرنے والے پر مخفی نہیں اور اسلم یہ ہے کہ فی الزوال کی دو رکعتیں شمار کی جائیں اور ظہر سے پہلے چار رکعتیں کیونکہ حدیث ام حبیبہ و عائشہ رضی اللہ عنہما سے ظہر کے پہلے چار سُنتوں کا ثبوت ہوتا ہے اور یہی حنفیہ اور جمہور علماء کا مذہب ہے اور بستر پر سونے کی دو رکعتیں حضورؐ سے دوامًا ثابت نہیں)۔

اس تقریر پر یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ تمہارے بیان سے صرف اتنا معلوم ہُوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے پانچ فرضوں کے علاوہ پینتالیس رکعتیں پڑھی ہیں۔ یہ تو ثابت نہ ہوا کہ پینتالیس نمازیں پڑھی ہیں تاکہ مجموعہ پچاس نمازیں ہوں۔ آگے اس کا جواب ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ۴۵ رکعتیں ہی ۴۵ نمازیں ہیں) کیونکہ ایک رکعت پر (شرعًا) نماز کا اطلاق ہوتا ہے۔ جس کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ زَادَکُمْ صَلٰوۃً ھِیَ الْوِتْرُ

"اللہ تعالیٰ نے تمہاری نمازوں میں ایک نماز اور بڑھا دی ہے۔ سُن لو وہ وتر ہے۔"

(اور وتر ایک رکعت ہے) تو (دیکھو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے

ایک رکعت[عہ] کو نماز فرمایا ہے اور بظاہر اس (وتر کے بڑھانے) میں حکمت یہ ہے کہ رسول اللہ[عہ] صلے اللہ علیہ وسلم نے (۴۵ کے) عدد میں ایک کی کمی چھوڑ دی تھی تو اللہ تعالےٰ نے اُس کو زیادہ کر کے کمی کو پُورا کر دیا تاکہ اللہ تعالےٰ کے احسان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کی اُمت پر فضل کامل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنے احسان سے اس اُمت کے صلحاء میں داخل کرے۔ دنیا میں بھی آخرت میں بھی، تو جیسا ابتداء میں اللہ تعالےٰ نے محض فضل اور تخفیف کے لیے (نمازوں کا) عدد کم کر دیا تھا (کہ پچاس کی جگہ پانچ کر دیں) اسی طرح (آخر میں) تفضل و تکمیل کے لیے (وتر کی

عہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ وتر کم از کم ایک رکعت ہے یا تین رکعت۔ حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ وتر کم از کم تین رکعت ہے مگر اس باب کی احادیث کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وتر حقیقت میں ایک ہی رکعت ہے مگر اُس کے ساتھ دو رکعتوں کا ملانا ضروری ہے۔ اگر تنہا ایک ہی رکعت پر اکتفا کیا جائے تو حنفیہ کے نزدیک جائز نہیں۔ کیونکہ عبداللہ بن مسعود کا ارشاد ہے کہ ما اجزئت رکعۃ واحدۃ قط کہ ایک رکعت تنہا کبھی کافی نہیں ہوتی۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت نہیں کہ آپ نے کبھی وتر کی تنہا ایک رکعت پڑھی ہو۔ پس یہ بھی صحیح ہے کہ وتر ایک رکعت ہے کیونکہ حقیقت میں ایک ہی رکعت وتر ہے اُس کے ساتھ دو رکعتیں اس لیے ملائی جاتی ہیں تاکہ ایک رکعت تنہا نہ ہو۔ جس کو بعض احادیث میں بتیراء کہا گیا ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بُتیراء سے منع فرمایا ہے۔ جب وتر کے ساتھ دو رکعتوں کا ملانا ضروری ہے تو یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ وتر تین رکعت ہے۔ بہر حال اس اختلاف سے شارح کے کلام پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔ اُن کا یہ مدعا بہر حال میں ثابت ہے کہ شرعًا ایک رکعت کو بھی نماز کہا جاتا ہے واللہ اعلم۔ اس کی تائید فقہاء حنفیہ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص قسم کھائے واللہ لا اصلی بخدا میں نماز نہ پڑھوں گا تو جب تک وہ ایک رکعت پوری نہ پڑھے حانث نہ ہو گا۔ جب ایک رکعت پُوری پڑھ لے گا حانث ہو جائے گا۔ کیونکہ ایک رکعت سے کم نماز نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہُوا کہ ایک رکعت کو شرعًا نماز کہا جاتا ہے۔ ۱۲ ظ

عہ فی الاصل ویظھر فیہ من الحکمۃ ان المولی سبحانہ لما نقص من العدد واحدۃ زادھا ھو جل جلالہ الخ وفیہ تصحیف عندی والصحیح ان المولی صلے اللہ علیہ وسلم الخ فافھم ۱۲ ظ

ایک رکعت بڑھا کر، ثواب کو کامل کر دیا کہ اب ان ۵ نفل رکعتوں کے پڑھنے والے کو حقیقی پچاس نمازوں کا ثواب ملے گا۔ اگرچہ تنہا پانچ فرض بھی پچاس نمازوں کے برابر ہیں۔ کیونکہ ہر نماز کا ثواب دس کے برابر ہے۔ مگر وہ حکمی پچاس ہیں، حقیقی نہیں واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲۔

یہاں ایک لطیف گفتگو ہے وہ یہ کہ یہ اُمّت (محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ) دُوسری اُمتوں پر گواہ کیوں بنائی گئی؟ جیسا کہ اللہ عزّ وجل کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے:

وکذلک جعلنٰکم امۃ وسطا (ای خیارا) لتکونوا شھداء علی النّاس ویکون الرسول علیکم شھیدا۔

"اور ایسا ہی ہم نے تم کو امت وسط یعنی بہترین اُمت بنایا تاکہ تم اور لوگوں پر گواہ بنو اور یہ رسول تمہارے اُوپر گواہ بنیں"

اُمتِ محمدیہ دُوسری اُمتوں سے کیونکر افضل ہوگئی حالانکہ یہ اُن سے کمزور ہے

حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو (شب معراج میں) سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمایا تھا کہ میں بنی اسرائیل کو بہت زیادہ جھیل چکا ہوں (اُن پر دو نمازیں فرض کی گئی تھیں وہ اُن کو بھی پوری طرح ادا نہ کرسکے) اور آپ کی اُمت (اُن سے کمزور ہے وہ) اس کی (یعنی پانچ نمازوں کی) طاقت نہیں رکھتی تو (جواب یہ ہے کہ) اللہ تعالےٰ نے اپنا فضل فرمایا کہ ہمارے آقا (سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو درجۂ کمال کی توفیق عطا فرمائی کہ جو عدد اولاً مطلوب تھا اس کو (خود) آپ نے ہی پُورا کر دیا۔ (اور اُمت کو بھی اس کی ترغیب دی) تاکہ گواہوں کا تزکیہ (کامل ہو جائے کیونکہ تزکیہ و عدالت گواہی کی شرط ہے۔ پس اللہ تعالےٰ کے فضل سے اس اُمت کا تزکیہ (اچھی طرح) ظاہر ہوگیا (کہ دوسری اُمتیں باوجود قوت کے دو نمازوں کو بھی پُورا نہ کرسکیں اور یہ اُمت باوجود ضعف کے پچاس نمازیں ادا کرتی ہے۔

ترقی کے دو دروازے

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو باوجود اس کے ضعف کے اسی پر نہیں چھوڑ دیا، بلکہ آپؐ نے ہمارے لیے ترقی کے دو دروازے اور کھول دیئے۔ ایک تو اپنے اس ارشاد سے کہ رحمہ اللہ عبدا صلی اربعا قبل الظہر وصلی اربعا بعدہا ومن صلی بین العشائین اثنتی عشرۃ رکعۃ بنی اللہ لہ قصرا فی الجنۃ۔ "اللہ اس بندے پر رحم فرمائے جو چار (رکعت والے فرض) سے پہلے چار رکعتیں (نفل) پڑھ لے اور چار (رکعت والے فرض) کے فرض کے بعد بھی چار رکعتیں (نفل) پڑھ لے اور جو شخص مغرب و عشاء کے درمیان بارہ رکعتیں پڑھے گا۔ اللہ تعالےٰ اُس کے لیے جنّت میں عالی شان محل بنائیں گے"

اس حدیث سے ظہر و عصر و عشاء کے پہلے اور پیچھے چار رکعتیں پڑھنے کی فضیلت ثابت ہوئی۔ مگر عصر کے بعد نماز نفل کی ممانعت احادیث مشہورہ متواترہ میں وارد ہے اور یہ حدیث اُن کے برابر نہیں اس لیے بعد عصر کو اس حدیث سے مستثنیٰ کیا جائے گا۔ ترمذی نے بسند حسن روایت کیا ہے رحم اللہ امرأ صلی قبل العصر اربعا۔ اللہ تعالےٰ اُس شخص پر رحم کرے جو عصر سے پہلے چار رکعتیں پڑھے۔ اس میں عصر کے بعد کا ذکر نہیں اس لئے نماز عصر سے پہلے ہی چار رکعتیں پڑھنا چاہئیں۔ بعد میں نہیں۔ واللہ تعالےٰ اعلم ۱۲۔ اور اس کے مشابہ دوسری احادیث بھی اس کے ہم معنی وارد ہوئی ہیں (جن میں نوافل کی ترغیب ہے) اور وہ بہت حدیثیں ہیں"

جملہ افعال و اقوال میں تزکیۂ کامل کی ضرورت ہے

دوسرا دروازہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (نماز کے علاوہ ہمارے) بقیہ افعال و اقوال کے تزکیۂ کامل کی ضرورت پر بھی اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے:

من لم تنہہ صلوتہ عن الفحشاء والمنکر لم یزدد من اللہ الا بعدا۔

«جس شخص کو اُس کی نماز بے حیائی اور بُرے کاموں سے نہ روکے اُس کو اللہ سے بُعد ہی بڑھے گا۔»

(قُرب نہ بڑھے گا کیونکہ اس صُورت میں اُس کی نماز نماز نہ ہوگی بلکہ صرف اُٹھک بیٹھک ہوگی جو عظمتِ الٰہی کے لائق نہیں بلکہ اس کے منافی ہے اور یہ وعید اُس وقت ہے جبکہ یہ شخص گناہوں سے نادم ہو کر توبہ بھی نہ کرتا ہو۔ اگر توبہ کر لیتا ہو اور دل میں ندامت ہو تو بُعد نہ ہوگا بلکہ اُمید ہے کہ کسی وقت گناہوں سے بالکل الگ ہو جائے گا۔ غرض گناہ سے ندامت ہونا اور توبہ کی توفیق ہونا بھی نماز کی برکات میں سے ایک برکت ہے)

پس اے شبہات اور شہوات کے ساتھی تجھے اللہ کی قسم! کچھ تو اپنی جان کی خبر لے۔ اپنے کو اس مقام رفیع اور عظیم الشان درجے سے محروم تو نہ کر۔ اپنے نفس کو ذلت اور ملامت کے مقام میں کھڑا کر! (شہوات پرستی میں آزاد نہ چھوڑ) کیونکہ جو شخص اپنی خواہش نفس کا اتباع کرتا ہے اس کی مروت (آدمیت) زائل ہو جاتی ہے اور دین بدنما ہو جاتا ہے۔ جس کی یہ حالت ہو اُس کا عمل برباد ہے اور جہنم اُس کے لیے زیادہ مناسب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "اگر تم (برابر) روزہ رکھو یہاں تک کہ (سوکھ کر) تانت کی طرح (لاغر) ہو جاؤ اور راتوں کو نماز پڑھو یہاں تک کہ کمان کی طرح (خمیدہ) ہو جاؤ۔ مگر تمہارے اندر ورع (اور تقویٰ) نہ ہو جو (محرمات سے) روکنے والا ہو تو یہ اعمال تم کو جہنم سے نہیں بچا سکتے" اور جوان آدمی جب اپنی شہوتوں کو چھوڑ دیتا ہے تو اب اس کا نفس حور و قصور کے حاصل کرنے کی توقع کرتا ہے (وہ ان اعمال میں کوشش کرنے لگتا ہے جو جنت میں پہنچانے والے اور جہنم سے روکنے والے ہیں)

نوافل کی ترتیب اور تفریق کی حکمت

تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عجیب حکمت میں غور

تو کرو کہ آپ نے ان (نفل) نمازوں کو کس عجیب ترتیب کے ساتھ متفرق اوقات میں رکھا ہے۔ اگر آپ ان سب کو ایک ہی وقت میں رکھ دیتے یا ان کا عدد مقرر فرما دیتے جس میں زیادتی یا کمی نہ ہو سکتی ہو تو اس میں (امت کو) مشقت ہوتی اور شاید بہت لوگ ان (کے پورا کرنے) کی قدرت نہ پاتے۔ مگر آپؐ نے (ایسا نہیں کیا بلکہ) ان میں سے بعض (نوافل) کو تو فرض نمازوں کے ساتھ رکھا اور جو بعض (نوافل فرض) نمازوں کے ساتھ نہیں ہیں اُن کا وقت (بہت) وسیع ہے۔ مثلاً رات کی نماز (یعنی تہجد) ایک جانب میں ہے (جس کا وقت بہت ہے) اور چاشت کی نماز طلوعِ آفتاب سے زوال تک (ایک جانب میں) ہے (اور یہ بھی کافی وقت ہے) پھر اگر کوئی قیام اللیل (یعنی تہجد) اور چاشت کی نماز سے عاجز ہو وہ اُن نمازوں سے تو عاجز نہ ہوگا جو فرضوں کے ساتھ ہیں۔ یہ تو سب ہی آدمیوں کو آسان ہیں۔ چنانچہ ایسا بہت کم دیکھا گیا ہے کہ کوئی نمازی فرض نماز کو ادا کرتے ہوئے اُس سے پہلے اور پیچھے نفل نماز نہ پڑھتا ہو اور اگر کوئی ایسا ہو تو وہ (شاذ و نادر کے حکم میں ہے (اور نادر بمنزلہ معدوم کے ہے) جس کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔

تم اس لطیف اشارہ پر بھی نظر کرو کہ جب ہم سے اوّلاً پچاس نمازوں کا مطالبہ کیا گیا پھر فرض پانچ رہ گئیں تو اصلی فرض تو یہ پانچ ہی ہیں مگر کمال کا درجہ پچاس ہیں تو جتنی اُس اصل میں جو حکم قطعی سے ثابت ہے کمی رہ گئی تھی اُس کو دوسری اصل سے جو اوّلاً مطلوب تھی پُورا کر دیا گیا یعنی پانچ فرضوں (کے ساتھ پینتالیس رکعتیں ملا کر اُن) کو پچاس کر دیا گیا اور ان کا نام نفل رکھا کیونکہ یہ حتمی (اور لازم) نہیں (بلکہ درجۂ کمال حاصل کرنے کے واسطے ہیں) اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ جل جلالہٗ فرمائیں گے میرے بندہ کی نماز کو دیکھو اگر وہ فرض کو پوری طرح بجا لایا ہو فبہا ورنہ دیکھو کہ اگر اس کے پاس کچھ نوافل ہوں تو فرض (کی کمی) کو اُن سے پُورا کر دو۔ تو اُس اصل کو جو فرض ہے دوسری اصل سے جو کہ اوّلاً وضع کی گئی تھی پُورا کر دیا جائے گا۔ پس اس وقت اللہ تعالےٰ کا یہ

ارشاد (ہرطرح) صادق آئے گا۔ مایبدل القول لدیّ ۔ کہ میرے یہاں بات نہیں بدلا کرتی۔ چنانچہ گو فرض نمازیں اس وقت پانچ ہیں مگر وہی پچاس بھی ہیں کیونکہ اوّل تو پانچ کا ثواب پچاس کے برابر کر دیا گیا۔ پھر ان پانچ کی کمی کو بھی نوافل سے پُورا کر دیا گیا حالانکہ نفل فرض کے برابر نہیں مگر چونکہ اولاً پچاس نمازیں فرض ہوئی تھیں اس لیے ۴۵ نفلوں کو بھی فرض کا درجہ دے دیا گیا۔ اس پر شاید یہ سوال وارد ہو کہ کیا ۴۵ رکعات سے زیادہ کو فرض کا درجہ نہ دیا جائے گا۔ کیا اُن سے فرائض کی کمی کو پُورا نہ کیا جائے گا۔ جواب یہ ہے کہ قیاس کا مقتضیٰ یہی تھا مگر اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل سے تمام نوافل کو فرض کا مکمل بنا دیا ہے۔ کیونکہ نفل ہونے میں یہ ۴۵ اور اس سے زیادہ سب برابر ہیں۔

(واللہ ذوالفضل العظیم) قولہ الوجہ الاوّل ھذا الذی جاء عنہ علیہ السلام من صفۃ ھذا التنفل ھل ھو تعبد لا یعقل الی قولہ فی الوجہ الثانی فجاء قولہ تعالیٰ مایبدل القول لدیّ۔

ف اس حدیث کی شرح میں علامہ شارح نے حکمت تنفل کے متعلق جس علم عظیم کو ظاہر کیا ہے یہ اُن علوم میں سے ہے جو صوفیہ کے ساتھ مخصوص ہیں اور در اصل یہ اسرار کشفیہ ہیں جن کے بیان سے زبان اکثر قاصر رہتی ہے اسی لیے ممکن ہے کہ اس تقریر کے بعض مقدمات اہلِ علم کی نظر میں مخدوش ہوں مگر علوم کشفیہ ذوقیہ کو مقدمات و دلائل کی حاجت نہیں۔ صاحبِ ذوق کا انشراح صدر اس کے لیے کافی ہے۔

ف یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو سنن مؤکدہ کے بجالانے میں بھی تساہل اور تکاسل سے کام لیتے ہیں اُن کو متنبہ ہو جانا چاہیئے کہ وہ اپنے کو بہت بڑے درجہ سے محروم کر رہے ہیں اور اپنی بھلائی سے غفلت کر رہے ہیں ایسا کون ہے جو فرائض کو بلاکم و کاست پُوری طرح بجالاتا ہو کہ نوافل سے اُن کی تکمیل کا محتاج نہ ہو۔ پہلے زمانہ میں ایسے نمازی شاذ و نادر ہی ہوتے تھے جو فرائض کے پہلے اور پیچھے کچھ نوافل نہ پڑھتے ہوں مگر آج کل ایسے لوگوں کی کثرت ہو رہی ہے۔ اللہ تعالےٰ اُن کو ہدایت دیں اور ہمیں اور سب مسلمانوں کو تکمیلِ صلوۃ کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

ف یہاں سے سالکین کو سبق لینا چاہیئے کہ اُن کو پانچ فرضوں کے علاوہ کم از کم ۴۵ رکعتیں نوافل کی مع وتر کے پڑھنا چاہئیں تاکہ حقیقتاً و حکماً ہر طرح ۵۰ نمازیں ادا ہو جائیں کیونکہ طریق سلوک، مجاہدہ اور کثرت عبادت پر مبنی ہے ان کو پینتالیس رکعات سے کم نوافل نہ پڑھنا چاہئیں۔ جس کی ایک صُورت تو وہ ہے جو حضرت شارح نے بیان فرمائی۔ دوسری صُورت یہ ہے کہ سنن مؤکدہ کی بارہ رکعتوں اور وتر کی تین رکعتوں کے علاوہ تیس ۳۰ رکعتیں اور پڑھی جائیں۔

حنفیہ کے نزدیک سنن مؤکدہ کی تفصیل یہ ہے کہ نماز فجر کے پہلے دو رکعتیں ظہر سے پہلے چار اور اس کے بعد دو رکعتیں مغرب کے بعد، دو رکعتیں عشاء کے بعد دو رکعتیں ہیں۔ ان کے ساتھ وتر کی تین رکعات ملانے سے مجموعہ عدد پندرہ ۱۵ ہُوا۔ ان کے علاوہ تیس ۳۰ رکعات نوافل اس طرح پڑھ لی جائیں کہ مغرب کی سُنتوں کے بعد صلوۃ الاوابین چھ رکعات۔ تہجد آخر شب میں آٹھ رکعات۔ صلوۃ الاشراق چار رکعات۔ عصر سے پہلے دو رکعتیں اور اسی میں تحیۃ المسجد کی نیت کر لی جائے صلوۃ الضحیٰ چار رکعات، ظہر کی سنتوں کے بعد دو رکعتیں، عشاء سے پہلے دو رکعتیں، عشاء کی سنتوں کے بعد دو رکعتیں۔ اس طرح مجموعہ عدد رکعات نوافل و سنن مع وتر کے پینتالیس ۴۵ ہوگا۔ ان کے ساتھ پانچ فرض نمازوں کو ملا لینے سے پچاس ۵۰ نمازوں کا عدد پُورا ہو جائیگا۔ اگر آخر شب میں تہجد کے لیے بیدار ہونے کی اُمید نہ ہو تو عشاء کی سنتوں کے بعد وتر سے پہلے یا پیچھے ۸ رکعتیں تہجد کی نیت سے پڑھ لی جائیں۔

ف جب یہ تسلیم کر لیا گیا کہ شرعاً ایک رکعت پر بھی نماز کا اطلاق ہوتا ہے تو ۵۰ نمازیں پورا کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ پانچ فرض اور وتر کی رکعات کا مجموعہ بیس ۲۰ رکعات ہے۔ ان کے علاوہ تیس ۳۰ رکعتیں اور پڑھ لی جائیں جن میں بارہ رکعات تو سنن مؤکدہ کی ہوں اور چار اشراق کی اور ظہر کی دو سنتوں کے بعد دو رکعتیں۔ عصر سے پہلے چار رکعتیں مغرب کی سنتوں کے بعد چار رکعتیں۔ عشاء کی سُنتوں کے بعد دو نفلیں،

وتر کے بعد بہ نیت تہجد دو رکعتیں ۔

اگر کسی کو یہ ترتیب آسان نہ ہو تو جس وقت فرصت زیادہ ہو اُس میں تعداد رکعات بڑھا کر تیس کا عدد پورا کر دے ۔ مگر جو صورت ہم نے بیان کی ہے وہ بعض احادیث کے موافق ہے ۔ مثلاً ایک حدیث قدسی میں ہے :۔

ابن آدم ارکع لی اربع رکعات من اول النہار اکفک آخرہ ۔

" اے ابن آدم ! تو دن کے شروع میں میرے لیے چار رکعتیں پڑھ لیا کر ۔ میں دن بھر تیری حفاظت کروں گا "

اکثر علماء نے اس حدیث کو نمازِ اشراق پر محمول کیا ہے ۔ ترمذی کی حدیث میں ہے رحمہ اللہ امرأ صلّے قبل العصر اربعًا ۔ جس کا ترجمہ گزر چکا ۔ نمازِ عشاء اور ظہر کے بعد چار رکعتوں کی فضیلت ایک حدیث میں گزر چکی ہے ۔ صلوٰۃ الاوابین کے بارہ میں اختلاف ہے کہ چھ رکعات علاوہ سنت مغرب کے ہیں یا مغرب کی سنتوں کے ساتھ ، اگر کسی کو مغرب کے بعد چار نفلوں کا وقت نہ ملے تو وہ عشاء سے پہلے چار رکعتیں پڑھ لیا کرے کہ ایک حدیث میں جو اُوپر گزر چکی ہے عشاء سے پہلے بھی چار رکعتیں پڑھنے کی فضیلت وارد ہے ۔ اسی طرح بعض روایات میں وتر کے بعد دو رکعتوں کو تہجد کا قائم مقام بتلایا گیا ہے ۔ واللہ تعالےٰ اعلم ۔

ف یہ تو تزکیہ صلوٰۃ کی صورت تھی اسی پر اکتفا نہ کرنا چاہیئے بلکہ جملہ افعال و اقوال میں تزکیہ کا اہتمام کیا جائے اسی کا نام ورع اور تقویٰ ہے جس کے لیے اصلاحِ نفس کی ضرورت ہے جو مشائخ صوفیاء کی تربیت و تعلیم سے حاصل ہوتی ہے کہ وہی امراضِ قلب کے طبیب ہیں ؎

نفس نتواں کشت الا ظل پیر
دامنِ آں نفس کش را سخت گیر

ف حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی سنتیں مسجد میں نہ پڑھتے ۔ بلکہ گھر میں پڑھتے تھے ۔ اسی طرح جمعہ کے بعد گھر میں دو رکعتیں پڑھتے تھے ۔ اس میں واللہ اعلم حکمت یہ تھی کہ مغرب کا وقت تنگ ہے اور مشغولی کا وقت بھی ہے ۔ بعض لوگ ضروری کاموں کو ادھورا چھوڑ کر نماز کے لیے آجاتے ہیں جن کو نماز مغرب کے بعد جلدی پورا کرنا ضروری ہوتا ہے ۔

مغرب اور جمعہ کے بعد مسجد میں سُنتیں نہ پڑھنے کی حکمت

بعض لوگ اس وقت تھکے ماندے اور بعضے روزہ دار ہوتے ہیں ۔ اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مغرب کی سُنتیں مسجد میں پڑھتے تو صحابہ بھی مسجد کے پابند رہتے جس سے بعض کو تکلیف ہوتی جو آپ کو گوارا نہ تھی ۔ حضورؐ نے تو فرض مغرب کے متعلق بھی یہ فرمایا ہے کہ اگر شام کا کھانا سامنے رکھ دیا جائے اور نماز کی اقامت ہونے لگے تو پہلے کھانے سے فارغ ہو جاؤ ۔ تو نوافل کے لیے اُن کو مسجد کا پابند بنانا آپ کیسے گوارا فرماتے ؟ اس لیے مغرب کی سنتیں گھر میں پڑھتے تھے تاکہ اہلِ حاجت فرض پڑھتے ہی اپنے گھر چلے جائیں اور ضروری کاموں سے فارغ ہو کر یا کسی قدر راحت و آرام کر کے سنتیں پڑھ لیں اور جمعہ کے بعد مسجد میں سُنتیں اس لیے نہ پڑھتے تھے کہ ناواقف لوگ یہ خیال نہ کریں کہ یہ دو رکعات ظہر کی چار رکعتیں پُوری کرنے کے لیے پڑھی جاتی ہیں ۔ پھر رفتہ رفتہ یہ اعتقاد نہ ہو جائے کہ یہ رکعتیں فرض ہیں ۔

جیسا بعض علماء کا قول ہے کہ جمعہ کا خطبہ ظہر کی دو رکعتوں کا قائم مقام ہے حالانکہ خطبہ کو نماز سے بظاہر کچھ نسبت نہیں تو ان دو رکعتوں کو تو ضرور ظہر کی دو رکعتوں کا قائم مقام سمجھ لیا جاتا ۔ کیونکہ نماز کو نماز سے پوری نسبت ہے ۔ اب اس میں علماء نے گفتگو کی ہے کہ مغرب کی سنتوں کا اور جمعہ کے بعد دو رکعتوں کا مسجد میں پڑھنا کیسا ہے ؟ سو اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ مغرب کے بعد مسجد میں سُنتیں پڑھنا جائز ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس علت کی وجہ سے ان کو گھر میں پڑھا ہے وہ علت دوسروں کے حق میں مفقود ہے ۔ لیکن افضل یہی ہے کہ اُن کو گھر میں ہی ادا کیا جائے ۔ کیونکہ فضیلت حضورؐ کے اتباع ہی میں ہے ۔ اگرچہ سلف میں بعض حضرات ان سنتوں کو

مسجد میں پڑھتے تھے اور جمعہ کے بعد دو رکعتیں پڑھنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے مسجد میں پڑھنے سے منع فرمایا ہے بعض نے جائز کہا ہے۔ مگر جائز کہنے والے بھی یہ فرماتے ہیں کہ جمعہ کی نماز کے متصل نہ پڑھے بلکہ ایک دروازہ سے نکل کر دوسرے دروازہ سے مسجد میں آکر پڑھ سکتا ہے یا جس جگہ فرض جمعہ ادا کیا ہے اُس جگہ سے ہٹ کر یہ رکعتیں پڑھے اور اگر جگہ بدلنے میں دشواری ہو تو کم از کم جمعہ کی نماز کے بعد کچھ دیر بیٹھا رہے اور پھر یہ دو رکعتیں پڑھے تاکہ وہ شبہ جاتا رہے کہ یہ دو رکعتیں نماز ظہر کی چار پُوری کرنے کے لیے ہیں اور اس میں تو کسی کا بھی اختلاف نہیں کہ اُن کا گھر میں پڑھنا ہی افضل ہے۔ یہ خلاصہ ہے اُس تقریر کا جو علامہ شارح نے اسی مقام پر بیان فرمائی ہے۔

علماءِ زمانہ کی شکایت

اس کے بعد اُنھوں نے اپنے زمانہ کے علماء پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ وہ جمعہ کی نماز کے متصل یہ رکعتیں پڑھتے ہیں۔ نہ جگہ بدلتے ہیں نہ کچھ توقف کرتے ہیں۔ گویا اُنھوں نے اس حدیث کو اور مسلم کی اس حدیث کو سُنا ہی نہیں جس میں وارد ہے کہ ایک شخص جمعہ کی نماز سے فارغ ہو کر اسی جگہ نفلیں پڑھنے لگا تو حضرت عمرؓ نے اُس کو اپنی طرف کھینچا اور فرمایا بیٹھ جاؤ (پہلی اُمتیں اسی سے برباد ہُوئی ہیں کہ وہ نمازوں میں فصل نہ کرتے تھے) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے حضرت عمرؓ کے قول کی تقریر و تصدیق فرمائی۔ یہ دونوں حدیثیں صحت اور شہرت کی انتہا کو پہنچی ہوئی ہیں۔ پھر بھی علماءِ زمانہ ان کی مضمون پر غور نہیں کرتے۔ پس علم اور اہلِ علم کہاں چلے گئے؟ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ٥

دین میں کیسی نئی نئی باتیں پیدا ہونے لگیں؟ جن کا زیادہ حصّہ اس جماعت کے ہاتھوں پیدا ہو رہا ہے جو علم کی طرف منسوب ہے۔ ان کے پاس بجز الفاظ نقل کر دینے اور زبردستی بحث و مباحثہ اور فخر و مباہات کرنے کے کچھ نہیں رہا۔ ہیہات علم اس طرح حاصل نہیں ہوتا نہ اس کا یہ طریقہ ہے۔ علم تو اتباعِ سُنّت سے

سے حاصل ہوتا ہے اور نور (قلب) و حکمت (باطن) سے اتباعِ سُنت میں سلف کی موافقت نصیب ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو بھی اپنے فضل سے اس کی توفیق ارزانی فرمائیں۔ آمین

ف نوافل و وتر کا گھر میں ہی پڑھنا افضل ہے جیسا احادیث سے واضح ہے مگر چونکہ ایک زمانہ میں منکرینِ سُنّت کی جماعت پیدا ہو گئی جس نے سنن و نوافل کو بالکل ہی ترک کر دیا تو اہلِ حق نے سنن مؤکدہ کو مسجد میں پڑھنا شروع کر دیا تاکہ لوگ اُن کو منکرِ سنت اور تارکِ سُنت سمجھ کر بدنام نہ کریں اور منکرینِ سُنت کا عملاً رد بھی ہو جاوے۔ مگر جمعہ کے بعد نفلیں پڑھنے میں اس کا خیال کرنا چاہیئے کہ جس جگہ جمعہ کی نماز پڑھی ہے اُسی جگہ نفلیں نہ پڑھی جائیں بلکہ وہاں سے ہٹ کر یا کچھ دیر توقف کر کے پڑھیں۔ فرض کے بعد معاً متصلاً نہ پڑھیں۔ شارح نے جمعہ کے بعد دو رکعتیں بیان فرمائی ہیں۔ یہ اُن کا مذہب ہے حنفیہ کے نزدیک چارؔ یا چھؔ رکعتیں ثابت ہیں۔ دلائل اعلاءُ السنن میں ملاحظہ ہوں۔

ف علامہ شارح کی تقریر سے اتباعِ سُنت کی تاکید اور فقہ علم اور فقہ حال کی تعریف بخوبی واضح ہے اور فقہ حال ہی کا نام تصوف ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ شریعت کی جو باتیں زبان سے بیان کی جاتی ہیں وہ عملاً حال بن جائیں۔ کیا اب بھی کسی یہ کہنے کا حق ہے کہ تصوف کا قرآن و حدیث سے ثبوت نہیں؟ حق یہ ہے کہ محققین صوفیہ سے بڑھ کر متبع کتاب و سنت کوئی جماعت نہیں۔ جعلنا اللہ ممن تبعھم۔ آمین۔

حدیث

غزوۂ بنی قریظہ

عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ظہر کے بعد) غزوۂ احزاب سے (فارغ ہوکر) واپس ہوئے تو آپ نے ہم سے فرمایا کہ کوئی شخص عصر کی نماز نہ پڑھے۔ مگر بنو قریظہ (کے محلہ) میں (پہنچ کر یعنی وہاں جلدی پہنچو۔ نمازِ عصر کی وجہ سے تاخیر نہ کرو۔ نماز وہیں جاکر پڑھو) تو (صحابہ یہ حکم سُنتے ہی روانہ ہو گئے جن میں سے اکثر تو نمازِ عصر کے وقت بنو قریظہ کے محلہ میں پہنچ گئے اور) ایک جماعت کو راستہ ہی میں عصر کا وقت ہو گیا تو (ان میں دو فریق ہو گئے) بعض نے کہا کہ ہم تو عصر کی نماز بنو قریظہ میں پہنچ کر ہی پڑھیں گے راستہ میں نہ پڑھیں گے۔ (کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد یہی تھا کہ بنو قریظہ میں پہنچنے سے پہلے کوئی عصر کی نماز نہ پڑھے۔ پس ہم کو اس ارشاد کی پوری تعمیل کرنا چاہیئے) بعض نے کہا ہم تو (راستہ ہی میں) نماز پڑھ لیتے ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ مراد نہ تھی (کہ نماز کو قضا کردو یا وقت مکروہ میں ادا کرو۔ بلکہ آپ کا مطلب یہ تھا کہ نماز عصر کی وجہ سے روانگی میں تاخیر نہ کی جائے۔ سو ہم نے روانگی میں تاخیر نہیں کی بلکہ حکم کے ساتھ ہی روانہ ہو گئے اور جب ہم نے حکم کی تعمیل کر دی ہے تو اب راستہ میں نماز پڑھنا اور بنو قریظہ کے محلہ میں نماز پڑھنا برابر ہے) پھر (دونوں فریق کی) اس (گفتگو اور اختلاف رائے) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر کیا گیا تو آپ نے اُن میں سے کسی کو ملامت نہیں فرمائی "۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو بنو قریظہ کی طرف جانے کا حکم دیا اور صحابہ نے اس حکم کی تعمیل میں سبقت کی اس پر چند وجوہ سے کلام ہے "۔

(۱۱۱) اس حدیث کے فوائد پر گفتگو کرنے سے پہلے واقعہ کی طرف اشارہ کرنے کی ضرورت ہے جس کی وجہ سے صحابہ کو بنو قریظہ کی طرف جانے کا حکم ہُوا تھا۔

خلاصہ واقعہ غزوۂ خندق سو واقعہ یہ ہے کہ جب صحابہ غزوہ احزاب سے واپس ہُوئے (جس کو غزوہ خندق بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی حفاظت کے لیے شرقی جانب میں بڑی گہری اور چوڑی خندق کھدوا ئی تھی کہ اسی طرف سے مدینہ میں دشمن میں آنے کا راستہ تھا باقی سمتیں پہاڑوں، ٹیلوں اور لوگوں کے مکانات کی وجہ سے محفوظ تھیں۔ فوج اُدھر کو نہیں آسکتی تھی۔ ایک ایک دو دو آدمی آسکتے تھے تو اُن کے روکنے کو تیر اندازوں کی مختصر جماعت کافی تھی۔ یہ لڑائی ۵ھ میں ہوئی ہے اُس کے بانی یہود بنی نضیر تھے جو چند سال پہلے مدینہ سے جلا وطن کئے گئے اور خیبر میں جا بسے تھے۔ اُنہوں نے مکّہ جا کر قریش کو مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے اُبھارا اور یقین دلایا کہ خیبر کے یہودی بھی تمہارے ساتھ ہوں گے اور یہود بنو قریظہ بھی جو مدینہ میں رہتے ہیں ہماری موافقت کریں گے۔ چنانچہ اہلِ مکّہ نے اپنی پُوری جمعیت کے ساتھ مدینہ کا رُخ کیا۔ اطراف و جوانب کے دیہاتی بھی اُن کے ساتھ ہو گئے۔ مدینہ پہنچتے پہنچتے اُن کی تعداد دس بارہ ہزار ہو گئی۔ بنو قریظہ نے اُن کی کثرت پر بھروسہ کر کے مُسلمانوں سے غدّاری کی اور نقضِ عہد کر کے قریش کے ساتھ ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنا پسند نہ فرمایا

شہر کے اندر رہ کر ہی مقابلہ کا حکم دیا۔ لشکرِ قریش نے خندق کے پاس قیام کیا۔ کیونکہ شہر میں گھسنے کا راستہ وہی تھا مگر خندق کا عرض و عمق دیکھ کر اُن کے حوصلے پست ہو گئے۔ اس کا عبور کرنا آسان نہ تھا۔ دو چار بہادروں نے خندق میں گھوڑے ڈالے بھی مگر مُسلمانوں کی تیر اندازی نے اُن کو پار ہونے کی مہلت نہ دی۔ ایک دو بہادر ہمت کر کے پار بھی ہوئے تو حضرت علی اور حضرت زبیرؓ جیسے بہادروں کی تلواروں نے اُن کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اب قریش نے خندق کے کنارہ سے مُسلمانوں پر تیر برسانے شروع کئے تو مسلمانوں نے بھی تیر بازی سے اُن کو جواب دیا۔ کئی دن تک اسی طرح مقابلہ رہا۔ سردی کا موسم تھا۔ قریش کا لشکر کھلے میدان میں سردی سے پریشان تھا۔ اُدھر سامانِ رسد بھی ختم ہونے لگا تو قریش نے بنو قریظہ پر تقاضا کیا کہ تم مدینہ کے اندر سے مُسلمانوں پر حملہ کر دو تاکہ وہ تمہاری طرف متوجّہ ہوں اور ہم خندق کو عبور کر کے شہر میں گھس آئیں۔

بنو قریظہ نے قریش کی کمزوری اور بے بسی دیکھ کر ان کی موافقت سے پہلو تہی کی اور دوبارہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے صلح کرنا چاہی ابھی وہ پیام صلح نہ بھیجنے پائے تھے کہ اُسی رات ٹھنڈی ہوا بڑے زور سے چلی جس سے قریش کے خیموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں۔ کھلے میدان میں خیموں کی پناہ بھی باقی نہ رہی تو سب سے پہلے ابو سفیان اپنی سانڈنی پر سوار ہو کر مکّہ کی طرف بھاگے اُن کو بھاگتا دیکھ کر تمام لشکر نے راہِ فرار اختیار کی۔ صُبح تک میدان بالکل صاف تھا کہ کفار میں سے ایک بھی مدینہ کے آس پاس نظر نہ آتا تھا۔

یاایھا الذین امنوا اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جاءتکم جنود فارسلنا علیھم ریحا وجنودا لم تروھا وکان اللہ بما تعملون بصیرا الی قولہ ورد اللہ الذین کفروا بغیظھم لم ینالوا خیرا وکفی اللہ المؤمنین القتال وکان اللہ قویا عزیزا ۔

(سورۃ الاحزاب)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم نے اور صحابہ نے اس غیبی امداد پر شکرانۂ فتح ادا فرمایا اور پھر دو دن تک احتیاطاً وہاں قیام کر کے مدینہ کا رُخ کیا) اس وقت مُسلمانوں میں کچھ لوگ زخمی بھی تھے جن کو قریش کی تیر بازی سے زخم کاری لگا تھا (آپ ان کو ساتھ لے کر واپس ہوئے) اور بدن سے ہتھیار کھول کر غسل کرنے کا ارادہ فرمایا کہ اُسی وقت جبریل علیہ السّلام ہتھیار بند تشریف لائے اور کہا کیا آپ ہتھیار کھولنا چاہتے ہیں حالانکہ ملائکہ ابھی تک ہتھیار بند ہیں (آپ نے فرمایا اب کیا کام رہ گیا ہے جس کے لیے ہتھیار بند رہنے کی ضرورت ہے) جبریل علیہ السلام نے کہا بنو قریظہ پر حملہ کرنا اور اُن کو غداری کی سزا دینا ہے پھر اللہ تعالےٰ کی طرف سے حکم پہنچا کہ اسی وقت (بنو قریظہ کی طرف) چلنے ابھی ہتھیار نہ کھولئے اور جتنے مُسلمان احزاب کے مقابلہ کو گئے تھے اُن کو بھی حکم دیجئے کہ اس وقت (بنو قریظہ کی طرف) روانہ ہو جائیں۔ چنانچہ صحابہ روانہ ہو گئے۔ اُن میں جو زخمی تھے وہ بھی دو دو آدمیوں کا سہارا لیے ہوئے نکل کھڑے ہُوئے۔ دُشمنِ اسلام (یعنی احزاب قریش) نے (رات کی سردی سے بے تاب ہو کر اگرچہ راہِ فرار اختیار کر لی تھی۔ مگر دُھوپ نکلنے پر حواس درست ہُوئے تو اپنی اس حرکت پر نادم ہوئے اور (دوبارہ لوٹ کر) مدینہ پر حملہ کرنے کی طمع کرنے لگے۔ کیونکہ اُن کو معلوم تھا کہ (تیر باری سے) مُسلمان بہت زخمی ہو چکے ہیں (اور ہمارے بھاگنے کی خبر سُن کر خندق سے پہرہ بھی اُٹھا لیا گیا ہو گا۔ اب ہم کو دفعتہً مدینہ میں گھس جانا دشوار نہ ہو گا اور زخم خوردہ لشکرِ اسلام کو ہمارے مقابلہ کی سکت نہ ہو گی) وہ یہ خیالات ہی پکا رہے تھے کہ دفعتہً (کسی جاسوس وغیرہ کی زبانی) یہ خبر سُن کر کہ مُسلمان (خندق سے واپس ہوتے ہی) اسی وقت (بنو قریظہ کے مقابلہ کو) نکل کھڑے ہُوئے ہیں تو اللہ عزّ وجل نے ان لوگوں کے دلوں میں رُعب ڈال دیا (اُن کو معلوم ہو گیا کہ لشکرِ اسلام باوجود زخم خوردہ ہونے کے ان کی طرح بزدل اور کمزور نہیں ہُوا اُس کے وہی دم خم باقی ہیں) تو سب (مکّہ ہی کو) واپس بھاگے چلے گئے اور اللہ تعالےٰ نے (اپنی عنایت اور رحمت سے) مسلمانوں کے سر سے وہ بلا ٹال دی

جو اُن لوگوں نے مدینہ پر لوٹ کر حملہ کرنے کی صُورت میں ڈالنا چاہی تھی (یہ تو مختصر حکایت واقعہ تھی اب سمجھو کر اس سے کیا فائدے حاصل ہُوئے)۔

کامیابی اور امدادِ غیبی کا بڑا سبب امتثال امر ہے

اس سے معلوم ہُوا کہ نصرت (اور کامیابی) کا بڑا سبب امتثال امر ہے (کہ اللہ تعالےٰ کے احکام کو بجالایا جائے) کیونکہ یقیناً یہ زخمی مُسلمان جو دو دو آدمیوں کے سہارے سے نکلے تھے نہ (دشمن سے) لڑنے کی طاقت رکھتے تھے نہ کسی کو دفع کر سکتے تھے (محض تعمیلِ حکم کے لیے نکل کھڑے ہُوئے تھے) تو جب اُنہوں نے حکم کے آگے گردن جُھکا دی اور معاملہ کو اللہ کی قُدرت کے حوالہ کر دیا (اور زبانِ حال سے کہہ دیا کہ جتنا ہماری قدرت میں تھا ہم نے کر دیا آگے جو کچُھ ہو گا آپ کی قدرت سے ہو گا) تو اللہ تعالےٰ نے اُن کی ایسی مدد کی کہ بدون لڑے کامیاب ہو گئے۔ ان کو کچھ بھی نہ کرنا پڑا حضرات صحابہ نے اس بات کو خوب سمجھ لیا تھا کہ اللہ تعالےٰ ہم سے صرف اپنے حکم کی تعمیل چاہتے ہیں اور نصرت (وکامیابی) محض اللہ کے (فضل و) انعام سے ہوتی ہے جو وہ اپنے اس ارشاد کی تصدیق کے لیے عطا فرماتے ہیں: وکان حقا علینا نصر المؤمنین "مُسلمانوں کی مدد کرنا ہمارے ذمّہ لازم ہے"۔

(جس کا محض اپنے فضل سے اللہ تعالےٰ) نے ذمّہ لیا ہے۔ اس میں بندہ کا کچھ دخل نہیں۔ اس کا کام تو تعمیلِ حکم ہے۔ انقیاد اور تسلیم کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے کامیابی عطا فرماتے ہیں) اور اپنے بندوں کے ساتھ اللہ تعالےٰ کا معاملہ قیامت تک یہی رہے گا کہ جو اُس کی مدد کرے گا اللہ تعالےٰ بھی اُس کی مدد کریں گے"۔ اور اللہ تعالےٰ کی بات سے بڑھ کر کس کی بات سچّی (ہو سکتی) ہے؟ (پس یہ سنت اللہ بدل نہیں سکتی اگر کسی جگہ دُشمن کے مقابلہ میں باوجود جُملہ اسباب کامیابی مجتمع ہونے کے مُسلمان ناکام رہے ہوں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ بجا آوریٔ احکام میں اُن سے کوتاہی ہوئی ہے) بندہ کی طرف سے اللہ تعالےٰ کی مدد یہی ہے کہ اُس کے حکم کی تعمیل کرے اور جس بات سے منع کر دیا گیا ہے اُس سے پرہیز کرے۔ (اور درحقیقت یہ خود بندہ کی طرف سے اپنی مدد ہے کیونکہ تعمیلِ احکام اور اجتنابِ حرام سے جو کچھ نفع ہے بندہ ہی کا ہے۔ اللہ تعالےٰ کو نہ اس کی اطاعت سے کچھ نفع نہ معصیت سے کوئی نقصان، مگر یہ بھی اُن کی طرف سے نعمت پر نعمت ہے کہ اس کو اپنی نصرت فرما دیا۔ حالانکہ وہ اس سے بری ہیں کہ کوئی اُن کی مدد کرے)

ف ہمارے بزرگوں کا ارشاد ہے کہ شرعاً بندہ سے عمل مقصود ہے۔ کامیابی مقصود نہیں کیونکہ کامیابی اس کے اختیار میں نہیں اس کے اختیار میں عمل ہے۔ پس عمل ہی کو مقصود سمجھنا چاہیئے۔ ثمرات پر نظر نہ کرنا چاہیئے۔ جس شخص کا عمل مرضی الہیٰ کے موافق ہے وہ ظاہری ناکامی کی حالت میں بھی کامیاب ہے۔ کیونکہ سب سے بڑی کامیابی رضائے حق ہے اور وہ اس کو حاصل ہے۔ اس بات کو پیشِ نظر رکھنے سے تمام پریشانیوں کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ سالکین میں زیادہ تر پریشان وہ ہیں جو عمل کو مقصود نہیں سمجھتے بلکہ خاص حالات وکیفیات کو مقصود سمجھتے ہیں جن کو وصل اور وصول اور کامیابی کا لقب دے رکھا ہے۔ حالانکہ یہ حالات اور کیفیات بندہ کے اختیار میں نہیں اور امور غیر اختیار کے درپے ہونا پریشانی مُول لینا ہے۔ پس اُن کو تکمیلِ اعمال کا اہتمام کرنا چاہیئے جو اُن کے اختیار میں ہے جس کا ان کو مکلف کیا گیا ہے۔ جب عمل کامل ہو جاتا ہے تو عادۃ اللہ یہ ہے کہ وصول وکامیابی عطا ہو جاتی ہے اور تکمیل اعمال کا طریقہ یہ ہے کہ آدابِ ظاہرہ کو بھی ادا کیا جائے جو علمائے شریعت سے معلوم ہو سکتے ہیں اور آدابِ باطنہ کی بھی پُوری رعایت کی جائے جو مشائخ طریق سے معلوم ہوں گے۔

آدابِ باطنہ میں بڑا ادب یہ ہے کہ عمل ریا سے پاک ہو۔ رضائے حق کے سوا اُس سے کچھ مقصود نہ ہو اور عمل کے بعد دل میں تواضع ہو۔ عجب پیدا نہ ہو کہ میں نے اتنا بڑا کام کیا بلکہ عمل کو اللہ کا فضل سمجھے اپنا کمال نہ سمجھے۔ اعمال صالحہ سے طبعاً فرحت اور مسرت کا ہونا عجب نہیں یہ تو عمل صالح کی خاصیت ہے کہ اُس سے فرحت

ونشاط اور حلاوتِ باطنہ حاصل ہوتی ہے۔ قل بفضل اللّٰہ و برحمتہ فبذلک فلیفرحوا جیسا گُناہ کی یہ خاصیت ہے کہ اُس سے مومن کے دل کو رنج اور پریشانی ہوتی ہے۔

حدیث میں ہے :

"اذا سرتک حسنتک وساءتک سیئتک فانت مؤمن"

عُجب یہ ہے کہ عمل کو اپنا کمال سمجھے۔ جس کا لازمی اثر یہ ہے کہ دوسروں سے جو اُس کے برابر عمل نہیں کرتے اپنے کو افضل سمجھے اور یہ آداب ظاہرہ و باطنہ جیسا مجاہدۂ باطن میں ہیں۔ اسی طرح جہاد ظاہر میں بھی ہیں۔ مسلمانوں کو جہاد ظاہر میں بھی ان آداب کی رعایت کرنا چاہیئے۔ مثلاً ظاہری ادب یہ ہے کہ فتویٰ شرعی سے جہاد کی اجازت ہو اور جن شرائط کے ساتھ جہاد مشروط ہے وہ سب مجتمع ہوں اور باطنی ادب یہ ہے کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے سوا کچھ مقصود نہ ہو۔

ف یہاں سے سیاسی جدوجہد کرنے والے مسلمانوں کو بھی سبق لینا چاہیئے کہ نصرت الٰہی کا سب سے بڑا سبب مسلمانوں کے حق میں امتثال حکم ہے۔ مسلمان تو اسی طرح کامیاب ہو سکتا ہے مگر ہمارے سیاست دان اس سب سے بڑے سبب کا تو اہتمام نہیں کرتے۔ دوسرے اسباب کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔

یہاں شاید یہ سوال پیدا ہو کہ بعض دفعہ صلحاء بھی تو باوجود اصلاح اعمال کے ناکام ہو گئے ہیں کامیاب نہ ہوئے۔ جواب یہ ہے کہ اعمال دو قسم کے ہیں۔ ایک انفرادی جو ہر شخص کی ذات سے الگ الگ متعلق ہیں۔ ان میں ہر شخص اپنے عمل کی اصلاح سے کامیاب ہو جاتا ہے۔ دوسرے اجتماعی جو مسلمانوں کے اجتماع سے متعلق ہیں۔ انفرادی اعمال میں صلحاء کبھی ناکام نہیں ہوتے جبکہ امتثالِ حکم میں اُنھوں نے کوتاہی نہ کی ہو اور اجتماعی اعمال میں کامیابی کے لیے تنہا صلحاء کا اصلاح عمل کافی نہیں بلکہ جماعت کی جماعت کا عمل درست ہونا چاہیئے یا کم از کم اُن میں سے اکثر کا عمل درست ہو۔ اگر ایسا نہ ہُوا بلکہ اکثر کا عمل مرضیٔ حق کے خلاف ہُوا تو نصرت و کامیابی لازم نہیں۔ لیکن اس صورت میں اگر ناکامی ہُوئی تو جماعت ہی کو ناکام کہا جائے گا ہر شخص کو ناکام نہ کہا جائے گا۔ کیونکہ جن کا عمل مرضیٔ حق کے موافق تھا وہ اُس وقت بھی حقیقۃً کامیاب ہوں گے۔

چنانچہ ایک بزرگ نے ایسے ہی موقع پر ایک شخص کو جواب دیا تھا جس نے بطور طعن کے دریافت کیا تھا کہ آپ کے بزرگوں کی جدوجہد سے کیا حاصل ہُوا؟ فرمایا ؎

سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہ کن
بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

رہا یہ سوال کہ جماعت کی جماعت کے اعمال کی اصلاح تو بہت دشوار ہے۔ اس شرط کے تو یہ معنی ہوئے کہ مسلمان کسی وقت بھی کسی اجتماعی عمل میں کامیاب نہ ہو سکیں گے، جواب یہ ہے کہ کسی اجتماعی عمل میں کامیابی کے لیے زمانۂ ماضی اور مستقبل میں اعمال کا درست ہونا شرط نہیں اگرچہ کمال فلاح اسی سے وابستہ ہے بلکہ حالتِ موجودہ میں اصلاحِ عمل شرط ہے اور یہ کچھ دشوار نہیں کیونکہ سچی توبہ سے ایک منٹ میں پچھلے گُناہ معاف ہو سکتے ہیں۔

پس جب مُسلمان کسی اجتماعی عمل کو شروع کرنا چاہیں اُس وقت سب سے پہلے اُن کا امیر حق تعالےٰ کی جناب میں اپنے تمام گناہوں سے توبہ کرے، پھر سب مُسلمانوں سے کہے کہ ہر شخص سچے دل سے توبہ کرے اس کے بعد حالتِ عمل میں اللہ تعالےٰ کے احکام کی تعمیل کرتے رہیں۔ گناہوں سے الگ رہیں انشاء اللہ کامیابی اُن کے قدم چُومے گی۔ پس جہاں دوسرے اسباب کے لیے جدوجہد کی جاتی ہے اس سب سے بڑے سبب کے لیے بھی تھوڑی سی کوشش کر لی جایا کرے تو کیا حرج ہے؟

شاید اس مقام پر کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ امام حسین علیہ السلام جماعتِ یزید کے مقابلہ میں کیوں ناکام ہوئے۔ وہ تو امتثالِ احکام میں اُس وقت

سب سے بڑھے ہوئے تھے اور اُن کے ہمراہی بھی سب صلحاء تھے۔ جواب یہ ہے کہ اگرچہ نصرت اور کامیابی کے لیے امتثالِ حکم بہت بڑا سبب ہے مگر تنہا یہی کافی نہیں بلکہ دُوسرے اسباب کا مجتمع ہونا بھی ضروری ہے۔ منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ اہلِ حق کی جماعت سے اہلِ باطل کی جماعت دوگنی سے زیادہ نہ ہو۔ اہلِ حق کے پاس سامانِ رسد وغیرہ کی کمی نہ ہو۔ اگر اہلِ باطل کی جماعت دوگنی سے زیادہ ہو یا اہلِ حق کے پاس کھانے پینے کا سامان نہ ہو۔ نہ کہیں سے سامانِ رسد کے آنے کی اُمید ہو تو اُس وقت اہلِ حق کو میدان سے بھاگ جانے یا دُشمن سے دب کر صُلح کر لینے کی اجازت ہے اور بعض دفعہ ایسا کرنا واجب ہے جبکہ مقابلے سے مُسلمانوں سے نفع پہنچنے کی اُمید نہ ہو اور ظاہر ہے کہ حضرت امام کی جماعت اہلِ باطل کی جماعت کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ بچے بڑے سب ملا کر بیاسی[۸۲] آدمی تھے اور لشکرِ یزید چار ہزار سے بھی زیادہ تھا۔ پھر حضرت امامؑ کی جماعت کا پانی بند کر دیا گیا تھا، سب کے سب پیاسے تھے۔ اس حالت میں مقابلے کے جُملہ اسباب مجتمع نہ تھے۔ اس لیے حضرت امام کو شرعًا وہاں سے بھاگ جانے یا صُلح کرنے کی اجازت تھی۔ بھاگنے کا تو راستہ بند تھا کیونکہ دُشمن نے ہر طرف سے محاصرہ کر لیا تھا، صلح کے لیے حضرت امام نے پیام بھیجا تو ظالموں نے اس کو بھی ٹھکرا دیا۔

اب حضرت امام کے سامنے دو ہی راستے تھے یا یزید کی بیعت قبول فرما لیتے اور اس حالت میں شرعًا اس کی اجازت تھی۔ چنانچہ بہت سے صحابہ نے اسی وجہ سے اُس کی بیعت قبول کر لی تھی کہ اپنے اندر مقابلہ کی طاقت نہ پاتے تھے یا باطل کو نیچا دکھانے کے لیے اپنی جان پر کھیل جاتے شرعًا اس کی بھی اُن کو اجازت تھی۔ کیونکہ اس صُورت میں اگرچہ بظاہر اہلِ حق کو کچھ فائدہ نہ تھا۔ مگر باطنًا اہلِ حق اور اہلِ باطل سب کو یہ نفع پہنچنے کی توقع تھی کہ اہلِ حق کو باطل کے سامنے سرنگوں ہونے سے ہمیشہ کے لیے نفرت ہو جائے گی۔ ان کی ہمتیں اظہارِ حق کے لیے بلند ہو جائیں گی اور جماعتِ یزید کو اپنا بر سرِ باطل ہونا واضح ہو جائے گا۔ چنانچہ آپ نے اسی دوسری صورت

کو اختیار فرمایا اور تاریخ شاہد ہے کہ قتل امام حسینؓ کے بعد یزید اور جماعت یزید سب کے سب عامۂ اہلِ سلام کی نظروں میں ایسے ذلیل و خوار ہوئے کہ ان کو کسی سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ہر طرف سے اُن پر لعنت و نفرین کے گولے برستے تھے، شرم کے مارے کسی جگہ سر اُٹھانے کے قابل نہ رہے۔

شہادتِ امام نے اہلِ باطل کا باطل پر ہونا اچھی طرح دُنیا پر روشن کر دیا اور فقہاء نے تصریح کی ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں اگر جان کا خطرہ ہو تو صاحبِ حق کو تنہا اپنی جان پر کھیل جانے کی اجازت ہے اس کو القاء نفس فی التہلکہ نہ کہا جائے گا کیونکہ اس سے گو ظاہر میں اہلِ حق کو نفع نہ ہو مگر باطنًا مسلمانوں کو اصلاحِ عقیدہ کا فائدہ حاصل ہوگا کہ منکر کا منکر ہونا اور بدعت کا بدعت اور قبیح ہونا سب مُسلمانوں پر واضح ہو جائے گا۔ کفار کے مقابلے میں اس طرح جان پر کھیلنا جائز نہیں۔ کیونکہ اس سے نہ مسلمانوں کو کچھ نفع ہے نہ اصلاحِ عقیدۂ کفار کی توقع اور اگر کسی وقت کوئی نفع متصور ہو۔ مثلاً یہ کہ اس سے کفار کے دلوں میں ہیبت و رُعب قائم ہوتا ہو یا اُن کی اغاظت ہو کہ مسلمانوں کی جان بازی سے اُن کے دل جلیں تو وہاں بھی اس کی اجازت ہے۔ تفصیل کتب فقہ سے معلوم کی جائے۔ امید ہے کہ اب اس مقام پر کوئی اشکال باقی نہ رہا ہوگا۔ نیز یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ امتثال احکام سے نُصرت کا وعدہ کفار کے مقابلہ میں ہے مسلمانوں کے مقابلہ میں نہیں۔ اگر مسلمان باہم قتال کریں تو صلحاء کا غلبہ لازم نہیں۔ وفیہ مافیہ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۱۱۲) فحوی کلام بھی بمنزلہ نص کے ہے

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فحوی کلام پر بھی اسی طرح عمل واجب ہے جیسا نص پر عمل کرنا واجب ہے۔ فحوی کلام وہ ہے جو کلام کی قوت (اور تاکید اور قرینۂ حال) سے سمجھا جائے۔ چنانچہ اس واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صحابہ سے یہ فرمایا کہ بنو قریظہ کی طرف روانہ ہو جائیں تو وہ سمجھ گئے کہ مقصود

قتال کے لیے نکلنا ہے اس لیے آپ نے مقصود کو صراحۃً بیان نہیں فرمایا۔ کیونکہ قوتِ کلام سے صحابہ آپ کا مطلب سمجھ گئے تھے۔

جہادِ نفس اور جہادِ شیطان میں کامیابی کا طریقہ التجا ہے

یہ تو جہادِ اصغر کے متعلق حکم تھا جس میں دشمن سے (یعنی کافروں سے) مقابلہ ہوتا ہے۔ یہی حکم جہادِ اکبر کا ہے جس میں نفس کے ساتھ جہاد ہوتا ہے (کہ اس میں بھی امدادِ غیبی اور کامیابی کا بڑا سبب امتثالِ امر ہے) اس کی طرف اللہ تعالےٰ نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے :

واما ینزغنك من الشیطان نزغ فاستعذ باللہ۔

"اور اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ پریشان کرے تو اللہ کی پناہ طلب کیجئے"

(اس میں جہادِ نفس اور جہادِ شیطان کے لیے اللہ کی طرف التجا کو کامیابی کا سبب بتلایا گیا ہے کیونکہ) حالت جس قدر سنگین ہوتی ہے اُسی کے مناسب کامیابی کا ذریعہ بھی بڑا ہوتا ہے۔ چونکہ شیطان اور نفس کا معاملہ زیادہ سنگین ہے تو اس کے مقابلے میں کامیابی کا ذریعہ محض التجا قرار دیا گیا (کہ اللہ کی پناہ طلب کرو، اللہ کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جاؤ) جیسا نفس کے مقابلہ میں کامیابی کا طریقہ یہ ہے کہ شریعت کے موافق مجاہدہ کیا جائے۔ چنانچہ حق تعالےٰ فرماتے ہیں :

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا

"اور جو لوگ ہمارے واسطے (اپنے نفس سے) مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان کو اپنے (رضا و قرب) کے راستے دکھلا دیتے ہیں"

اور اس مجاہدہ میں امداد (غیبی) کا ذریعہ یہ بتلایا کہ اللہ تعالےٰ سے سچے دل سے مدد مانگو (تو اس کا مآل بھی استعاذہ و التجا کی طرف ہوا) چنانچہ ارشاد ہے :

ایاك نعبد وایاك نستعین، اے اللہ! ہم آپ ہی عبادت کرتے ہیں (یہ تو مجاہدۂ نفس ہوا) اور آپ ہی سے مدد مانگتے ہیں (یہ التجا ہوئی جو مجاہدہ میں کامیابی کا وسیلہ ہے) اسی لیے بعض اہلِ توفیق نے فرمایا ہے کہ جب مجھ پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے خواہ کسی قسم کی ہو (ظاہری یا باطنی) تو میں التجا میں مشغول ہو جاتا ہوں۔ پھر اُس کی پرواہ نہیں کرتا اور التجا کے چند طریقے ہیں ایک یہ کہ ذکر اللہ اور عبادت میں ہمہ تن مشغول ہو جائے اور معاملہ کو اللہ کے سپرد کر دے کیونکہ اللہ تعالےٰ نے اپنے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زبانی ارشاد فرمایا ہے :

من شغله ذکری عن مسألتی أعطیته افضل ما اعطی السائلین

"جو شخص میری یاد میں ایسا مشغول ہو جائے کہ مجھ سے مانگنے (اور دعا کرنے) کی بھی اسے فرصت نہ ہو، میں اُس کو مانگنے والوں سے زیادہ دیتا ہوں"

(اس سے معلوم ہوا کہ ذکر اللہ اور عبادت میں ہمہ تن مشغول ہو جانا بھی التجا کی ایک فرد ہے) ایک صورت یہ ہے کہ صدقہ (خیرات) کرے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے استعینوا علی حوائجکم بالصدقة (اپنی حاجات میں کامیاب ہونے کے لیے) صدقہ سے مدد لو۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ دعا میں مشغول ہو جائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے من الهم الدعاء فقد فتح علیه ابواب الخیر۔ جس کو دعا کی توفیق ہو گئی اُس پر خیر کے دروازے کھول دیئے گئے۔ اور اگر ان (تینوں) کے مجموعہ کو اختیار کر لیا جائے پھر تو کیا پوچھنا ؟ کیونکہ اہلِ توفیق کا مشاہدہ ہے کہ خیر (حاصل ہونے) کا جو سبب بھی ہے وہ عین خیر ہے قوله الوجه الخامس فیه دلیل علی ان نحوی الکلام الی قوله هو عین الخیر۔

ف یہ مضمون آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے جو لوگ اثنائے سلوک میں کسی ضیق میں مبتلا ہو جائیں یا اور کسی قسم کی پریشانی پیش آئے اُن کو اسباب سے کام لینا چاہیئے۔ ان شاء اللہ بہت جلد کامیابی نصیب ہو گی۔ جعلنا اللہ من جعله منظرا بالمراد منصورا وجعل کربا تنا کلها هباء منثورا۔

(۱۱۳) نفس کا مُردہ ہونا ہی حیات ہے

اس میں صوفیہ کے ایک قول کی بھی دلیل ہے کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ نفس کا مرجانا ہی اُس کی زندگی ہے۔ جو شخص حیات کا طالب ہو اُسے مُردہ بن جانا چاہیئے (اس مطلب کو اس عنوان سے بھی بیان کیا جاتا ہے موتوا قبل ان تموتوا، مرنے سے پہلے ہی مرجاؤ۔

یعنی ظاہری موت سے پہلے ہی اپنے آپ کو مُردہ بدست زندہ بنادو۔ اپنے ارادہ و اختیار و تجویز اور دعوے کو فنا کردو) کیونکہ حضرات صحابہ کی نظر میں جب اپنے نفس کی کچھ وقعت نہ رہی اور وہ اللہ تعالٰے کے راستے میں موت پر راضی ہو کر نکل کھڑے ہُوئے۔ کیونکہ جو شخص اس حالت سے نکلے گا جو ہم نے صحابہ کی حالت اُوپر بیان کی ہے وہ موت ہی کے ارادے سے نکلے گا تو وہ اُسی وقت نصرت (اور کامیابی) اور ثواب و سلامتی سے کامیاب ہو گئے۔

جس نے جو دولت باطنی پائی ذلّتِ نفس سے پائی

یہی اہلِ توفیق کا حال ہے کہ اُنھوں نے جو کچھ پایا اسی سے پایا ہے کہ اُن کی نظروں میں اپنے نفس کی کچھ قدر و قیمت باقی نہیں رہی اور وہ (ہر وقت اللہ تعالٰے کے حکم پر) اپنی جان دینے کو تیار رہے ہیں اور اہلِ دُنیا اپنے نفس کی محبت سے ذلیل ہو گئے۔ اُن کے لیے یہاں بھی ذلّت لازم ہو گئی اور وہاں بھی۔

حدیث میں وارد ہے کہ ہر بندہ کے سر میں اُس کی (عقل و) حکمت ہے (جس کی باگ[عہ]) فرشتے کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ بڑائی اور بلندی کا

دعوے کرنے لگتا ہے تو فرشتہ اُس کے سر پر چوٹ لگا کر کہتا ہے:

"پست ہو جا خدا تجھے ذلیل کرے"۔ اور اگر تواضع اختیار کرے تو فرشتہ کہتا ہے:

"بلند ہو جا! خُدا تجھے رفعت (و عزّت) دے۔

اللہ تعالٰے ہمیں بھی اپنے فضل سے وہ دولت عطا فرمائیں جس سے اللہ تعالٰی ہم کو اپنا مقرب بنالیں۔ (آمین)

قوله الوجه السادس فيه دليل صوفي الى قوله من الله علينا بما به يقربنا اليه بمنه "



عہ یہاں کوئی لفظ اصل کتاب سے چھُوٹ گیا ہے میں نے اپنے ذوق سے اس کا ترجمہ کر دیا ہے۔

فان كان صوابًا فمن الله ومن رسوله وان كان خطأ فمني ومن الشيطان ۱۲ ظ

باب پنجاہ و ہفتم ۵۷

حدیث

السنة یوم عید الفطر

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم (عیدگاہ کو) عید الفطر کے دن اُس وقت تک نہ جاتے جب تک چند چھوارے نہ کھالیتے۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ اُن کو عدد طاق کی رعایت سے تناول فرماتے (مثلاً تین یا پانچ یا سات)

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ عید الفطر میں سُنت یہ ہے کہ کوئی شخص عیدگاہ کو بدون کچھ کھائے نہ جائے اور مستحب یہ ہے کہ چھوہارے کھائے جائیں اور اُن میں عدد طاق کی رعایت کی جائے۔ اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۱۴) چھوارہ (اور کھجور) مدینہ والوں کے لیے سب چیزوں سے زیادہ آسان (اور سہل الحصول) ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اُسی چیز کو پسند فرماتے تھے جو آسان (اور سہل الحصول) ہو (اس لیے آپؐ عید کے دن چند چھوارے نوش فرما کر نماز کو چلے جاتے)

کھانے پینے میں تکلف خلافِ سُنت ہے اس سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ اس دن ناشتہ

کے لیے تکلف کرنا خلافِ سُنت ہے۔ کیونکہ دل اُسی میں مشغول رہے گا اور سید نا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کو بڑی فکر آخرت کی تھی یہاں تک کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ آپ اپنے گھر والوں سے فرمایا کرتے تھے کھانا ایسا بناؤ جو پیا جا سکے۔ ایسا نہ بناؤ جسے کھانے (اور چبانے) کی ضرورت ہو کیونکہ کھانے اور پینے (کی مدت) میں اتنی اتنی آیتوں کا فرق ہے (یعنی کھانے میں زیادہ دیر لگتی ہے جس سے تلاوتِ قرآن کا حرج ہوتا ہے پینے میں زیادہ دیر نہیں لگتی) پس یہ حضرات دُنیا کو بقدر ضرورت ہی لیتے تھے۔

قولہ فی الوجہ الثانی منہا انہا ایسر الاشیاء عندھم الی قولہ فما کانوا رضوان اللہ علیہم یاخذون من الدنیا الا قدر المزود ۔

ف اس سُنت پر سب سے زیادہ عمل حضرات صوفیہ کا ہے وہ بھی دُنیا بقدر ضرورت ہی لیتے ہیں ما اُس میں تکلف نہیں کرتے جو آسانی سے بلا مشقت و طلب میسّر ہو اُسی پر قناعت کرتے ہیں۔

(۱۱۵) **خیرِ حقیقی امتثال امر ہے** یہاں سے معلوم ہُوا کہ (ہر حال میں) امتثالِ امر ہی حقیقی خیر ہے خواہ نفس کے موافق ہو یا خلاف ہو۔ اگر امتثالِ امر میں خواہشِ نفس کی موافقت بھی ہو جیسا یہاں ہے (کہ عید کے دن سویرے ہی کچھ کھا لینا سُنت ہے اور یہ سُنت خواہشِ نفس کے موافق ہے) اس کے سوا اور جو مواقع اُس کے مشابہ ہوں تو یہ بھی منجملہ نعمتوں کے (ایک بڑی نعمت) ہے کیونکہ اس وقت نفس اپنی خواہش کو بھی پُورا کرتا ہے اور ثواب بھی ملتا ہے۔ ہمارے اس قول کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الاضحیٰ میں عیدگاہ جانے سے پہلے کچھ نہ کھاتے تھے یہاں تک کہ (نماز کے بعد) اپنی ہدی یا قربانی کو ذبح فرماتے (پھر اُس میں سے کھاتے) اور قربانی میں سے بھی سب سے پہلے گوشت[ع] جگر تناول فرماتے کیونکہ یوم النحر میں جملہ طاعات

[ع] ہذہ ترجمۃ قولہ زیادۃ الکبد و فی مختصر القاموس زائدۃ الکبد هنیئۃ منہ صغیرۃ الی جانبہ ستحیۃ عنہ اھ

سے افضل اراقۃ الدم (یعنی قربانی کرنا) ہے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ جس چیز کو اللہ تعالےٰ پسند فرماتے ہیں اسی کو پہلے تناول کیا جائے (اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ بعض دفعہ اُن افعال میں بھی ثواب ملتا ہے جو خواہش نفس کے موافق ہیں۔ جیسے کھانا پینا وغیرہ۔ یہ ضرور نہیں کہ ثواب اُسی کام میں ملا کرے جو نفس کے خلاف ہو) ۔

یہاں ایک سوال ہو سکتا ہے وہ یہ کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے گوشۂ جگر کیوں کھاتے تھے ؟ تو واللہ اعلم اس کی وجہ یہ تھی کہ اہل جنت کے ساتھ تشبہ ہو جائے کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ پہلا کھانا جو جنتی کھائیں گے اُس مچھلی کا گوشۂ جگر ہو گا جس پر تمام زمینوں کا مدار ہے (اور یہ بھی احتمال ہے کہ کلیجی جلدی تیار ہو جاتی ہے گوشت کے پکنے میں دیر ہوتی ہے اس لیے آپؐ پہلے کلیجی تناول فرما لیتے تاکہ زیادہ دیر تک بھوکا رہنے سے تکلیف نہ ہو۔

مذمّت مخالفت سنت و ترجیح عادت

یہاں سے معلوم ہُوا کہ آج کل کے اہل تنعم دُنیا داروں کا یہ طریقہ یہ کہ عید الاضحےٰ کی رات ہی پہلے سے گوشت تیار کرتے اور قسم قسم کے کھانے پکاتے اور قربانی کا جانور ذبح کرنے سے پہلے ہی کھا لیتے ہیں سُنّت کے خلاف ہے۔ یہ تو اُن کا حال ہے جو قربانی کرتے ہیں اور بہت سے تو قربانی چھوڑ کر سُنّت کی مخالفت کرتے ہیں کہ (باوجود صاحبِ نصاب ہونے کے قربانی نہیں کرتے) غرض بعض دفعہ شریعت کے اچھے کام بھی اُن بدعتوں اور مخالفتوں سے رنگ دیئے جاتے ہیں جن کو لوگوں نے اپنا دستور العمل بنا لیا ہے (چنانچہ قربانی کرنا سُنّت ہے مگر اس کو سُنّت کے موافق ادا نہیں کیا جاتا کیونکہ رواج کے موافق ادا کیا جاتا ہے کہ قربانی سے پہلے ہی انواع و اقسام کے کھانے تیار کر کے کھائے جاتے ہیں حالانکہ سُنّت یہ ہے کہ سب سے پہلے قربانی کا گوشت کھایا جائے) اور یہ لوگ بطور حجت کے یہ کہہ دیتے ہیں کہ لوگوں کی عادت (اور قوم کا رواج) یوں ہی ہے مگر ایسے لوگوں

کو ہم آدمی کس طرح کہیں جو اپنے نبی کی سُنّت کو چھوڑتے اور اپنی بُری عادتوں کو سُنّت پر ترجیح دیتے ہیں ۔

قولہ الوجہ الثالث فیہ من الفقہ ان حقیقۃ الخیر ہو نفس الامتثال الی قولہ دیؤثرون عادۃ نفوسہم الذمیمۃ ۔

ف یہ ہے تصوّف حقیقی کہ ادنیٰ ادنیٰ عمل میں بھی اتباعِ سُنّت کا اہتمام کیا جائے۔ صوفیہ محققین کے نزدیک وہ لوگ آدمی نہیں جو سنت نبویہ کو چھوڑ کر رسم و رواج کو اُس پر ترجیح دیں ۔ واللہ المستعان ۔

یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی بھی واضح ہوگئی جو ثواب کا مدار مخالفت نفس ہی پر سمجھے ہُوئے ہیں ۔ حالانکہ مدار فضیلت امتثال امر ہے خواہ نفس کے موافق ہو یا خلاف ہو خوب سمجھ لو ۔



حدیث

العمل فی ایام التشریق

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی زمانے میں عمل کرنا ان دنوں کے عمل سے افضل نہیں (مراد ایام تشریق ہیں) صحابہ نے کہا یا رسول اللہ! اور جہاد بھی نہیں فرمایا! جہاد بھی نہیں مگر یہ کہ کوئی شخص اپنے جان و مال کو خطرے میں ڈال دے پھر کچھ لیکر واپس نہ ہو"

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ کسی زمانے میں عمل کرنا ایام تشریق کے عمل کے برابر نہیں اور وہ یوم النحر کے بعد تین دن ہیں " اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

ایامِ عید عبادت کے لیے ہیں لہو و لعب کے لیے نہیں ہیں

(۱۱۶) اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایام اگرچہ عید کے دن ہیں مگر عبادت کے لیے ہیں لہو (ولعب) کے لیے نہیں" تو آج کل جو بیہودگیاں ان دنوں میں کی جاتی ہیں وہ اس حدیث سے ممنوع ہیں۔

اب اگر کوئی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے احتجاج کرے لکل امۃ عید و ہٰذا یومٍ عید نا ۔ ہر اُمت کی ایک عید (ہوتی) ہے اور یہ دن

ہماری عید کا ہے تو (اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے (اس کے ساتھ) اُن کاموں کو بھی تو بتلا دیا ہے جو ان دنوں میں جائز کئے گئے ہیں۔ (اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا کہ یہ دن ہماری عید کا ہے) چنانچہ ارشاد فرمایا:

انماھی ایام اکل وشرب وذکر اللہ ۔ "بس یہ دن کھانے پینے اور اللہ کو یاد کرنے کے ہیں"

(جس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی عید دوسری قوموں کی عید کی طرح لہو و لعب کی عید نہیں بلکہ ذکر اللہ کی عید ہے) نیز ارشاد فرمایا افضل ما یعمل فیھا اراقۃ الدماء سب سے افضل عمل جو ان دنوں میں کیا جاتا ہے خون بہانا (یعنی قربانی کرنا) ہے اور اس میں سُنت یہ ہے کہ اپنی قربانی میں سے خود بھی کھائے۔ صدقہ بھی کرے (دوستوں عزیزوں کو) ہدیہ بھی دے۔ غرض ان دنوں میں سب سے اعلیٰ عبادت مشروع کی گئی ہے یعنی ذکر اللہ، کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ما عمل آدمی عملا انجی لہ من عذاب اللہ من ذکر اللہ ۔

"آدمی کوئی عمل اللہ کے عذاب سے زیادہ نجات دینے والا ذکر اللہ سے بڑھ کر نہیں کرتا"

اور قربانی میں مال کا خرچ کرنا بھی مشروع کیا گیا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے تنافسوا فی اثمانھا فانھا مطایاکم الی الجنۃ ۔ قربانی کی قیمتوں میں دل کھول کر خرچ کیا کرو کیونکہ وہ جنت کے (پہنچانے کے لیے) تمہاری سواریاں ہیں۔ اور قربانی میں صدقہ بھی مشروع کیا گیا اور صدقہ جیسا حدیث میں ہے تطفئ غضب الرب اللہ کے غصّہ کو کم کرتا ہے۔ بس ان دنوں میں جس مجاہدۂ نفس سے منع کیا گیا ہے وہ صرف روزہ ہے اور کچھ نہیں۔ باقی عبادات سب مطلوب ہیں خواہ وجوبًا یا استحبابًا کیونکہ فرض (واجب) تو بشرط قدرت کسی وقت بھی ساقط نہیں ہوتا نہ عید میں نہ اور دنوں میں اور یہ حدیث (جو اس باب میں مذکور ہے) تمام مستحبات کی ترغیب دے رہی ہے اور ان ایام میں اُن کے ادا

کرنے کو دوسرے ایام سے افضل بتلا رہی ہے جس سے تاکید مقصود ہے (کہ ان ایام میں دُوسرے دنوں سے زیادہ مستحبات کا اہتمام کرنا چاہیئے کیونکہ ان ایام کا ہر عمل جہاد سے بھی افضل ہے۔

اوقاتِ غفلت میں عبادت کرنا افضل ہے

یہاں ایک سوال ہے کہ ان ایام میں اعمال کی فضیلت کسی علت کی بناء پر ہے یا تعبد محض ہے (جس کی کوئی علت نہیں) تو (جواب میں) ہم کہتے ہیں کہ ایک علت کی وجہ سے ہے وہ یہ کہ قواعد شرعیہ سے یہ بات ثابت ہے کہ اوقات غفلت میں عبادت کرنا افضل ہے جیسا مغرب و عشاء کے درمیان نماز پڑھنے کی فضیلت وارد ہے کیونکہ یہ لوگوں کی غفلت کا وقت ہے اسی طرح قیام اللیل (اور تہجد) کی فضیلت کہ وہ بھی غفلت کا وقت ہے لوگ اس وقت غفلت اور نیند میں ہوتے ہیں۔ اسی طرح نماز چاشت کی فضیلت کیونکہ اس وقت بھی لوگ اپنے اسباب (معاش) میں غافل ہوتے ہیں۔ غرض ایسی بہت نظیریں ہیں (جن سے اوقاتِ غفلت میں عبادت کی فضیلت ثابت ہے) تو چونکہ یہ ایام عید بھی کھانے پینے اور نفس کی راحت کے دن ہیں اس لیے ان دنوں میں لوگوں پر نیند اور غفلت کا زیادہ غلبہ ہوتا ہے (تو جس شخص ان دنوں میں عبادات اور ذکر میں لگا رہے گا اُس کو بہت بڑی فضیلت حاصل ہو گی۔)

عیدین یا نکاح میں دف بجانا جائز ہے یا نہیں ؟

باقی آج کل تو نیک کاموں سے رغبت ہی اُٹھ گئی۔ اب تو ان دنوں کو لہو و لعب اور حرام کاموں کے لیے خاص کر لیا گیا ہے اور حجت کے طور پر یہ حدیث پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم (عید کے دن) حضرت عائشہ کے گھر میں داخل ہوئے تو اُن کے پاس قبیلہ بنو النجار کی چھوکریاں (گا رہی اور) دف بجا رہی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کی طرف پشت کر کے اپنے بستر پر لیٹ

گئے۔ کچھ دیر کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وہاں آئے تو لڑکیوں کو دھمکایا اور فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے گھر میں یہ شیطان کا باجہ ؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔ "ان کو (اپنے حال پر) رہنے دو۔ کیونکہ یہ عید کا دن ہے (ان کو بھی اپنا جی خوش کرنے دو) اگر یہ حدیث صحیح ہو[عہ] تب بھی اس میں (جواز لہو و لعب کے لیے) کچھ حجت نہیں کیونکہ (بظاہر یہ واقعہ ابتدائے اسلام کا ہے۔ اُس وقت تو شراب بھی حلال تھی، سود بھی حلال تھا، جُوا بھی جائز تھا اور بہت سے فرائض اس وقت تک فرض نہ ہوئے تھے۔ پھر حکم اس کے خلاف جاری ہوا (شراب و ربا و قمار حرام کر دیئے گئے اور بہت سے فرائض لازم کئے گئے) کیا تم نہیں دیکھتے کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

انما بعثت بکسر الدف والمزمار "میں تو ڈھپڑوں اور باجوں کو توڑنے کو مبعوث ہُوا ہوں"۔

یہ سُن کر صحابہ رضی اللہ عنہم (مجلس سے) نکلے اور بچوں کے ہاتھوں سے دف اور باجے چھین کر توڑنے لگے تو جن چیزوں کی اباحت ابتدائے اسلام میں بعض احادیث سے معلوم ہوتی ہے پھر بعد میں اُن کی حرمت ثابت ہو گئی۔ اُن احادیث سے یہ حجت قائم نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ منسوخ ہو چکی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی تصریح فرما دی ہے :

لھو المؤمن لا یکون الا فی ثلاث فی رمیہ عن قوسہ و تادیبہ لفرسہ وملاعبۃ لاھلہ۔

"کہ مومن کا لہو (و لعب) تین چیزوں کے سوا نہیں ہوتا (۱) کمان کے ساتھ تیراندازی کرنا (۲) اپنے گھوڑے کو شائستہ بنانا (۳) اپنی بیوی سے دل لگی کرنا (اُس کے ساتھ کھیلنا) پھر ان تین پر چوتھی چیز کا اضافہ کیسے ہو سکتا ہے !

[عہ] احقر کہتا ہے کہ یقیناً صحیح ہے فقد اخرجہ الشیخان وغیرھا ۱۲ ظ

اور اس مضمون میں بہت حدیثیں (وارد) ہیں (کہ ان تین کے سوا (لہو ولعب باطل ہے) اور حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

ومن الناس من یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ

"بعض لوگ لہو (ولعب) کی باتیں اختیار کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے راستہ سے گمراہ کریں۔"

پس لہو شرعاً ممنوع ہے عیدین ہو یا غیر عیدین سوا اُس کے جو ہم نے ابھی بیان کیا (اور وہ بھی محض صورۃً لہو ہے حقیقتہً لہو نہیں۔ کیونکہ تیراندازی اور گھوڑے کی سواری جہاد میں کارآمد ہے اور بیوی کے ساتھ دل لگی ہنسی کرنے میں اُس کی دلجوئی ہے جس سے محبت میں ترقی ہوتی ہے اور زوجین میں باہم تعلق محبت ہونا مصالح نکاح کی بنیاد ہے)

الوجہ الاول منھا ان فیہ دلیلا علی ان ھذہ الایام وان کانت ایام عید الی قولہ فاللھو ممنوع شرعا الا ما ذکرنا ثانیا۔

ف مزامیر کی حرمت پر تو فقہاء کا اتفاق ہے اور دف کے متعلق جمہور فقہاء کا قول یہ ہے کہ عیدین میں اور نکاح اور خوشی کے موقع میں جائز ہے بشرطیکہ ویسے ہی بے قاعدہ بجا دیا جائے۔ قواعد موسیقی کے طریقہ پر تطریب کے ساتھ نہ ہو کیونکہ آثارِ صحابہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی مواقع سرور میں بالخصوص نکاح میں دف کی اجازت دی ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ حدیث عائشہؓ منسوخ نہیں اور حضرت عائشہؓ کے گھر میں جو لڑکیاں دف بجا رہی تھیں وہ باقاعدہ گانے والیاں نہیں تھیں۔

حدیث میں تصریح ہے وجاریتان تغنیان ولیستا بمغنیتین کہ دو لڑکیاں گا رہی تھیں اور وہ گانے والیاں نہ تھیں" اور فتح کی حدیث میں غالباً دف کا لفظ نہیں ہے بلکہ معازف کا لفظ ہے اور **معازف** وہ باجا ہے جو ہاتھ سے بجایا جاتا ہے جیسے ستار، ڈھولک، سارنگی، ہارمونیم وغیرہ اور مزامیر وہ

باجہ جو مُنہ سے بجایا جائے جیسے تُرئی۔ نفیری اور بین وغیرہ۔ دف کو معازف میں عام طور سے شمار نہیں کیا جاتا وہ الگ چیز ہے۔ یہ فقہاء حنفیہ و شافعیہ کا مسلک ہے اور احوط وہ ہے جو شارح نے بیان کیا ہے کہ سب ہی سے احتراز کیا جائے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ف یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی معلوم ہوگئی جو ایامِ تشریق میں عبادت کا اہتمام نہیں کرتے۔ اُن کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلامی عید دوسری قوموں کی عید سے جُدا ہے۔ اسلامی عید کا حاصل یہ ہے کہ سال بھر جو نفس کو مجاہدہ اور خلوت کے ساتھ عبادت میں مشغول کیا تھا چند دنوں اُسے خوش کر کے بھی عبادت میں لگایا جائے تاکہ مجاہدہ سے جو بعض دفعہ ایک قسم کی افسردگی پیدا ہو جاتی ہے اُس کی تلافی ہو جائے۔ ایامِ عید میں جب نفس کو اچھے کھانوں، اچھے کپڑوں اور دوستوں کی ملاقاتوں سے خوش کیا جائے گا تو اب وہ انشراح اور خوشی کے ساتھ عبادت میں لگے گا۔ پس ایامِ عید میں بھی نفس کو آزاد نہ چھوڑا جائے بلکہ اُسے خوش کر کے کام میں لگایا جائے۔ اگر عید کے دنوں میں آزاد رکھا گیا تو وہ چند دن اور بھی آزاد رہنا چاہے گا اور اس طرح آزادی کا راستہ کھولنے سے سال بھر عبادات میں خلل رہے گا۔

ف یہاں سے آج کل کے اہلِ سماع کو بھی سبق لینا چاہیئے کہ وہ سماع میں اُن آلات لہو سے بھی پرہیز نہیں کرتے جن کی حرمت پر سب علماء کا اتفاق ہے۔ دیگر آدابِ سماع کی تو کیا رعایت کریں گے کہ سامعین سب اہل ہوں۔ نااہل کوئی نہ ہو۔ سنانے والا بھی اہل ہو۔ صاحبِ دل ہو۔ مضمون بھی لغو و بیہودہ نہ ہو بلکہ حمد و نعت یا کلامِ معرفت ہو اور سماع بھی بحالتِ اضطرار ہو رہا ہو کہ بدون اُس کے قبض کسی طرح مرتفع ہی نہ ہوتا ہو۔ وغیر ذلک من الشرائط التی ذکرھا القوم الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ ط

(۱۱۷) ایامِ تشریق ابتلاء و امتحان کے ایام ہیں

ایامِ تشریق کو ایک اور فضیلت بھی ہے کہ یہ ایام حضرت

خلیل علیہ الصلوۃ والسلام کے ابتلاء و امتحان کے ایام ہیں (پس ان میں اس ابتلاء کو یاد کر کے لہو ولعب سے بچنا چاہیئے) پھر اللہ تعالےٰ نے اُن پر کرم فرمایا کہ محنت (و آزمائش) کو نعمت سے اور کتنی بڑی نعمت سے بدل دیا کہ جنت سے ایک دُنبہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے فدیہ میں آیا اور حضرت ابراہیمؑ کو بانی سنت اضحیہ بنا دیا گیا کہ اب قیامت تک کی تمام قُربانیوں کا ثواب اُن کو بھی ملتا رہے گا۔)

ان دو وصفوں کی وجہ سے یہ ایام تمام ایام سے افضل ہو گئے اور اللہ سبحانہٗ جب اپنے بندوں میں سے کسی پر کوئی احسان فرماتے ہیں اس کو زائل نہیں کرتے پس اُن کے لیے اس فضیلت کو باقی رکھا اور اس میں یہ زیادتی فرمائی کہ نعمت کو بھی باقی رکھا یعنی (ہمیشہ ہمیشہ کو) اُن کے لیے قربانی اور اُس کے متعلقات مشروع کر دیئے گئے (کہ نماز بھی پڑھیں۔ تکبیریں بھی عید کی نماز میں زیادہ کہیں اور ہر نماز کے بعد بلند آواز سے تکبیرات تشریق کی پابندی کریں) اور محنت (و مشقت) کو بھی اُن سے مرتفع کر دیا۔ یعنی بچوں کے ذبح کرنے (کے حکم) کو (قبل از عمل ہی منسوخ کر دیا گیا۔ اب ان کی جگہ جانوروں کی قربانی واجب کر دی گئی۔)

کیا ایامِ تشریق میں ہر عمل دوسرے ایام کے اعمال سے افضل ہے ؟ یا خاص اعمال ہی افضل ہیں ؟

یہاں ایک سوال ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "ما العمل" میں الف و لام جنس کا ہے کہ اس فضیلت میں فرائض و مستحبات علی اختلاف الدرجات سب مساوی ہیں یا لام عہد ہے جس سے مخصوص اعمال مُراد ہیں ؟ تو لفظ کا صیغہ (اور اس کی صورت) دونوں کو محتمل ہے۔ پس ان ایام میں جو فرائض ادا کیئے جائیں گے وہ بھی دوسرے ایام کے فرائض سے افضل ہوں گے۔ جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز کے متعلق فرمایا ہے من شهدها فی

جماعة فكانما قام ليلة "جس نے صبح کی نماز جماعت سے پڑھی گویا اُس نے رات بھر نماز پڑھی" اور عشاء کے متعلق فرمایا ہے: من شهدها فی جماعة فكانما قام نصف ليلة "جس نے عشاء جماعت سے پڑھی اُس نے گویا آدھی رات نماز پڑھی" تو دیکھو یہ بھی جماعت سے ادا کی گئی ہے اور وہ بھی مگر دونوں کے ثواب میں آدھوں آدھ کا فرق ہے۔ اس کی وجہ بجز اُس کے کچھ نہیں کہ صبح کی نماز میں عشاء کی نماز سے زیادہ مشقت ہے۔ کیونکہ صبح کے وقت بہت لوگ جنابت کی حالت میں اور غفلت کی نیند میں ہوتے ہیں۔ عشاء کے وقت یہ بات نہیں ہوتی۔

اسی طرح ایامِ تشریق کے اندر لوگ کھانے پینے اور راحت کرنے، بیویوں سے مشغولی ہونے کے سبب زیادہ غفلت میں ہوتے ہیں۔ اس علت پر نظر کر کے یہ ایام اور دنوں سے افضل ہو گئے اور ان میں عمل کرنا مطلقاً جہاد کے مشابہ ہو گیا کیونکہ جہاد کی بھی دو قسمیں ہیں۔ فرض اور نفل، اور ان ایام میں بھی ہر طرح کے اعمال ادا ہوتے ہیں۔ فرائض بھی سنن و مستحبات بھی۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ لام عہد کے لیے ہو جس سے اُن اعمال پر اشارہ ہوگا جو احادیث میں اُوپر بیان ہوئے ہیں کہ یہ دن کھانے پینے اور ذکر اللہ کرنے کے ہیں اور بہتر یہی ہے کہ لفظ کو عموم پر رکھا جائے کہ اس میں زیادہ فائدہ ہے۔ اس صورت میں ان حدیثوں کا جو خاص اعمال پر دلالت کر رہی ہیں۔ مطلب یہ ہوگا کہ ان دنوں میں فرائض کے بعد جن اعمال کا اہتمام کرنا چاہیئے اُن میں سب سے مقدم وہ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے ہیں۔ یعنی قربانی کرنا، ذکر اللہ کرنا، صدقہ کرنا۔ یہ مطلب نہیں کہ ان کے سوا اور اعمال نہ کیئے جائیں۔ ہماری اس بات کی تائید رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے ما عمل آدمی افضل (کسی آدمی نے ان ایام میں کوئی عمل قربانی سے افضل نہیں کیا) تو آپ نے ان مخصوص اعمال کو افضلیت کے

طور پر بیان فرمایا ہے اور جن اعمال کو افضلیت کے طریقہ پر بیان کیا جائے۔ اُن کے ساتھ دُوسرے اعمال بھی جمع ہو سکتے ہیں اور اگر کوئی ان اعمال (مخصوصہ) پر قادر نہ ہو (مثلاً قربانی کی وسعت نہیں نہ صدقہ کر سکتا ہے) تو فرائض سے زیادہ کچھ نیک کام کر لینے سے اپنے کو محروم نہ رکھے (مثلاً ذکر اللہ اور تلاوت قرآن اور نوافل ہی کی کثرت کرے۔)

قوله فی الوجه الاول وفضلت ایضا من نوع اخراعنی ایام التشریق الی قوله فلا یخلی نفسه من الخیر الزائد علی الفرائض۔

(۱۱۸) فضیلت جہاد و مجاہدہ

حدیث میں فضیلت جہاد پر بھی دلالت ہے کیونکہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے (ایام تشریق کے عمل کی فضیلت سُن کر) عرض کیا ولا الجهاد (یا رسول اللہ! اور کیا جہاد بھی اس سے افضل نہیں) اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے فضیلت جہاد ثابت نہ ہو چکی ہوتی تو صحابہ اس طرح سوال نہ کرتے (معلوم ہوا کہ جہاد کی فضیلت اُن کو پہلے سے معلوم تھی) اور جہاد کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی وارد ہے:

اعمال البر فی الجهاد کبزقة فی البحر۔

"نیک اعمال جہاد کے مقابلہ میں ایسے ہیں جیسے سمندر کے سامنے ایک کُلی پانی"۔

یہاں ایک سوال ہے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کی چند قسمیں قرار دی ہیں اور جہاد کی اعلیٰ قسم میں اُس صورت کو بیان فرمایا جو دوسرے موقعہ میں شرعاً ممنوع ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں (الا رجل) خرج یخاطر بنفسه وماله۔ مگر وہ شخص جو جہاد میں نکلا اور اپنی جان و مال کو خطرے میں ڈال دیا، حالانکہ دُوسرے مواقع میں جان و مال کو خطرے میں ڈالنا ممنوع ہے۔ پھر اس پر بس نہیں بلکہ اس صورت کی افضلیت کو اس پر موقوف کیا گیا کہ جان و مال کو خطرے میں ڈال دینے کے بعد ہلاکت محقق بھی ہو جائے۔ چنانچہ

ارشاد ہے فلم یرجع بشیٔ (کہ پھر ان میں سے کچھ لے کر واپس نہ ہوا) حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ولا تلقوا بایدیکم الی التهلکة "اپنے ہاتھوں خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو (جس سے معلوم ہوا کہ جان و مال کو قصداً ہلاکت میں ڈالنا ممنوع ہے۔)

مامور بہ میں اُسی کی نوع سے زیادتی کرنا محمود ہے

جواب یہ ہے کہ جو شخص مامور بہ میں اُسی کی نوع سے کچھ زیادتی کرتا ہے وہ زیادہ تعریف و مدح کا مستحق ہوتا ہے جیسا توکل، امور بہ ہے کہ شرط ایمان ہے۔ اس میں جتنی زیادتی ہوگی اتنی ہی مدح ہوگی۔ چنانچہ ارشاد ہے:

من توکل علی اللہ حق توکله "جو اللہ پر توکل کرے پورا توکل"

(اسی طرح تقوے کے بارے میں ارشاد ہے "اتقوا اللہ حق تقاته" (اللہ سے ڈرو جیسا اُس سے ڈرنے کا حق ہے) اسی طرح ایثار خصائل ایمان سے ہے۔ اُس میں بھی اُسی وقت مدح ہوگی جبکہ زیادہ ایثار کیا جائے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ویؤثرون علی انفسهم ولو کان بهم خصاصة "اور وہ دوسروں کو اپنے اُوپر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود بھُوکے رہیں) اور اس کا تتبع کیا جائے تو بہت نظیریں ملیں گی۔ اب سمجھو کہ جہاد کا مشروع ہونا چونکہ ہلاکتِ نفس کی طرف مفضی ہے۔ تو جو شخص جہاد کے موقعہ پر اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال دے گا اس کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہوگی کیونکہ (یہ) امور بہ میں اُسی کی نوع سے زیادتی ہے اور مامور بہ میں زیادتی کرنا اخلاص اور صدق کی دلیل ہے اور اخلاص و صدق تمام اعمال سے بلند تر ہیں۔ نیز رضائے خداوندی مامور بہ کو پوری طرح بجالانے سے حاصل ہوتی ہے تو اُس میں زیادتی کرنا طلب رضا میں ترقی کرنا ہے۔ جیسا موسیٰ علیہ السلام نے (حق تعالیٰ سے) عرض کیا تھا وعجلت الیک رب لترضی (اے اللہ! اور میں آپ کے پاس جلدی کر کے آگیا تاکہ آپ راضی ہوں۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ مامور بہ میں زیادت موجب زیادت رضا ہے اور اسی پر زیادہ مدح ہوتی ہے)

اسی لیے جب شاہ سوار کی تعریف کی جاتی ہے تو کہتے ہیں فارس احمق بڑا احمق سوار ہے اور یہ اُس کی اعلیٰ درجہ کی مدح ہے۔ کیونکہ احمق ہی اپنے کو خطرہ میں ڈالتا ہے اور اسی سے اُس کی شہسواری ظاہر ہوتی ہے۔

احوال نفیسہ بدوں مجاہدات کے حاصل نہیں ہو سکتے۔

اس میں صوفیہ کی بھی دلیل ہے کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ تم احوال نفیسہ تک بدون نفس نفیس کے ہلاک کرنے اور مجاہدات سے اُس کو خطرے میں ڈالنے کے نہیں پہنچ سکتے۔ اسی سے تم انتہا کو پہنچ سکتے ہو۔ جب (اس مُردار) کمینہ دُنیا کا طالب یوں کہتا ہے ع

احاول ملکا او اموت فاعذرا " میں ملک لے کے ہٹوں گا یا اُسی کی طلب میں مر جاؤں گا۔ تا کہ معذور شمار کیا جاؤں۔ حالانکہ دُنیا کی سلطنت حاصل بھی ہو جائے تو لامحالہ فنا ہونے والی ہے (اس کو بقاء نہیں) اور آخرت میں (حکومت کا) غالب انجام یہ ہے کہ اس سے ہمیشہ کی کلفت ہی نصیب ہوگی۔ تو اب تمہارے نزدیک اُس شخص (کی طلب) کا کیا حال ہونا چاہیے جو دربار قدس میں پہنچ کر مقعد صدقٍ[عہ] سے قدرت والے بادشاہ کے نزدیک سرفراز ہو۔ سلطنت ابد کا طالب ہے وہ تو یوں کہے گا ؎

دعوني ياعذالي في هواه خلعت عذاري ويذكراه علالوني فتقواء شعاري
وتملوا مطايا اعمال خشية للجواد وبالنفوس جودوا بلا تلعثم منكم ولا انكاد
وايقنوا بوصل الحبيب عند فيض الادمع الغزار

(ترجمہ) اے ملامت گرو ناصحو مجھے چھوڑ دو۔ میں نے اُس کی محبت میں حیا کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ اُسی کے ذکر سے میرا دل بہلاؤ کہ اُس کا تقویٰ ہی میرا شعار ہے اور اعمال کی تیاریاں تیار کر لو جو قرب (حاصل کرنے) کے لیے تیزی کے ساتھ چلنے والی ہوں۔ اور اپنی جانوں کو بدون کسی رکاوٹ اور انکار کے پیش کر دو اور آنسوؤں کے بہنے کے وقت وصال محبوب کا یقین رکھو۔ قوله الوجه الثاني وفيه دليل على فضيلة الجهاد الى قوله عند فيض الادمع الغزار۔

ف جان کو خطرہ میں ڈالنا جہاد کے سوا دوسرے مواقع میں جائز نہیں۔ جہاد کے موقعہ پر جائز ہے کیونکہ جہاد کا موضوع ہی یہ ہے کہ قتال کے ذریعے اللہ کا بول بالا کیا جائے اور ذلت بدون جان کی بازی کے نہیں ہو سکتا تو وہاں خطرے میں اپنے کو ڈال دینا جائز بلکہ محمود ہے۔ چنانچہ بعض صحابہ سے ثابت ہے کہ انہوں نے جہاد کے موقعہ پر تنہا ہزاروں پر حملہ کیا۔ دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور بہتوں کو مار کر نکل آئے۔ یہ قاعدہ بہت ہی نفیس ہے کہ مامور بہ میں اُسی کی نوع سے زیادتی کرنا محمود ہے۔ دوسری نوع سے زیادتی کرنا محمود نہیں۔ مثلاً نماز میں جتنا بھی خشوع و خضوع ہوگا محمود ہوگا۔ مگر اوقات میں زیادتی کرنا کہ جن اوقات میں شریعت نے نماز سے منع کیا ہے اُن میں بھی نماز پڑھنے لگے مذموم ہے کہ یہ دوسری نوع کی زیادت ہے۔ اسی طرح فرائض کی رکعات معینہ میں زیادتی کرنا مذموم ہے کہ حدود سے تجاوز ہے۔ و علیٰ ہذا القیاس۔

عہ مقعد صدق یا اعلیٰ درجہ ہے ۱۲

باب پنجاہ و نہم ۵۹

حدیث

جواز التنفل علی الدابۃ فی السفر

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں اپنی سواری پر رات کی نماز (یعنی تہجد) پڑھا کرتے تھے۔ جدھر بھی اُس کا رُخ ہوتا اور سر سے اشارہ کرتے تھے۔ مگر فرائض (سواری پر) نہیں پڑھتے۔ (وتر اُسی پر پڑھا کرتے تھے۔

شرح ظاہر حدیث سے معلوم ہوا کہ سواری پر نفلیں پڑھنا سفر میں جائز ہے خواہ سوار کا منہ قبلہ کی طرف ہو یا نہ ہو۔ اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۱۹) نمازِ نفل کی فضیلت حدیث سے نفل نماز پڑھنے کی فضیلت ثابت ہو رہی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں بھی نماز نفل کو ترک نہیں کیا۔ حالانکہ سفر میں بوجہ مشقت کے فرائض کے اندر تخفیف ہو جاتی اور اُن کی ہیئت بدل جاتی ہے۔ پھر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز نفل کو بدستورِ سابق مستحب قرار دیا اور اُس کے لیے نماز کا نام باقی رکھا جس کا بجالانا مطلوب ہے۔

نماز کو کسی وقت کیوں ساقط نہیں کیا گیا یہاں ایک سوال ہے وہ یہ کہ نماز کو مرض اور خوف اور سفر

میں کیوں باقی رکھا گیا۔ حالانکہ اُس کی صورت (ان عذروں کی وجہ سے) بدل جاتی ہے جیسا کہ معلوم ہے مگر کسی حالت میں بھی جب تک عقل باقی رہے نماز چھوڑنے کی اجازت نہیں دی گئی تو (جواب میں) ہم کہتے ہیں واللہ اعلم اس میں دو حکمتیں ہیں ایک یہ کہ نماز کفر و ایمان میں فارق (اور ممیز) ہے اور ایمان کی علامت ہر حال میں مطلوب ہونا چاہیئے جیسا ایمان ہر حال میں مطلوب ہے مگر یہ کہ عقل ہی زائل ہو جائے تو اُس وقت انسان مکلف نہیں رہتا (اسی طرح نماز بھی بجز زوال عقل کے کسی حال میں ساقط نہیں ہوتی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ نماز بندہ اور حق تعالےٰ کے درمیان وُصلہ ہے (یعنی اللہ تعالےٰ سے تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے) اور جو چیز اللہ تعالیٰ کے بندہ اور درمیان وصلہ ہو اُس کا (ہر حال میں) بندہ محتاج ہے اسی لیے نماز (ہر حالت میں) باقی رکھی گئی اور عذر کے موافق طرح طرح سے اُس میں تخفیف کر دی گئی۔ جیسا سب کو معلوم ہے (کہ سفر میں چار فرض کے دو رہ جاتے ہیں۔ جماعت اور سُنن مؤکدہ کا تاکد ساقط ہو جاتا ہے۔ بیماری میں قیام کی قدرت نہ ہو تو بیٹھ کر، بیٹھنے کی طاقت نہ ہو تو لیٹ کر نماز پڑھ سکتا ہے۔)

اسی حقیقت کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں واستعینوا بالغدوۃ والروحۃ وشئ من الدلجۃ۔ مدد حاصل کرو صُبح کے وقت اور شام کے وقت اور رات کی تاریکی میں کچھ عبادت کر کے (اس سے بھی یہی مُراد ہے کہ ان اوقات میں نماز کا کچھ معمول ہونا چاہیئے۔) کیونکہ بندۂ ضعیف کے لیے بڑی استعانت اُسی چیز سے ہو سکتی ہے جو اللہ تعالےٰ کے ساتھ اُس کے تعلق کو بڑھانے والی ہو۔ اسی سے اُس کو اپنی اُمید کے موافق بہترین فائدہ حاصل ہو گا۔

عبادت کسی بھی وقت ساقط نہیں اور جو کچھ ہم نے نماز کے بارے میں کہا ہے اُسی کے مشابہ عبادت

کی شان بھی ہے (کہ وہ بھی کسی وقت ساقط نہیں بلکہ بندہ کو ہر وقت عبادت میں رہنا چاہیئے) کیونکہ حکمت ربانیہ اس کو مقتضی ہے کہ ہم سے عبادت اور اُس کا دوام مطلوب ہو۔ اسی کے واسطے ہم پیدا کئے گئے ہیں۔ چنانچہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے وماخلقت الجن والانس الالیعبدون۔ میں نے جن وانسان کو بس اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں، حالانکہ حق تعالیٰ ہم سے بھی مستغنی ہیں اور ہماری عبادت سے بھی۔ لیکن کسی وجہ سے جس کو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں حکمت اس کو مقتضی ہوئی ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں:

الذی یعلم السر فی السموات والارض

"یعنی وہی جانتا ہے آسمان وزمین کے پیدا کرنے کی حکمت کو۔"

اسی طرح ہمارے پیدا کرنے اور تمام مخلوقات کے پیدا کرنے کی حکمت کو بھی وہی جانتے ہیں اور رہا یہ کہ حکمت اس کو مقتضی کیوں ہوئی۔ اس کے متعلق لوگوں نے جو مختلف باتیں بیان کی ہیں اُن میں ہر ایک کے لیے دلیل قطعی کی ضرورت ہے اور دلیل قطعی نبوت ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے اور نبوت کے ذریعے اس باب میں کچھ وارد نہیں ہوا[ع]۔ پس ہمارے ذمہ اس بات پر ایمان لانا واجب ہے کہ اللہ تعالےٰ تمام مخلوقات سے مستغنی ہیں اور یہ کہ اللہ تعالےٰ نے مخلوقات میں سے ایک ذرہ کو بھی بدون کسی حکمت کے نہیں پیدا کیا۔ اب اگر کسی صحیح طریق سے یا احتمال کے طور پر کوئی حکمت (کسی کی) عقل میں آجائے اور اصول شریعت کے منافی بھی نہ ہو تو اُس سے ایمان میں قوت ہوگی۔ چنانچہ اگر اُس قاعدہ کے موافق ایمان لایا جائے جو ہم نے ابھی بیان کیا کہ اللہ تعالےٰ ہر چیز سے مستغنی ہیں اور تمام چیزیں کسی حکمت کی وجہ سے پیدا کی گئی ہیں جس کو اللہ تعالےٰ ہی جانتے ہیں اور اس کے ساتھ اللہ تعالےٰ کو (ضرورت وحاجت اور غرض سے) منزہ اور پاک بھی سمجھا جائے جیسا (اُن) کی شان کے) مناسب ہے تو یقیناً اس سے ایمان میں ترقی ہوگی۔ اللہ تعالےٰ اپنے فضل وکرم سے ہم کو بھی یہ دولت عطا فرمائیں۔

(اس تمہید کے بعد) پھر اُسی مضمون کی طرف عود کرتے ہیں جس پر ہم نے اشارہ کیا تھا کہ ہم کو جس کام کے لیے پیدا کیا گیا اور جو ہم سے مطلوب ہے وہ دوام عبادت ہے۔ مگر ایک تو فطرۃً انسان ضعیف البنیان ہے پھر اُس کو بشری ضرورتوں کی بھی احتیاج ہے۔ جیسے کھانا، پینا (سونا) وغیرہ جس کو ہم اپنے اندر بداھتہً محسوس کرتے ہیں تو (اب دیکھو) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سب باتوں کو کیسی لطیف حکمت کے ساتھ جمع فرمادیا ہے جس پر بدون فیض ربانی اور الہام رحمانی کے) کسی کو اطلاع نہیں ہو سکتی تھی۔

ذکر اللہ تمام عبادات میں اعلیٰ ہے

وہ یہ کہ قواعد شریعت سے معلوم ہو چکا ہے کہ تمام عبادات میں اعلیٰ اور عذاب الٰہی سے زیادہ نجات دینے والی چیز ذکر اللہ ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اعلیٰ عبادت یعنی ذکر اللہ کو ہماری تمام حرکات و سکنات میں مقرر فرما دیا جن میں سے بعض (مقامات) میں تو ذکر اللہ واجب ہے۔ بعض میں مستحب ہے اور مستحب میں بھی بعض کا استحباب مؤکد ہے بعض کا غیر مؤکد۔ چنانچہ آپؐ نے ہمارے لیے یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ کھانے پینے، جماع کرنے، کپڑا پہننے، کپڑا اُتارنے، بستر پر لیٹنے، گھر میں داخل ہونے، قضاء حاجت کو جانے، وہاں سے نکلنے اور شکار کرنے اور حلال جانور کو ذبح کرنے اور کسی جگہ سفر کر کے جانے اور مہتم بالشان معاملے میں گفتگو کرنے سے پہلے اللہ تعالےٰ کا ذکر کر لیا کریں اور ہر موقعہ کے مناسب ذکر کرنے کا طریقہ بھی آپؐ نے بتلا دیا۔ ان میں سے بعض مقامات ایسے ہیں کہ اگر وہاں اللہ کا نام نہ لیا جائے تو وہ شئے ہم پر حرام ہو جاتی ہے۔ اُس کا کھانا جائز نہیں ہوتا۔ جیسے حیوان کو ذبح کرتے ہوئے یا شکار پر کتا یا تیر چھوڑتے ہوئے بسم اللہ کہنا ضروری ہے،

[ع] اور جو وارد ہے وہ محدثین کے نزدیک بے اصل ہے یعنی کنت کنزاً مخفیاً فخلقت الخلق لاُعرف اگرچہ محققین کے نزدیک اس کا مضمون صحیح ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ ظ

کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ

"اور جس چیز پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اُسے مت کھاؤ "

اسی لیے اہلِ کتاب کا ذبیحہ ہمارے واسطے حلال کر دیا گیا ہے اگرچہ وہ سیّدنا محمد صلے اللہ علیہ وسلّم پر ایمان نہیں رکھتے مگر اللہ تعالیٰ کو مانتے اور ذبح کے وقت اللہ کا نام لیتے ہیں اُن کو بھی ذبح کے وقت اللہ کا نام لینے کا حکم ویسا ہی ہے جیسا ہم کو ہے اور مجوس اللہ کو نہیں مانتے (کیونکہ وہ مشرک ہیں اور مشرک کے ساتھ خدا کا ماننا نہ ماننے کے حکم میں ہے) تو اُن کا ذبیحہ ہمارے واسطے ہرگز حلال نہیں کیونکہ نسبت ہی بُعد ہو گیا ہے ۔ اور بعض احوال میں اللہ تعالیٰ کا نام لینا سُنّت ہے جیسے بیت الخلاء میں جاتے ہوئے، گھر میں داخل ہونے کے وقت، بستر پر لیٹتے ہوئے وغیرہ وغیرہ ۔

بعض احوال میں اللہ کا نام لینا مستحب ہے جیسے کسی کا کام بناتے ہوئے خواہ دُنیا کا کام ہو یا دین کا۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ جب اُن کے پاس کوئی کام کرنے والا آتا جیسے کپڑا سینے والا یا اور کوئی ٹیئر کرنے والا اور آپ اُس کے حوالہ کوئی کام کر دیتیں تو درمیان میں دریافت کرتیں کہ تو نے کام کرتے ہوئے اللہ کا نام بھی لیا ہے یا نہیں ؟ اگر وہ کہتا کہ ہاں بسم اللہ کر کے میں نے کام شروع کیا ہے تو اُس کو کام پورا کرنے دیتیں اور اگر یہ کہتا کہ میں نے بسم اللہ کر کے کام شروع نہیں کیا تو کام پورا کرنے سے پہلے ہی اُس کو اُٹھا دیتیں کہ اللہ کا نام پہلے کیوں نہیں لیا تو ان مواقع میں اور جو اُن کے مشابہ ہوں اللہ تعالیٰ کا نام لینا مستحب ہے اسی طرح نیند سے بیدار ہونے کے وقت وغیرہ وغیرہ ۔

تم اس عجیب حقیقت اور سہل و لطیف طریقہ میں غور کرو (کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ضعف کی رعایت کر کے کتنا آسان راستہ عبادت کا مقرر کر دیا کہ بندہ ہر وقت عبادت میں بھی مشغول ہو سکتا ہے اور اپنی ضروریاتِ زندگی کو بھی پُورا کر سکتا ہے) الا یعلم من خلق وھو اللطیف الخبیر ۔ کیا جس نے پیدا کیا وہ بھی (تمہاری حالت کو) نہ جانے گا حالانکہ وہ تو بڑا باریک بین اور خبردار ہے ۔ مگر یہ مقام اُسی کو حاصل ہوتا، بلکہ اُس کی بُو بھی وہی پاتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اتباعِ سنتِ نبویہ کی توفیق عطا فرمائی ہو۔ پھر جس حقیقت کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی تاکید کو اپنے اس ارشاد سے اور بڑھا دیا جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کی زبانی فرمایا ہے ۔

من ذکرنی فی نفسہ ذکرتہ فی نفسی ومن ذکرنی فی ملاء ذکرتہ فی ملأ خیر منھم ومن تقرب الی بشبر تقربت منہ ذراعاً ومن تقرب الیّ ذراعاً تقربت الیہ باعاً ومن اتانی یمشی اتیتہ ھرولۃ ۔ "جو مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے میں اس کو اپنے دل میں یاد کرتا ہوں اور جو مجھے جماعت میں یاد کرتا ہے میں اُس سے بہتر جماعت میں اُس کا ذکر کرتا ہوں اور جو میری طرف ایک بالشت آتا ہے میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں۔ جو میری طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے میں اُس کی طرف دو ہاتھ سے زیادہ بڑھتا ہوں جو میری طرف چل کر آتا ہے میں اُس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں "

(مطلب یہ ہے کہ بندہ جب میری طرف متوجہ ہوتا ہے میں اُس سے زیادہ اُس کی طرف متوجہ ہوتا ہوں ۔ اس مقصود کو سمجھانے کے لیے اس عنوان خاص سے بیان کر دیا گیا جس کا ظاہر مراد نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ دل سے مسافت سے اور حرکت و سرعت سے منزہ ہیں) نیز قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-

الذین یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلی جنوبھم "(وہ اہلِ عقل کون ہیں ؟ وہ ہیں) جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے ہوتے ہوئے بھی، بیٹھتے ہوئے بھی، لیٹتے ہوئے بھی، اس اشارہ میں غور کرو کہ ذکر پر ایسا دوام ہونا

چاہیئے) کہ بندہ کی کوئی حالت بھی ایسی نہ ہو جس میں وہ مستقل عبادت میں مشغول نہ ہو۔ اگر عبادت کا یہ طریقہ (یعنی ذکر) مشروع نہ ہوتا تو دُنیا سے بالکلیہ علیحدگی کے بغیر دوام عبادت کا تصور ہی نہ ہو سکتا اور یہ صورت ہماری فطری احتیاج کے منافی تھی تو اللہ تعالےٰ نے اس عجیب طریقے سے ہماری احتیاج کے ساتھ عبادت کو جمع فرما دیا (کہ ذکر کو بھی عبادت کی اعلےٰ قسم بنا دیا) اور اس طرح ہم کو تمام بھلائیوں کی طرف اپنے فضل و رحمت سے آسان اور نزدیک راستہ سے پہنچا دیا اور یہ جو ہم نے بیان کیا ہے کہ کھانے کے وقت اللہ کا نام لینا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس باب کی حدیثیں ہم نے یہاں بیان نہیں کیں۔ کیونکہ یہاں ہمارا مقصود اس خیر کی طرف راہنمائی کرنا اور (مخاطب کے) دل میں اس (اہم مضمون) کو ڈالنا تھا تاکہ اس کی قدر کی جائے ورنہ جتنی حالتوں کے متعلق ہم نے ذکر کی تاکید کی ہے ان سب کے بارے میں متعدد حدیثیں وارد ہیں۔ ایک (دو) نہیں۔ اگر اللہ تعالےٰ نے (ہماری) عمر درازی اور توفیق الٰہی نے مدد کی تو انشاء اللہ ان سب احادیث کو مستقل کتاب[ع] میں لکھیں گے تاکہ واقفیت حاصل کرنے والوں کو آسانی ہو۔ بعونہ وفضلہ ان شاء اللہ تعالےٰ اور اسی حقیقت کی وجہ سے صوفیہ کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہوئی۔ کیونکہ وہ ہمیشہ ذکر میں مشغول اللہ تعالےٰ کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ اس خاص حالت ہی کی وجہ سے اُن کو خواص کہا جاتا ہے۔ اس لیے صوفیہ نے (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) کہا ہے کہ اگر تم ہماری محبت میں سچے ہو تو عاشق تو جہاں بھی جاتا ہے محبوب کے ذکر کے ساتھ جاتا ہے (پس تم کو بھی ہر حال میں ہمارا ذکر کرنا چاہیئے) کیونکہ دوام ذکر سے اللہ تعالےٰ کی ہم نشینی اور

[ع] معلوم نہیں وہ کتاب حضرت شارح نے لکھی ہے یا نہیں؟ اور لکھی ہے تو طبع ہوئی ہے یا نہیں؟ لیکن اس باب میں حصن حصین بہت مکمل کتاب ہے اور حضرت حکیم الامت نے تتمۂ قربات عند اللہ وصلوات الرسول میں اُس کا بہت اچھا خلاصہ جمع فرما دیا ہے ۱۲ نظ (یعنی "مناجاتِ مقبول" میں ناشر ۱۲)

حضور (و قرب) حاصل ہوتا ہے جس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی فرمایا ہے انا جلیس من ذکرنی میں اس کا ہم نشین ہوتا ہوں جو مجھے یاد کرتا ہے۔ پس اگر تجھ کو کچھ عقل ہے تو سمجھ لے کہ تجھ سے کیا قصد کیا گیا ہے اور اے مسکین تو کیا ہے اور کون ہے (تو اللہ کا محب ہے یا نہیں) اور محب ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کی دلیل بھی تیرے پاس ہے یا نہیں؟)

قوله الوجه السادس فيه دليل على افضلية التنفل الى قوله ومن انت يا مسكين۔

ف سہولت ذکر اور دوام ذکر کا طریقہ شارح نے اس مقام پر جس علم عظیم اور حکمت باہرہ کی طرف اشارہ کیا ہے اُس کو واضح کرنے کی ضرورت ہے اس لیے اس کو کھول کر بیان کرنا چاہتا ہوں کہ تم ذرا اپنے ذہن کو تو دیکھو کہ کیا یہ ایک لحظہ خیالات تصورات خواطر اور وساوس سے خالی بھی رہتا ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا ہے کہ امڈا چلا آ رہا ہے۔ ایک لامتناہی مبداء سے نکل رہا ہے۔ اس کی حقیقت میں غور کرو تو معلوم ہو گا کہ یا تو اچھے خیالات ذہن میں آتے ہیں یا بُرے؟ اس کی آمد کسی طریقے سے رد کی نہیں جا سکتی۔ کون سی قوت اس کو روک سکتی ہے؟ کسی خیال کو محض ارادہ کی قوت سے پیدا نہ ہونے دینا انسانی طاقت سے باہر ہے۔

خیالات ایک نامعلوم سرچشمہ سے ظہور کرتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان نہ ان کے پیدا کرنے پر قادر ہے، نہ اُن کے فناء کرنے پر۔ لیکن انسان کو اتنی طاقت ضرور دی گئی ہے کہ اپنی توجہ بُرے خیالات کی طرف سے ہٹا کر اچھے خیالات کی طرف مبذول کر دے یا علم نفسیات کی اصطلاح میں یوں کہو سلبی خیالات کو ایجابی خیالات میں بدل دے یہی مجاہدہ کی حقیقت ہے۔ ذہن میں سلبی خیالات اضطراری طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ اب یہ آپ

کے اختیار میں ہے کہ ان خیالات کو گلے لگالیں اور معزز مہمان کی طرح عزت و وقار سے دل میں جگہ دے دیں یا یہ کہ اُن کے ذہن میں آتے ہی ایجابی خیال کو اُن کی سرکوبی کے لیے لے آئیں اور نور کی قوت کو ظلمت کی طاقت کے مقابل کر دیں ان الذین اتقوا اذا مسھم طائف من الشیطان تذکروا فاذاھم مبصرون۔

ظاہر ہے کہ نور و ظلمت کے مقابلہ میں نور ہی کامیاب ہو گا۔ کیونکہ ظلمت نور ہی کی غیبت کا نام ہے۔ نور کے نہ ہونے ہی سے ظلمت پیدا ہوتی ہے جہاں نور ہو وہاں ظلمت کیسے آسکتی ہے ؟

شارع علیہ السلام نے یہی طریقہ ہم کو بتلایا ہے کہ تم اس پر تو قادر نہیں ہو کہ سلبی خیالات کو ذہن میں نہ آنے دو مگر اس پر قادر ہو کہ ایجابی خیال کو اُن کے مقابل کر دو۔ ایجابی خیالات میں سب سے زیادہ ایجابی خیال حق تعالٰے کا خیال ہے جو تمام محامد و محاسن کے جامع اور تمام خوبیوں اور کمالات کا سرچشمہ اور طمانیت و سرور اور علو و قوت و عزت و سطوت کے مبداء ہیں۔ اگر تم اپنے قلب کو تمام سلبی خیالات سے خالی کر کے حق تعالٰے کے خیال کو اُس میں جمانے کی کوشش کرو گے تو چند روز میں حق تعالٰے کی صفات کا اپنے اندر ظہور دیکھو گے۔ فطرتِ انسان کا یہ خاصہ ہے کہ وہ جس کے خیال اور دُھن میں رہتا ہے رفتہ رفتہ اُسی کی خو بو اس میں پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس قانون کو ماننے کے بعد تم ہرگز سلبی خیالات پر توجہ کو زیادہ مرکوز نہ کرو گے بلکہ ایجابی خیالات ہی کو دل میں جمانے کی کوشش کرو گے۔ اب تم ہی بتلاؤ کہ حق تعالٰے سے بہتر کوئی اور چیز ہو سکتی ہے جس سے تم ایک لحظہ کے لیے بھی حقیقی معنے میں خوش رہ سکتے ہو ؎

کیست زو بہتر بگوا ے ہیچکس
تا بدان دل شاد باشی یک نفس

اگر چشم بصیرت کھلی ہوئی ہے تو پھر کیا حق تعالٰے کی دُھن سے بہتر اور کسی کی دُھن ہو سکتی ہے ؟ ہرگز نہیں ! حق تعالٰے کو چھوڑ کر خلق میں محویت گو وہ بظاہر

کیسی ہی دلفریب اور دل کش کیوں نہ ہوں نور کو چھوڑ کر ظلمت میں گرفتار ہونا ہے۔ اور ظلمت سے ضیق۔ غم و حزن اور خوف کے سوا اور کیا حاصل ہوتا ہے۔ ظلمت میں کوئی چیز بھی اپنی صحیح خد و خال میں نظر نہیں آسکتی۔ پس ظاہر نظر میں اشیاء کی یہ دلفریبی نفس کا دھوکہ ہے۔ التباس ہے قوتِ واہمہ کی اختراع ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد غم کا سایہ قلب پر چھا جاتا ہے۔ ابھی اعتماد تھا ذرا دیر بعد خوف طاری ہو جاتا ہے۔ طبیعت میں استقلال و استحکام نہیں ہوتا۔ کوئی پناہ گاہ نظر نہیں آتی۔ اگر چشمِ بصیرت کھُل جائے اور ظلمت کی جگہ نُور دل میں جلوہ گر ہو جائے تو تمام اشیاء اپنی اصلی حالت پر نظر آنے لگیں گی۔ حیاتِ طیبّہ نصیب ہو گی۔ طمانیت و بردِ قلب حاصل ہو گی خوف و حزن زائل ہو جائے گا۔ استقلال و استحکام عطا ہو گا۔

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب من عمل صالحا من ذکرا و انثی و
ھو مؤمن فلنحیینہ حیوۃ طیبۃ ؕ

پس ہم کو نور قلب حاصل کرنا چاہیئے جس کا ذریعہ ذکر اللہ سے بہتر نہیں ہو سکتا۔ پھر حق تعالٰی کی یاد کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس کا ذکر زبان پر جاری رہے فاذکروا اللہ ذکرا کثیرا۔ ولا یزال لسانک رطبا من ذکر اللہ ؕ پر پُورا عمل ہو۔ اُٹھتے بیٹھتے یہی شغل ہو اور مقصود اس سے رضا و قرب الٰہی کے سوا کچھ نہ ہو۔ جب دل کی توجہ ذکرِ الٰہی کی وجہ سے خرافاتِ دُنیا سے ہٹ کر ایک مرکز پر مرکوز ہو گی تو خود بخود فاسد اور پریشان کُن خیالات و وساوس کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ خیالات کی پراگندگی موقوف ہوتے ہی ایک روحانی کیفیت اور طمانیت سے قلب معمور ہو جائے گا۔

اس دولت کے حاصل ہو جانے کے بعد تمام چیزوں سے استغنا ہو جائے گا نہ کسی چیز کے حصول سے لذت ہو گی نہ کسی چیز کے ضائع ہونے سے رنج۔ ہاں کسی چیز سے لذت ہو گی تو اللہ کی نعمت سمجھ کر ہو گی۔ اگر رنج ہو گا تو اللہ کی ناراضی کے خیال سے ہو گا۔

"مگر اللہ تعالےٰ کی رضا و عدم رضا کا طریقہ قرآن و حدیث میں تمہارے سامنے ہے اپنے اعمال کو اُن سے جانچ لینے کے بعد پھر دُنیا کی کسی چیز کے فوت ہونے سے رنج نہ ہو گا ؎

اذا رضیت عنی کرام عشیرتی   فلا زال غضبانا علی لئامہا

ایک طریقہ کا ذکر یہ ہے کہ مختلف حالات مختلف اوقات کے متعلق جو دُعائیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی ہیں اُن کی پابندی کی جائے اس طرح کسی وقت بھی اللہ تعالےٰ سے غفلت دل میں راہ نہ پائے گی۔ کیونکہ اُن کی پابندی اُسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ ہر وقت اللہ تعالےٰ کی یاد دل میں جمی رہے۔ پہلے پہل اس پابندی میں کسی قدر دشواری اس لیے ہوتی ہے کہ قلب میں اللہ تعالےٰ کی یاد پوری طرح نہیں جمی۔ پھر ہر موقعہ پر دل میں خود بخود اس دُعاء کا تقاضا پیدا ہونے لگتا ہے جو حضورؐ نے اس موقعہ کے لیے ارشاد فرمائی ہے۔ ان دُعاؤں کا خاص فائدہ یہ ہے کہ اپنی ہر حالت ہر کیفیت اور دُنیا کی ہر شئے کے متعلق یہ عقیدہ دل میں راسخ ہو جاتا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے اور ہو رہا ہے اللہ کی مشیت سے ہو رہا ہے۔ دُنیا میں جو چیز بھی ہے اللہ تعالےٰ کی مخلوق اور محکوم ہے۔ وہی رب اور حاکم ہیں۔ اُن کے سوا نہ کوئی رب ہے نہ مؤثر نہ نفع دینے والا ہے نہ ضرر دینے والا۔ چونکہ ہمارا سابقہ رات دن ان ہی اشیاء سے رہتا ہے۔ یہی ہمارے سامنے ہیں۔ یہی ہمارے دل و دماغ میں بسی ہوئی ہیں۔ ان ہی کی محبت سے ہمارے قلوب بھرے ہوئے ہیں۔ مگر سب فانی اور زوال پذیر ہیں۔ ان کا زوال و فنا ہمارے حزن و غم کا باعث ہوتا ہے تو ہم کو چاہیئے کہ مخلوق کو دیکھ کر خالق کی طرف ذہن کو منتقل کریں تاکہ ہر طرف حق تعالےٰ ہی کا جلوہ نظر آئے۔ ہر شئی کی سلبی جہت سے توجہ کو ہٹا کر ایجابی جہت یعنی جہت حق کی طرف انتقال کریں۔ اس طرح یادِ حق دل میں قائم ہونے لگے گی۔ اب ہمارے ذہن میں شئے نہ ہو گی حق ہو گا اور اُن تمام انوار سے قلب معمور ہونے لگے گا

جو اللہ تعالےٰ کی طرف رُخ کرنے سے حاصل ہوتے ہیں اور بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ سعادت و مُسرت کا سرچشمہ خود ہمارا دل ہے۔ حق تعالیٰ کا جلوہ گاہ خود ہمارا قلب ہے۔ کسی اہلِ دل نے کہا ہے ؎

شوئے جاناں بھی آنکھ اُٹھاتا ہے بارِ دل
گردن جُھکائے دیکھ رہا ہوں بہارِ دل

دوسرا کہتا ہے ؎

بیا بیا و تماشائے خوش نظارہ کُن !
چہ گل شگفتہ بدل از نسیم کوئے حبیب

عارف شیرازی کہتے ہیں ؎

خلوت گزیدہ را بتماشا چہ حاجتست
چوں کوئے دوست ہست بصحرا چہ حاجتست

آفاق میں حق تعالےٰ ظاہر ہیں ہر شئے کے ساتھ جہت حق موجود ہے مگر علم صحیح کے استعمال سے وہم والتباس کو دور کرنے اور نظر کی اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلمؐ نے مختلف حالات و اوقات کے لیے جو خاص خاص اذکار و ادعیہ تعلیم فرمائی ہیں اُن کا مقصد یہی ہے کہ اُن کی پابندی سے نظر کی اصلاح ہوئی نقطۂ نظر بدلا تو معلوم ہوا کہ نفس و آفاق میں حق تعالےٰ نہاں و عیاں ہیں۔ اُن سے ہی تعلق قائم کرنا اُن ہی کی یاد کا دل میں جمانا تمام مسرتوں اور سعادتوں کا حاصل کرنا ہے۔ اللہ سے غفلت و ذہول اور خلق میں استغراق و انہماک تمام بلاؤں اور آفتوں میں گرفتار ہونا ہے ؎

عشق بامردہ نباشد پائدار   عشق را باحی و باقیوم دار
گر گریزی بر امید راحتے   ہم از انجا پیشت آید آفتے
ہیچ کنجے بے دو دبے دام نیست   جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

گھر سے باہر قدم نکالو تو اللہ کو یاد کرو۔ بازار میں جاؤ تو اُس کو یاد کرو

دکان کھولو تو اللہ کو یاد کرو۔ مسجد میں قدم رکھو تو اللہ سے دعا کرو۔ باہر آؤ تو اُسی سے فضل کی درخواست کرو۔ بیوی بچوں کو دیکھو تو اُس کی نعمت کا شکر کرو۔ کھانا کھاؤ تو اللہ کے نام سے شروع کرو۔ کھانا کھا چکو تو اُس کی نعمت کا شکریہ ادا کرو۔ سونے کا ارادہ کرو تو موت کو یاد کرکے اللہ کی حفاظت کا دامن پکڑو۔ جاگو تو نئی زندگی عطاء ہونے پر اللہ کی حمد کرو۔ اسی طرح ہر حالت ہر وقت اور ہر کیفیت میں اللہ تعالیٰ کی حکمت و قدرت اور حکومت و سطوت کا مشاہدہ کرو خود اپنی ذات کو اپنی ہستی کو بھی اللہ کی مخلوق و محکوم سمجھ کر دیکھو۔ اللہ سے غافل ہوکر اپنی ہستی پر نظر نہ کرو۔ یہ مراقبہ راسخ اور کامل ہونے کے ساتھ ہی فاینما تولوا فثم وجہ اللہ اور نحن اقرب الیہ من حبل الورید کے معنی کی ابتدائی فہم حاصل ہونے لگے گی اور زبانِ حال سے یوں کہنے لگو گے ؎

حُسنِ خویش از روئے خوباں آشکارا کردۂ
پس بچشمِ عاشقاں خود را تماشا کردۂ

جعلنا اللہ وایاکم ممن راقب اللہ فوجدہ تجاھہ آمین!



باب شصت

حدیث

اشراط الساعة

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لاتقوم الساعۃ حتی یقبض العلم وتکثر الزلازل ویتقارب الزمان وتظھر الفتن ویکثر الھرج وھو القتل حتی یکثر فیکم المال فیفیض۔

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت قائم نہ ہوگی۔ یہاں تک کہ علم (دُنیا سے) اُٹھالیا جائے اور زلزلے کثرت سے آئیں اور زمانہ قریب ہوجائے (یعنی گھٹنے لگے) اور فتنے ظاہر ہوں اور کشت وخون زیادہ ہونے لگے۔ یہاں تک کہ تمہارے اندر مال کی اتنی کثرت ہوجائے کہ بہنے لگے"۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ یہ پانچ چیزیں جو یہاں مذکور ہیں قرب قیامت کی علامات میں سے ہیں۔ اس کے متعلق چند باتیں بیان کرنی ہیں۔

(۱۲۰) یہ علم جو دُنیا سے اُٹھایا جائے گا علم منقول ہے یا غیر منقول؟ تو اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہم کہتے ہیں کہ اس سے اُس نور کی طرف اشارہ ہے

علم حقیقی وہ نور ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیضانِ فہم ہوتا ہے

جس کے ذریعے اللہ تعالےٰ کی طرف سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے

(فیضان) فہم ہوتا ہے۔ کیونکہ کتابیں تو ہمیشہ رہیں گی بلکہ زیادہ ہوتی رہیں گی۔ لیکن فہم دعقل میں نقص ہوتا رہے گا۔ یہاں تک کہ (کسی وقت) بالکل ہی اُٹھ جائے گا۔"
اس پر پہلے بھی ہم ایک حدیث کی شرح میں گفتگو کر چکے ہیں۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالےٰ علم کو اس طرح نہ اُٹھائیں گے کہ لوگوں کے دلوں سے اُس کو نکال دیں (بلکہ اس طرح اُٹھائیں گے کہ عُلماء کو دُنیا سے اُٹھا لیا جائے گا) قولہ منہا ھذا العلم الذی یقبض ما المراد بہ الی قولہ ینتزعہ من العباد۔

ف معلوم ہُوا کہ علم حقیقت میں نور ہے جو دل میں عمل اور تقویٰ کی برکت سے پیدا ہوتا ہے۔

(۱۲۱) آیاتِ الٰہیہ سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کا یہ ارشاد کہ زلزلے کثرت سے آئیں گے۔ اس پر سوال یہ ہے کہ اس میں (یعنی قیامت کے قریب بکثرت زلزلے آنے میں) کوئی ایسی حکمت ہے جس کو ہم سمجھ سکیں یا ہم کو وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ جواب یہ ہے کہ حکمت تو یقیناً ہے اور (اللہ تعالیٰ کی) عادت جاریہ کے مقتضیٰ پر نظر کرکے وہ حکمت ظاہر بھی ہے مگر یقین کے ساتھ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس میں یہی حکمت ہے (اس کے سوا کچھ نہیں۔ ممکن ہے کہ جو ہم نے سمجھا ہے وہ نہ ہو کچھ اور حکمت ہو) بہرحال شریعت کے تتبع (اور اُس میں تدبر) کرنے سے ہمیں زلزلہ کی دو حکمتیں معلوم ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ عادۃ اللہ یُوں جاری ہے کہ زلزلہ دو وجہ سے آتا ہے ایک انتقام کے لیے جب وہ کسی سے انتقام لینا چاہیں۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ زلزلہ سے بہت لوگ ہلاک اور برباد ہُوئے ہیں حتیٰ کہ ہمارے زمانے تک بھی ایسا ہو رہا ہے۔ چنانچہ جس وقت میں افریقہ میں تھا تو تواتر کے ساتھ یہ خبر پہنچی کہ افریقہ کی ایک بستی میں زلزلہ آیا جس سے وہاں کی پُوری آبادی زمین میں دھنس گئی اور وہ لوگ

اسی قابل تھے کیونکہ اُن میں فساد بہت بڑھ گیا تھا۔ دُوسرے اُن لوگوں کے دلوں میں خوف پیدا کرنے کے لیے جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔ کیونکہ زلزلہ بھی (قدرت کی) نشانیوں میں سے ہے اور اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں وما نرسل بالآیات الا تخویفا (اور ہم ان نشانیوں کو ڈرانے ہی کے واسطے بھیجتے ہیں) اور یقیناً قرب قیامت میں فساد بڑھ جائے گا تو اُس وقت زلزلے بطور عذاب کے بھی آئیں گے اور اس لیے بھی کہ جن کی تقدیر میں سعادت ہے وہ اس سے عبرت حاصل کریں۔
دوسری حکمت یہ ہے کہ قیامت بہت بڑے زلزلے کے ساتھ آئے گی۔ جیسا حق تعالیٰ نے فرمایا ہے فدکتا دکۃ واحدۃ نیز حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

ولقد اخذناھم بالعذاب فما استکانوا لربھم وما یتضرعون
حتی اذا فتحنا علیھم بابا ذا عذاب شدید اذا ھم
فیہ مبلسون۔

"اور ہم نے اُن کو عذاب سے پکڑا سو وہ اپنے رب کے سامنے نہ جھکے نہ عاجزی زاری کرنے لگے۔ یہاں تک کہ جب ہم نے سخت عذاب کا دروازہ اُن پر کھولدیا تو اب وہ ہکّے بکّے رہ گئے۔"

مطلب یہ ہے کہ اول اُن کو معمولی عذاب سے پکڑا گیا تاکہ حجت تمام ہو جائے اور (اپنی حرکتوں سے) باز آجائیں۔ جب اس پر بھی باز نہ آئے تو عذاب مہلک نے اُن کو آلیا۔ پس (صانع) حکیم کی سُنت یہی ہے کہ پہلے تھوڑا سا عذاب بھیجتے ہیں تاکہ جس میں خیر کی اہلیت ہو وہ اللہ کی طرف رجوع کرے۔ اور جو عذاب ہی کے لائق ہیں اُن پر پُورا عذاب نازل ہو۔

اسی قاعدہ کے موافق قیامت سے پہلے بہت زلزلے آئیں گے۔ کیونکہ حکمت کا تقاضہ یہی ہے کہ بندوں کو اول ڈرا دیا جائے۔ اگرچہ اس سے اُن لوگوں کو نفع نہ ہوگا جن کے لیے عذاب ناگزیر ہے وہ برابر اپنی بدی میں ترقی کرتے رہیں گے تو اُن کو سخت بلا کا سامنا ہوگا حکمۃ بالغۃ فما تغنی النذر۔ غرض قیامت

کا زلزلہ بہت سخت ہوگا جس سے تمام زمین ایک دم شکستہ ہوکر ریزہ ریزہ ہو جائے گی تو اس سے پہلے بہت سے زلزلے آئیں گے تاکہ اُن کی کثرت سے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اسی قسم کا ایک بڑا زلزلہ بھی آنے والا ہے۔ قولہ ویکثر الزلازل فهل هذا فیه معنی من الحکمة الی قوله بوجود الزلزلة العظمی من جنسها۔

ف آیاتِ الٰہیہ سے عبرت حاصل کرنا صوفیہ کا خاص مذاق ہے وہ ادنیٰ ادنیٰ عذاب سے بھی گھبرا کر اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

(۱۲۲) ایمان و عمل صالح سے وقت میں بھی برکت ہوتی ہے اور عمر و مال میں بھی

زمانہ کے قریب ہونے (اور گھٹنے) کا کیا مطلب ہے آیا نقصان حسّی مراد ہے یا نقصان باطنی؟ دونوں احتمال ہیں اور ظاہر یہ ہے کہ دونوں ہی مراد ہیں کیونکہ آثار میں دونوں پر الگ الگ اشارہ وارد ہے۔ نقصان باطنی تو واقع ہو چکا ہے اب ہم کو نقصان حسّی اور نقصان باطنی (کی حقیقت) کے بیان کرنے کی ضرورت ہے اور آثار میں جو اشارہ دونوں کے متعلق وارد ہے اُس کو بھی بتلانا ہے تو (سمجھو کہ) نقصان باطنی کا مطلب یہ ہے کہ عمل میں نقصان واقع ہوگا۔ کیونکہ انسان کی عمر ہی اُس کا راس المال (اور قیمتی سرمایہ) ہے اور اس کا نفع یہ ہے کہ عمل اچھا ہو اگر بابرکت کاموں میں کمی ہونے لگے تو زمانہ ناقص ہوگا کیونکہ اُس سے فائدہ کم ہوگا۔ جیسے درخت اور پھل کی حالت ہے کہ اگر پھل میں کمی ہو تو کہا جاتا ہے کہ یہ درخت ناقص ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

ولنبلونکم بشیٔ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات

"ہم تم کو ضرور آزمائیں گے کسی قدر خوف سے اور فاقہ سے اور مال و جان اور ثمرات کے نقصان سے۔"

(معلوم ہوا کہ ان[ع] چیزوں کا نقصان بڑی مصیبت ہے جو بطور ابتلاء کے اللہ تعالیٰ

ع اس آیت کا ربط مقصود شارح سے ظاہر نہیں ہوا۔ ۱۲ ظ

کی طرف سے وارد ہوتی ہے بطور نعمت کے نہیں آتی) اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں جس دن میرے علم کے اندر کچھ ترقی نہ ہو اور نہ نیکی پر کوئی احسان کروں تو اُس دن آفتاب کا طلوع ہونا میرے واسطے نامبارک ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مومن کی بقیہ عمر کی کوئی قیمت نہیں ہوتی (کیونکہ) وہ اُس میں اپنی بگڑی کو بنالیتا ہے اور بگڑی کو بنانے کی خاطر بجز توبہ اور عمل صالح کے کیا ہے کہ اس کے ذریعے وہ اپنے نقصان کی تلافی کر سکتا ہے اور قلتِ عمل کا منشاء اس کے سوا کچھ نہیں کہ قلوب پر دُنیا کی محبت غالب ہو اور اسی میں دل مشغول ہو۔ دُنیا کو آخرت کے کاموں پر ترجیح دی جاوے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے (ایک حدیث میں) اس حقیقت پر متنبہ فرمایا ہے:

بقوله انتم فی زمان وذکر من صفات اهله انهم یبدؤن اعمالهم قبل اهوائهم وسیأتی زمان وذکر من صفات اهله انهم یبدؤن فیه اهوائهم قبل اعمالهم۔

"تم ایسے زمانے میں ہو جس میں خواہش (نفس) پر عمل (صالح) کو مقدم کیا جاتا ہے پھر ایک زمانہ آئے گا جس میں خواہش (نفس) کو عمل (صالح) سے مقدم کیا جائے گا۔"

وقال علیه السلام من ابتداء بحظه من دنیاه فاته حظه من اخرته ولم ینل من دنیاه الا ما کتب له ومن ابتداء بحظه من اخرته نال من اخرته ما احب ولم یفته من دنیاه ما کتب له۔

"نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو شخص دنیا کے حصّہ کو مقدم کرے گا اُس سے آخرت کا حصّہ فوت ہو جائے گا اور دُنیا میں سے اُتنا ہی ملے گا جتنا اس کے لیے مقدر ہے اور جو آخرت کے حصّہ کو مقدم کرے گا اُس کو آخرت میں اس کی خواہش کے موافق ملے گا اور دنیا بھی جتنی مقدر ہے فوت نہ ہوگی۔"

وقال علیه السلام من شرط الساعة وذکر فیه ویقل العمل۔

"نیز آپ نے علاماتِ قیامت میں یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ اُس وقت عمل کم ہو جائے گا۔"

اور اس مضمون میں بہت حدیثیں وارد ہیں۔ تو (اس تقریر سے) وہ بات واضح ہوگئی جو (نقصان) باطنی کے متعلق ہم نے عرض کی تھی اور یہ تو فقہ اور نقل کے طریقہ پر (کلام) تھا۔ رہے حضرات اہلِ معاملہ (صوفیہ کرام) تو اُن کے طریق پر (نقصان معنوی) کا بیان یہ ہے کہ وہ فرماتے ہیں وقت ایک تلوار ہے اگر تو اُس کو نہ کاٹے گا وہ تجھے کاٹ دے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اُس کو عمل (صالح) میں نہ گزارو گے تو وہ تم کو (اس) قال مقول ہی میں ختم کر دے گا۔

آجکل دُنیا کے کاموں اور دُنیوی معاملات میں بھی بے برکتی ہو رہی ہے

یہ تو اعمال آخرت کا بیان تھا اور اب تو اعمال دنیویہ میں بھی نقصان ظاہر ہوگیا اور تمام معاملات میں اچھی طرح واضح ہوگیا ہے۔ چنانچہ اہلِ صنعت میں سے کوئی بھی اپنی صنعت میں اُس درجہ پر نہیں پہنچ سکتا جو پہلے آدمیوں کے متعلق سنا گیا ہے۔ اسی طرح تاجر اور کاشت کار حتیٰ کہ بادشاہ بھی اُس درجہ پر نہیں پہنچ سکے۔ اس کے علاوہ تمام دنیوی اسباب و ذرائع میں بہت ہی نقص واقع ہوگیا ہے جس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے حقوق و احکام کے بجالانے میں کوتاہی اور سستی کرنے لگے اور باہم ایک دوسرے سے مکر (و فریب) کرنے لگے ہیں اس لیے اُن کے بدن اور مال اور عقل (ہر چیز) سے برکت اُٹھ گئی اور سب پر اس طرح وبال آگیا کہ لوگوں کو پتہ بھی نہیں (کہ ہم کیا سے کیا ہوگئے ہیں) چنانچہ لوگ تعجب کرتے ہیں کہ یہ بے برکتی کہاں سے آگئی؟ حالانکہ ہم نے طلب (اور محنت) میں کوشش کا کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ زبانِ حال اُن (کے سوال) کا جواب دیتی ہے قل هو من عند انفسکم۔ کہہ دو کہ یہ سب کچھ تمہاری ہی ذات سے ہے۔ کیونکہ یہ صفات (اور یہ حالات جو تمہارے اندر ہیں) تقاضائے ایمان کے خلاف ہیں۔ ایمان تو جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے یہ (چاہتا) ہے ولا تحاسدوا ولا تباغضوا ولا تدابروا وکونوا عباد اللہ اخوانا۔ نہ باہم حسد کرو نہ ایک دوسرے سے بُغض

رکھو نہ پیٹھ موڑ کر چلو اور اے اللہ کے بندو آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مومن اپنے بھائی مومن کے لیے وہی چاہتا ہے جو اپنے لیے چاہتا ہے۔ نیز آپ کا ارشاد ہے: اللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیہ۔ "اللہ تعالیٰ (اپنے) بندہ کی مدد کرتے رہتے ہیں جب تک وہ اپنے بھائی (مسلمان) کی مدد کرتا رہتا ہے"۔ حضرات سلف کا یہی طریقہ تھا۔

ہمدردی اور خیر خواہی خلق سے مال میں برکت ہونے کا عجیب واقعہ

چنانچہ میں نے ایک تاریخ میں دیکھا ہے کہ ایک بادشاہ نے کسی مُلک پر قبضہ کیا تو خزانہ میں گیہوں کے دانے بھی دیکھے جو اُس گیہوں سے بہت بڑے تھے جو عام طور پر لوگوں کی نظروں میں رہتا ہے۔ بادشاہ نے اُس کے متعلق تفتیش کی (کہ یہ گیہوں کس نے خزانے میں رکھے اور کس لیے رکھے) تو ایک بُوڑھے نے جس کی عمر لمبی ہو گئی تھی بتلایا کہ میں اس کی حقیقت سے واقف ہوں۔

بات یہ ہے کہ ایک جوان اور بڈھے نے شرکت میں کھیتی کی تھی جب کھیتی کٹ گئی اور خرمن تیار ہوگیا تو دونوں نے (اس کے دو حصّے کر لیے پھر) ایک نے دوسرے سے کہا کہ اس غلّہ کو باری باری اُٹھانا چاہیئے۔ ایک دفعہ تم اپنے حصّہ میں سے کچھ اُٹھا کر گھر پہنچاؤ۔ میں اپنے اور تمہارے حصّہ کا پہرہ دوں گا۔ پھر میں اپنے حصّہ میں سے کچھ اُٹھا کر گھر پہنچاؤں گا۔ تم میرے اور اپنے حصّہ کا پہرہ دینا۔ چنانچہ اس قرارداد کے موافق اوّل بُڈھے نے اپنے حصّہ میں سے کچھ اُٹھایا اور جوان پہرہ پر رہا۔ بڈھے کے بال بچے بہت تھے تو جوان اپنے دل میں کہنے لگا یہ بڈھا آدمی ہے اس کے بال بچے بھی ہیں مجھے اس کی مدد کرنا چاہیئے تو وہ اپنے ڈھیر میں سے کچھ گیہوں نکال کر اُس کے ڈھیر میں ڈال دیتا۔ پھر جب جوان کے اُٹھانے کی باری آئی اور بڈھا پہرہ پر ہوا تو اُس نے اپنے دل میں کہا یہ جوان آدمی ہے لوگ اس کے پاس (ملنے ملانے کو) زیادہ آتے ہیں۔ مجھے اس کی مدد کرنا چاہیئے۔ اُس نے بھی اپنے ڈھیر میں سے گیہوں

نکال کر جوان کے ڈھیر میں ڈال دیتے ۔ غرض دونوں یہی کرتے رہے (کہ جوان اپنے پہرہ کے وقت بڈھے کے ڈھیر میں اپنے گیہوں ملاتا رہا اور بڈھا اُس کے حصہ میں اپنے حصہ سے ڈالتا رہا نتیجہ یہ ہُوا کہ) دونوں باری باری گیہوں اُٹھاتے رہے اور غلّہ (میں برکت ہونے لگی کہ پہلے سے) بڑھنے لگا حتیٰ کہ گیہوں کا دانہ بھی بڑا ہونے لگا۔ یہاں تک برکت ہوئی) دونوں ڈھوتے ڈھوتے تھک گئے غلّہ کے اُٹھانے سے عاجز ہو گئے اور یہ بھی دیکھا کہ غلّہ کا دانہ بہت بڑھ گیا ہے۔ عام طور پر جتنا بڑا ہوتا ہے اُس کی حد سے بھی نکل گیا ہے تو ہر ایک نے دُوسرے سے قسم دے کر پوچھا کہ تُو میرے پیچھے کیا کرتا رہتا ہے (جو غلّہ میں اتنی برکت ہوگئی) تو ایک نے دُوسرے کو بتلایا کہ میں تو تیرے پیچھے ایسا کرتا ہوں۔ اُس نے کہا کہ میں بھی یہی کرتا رہتا ہوں۔ یہ قصہ بستی میں مشہور ہوگیا۔ یہاں تک کہ بادشاہ کو بھی خبر پہنچی تو اُس نے کسی کو بھیجا تاکہ اس گیہوں میں سے تھوڑا سا بادشاہ کے سامنے پیش کرے۔ جب بادشاہ نے یہ گیہوں دیکھا تو کہا اس میں سے کچھ (نمونہ کے طور پر) شاہی خزانہ میں رکھ دیا جائے تاکہ بعد والوں کو اس سے عبرت اور نصیحت حاصل ہو تو دیکھو جب ان دونوں نے ادب کے ساتھ حقیقتِ ایمان کا حق ادا کیا تو اُن پر ایمان کی برکتیں نازل ہوگئیں۔ حق تعالیٰ شانہٗ فرماتے ہیں :۔

ولو ان اهل القریٰ اٰمنوا واتقوا لفتحنا علیهم برکات من السماء والارض ۔

"اور اگر ان بستیوں کے باشندے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم اُن پر آسمان و زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے "

(اب نہ ویسا ایمان ہے نہ ویسا تقویٰ تو وہ پہلی سی برکتیں بھی نہیں رہیں) رہا حسّی نقصان تو وہ ابھی تک ظاہر نہیں ہُوا کیونکہ رات اور دن کے گھنٹے بدستور اپنے حال پر ہیں (اگرچہ یہ فرق ضرور ہوگیا ہے کہ ان گھنٹوں میں جتنا کام پہلے لوگ کر لیتے تھے اب اُتنا کام نہیں ہوسکتا) اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کے حسّی نقصان کی بھی اطلاع دی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ سال مہینہ کے برابر ہو

جائے گا اور مہینہ ہفتہ کے برابر اور ہفتہ دن کے برابر اور دن ایک گھنٹہ کے برابر ہوگا (الیٰ آخر الحدیث) اس علامت کا ظہور ابھی باقی ہے۔ وقولہ ویکثر الزلازل فهل هذا فیه معنی من الحکمة الی قوله فهذا مما بقی خروجه "

ف اعمال صالحہ اور تقوے سے وقت میں برکت ہونا صوفیہ کے نزدیک بدیہیات سے ہے۔

معتبر طریقے سے سُنا گیا ہے کہ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب شہید دہلوی عصر کی نماز کے بعد قرآن شریف پڑھنا شروع کرتے اور مغرب تک ختم کر لیتے تھے بعض بزرگانِ سلف نے تھوڑی عمر میں اس قدر کام کیا ہے کہ اُن کی تصانیف کے اوراق کو اُن کی عمر کے ایام پر تقسیم کیا گیا تو ہر دن ہزار صفحے ہوئے۔ آج کل تو اتنے صفحات کا مسودہ سے نقل کرنا بھی دشوار ہے۔ اُن حضرات نے ان کو لکھا بھی تھا اور تصنیف کے طور پر لکھا تھا جس میں عبارت آفرینی اور تدبر و تامل اور تلاش و تحقیق کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر ان ایام میں سے بچپن اور طالب علمی اور سفر و مرض کے ایام بھی نکال دیئے جائیں جن کا مستثنیٰ کرنا ضروری ہے تو یہ اوسط ایک ہزار صفحہ روزانہ سے بھی بہت زیادہ ہو جائے گا۔

(۱۲۳) علمِ شریعت اور دین داری قتلِ ناحق سے مانع ہے اور قلتِ علم و قلتِ دین فساد کی جڑ ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ قتل کی کثرت ہوگی۔ اس سے قتلِ ناحق مراد ہے کیونکہ حدود (الٰہیہ) کی وجہ سے قتل ہونا تو بستیوں کے لیے بھی رحمت ہے اور مخلوق کے لیے بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی زمین میں اللہ کی حدود میں سے ایک حد کا قائم کیا جانا اس سے بہتر ہے کہ اس پر مہینہ بھر بارش ہوتی رہے۔ ایک روایت میں (مہینہ بھر کی جگہ) چالیس دن وارد ہے اور قتلِ ناحق کی کثرت علم اور دین کی کمی ہی سے ہوتی ہے اور قیامت کے قریب یہ دونوں کم ہو جائیں گے (تو قتلِ ناحق کی کثرت ہونے لگے گی) اس کی تائید رسول اللہ

صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے کہ قاتل کو خبر نہ ہوگی کہ اُس نے کیوں قتل کیا اور مقتول کو پتہ نہ ہوگا کہ اُس کو کس وجہ سے مارا گیا۔ قولہ علیہ السلام ویکثر الھرج وھو القتل الی قولہ ولا المقتول فیماذا اقتل۔

ف آج کل قتلِ ناحق کی جس قدر کثرت ہے بیان سے باہر ہے۔ کافر سلطنتوں کا یہ حال ہے کہ باہمی جنگ میں صرف فوج ہی پر حملہ نہیں کرتے بلکہ کھلی بستیوں پر بے دریغ بم برساتے ہیں۔ جس سے نہتی بے گناہ رعیت بلاوجہ تباہ ہوجاتی ہے۔ جس میں عورت و مرد، بڈھے، جوان، بچے اور بڑے سب ہی ہلاک ہوتے ہیں۔ یہ تو کافروں کا حال ہے۔ اب مسلمانوں کا سُنیے۔ انہوں نے بھی کافروں کی دیکھا دیکھی یہی طرزِ عمل اختیار کرلیا ہے۔ جب کوئی جماعت کسی بات پر حکومت سے برسرِ پیکار ہوتی ہے تو وہ ریلوں کی پٹڑیاں اُکھاڑ کر پھینک دیتی ہے جس سے ریل گاڑی گر پڑتی ہے حالانکہ اُس میں ناکردہ گناہ مُسافر سوار ہوتے ہیں۔ کوئی اُن سے پُوچھے کہ مسافروں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا جو اُن کے ہلاک کرنے اور لُوٹنے کو تم نے جائز سمجھ لیا

یہاں سے معلوم ہُوا کہ علم دین اور سچّی دین داری ہی سے دُنیا میں امن و امان قائم ہو سکتا ہے۔ علوم دنیویہ سے دُنیا میں فساد ہی بڑھتا ہے۔ آج کل علوم دُنیا کی اشاعت ہر جگہ بہت زیادہ ہو رہی ہے۔ جا بجا اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہیں مگر کسی طرح فساد میں کمی نہیں آتی۔ بلکہ دن بدن ترقی ہے اگر اس کی جگہ علم دین اور دینداری کو ترقی دی جاتی تو یقیناً دُنیا فساد سے پاک ہوجاتی۔ ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقھم بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون۔ اس حقیقت پر سب سے زیادہ یقین و اعتقاد حضرات صوفیہ کو ہے اُن کے نزدیک اعمالِ سیئہ اور قلتِ دین سے آفات و بلیات کا نزول اور اعمالِ صالحہ و تقویٰ و استغفار و توبہ سے ان کا مندفع ہونا بدیہیات سے ہے۔ پہلے زمانے میں عامۂ مسلمین کو بھی اس کا پختہ اعتقاد تھا۔ مگر اب اس میں ضعف پیدا ہوگیا ہے

مولانا فرماتے ہیں ؎

ابر ناید از پئے منع زکوۃ   وز زنا افتد بلا اندر جہات

(۴۲۱) غلبۂ حرص کے ساتھ کثرتِ مال بڑا فتنہ ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ تمہارے اندر مال کی اتنی کثرت ہوجائے گی کہ بہنے لگے۔ یہاں مال سے چاندی سونا مُراد ہے اور کچھ نہیں۔ اگرچہ عرب کے محاورہ میں اُونٹ پر بھی مال کا اطلاق ہوتا ہے اور دوسرے لوگ اپنے عرف میں دوسری چیزوں کو بھی مال کہتے ہیں اور اس تخصیص کی ایک دلیل تو اسی حدیث میں موجود ہے اور ایک دوسری حدیثوں میں ہے۔ اس حدیث میں تو حضورؐ کا یہ ارشاد ہے کہ مال بہنے لگے گا اور یہ صفت حقیقتہً اُن ہی چیزوں میں استعمال کی جاتی ہے جو زمین سے نکلتی ہیں۔ مال ہو یا پانی (وغیرہ) کبھی مجازاً اور چیزوں کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہے مگر حقیقت چھوڑ کر لفظ کو مجاز پر بلادلیل محمول نہیں کیا جاتا۔ بلکہ حکم یہ ہے کہ لفظ کو ظاہر پر محمول کیا جائے جب تک کوئی معارض شرعی موجود نہ ہو اور یہاں کوئی بھی معارض نہیں ہے۔

دُوسری حدیثوں میں جو دلیل ہے وہ یہ ہے کہ بعض احادیث میں آیا ہے کہ نہر فرات (کا پانی ایک جگہ) سے رہٹے گا اور (وہاں) سونے کا پہاڑ ظاہر ہوگا۔ لوگ اُس پر باہم قتال کریں گے۔ یہاں تک کہ ہر سَو میں سے ننانوے قتل ہو جائیں گے صرف ایک بچے گا۔ نیز یہ بھی آیا ہے کہ زمین اپنے خزانوں کو اُگل دے گی مگر یہ اُس وقت ہوگا جبکہ لوگوں میں حرص بڑھ جائے گی اور حرص کی وجہ سے مال کم ہو جائے گا۔ پھر اللہ تعالے زمین کو حکم دیں گے کہ اپنے خزانے نکال دے (اُس وقت مال بہہ پڑے گا) یہاں تک کہ آدمی اپنا صدقہ (اور زکوۃ) لے کر نکلے گا تو اُس کا قبول کرنے والا کوئی نہ ہوگا جس کو دینا چاہے گا وہ کہہ دے گا کہ اگر تم یہ صدقہ کل لاتے تو ہم لے لیتے آج تو ہمیں اس کی حاجت نہیں۔ ان حدیثوں سے مال کے

ظاہر ہونے اور بہنے کی کیفیت بھی معلوم ہوگئی کہ زمین اپنے خزانے اُگل دے گی اور سونے کا پہاڑ (نہر فرات سے) نکلے گا اور اس کی جو علت بتلائی گئی ہے یعنی حرص کے ساتھ مال کی قلت وہ تو ہر زمانہ میں موجود ہے (تو اس فتنہ کے ظہور کا ہر وقت اندیشہ ہے) کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ آفتاب کبھی طلوع نہیں ہوتا مگر اُس کے دونوں طرف دو فرشتے ہوتے ہیں اُن میں سے ایک تو کہتا ہے اللھم اعط لمنفق خلفا" اے اللہ! مال خرچ کرنے والے کو (اُس کے مال کا) عوض دیجئے"۔ دوسرا کہتا ہے اللھم اعط لممسک تلفا" اے اللہ! مال جمع کرنے والے کو بربادی دیجئے"۔ یہ سوال نہ کیا جائے کہ جب قلت مال کا سبب حرص ہے تو پھر (غلبۂ حرص کے وقت) مال (زمین سے) کیوں نکلے گا (کیونکہ اس علت کا مقتضا، تو یہ ہے کہ جب تک لوگوں میں حرص کا غلبہ باقی ہو مال کی کثرت نہ ہو بلکہ قلت ہی رہے) جواب یہ ہے کہ مال کے ظاہر ہونے اور زیادہ ہونے میں فتنہ زیادہ ہے بالخصوص جبکہ اُس علت کو بھی اُس کے ساتھ ملا لیا جائے جو اُوپر مذکور ہوئی کہ صدقہ قبول کرنے والا بھی کوئی نہ ملے گا۔ اس سے بڑھ کر فتنہ کیا ہوگا (کہ مال کے پاک ہونے کی کوئی صورت ہی نہ ہوگی محض وبالِ جان ہی ہوگا) اور خود مال کا زیادہ ہونا اور بہنے لگنا بھی بہت بڑا فتنہ ہے (کلا ان الانسان لیطغیٰ ان راٰہ استغنیٰ "بے شک انسان سرکش ہو جاتا ہے جب وہ اپنے کو مستغنی سمجھتا ہے تو جب تک غلبۂ حرص کے ساتھ مال کی قلت ہو فتنہ کم ہے۔ اگر مال زیادہ ہو فتنہ زیادہ ہوگا) اس حدیث کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں (قیامت کی) جو علامات بیان کی گئی ہیں اُن کی تصدیق کی جائے اور ان امور پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا یقین کر کے ایمان کو قوی کیا جائے اور ان فتنوں سے بچنے کے لیے وہ عمل کیا جائے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے۔ آپ نے ایک دفعہ فتنوں کا ذکر فرمایا تو عرض کیا گیا آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں اگر ہمارے سامنے یہ فتنے آجائیں تو آپ نے فرمایا الجئوا الی الایمان والاعمال الصلحت "تم ایمان اور اعمال صالحہ کی پناہ ڈھونڈو۔ چنانچہ ان میں سے اکثر علامات اب ظاہر ہو چکی ہیں تو کیا صادق مصدق

صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے موافق کوئی اپنی نجات کی تیاری کرنے والا ہے؟

یہاں ایک صُوفیانہ گفتگو بھی ہے وہ یہ کہ جب ان حضرات کو معلوم ہوگیا کہ ان بڑے بڑے فتنوں سے بھی نجات ایمان اور اعمال صالحہ کے ذریعہ ہوتی ہے تو انہوں نے یقین کر لیا کہ چھوٹے چھوٹے فتنوں سے تو اعمال صالحہ اور ایمان کے ذریعہ بدرجہ اولیٰ نجات حاصل ہوگی تو اُنہوں نے ایمان اور عمل صالح کے سوا کسی کام میں اپنے کو مشغول نہ کیا بلکہ ہمیشہ کے لیے اُن ہی میں لگ گئے۔ جب اُنہوں نے دیکھ لیا کہ اس دُنیا کا فناء لابدی ہے تو اُنہوں نے اول کو آخر کر دیا اور آخر کو اوّل کر دیا (یعنی دُنیا کو مؤخر اور آخرت کو مقدّم کیا) اس لیے فرمایا ہے کہ جب یہ دُنیا کا گھر باقی نہ رہے گا تو اس کا سامان بھی فناء ہوگا۔ پس ایسے گھر کے لیے کام کرو جس کو فناء نہیں اور جس کا سامان بھی باقی رہنے والا ہے اور اپنے اوقات کو نفع سے آباد رکھو۔ اُن کو (عمل سے) خالی (چھوڑ کر برباد) نہ کرو۔

وقوله عليه السلام حتى يكثر فيكم المال فيفيض المال هنا المراد به الفضة والذهب الى قوله و لا تدعه خاليا۔

ف حضرات صُوفیہ کا حرص و ہوا سے منزہ ہونا اور کثرتِ مال کا طالب نہ ہونا مشاہد ہے۔ یہ حدیث اُن کے مذاق کی تائید کرتی ہے۔



باب شصت ویکم[۶۱]

حدیث

ان لنفسك عليك حقا و لاهلك عليك حقا

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کیا مجھے یہ نہیں بتلایا گیا کہ تم رات بھر (نماز میں) قیام کرتے اور ہر دن روزہ رکھتے ہو۔ میں نے عرض کیا بے شک میں ایسا کرتا ہوں۔ فرمایا۔ اگر تم (ہمیشہ) ایسا کرو گے تو تمہاری آنکھیں (اندر کو) گڑ جائیں گی اور تمہارا بدن لاغر ہو جائے گا۔ (جس سے تکلیف ہوگی) اور تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے۔ تمہارے گھر والوں کا بھی تم پر حق ہے پس روزہ بھی رکھو، افطار بھی کرو (رات کو نماز میں) قیام بھی کیا کرو اور سویا بھی کرو۔

شرح ظاہر حدیث ہمیشہ رات بھر نماز پڑھنے اور ہر دن روزہ رکھنے سے ممانعت پر دلالت کر رہا ہے۔ کیونکہ بشر اس سے عاجز ہے۔ اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۲۵) بدون تحقیق کامل کے کسی پر کوئی حکم نہ لگانا چاہیئے

کسی شخص پر کوئی حکم پوری تحقیق اور تفتیش کے بعد لگانا چاہیئے کیونکہ راوی نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر دی کہ عبداللہ بن عمر رات بھر نماز پڑھتے اور ہر

دن روزہ رکھتے ہیں۔ تو حضورؐ نے عبداللہ بن عمرؓ پر اس روایت سے کوئی حکم نہیں لگایا بلکہ پہلے اُن سے دریافت کیا۔ اگرچہ حضورؐ جانتے تھے کہ جس نے آپ کو خبر دی ہے وہ بھی سچا ہے کیونکہ حضرات صحابہ سب کے سب مقام صدق اور دیانت پر فائز تھے مگر تحقیق کا ایک پہلو باقی تھا کہ خود اُس شخص سے بھی دریافت کیا جائے تو حضورؐ نے اس پہلو کو نہیں چھوڑا بلکہ اُن سے دریافت کرنے کے بعد جب اُن کی زبان سے خود سُن لیا تب یقین کیا۔ پس آپ کے اس دریافت کرنے میں چند مسائل شرعیہ پر دلالت ہے ایک تو وہی جس پر ابھی اشارہ کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ تحقیق روایت کے متعلق قاعدہ شرعیہ مقرر کر دیا جائے (کہ راوی ثقہ اور صادق بھی ہو جب بھی دُوسرے پر کوئی حکم اُسوقت تک نہ لگایا جائے جب تک خود اُس سے معاملہ کی تحقیق نہ کر لی جائے) اور (تیسرے) یہ کہ یہ معلوم کیا جائے کہ اس وقت اس عمل کے متعلق اُس کی کوئی خاص نیت تھی جس کو زبان سے ظاہر نہیں کیا اور اسی لیے وہ نقل میں نہیں آسکی یا کوئی خاص نیت نہ تھی۔ نیز یہ بھی معلوم ہو جائے کہ یہ عمل کسی شرط پر معلق تھا یا نہیں؟ اور اس شرط کا علم راوی کو تھا یا نہیں یا مروی عنہ نے یہ بات ویسے ہی کہہ دی تھی اس پر عمل کرنے کا پختہ ارادہ نہ تھا۔ اس لیے آپؐ نے دریافت کیا تاکہ یقین کے ساتھ معلوم ہو جاوے کہ آئندہ کے لیے کیا ارادہ ہے۔ اس کے سوا اور بھی بہت احتمالات ہیں جن کو رفع کرنے کے لیے سوال کیا گیا واللہ اعلم۔ اسی لیے علماء نے فرمایا ہے کہ سُنت کی چند قسمیں ہیں۔ اُن میں سے ایک سُنت تو وہ ہے جس پر عمل کرنا واجب ہے گو اُس کے ثبوت کا یقین نہ ہو۔ مثلاً دو گواہوں کی شہادت پر فیصلہ کرنا کیونکہ اُن کے متعلق غلطی کا بھی احتمال ہے اور سچا ہونا بھی ممکن ہے مگر ہم کو اُن کی شہادت پر حکم نافذ کرنے کا امر ہے جبکہ اُن کا عادل ہونا متیقن ہو۔ پس جو شخص کسی حکم کو اس حال میں نافذ کر دے کہ شریعت کے موافق اس کے سبب کا پورا ثبوت نہیں ہوا تو اُس کا یہ فعل سراسر گمراہی ہے اگرچہ نفس الامر میں اُس کا فیصلہ بعینہٖ حق کے موافق ہی کیوں نہ ہو کیونکہ ہم کو غیب پر حکم لگانے کا امر نہیں کیا گیا۔ بجز اللہ عزوجل پر ایمان لانے کے کہ یہاں غیب پر حکم لگانے کا امر کیا گیا ہے۔

قولہ الوجہ الاول منہا ان الحکم لایکون الاعلی اکمل وجوہ التحقیق والتثبیت الی قولہ الاف الایمان بہ عزوجل حیث امرنا بہ۔

ف حضرات صوفیہ میں جو علم ظاہر و باطن کے جامع ہیں وہ روایات پر عمل کرنے میں بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ بدون تحقیق کامل کے کسی پر کوئی حکم نہیں لگاتے۔ بعض صوفیہ جو علم ظاہر کے جامع نہیں ہیں حُسن ظن کی بناء پر روایات میں تساہل کر جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی کتابوں میں ضعاف اور احادیث موضوعہ کثرت سے پائی جاتی ہیں مگر محققین صوفیہ کی یہ شان نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۱۲۶) ہر ذمہ دار کو اپنے ماتحتوں کے جزئیات احوال سے باخبر رہنا چاہیئے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ جس شخص کی نگرانی میں کچھ رعیت ہو خواہ چھوٹی رعیت ہو یا بڑی اُسے اپنی رعیت کے جزئیاتِ احوال کو معلوم کرنا چاہیئے اور رعیت میں سے جس کو بھی کسی کے احوال کی کچھ خبر ہو اُس پر واجب ہے کہ سردار کو اُن احوال سے مطلع کر دے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے (اس حدیث میں) عبداللہ بن عمرو سے فرمایا ہے کیا مجھ کو یہ نہیں بتلایا گیا کہ تم رات بھر نماز پڑھتے ہو۔ الخ اگر آپ نے خود اس کو دریافت نہ کیا ہوتا اور صحابہ کے نزدیک یہ بات طے شدہ نہ ہوتی کہ اُن کو اپنے اور دوسروں کے جن احوال کا علم ہو اُس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو مطلع کرتے رہیں تاکہ اُس کے متعلق حُکمِ الٰہی معلوم ہو جائے تو حضورؐ کو کوئی بھی یہ خبر نہ پہنچاتا کیونکہ آپ کی ہیبت صحابہ کے دلوں میں بہت تھی یہاں تک کہ وہ اس تمنّا میں رہا کرتے تھے کہ کوئی دیہات آکر آپؐ سے کچھ دریافت کرے تو حضورؐ جو کچھ جواب میں فرمائیں اُس کو سُنیں اور اُس سے فائدہ حاصل کریں" (تو بدون آپؐ کے دریافت کئے کسی کی مجال نہ تھی کہ ایک دوسرے کی بات حضورؐ تک پہنچاتا) قولہ الوجہ الثالث فیہ دلیل علی ان کل من کان مسترعی رعیۃ صغرۃ او کبری الی قولہ فیستفیدون۔

ف اس دلیل و استدلال میں نظر ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیبت کے

متعلق حضرت علی کا یہ ارشاد موجود ہے من راٰہ بداھۃ ھابہ ومن خالطہ بشاشۃ احبہ۔ جس سے واضح ہوگیا کہ ہر وقت کے پاس رہنے والوں پر زیادہ ہیبت غالب نہ ہوتی تھی بلکہ محبت غالب ہوتی تھی۔ احادیث و سیر کے مطالعہ سے یہ امر واضح ہے کہ حضرات صحابہ بلا تکلف آپؐ کے سامنے ہر قسم کی باتیں کر لیا کرتے تھے حتیٰ کہ غلام اور باندیاں اور مسلمانوں کے بچے بھی آپؐ سے بے تکلف تھے اور یہ جو ایک حدیث میں آیا ہے کہ صحابہ اس تمنا میں رہتے تھے کہ کوئی دیہاتی آکر آپؐ سے کچھ سوال کرے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ صحابہ ہیبت کی وجہ سے آپ کے سامنے بات نہ کر سکتے تھے صرف یہ معلوم ہوا کہ سوالات نہیں کر سکتے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ صحابہ کے بعض بے تکلف سوالات سے ایک دفعہ آپ کو ایذا پہنچی تھی کیونکہ وہ سوالات بے ضرورت تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی یا ایھا الذین اٰمنوا لا تسئلوا عن اشیاء ان تبد لکم تسؤکم۔ جس میں اس قسم کے سوالات سے ممانعت کر دی گئی۔ اس کے بعد صحابہ سوالات میں احتیاط کرنے لگے اور کسی عاقل دیہاتی کے آنے اور سوال کرنے کی تمنا کرنے لگے تھے۔ کیونکہ دیہاتیوں کے سوالات سے حضورؐ پر گرانی نہ ہوتی تھی۔ رہا یہ کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے اس واقعہ کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کس طرح ہُوئی سو اُس کے متعلق کنز العمال میں تاریخ حاکم کے حوالہ سے مذکور ہے کہ اُن کے والد حضرت عمرو بن العاص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تھی کہ عبداللہ رات بھر نماز پڑھتے ہیں اور رات کو روزہ رکھتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا اے عبداللہ! (رات کو) نماز بھی پڑھا کرو اور سویا بھی کرو (اور دن میں) روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کیا کرو اور اپنے باپ عمرو بن العاص کی اطاعت کرو۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن عمرو کی والدہ نے بھی اُن کی شکایت کی تھی کہ عبداللہ نے تو دُنیا کو ترک ہی کر دیا ہے بیویوں کو چھوڑ دیا ہے اُن سے کچھ مطلب ہی نہیں نہ وہ اُس سے کچھ واسطہ نہیں۔

عہ جو آپ کو دفعۃً دیکھتا اس پر آپ کی ہیبت غالب ہوتی اور جو دل کھول کر ملتا جلتا اُس پر محبت غالب ہوتی تھی ۱۲

گوشت کھاتے ہیں۔ صحیح ج ۲۔

اس سے معلوم ہُوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے عبداللہ بن عمرو کے جزئیات، احوال کو خود دریافت نہیں کیا بلکہ اُن کے والدین نے شکایت کی تھی اور اُن کے والدین کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے قرب اور قرابت کا ایسا تعلق تھا کہ حضورؐ کی ہیبت اس قسم کی باتوں سے اُن کو مانع نہ تھی۔ یہ تو اس دلیل و استدلال پر کلام تھا باقی حضرت شارح کا مدّعا اس دلیل پر موقوف نہیں۔ دوسرے دلائل سے یہ مدعا ثابت ہے کہ ہر ذمہ دار کو اپنے ماتحتوں کے احوال و اقوال کی خبر گیری کرنا چاہیئے البتہ تجسس سے پرہیز کرنا چاہیئے کہ قرآن و حدیث میں تجسّس سے منی وارد ہے۔ ماتحتوں کے احوال و افعال کی خبر گیری کا مطلب یہ ہے کہ کوئی کام اُن کے سپرد کر کے بے فکر نہ ہو جائے بلکہ تحقیق کرتا رہے کہ وہ اس کام کو کس طرح انجام دیتے ہیں اور اگر اُن کے دُوسرے اعمال کے متعلق کوئی شکایت پہنچے تو اُس کی پوری تحقیق کر کے اُن کو تنبیہ کی جائے۔ واللہ تعالےٰ اعلم۔

(۱۲۷) عبادت میں فرائض کو مقدم کرنا چاہیئے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ عبادت میں فرائض (مستحبات و نوافل پر) مقدم کرنا مناسب ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا ہے کہ تمہاری جان کا تم پر حق ہے۔ تمہارے گھر والوں کا تم پر حق ہے (تو آپؐ نے حقوق نفس اور حقوقِ اہل کو شب بیداری اور صوم دہر پر مقدم کرنے کا امر فرمایا ہے)

اس جگہ یہ سوال ہو سکتا ہے کہ نفس کے حق سے کیا مراد ہے؟ اسی طرح اہل کے حقوق کیا ہیں؟ اور اہل سے یہاں کون مراد ہے؟ سو حق نفس کے بارے میں حضرات فقہاء اور اہل معاملات (یعنی صوفیہ کرام) میں اختلاف ہُوا ہے۔ فقہاء تو یہ فرماتے ہیں کہ حق نفس یہ ہے کہ جن حظوظ کی بوجہ بشریت کے نفس کو حاجت ہے اُن کو پُورا کیا جائے (جیسے کھانا پینا، سونا، بیوی کے پاس جانا) اور کسی وقت نفس

کو راحت بھی دی جائے۔ جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (دوسری حدیث) میں فرمایا ہے روّحوا القلوب ساعة۔ دلوں کو کچھ کچھ دیر کے بعد آرام بھی دیا کرو۔ نیز آپ کا ارشاد ہے ان المنبت لا ارضا قطع ولا ظهرا ابقى۔ تیز دوڑانے والے نے نہ تو مسافت ہی کو طے کیا نہ سواری کو سلامت رکھا (کیونکہ برابر تیز دوڑانے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ جانور چلنے سے رہ جاتا ہے) مگر ان حضرات کے نزدیک بھی اس حظ کے پُورا کرنے کی شرط یہ ہے کہ سُنت کے موافق پُورا کیا جائے اور اہل معاملات (صوفیہ کرام) فرماتے ہیں کہ نفس کا تم پر حق یہ ہے کہ اُس کو مولیٰ کے سوا سب سے الگ کر دو (اس صورت میں یہ حدیث ایسی ہوگی) جیسا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے انصر اخاك ظالما او مظلوما (اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم) اور ظالم کی مدد یہ ہے کہ اُس کو ظلم سے روک دے (حالانکہ ظلم سے روکنا اس کو ناگوار ہوگا مگر اُس کا حق نصرت اسی طرح ادا ہوگا اس کی ناگواری کی پرواہ نہ کی جائے گی۔ اسی طرح نفس کو اللہ تعالیٰ کے سوا سب سے منقطع کر دینا اگرچہ اس کو ناگوار ہو مگر اُس کی خیر خواہی کا حق اسی طرح ادا ہوگا خوب سمجھ لو) اور دونوں قولوں کو جمع کرنا بھی ممکن ہے۔ اس صُورت میں تقریر یہ ہوگی کہ تعلقات قلبیہ میں تو حق نفس یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کے سوا سب سے اُس کو منقطع کر دو اور اسباب (ظاہرہ) میں حق نفس یہ ہے کہ خلاف شرع اسباب سے اُس کو جُدا کر دو۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ قلوب کو تمام احوال میں اللہ تعالےٰ کے سوا کسی سے لگاؤ نہ رہے (ہر طرف اللہ تعالےٰ ہی کی طرف متوجّہ رہے) اور اسباب ظاہرہ میں جو تصرف بھی ہو شریعت کے مطابق ہو جس کی رفعت شان پر سب کا اتفاق ہے۔ اس طریقہ کی شاہد آثار نبویہ میں حضرت معاذ کی حدیث ہے جب اُن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کے ساتھ یمن بھیجا تاکہ لوگوں کو دین کی تعلیم دیں۔ چنانچہ یہ دونوں وہاں پہنچے اور لوگوں کی تعلیم کے لیے ایک ایک سمت کو روانہ ہو گئے جیسا کہ اُن کو امر کیا گیا تھا۔ پھر کسی موقعہ پر دونوں کا اجتماع ہوا تو ایک نے دوسرے سے پُوچھا تم قرآن کس طرح پڑھتے ہو؟ حضرت

ابو موسیٰ نے فرمایا۔ میں اُس کو (نماز میں) کھڑا ہو کر بھی پڑھتا ہوں۔ بیٹھ کر بھی پڑھتا ہوں لیٹ کر بھی پڑھتا ہوں۔ وقفہ وقفہ سے پڑھتا رہتا ہوں۔ رات بھر نہیں سوتا۔ حضرت معاذ نے فرمایا کہ میں تو (رات کو نماز میں) کھڑا ہو کر پڑھتا بھی ہوں اور سوتا بھی ہوں اور جیسا قیام سے ثواب کی اُمید رکھتا ہوں اسی طرح سونے میں بھی ثواب سمجھتا ہوں۔ پھر دونوں اس اختلاف کا خود فیصلہ نہ کر سکے اور کسی نے دُوسرے کی بات کو افضل نہ مانا۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے اس اختلاف کا ذکر کیا تو حضورؐ نے فرمایا اے ابو موسیٰ! معاذ تم سے زیادہ سمجھدار ہیں جو قیام (لیل) بھی کرتے ہیں اور سوتے بھی ہیں (اسی کے مناسب) بعض بزرگان طریق کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ ان کو مناجات اور فضل (خداوندی) کی خاص حالت میسّر ہوئی تو دُعا کی کہ یہ حالت میرے لیے ہمیشہ رہا کرے تو اُن سے (بطریق الہام کے) کہا گیا کیا تم بشر نہیں ہو اور بشریت کے رہتے ہوئے یہ حالت ہمیشہ نہیں رہ سکتی ؎

در بزم عیش یک دو قدح درکش و برو   یعنی طمع مدار وصال دوام را (حافظ)

پس جب تم ہمارے حکم اور نہی کی طرف رجوع کرتے رہو (ہمارے حکم کو بجالاؤ اور جس فعل سے منع کیا گیا ہے اُس سے باز رہو) تم ہمیشہ ہمارے پاس رہو گے (یعنی قرب کا مدار احوال پر نہیں بلکہ اعمال پر ہے۔ تم اپنے اعمال کو شریعت کے موافق رکھو ہر حال میں مقرب رہو گے۔ احوال ہوں یا نہ ہوں اگرچہ عادۃ اللہ یہ ہے کہ استقامت اعمال سے استقامت احوال بھی عطا ہو جاتی ہے مگر احوال کے لیے دوام لازم نہیں) رہا یہ کہ یہاں اہل سے کون مراد ہے تو یہ بھی احتمال ہے کہ بیوی بچے وغیرہ جن کا نفقہ مرد کے ذمہ ہے سب ہی مراد ہوں کیونکہ اگر انسان ہر وقت عبادت میں مشغول رہے گا۔ ان کے حقوق کا ادا کرنا دشوار ہو جائے گا۔ حالانکہ ان حقوق کے متعلق اس سے سوال کیا جائے گا اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں اہل سے صرف بیوی مراد ہو کیونکہ شوہر پر اُس کا حق یہ بھی ہے کہ اس سے مقاربت کرے اور روزہ اور شب بیداری (کی کثرت) اس میں کمی کا باعث ہو گی جس سے ایک حق واجب

میں خلل واقع ہو گا۔ مگر عام معنے پر حدیث کا محمول کرنا زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ اس میں زیادہ فائدہ ہے (اور اس حدیث میں اہل کو زوجہ پر محمول کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اولاد اور ماں باپ وغیرہ کا حق بندہ کے ذمہ نہیں بلکہ یہ کہا جائے گا کہ چونکہ صحابی کے والدین نے خاص طور پر یہ شکایت کی تھی کہ عبداللہ کو تو نہ دنیا سے واسطہ نہ بیوی سے مطلب۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی خصوصیت کے ساتھ بیوی کے حق کی تاکید فرمائی بقیہ حقوق میں کوتاہی کی کسی نے شکایت نہ کی تھی تو یہاں اُن کے ذکر کی حاجت نہ تھی۔ دوسرے مواقع پر بہت احادیث میں حضورؐ نے جملہ اہل حقوق کے حقوق پر تنبیہ فرمادی ہے) قولہ الوجہ السادس فیہ دلیل علی ان الاولیٰ فی العبادۃ تقدیم الفرائض الی قولہ وحملہ علی الاعم اولیٰ لانہ اکبر فی الفائدۃ ؎

ف یہ ہے اصلی اور حقیقی تصوف کہ فرائض کو نوافل و مستحبات پر مقدم کیا جائے لیکن آج کل کے جاہلوں کا تصوف یہ ہے کہ نماز قضاء ہو جاوے، روزہ قضاء ہو جاوے مگر پیر کا بتلایا ہُوا وظیفہ قضاء نہیں ہو سکتا۔ بعضے جاہل صوفی اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہم نے تیس برس سے بیوی بچوں کی صُورت نہیں دیکھی۔ بعضے اس پر فخر کرتے ہیں کہ ہم سے کسی بزرگ کا کوئی عُرس فوت نہیں ہوتا برابر ہر عُرس میں شریک ہوتے ہیں۔ حالانکہ اس کی وجہ سے اُن کی صدہا نمازیں ریل کے سفر میں قضا ہو جاتی ہیں یا بے ڈھنگے پن سے پڑھی جاتی ہیں۔ مگر ان جاہلوں کے نزدیک نماز روزہ میں وہ ثواب کہاں جو عُرس اور قوالی میں ہے استغفر اللہ ولاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ ان لوگوں نے کیسا شریعت اسلامیہ کو مسخ کیا اور کس بُری طرح تصوف کو بدنام کیا ہے۔ یاد رکھو نہ یہ لوگ صُوفی ہیں نہ ان کو تصوف کی ہَوا لگی تصوّف تو اس کا نام ہے کہ دل نور ذکر سے منور ہو جاوے۔ اللہ تعالےٰ سے غافل نہ رہے اور اعمال میں شریعت کی پوری پوری موافقت ہو۔ جس کو یہ دولت حاصل ہے وہ صوفی ہے ورنہ مدعی اور جاہل ہے۔

ف یہاں سے معلوم ہُوا کہ مدار قرب احوال پر نہیں بلکہ اعمال پر ہے۔ یہ بات آب زر سے

لکھنے کی ہے۔ حضرت حکیم الامۃ دام مجدہم نے اپنے مواعظ و ملفوظات میں بار بار اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ سالک کو اپنے اعمال کی اصلاح اور تکمیل میں سعی کرنا چاہیئے کہ قرب اسی سے عطا ہوتا ہے۔ ایک دفعہ سبحان اللہ دل سے خلوص کے ساتھ کہنے سے تو قرب ہو گا مگر گھنٹہ بھر کے استغراق اور دن بھر کے جوش و خروش سے کچھ بھی قرب نہ ہو گا۔ کیونکہ احوال کو قرب میں دخل نہیں وہ تو صرف سہولت اعمال کے لیے عطا ہُوا کرتے ہیں تاکہ سالک کی ہمت عمل کے لیے بلند رہے خود مقصود نہیں۔ ان کی ایسی مثال ہے جیسے دستر خوان پر چٹنی کہ وہ غذا کے لیے معین ہوتی ہے خود مقصود نہیں ہوتی۔ انسان کو چٹنی کے ذریعہ غذا سے پیٹ بھرنا چاہیئے۔ اگر کوئی چٹنی کی لذت پا کر اُسی سے پیٹ بھرنے لگے تو یقیناً نقصان اُٹھائے گا اور سب اس کو احمق بتلائیں گے۔

(۱۲۸) حدیث میں (انسان کی) بشری کمزوریوں پر بھی دلالت ہو رہی ہے کہ تکلف کے ساتھ قدر تحمل طبعی سے زیادہ عمل کرنا اکثر ضرر اور نقصان کا سبب بن جاتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ سے ان پر متنبہ فرمایا ہے (فانکؑ ان فعلت ذلکؑ) ھجمت عینکؑ و نفھت نفسکؑ (اگر تم ایسا کرو گے تو تمہاری آنکھیں (اندر کو) گھڑ جائیں گی اور تمہارا جسم کمزور ہو جائے گا۔ اس کلام کا پر شوکت عنوان بتلا رہا ہے کہ طبیعت انسانی اپنے ضعف کی وجہ سے اس عمل کا تحمل نہیں کر سکتی جس کا ان صحابی نے ارادہ کیا تھا۔ اس کی ایک نظیر یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ کو وصال صوم سے منع فرمایا تھا (وصال صوم یہ ہے کہ لگاتار روزے رکھتا چلا جائے۔ درمیان میں رات کو بھی کچھ نہ کھائے) صحابہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! آپ تو ایسا کرتے ہیں۔ فرمایا میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔ مجھے رات کو اللہ تعالےٰ کھلاتے پلاتے رہتے ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ حسی طور پر آپ (غیبی) کھانا کھاتے تھے کیونکہ اس صورت میں آپؐ کا وصال باقی نہ رہتا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ مجھے ایسی قوت عطا فرماتے ہیں جیسی کھانے پینے والے کو (غذا سے) حاصل ہوتی ہے۔ اسی بناء پر ایک بزرگ جب وصال کا ارادہ کرتے (ایک روٹی

اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیتے تھے۔ ایک دن وہ کسی ضرورت سے باہر گئے تو کسی درویش نے وہ روٹی تکیے کے نیچے سے نکال لی۔ جب بزرگ واپس آئے اور تکیہ کے نیچے روٹی کو نہ پایا تو پُوچھا یہاں سے روٹی کہاں گئی؟ درویش نے کہا حضور! آپ جیسے شخص کو اس روٹی کی ضرورت ہی کیا ہے (وہ تو کئی دن سے ویسے ہی رکھی ہوئی تھی، ہم نے اُس کو الگ کر دیا کہ جب کھاتے نہیں تو فضول رکھنے سے کیا فائدہ؟) فرمایا ادب کی رعایت کرو۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ اس وقت میری جو حالت تم دیکھ رہے ہو یہ میری طبعی (اور فطری) حالت ہے (ہرگز نہیں) بلکہ محض فضل الٰہی اور فیض ربانی (اس کا سبب) ہے تو اگر کسی وقت مجھے حالت بشری کی طرف لوٹا دیا جاوے (اور یہ فیض و مدد روک دی جائے) اس وقت اگر میرے پاس یہ روٹی ہو گی تو میں اس سے دشمن کو دفع کر سکوں گا (یعنی بھوک کو جو کبھی ہلاکت کی طرف مفضی ہو جاتی ہے اسی لیے اس کو دشمن کہہ دیا گیا یا شیطان کو دفع کر سکوں گا جو فیض و مدد باطنی کے بند ہونے کے وقت سالک کو بہکانے آتا ہے کہ لو تمہاری محنت دریاضت کی وہاں یہ قدر کی گئی کہ مدد بند کر دی گئی اب تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ تو اُس وقت روٹی تکیے کے نیچے سے نکال کر اُس کے وسوسہ کو دفع کر دیا جائے گا کہ میرے مالک نے ایک مدد بند کر دی تو دُوسری امداد تو اُس کی طرف سے موجود ہے کہ اُس نے مجھے روٹی کھانے کو دی ہے جس سے بھوک کو دفع کر کے قوت حاصل کر سکتا ہوں)

اسی حقیقت کی بناء پر احکام کو اصلی اور اکثری حالت پر مبنی کیا گیا ہے۔ مثلاً تین وقت کے فاقہ کے بعد مُردار کو حلال کر دیا گیا کیونکہ طبیعت انسان کی اصلی وضع اپنی کمزوری کی وجہ سے اس مقدار سے زیادہ فاقہ کا تحمل نہیں کر سکتی۔ اگر اس سے زیادہ کا تحمل کیا جائے گا تو انسان کی حالت میں خلل واقع ہو گا جس سے بعض دفعہ موت کی نوبت آ جائے گی اور اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں:-

مایفعل اللہ بعذابکم ان شکرتم و اٰمنتم۔

"اللہ تعالےٰ کو تمہیں تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے اگر تم شکر کرتے رہو اور ایمان لے آؤ"

(توکسی حالت میں انسان کو ہلاکت میں پڑنے کی ضرورت نہیں بلکہ جب خُدا نے اجازت دے دی ہے بے تکلف مُردار کھا کر اپنی جان بچائے اور قوت حاصل کر کے ایمان اور عمل صالح میں ترقی کرے۔ عبدیت اور بندگی اسی کا نام ہے۔ اس وقت طبعی نفرت پر عمل کر کے مُردار سے احتراز کرنا اور جان کو ہلاکت میں ڈالنا خدا کی بندگی نہیں بلکہ اپنی طبیعت کی بندگی ہے۔ عاشق کی شان یہ ہونا چاہیئے۔

ؔ چوں طمع خواہد زمن سلطانِ دیں
خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

عشق و محبت کی شان یہ ہے کہ اگر ایک وقت محبوب سر پر تاج شاہی رکھے تو جیسا اُس وقت خوش ہو کر محبوب کا شکر یہ ادا کرتا ہے اسی طرح اگر دوسرے وقت تاج شاہی سر سے اُتار کر ایک بھنگی کے سامنے عجز و نیاز کا حکم دے تو اس حکم کو بھی خوشی سے بلا چون و چرا بجالائے ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن
دل بدست دگرے دادن و حیران بودن

پھر اگر انسان کو کسی وقت اس سے زیادہ قوت عطا ہو جائے (کہ تین وقت سے زیادہ فاقہ کرنے سے بھی اُس کو ضعف اور کمزوری نہ ہو) تو یہ محض فضل و احسان ہے کہ اللہ تعالے نے اس کو لیے دوسرا دروازہ کھول دیا ہے۔ کیونکہ جیسا اللہ تعالیٰ نے دوسروں کے لیے کھانے پینے سے قوت عطا کرنے کا قانون مقرر کیا ہے اسی طرح اپنے خاص بندوں کے لیے بدون کھانے پینے کے قوت اور ہمّت عطا کرنے کا قاعدہ جاری کر دیا ہے تاکہ وہ اللہ تعالے کے سوا کسی کی طرف التفات نہ کریں۔ تو جو شخص اس شان کو (یعنی وصال صوم کو) اختیار کر کے ان لوگوں کی حرص کرنے لگے حالانکہ ابھی اس کو یہ فیض حاصل نہیں ہوا تو اُس کی حالت میں ضرور خلل واقع ہوگا اور یہ شخص اس آیت کا مخاطب ہوگا ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ اپنے ہاتھوں اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ مگر یہ کہ کسی کے ساتھ اس وجہ سے

لطف (کا معاملہ) ہو جائے کہ بزرگوں کے ساتھ اُس کو حُسنِ ظن ہے۔ اُن کی حالت کی تصدیق (اُس کے دل میں) ہے تو اور بات ہے لیکن غالب یہی ہے کہ اس شخص کو (ابتداء میں) دشواری پیش آئے گی۔ پھر بزرگوں کی حرمت کی وجہ سے دشواری اُٹھا دی جائے گی۔

قولہ فی الوجہ السابع فیہ دلیل علی ضعف البشریۃ
الی قولہ ثم یحمل عنہ للحرمۃ۔

(۱۲۹) حدیث سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ دین میں جس عمل کو مستحب کہا گیا ہے وہ بھی ہر حال میں مطلوب ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ صم وافطر وقم ونم روزہ بھی رکھو افطار بھی کرو۔ رات کو اٹھو بھی اور سوؤ بھی۔ اس کے اشارہ سے مستحب کا مطلوب ہونا مفہوم ہو رہا ہے اور اشارۂ کلام اور فحوی کلام کا وہی حکم ہے جو نص کا حکم ہے۔ مجھے اس میں کسی کا اختلاف معلوم نہیں ہوتا تو گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کلام کے ضمن میں یہ فرما رہے ہیں کہ اداء حقوق (زوجہ وغیرہ) میں ایسے مشغول نہ ہو کہ مستحبات کو بالکل ہی نظر انداز کر دو بلکہ فرض اور مستحب دونوں کو بجالاتے رہو۔ اگر تم قواعد شریعت میں غور کرو گے تو سب کو اسی انداز پر پاؤ گے (کہ فرائض اور مستحبات دونوں ہی کے اہتمام کا حکم کیا ہے)

پس جس کے ساتھ خیر کا ارادہ کیا گیا ہے وہ اپنے عیوب پر نظر رکھتا ہے (کہ فرائض میں کوتاہی ہو رہی ہے یا مستحبات میں) جس سے کامیابی کا راستہ اُس کو نظر آجاتا ہے۔ اس لیے (ایک بزرگ نے) فرمایا ہے کہ تمہارا اپنے نفس پر نظر کرنا ماسوا سے حجاب ہو جاتا ہے (یعنی ایسا شخص دوسروں کی خبر گیری اور خدمت نہیں کرتا نہ اُن کے حقوق ادا کرتا ہے) اور اپنے نفس کے سوا دوسری چیزوں میں مشغول ہو جانا اپنے نفس سے حجاب ہو جاتا ہے (کہ ایسا شخص اپنے نفس کی اصلاح و تکمیل کی طرف متوجہ نہیں ہوتا دوسروں ہی کی فکر میں رہتا ہے۔ پس نہ ہمہ تن

دوسروں میں مشغول ہو نہ ہمہ تن اپنے نفس میں مشغول ہو، بلکہ دوسروں کا حق بھی ادا کرے اور اپنی اصلاح کا بھی اہتمام کرے) پھر اگر تم کو اپنے نفس (کی اصلاح و فکر) سے عُجب ہونے لگا (اپنے کمالات پر نظر کر کے اپنے کو کچھ سمجھنے لگا) تو دوسروں سے کچھ فائدہ نہ پہنچے گا اور اگر (اصلاح نفس میں اس طرح لگے رہے کہ) اپنے نفس (کے کمالات) سے اندھے بن گئے تو اپنی ذات سے بھی تم کو خیر حاصل ہوگی اور دوسروں سے بھی فائدہ پہنچے گا۔

قوله الوجه الثامن فيه دليل على ان المندوب في الدين مطلوب على كل حال الى قوله نات خيرها وخير ما سواها -

ف اپنے نفس سے اسی کو نفع پہنچتا ہے جو اس کی فکر اصلاح سے غفلت نہ کرے اور ہمیشہ اس کو مُتّہم سمجھے اور دوسروں سے نفع اس کو پہنچتا ہے جو اپنے کو سب سے کمتر سمجھے۔ پانی نشیب کی طرف جاتا ہے، بلندی کی طرف نہیں چڑھتا اور اگر کبھی اتفاق سے بلندی پر جاتا بھی ہے تو نشیب کو بھر کر جاتا ہے یہی حال فیضِ باطن کا ہے ؎

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود
ہر کجا مشکل جواب آنجا رود



باب شصت و دوم ۶۲

حدیث

الاستخارة فی الامور

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو تمام کاموں میں استخارہ کی تعلیم (اس تاکید سے) فرماتے تھے جیسا قرآن کی سورت (اہتمام کے ساتھ) سکھلایا کرتے تھے۔ فرماتے کہ جب کسی کو کسی کام کا فکر (وتردد) ہو تو دو رکعتیں نفل پڑھے اُن کے بعد یوں کہے:-

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِیْرُكَ بِعِلْمِكَ وَاَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ وَاَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِیْمِ فَاِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ۔ اَللّٰهُمَّ اِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ خَیْرٌ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِیْ اَوْ قَالَ عَاجِلِ اَمْرِیْ وَاٰجِلِهٖ فَاقْدُرْهُ لِیْ وَیَسِّرْهُ لِیْ ثُمَّ بَارِكْ لِیْ فِیْهِ وَاِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ شَرٌّ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِیْ وَاٰجِلِهٖ فَاصْرِفْهُ عَنِّیْ وَاصْرِفْنِیْ عَنْهُ وَاقْدُرْ لِیَ الْخَیْرَ حَیْثُ كَانَ ثُمَّ اَرْضِنِیْ بِهٖ. قال ویسمی حاجته -

ترجمہ: اے اللہ! میں آپ سے تجویز خیر طلب کرتا ہوں آپ کے علم کے وسیلہ سے اور قدرت طلب کرتا ہوں آپ کی قدرت کے طفیل؟ اور مانگتا ہوں آپ سے آپ کے بڑے فضل کا کچھ حصہ کیونکہ آپ قادر ہیں میں قادر نہیں آپ جانتے ہیں اور میں نہیں جانتا۔ آپ تو علام الغیوب

ہیں۔ یا اللہ! اگر آپ کے علم میں یہ کام میرے لیے خیر ہو (یہاں مقصود کا نام لے یا تصور کرے) میرے دین میں بھی دنیا میں بھی اور انجام کار میں بھی تو اُس کو میرے لیے تجویز کر دیجئے اور میرے لیے آسان بھی کر دیجئے۔ پھر اُس میں میرے لیے برکت (و ترقی) بھی دیجئے اور اگر آپ کے علم میں یہ کام میرے لیے شر ہو (یہاں بھی مقصود کا نام لے یا تصور کرے) میرے دین میں اور دُنیا میں اور انجام کار میں تو اُس کو مجھ سے ہٹا دیجئے اور مجھے (بھی) اُس (کے خیال) سے ہٹا دیجئے اور جہاں کہیں بھی خیر ہو اُس کو میرے لیے مقدر فرما دیجئے۔ پھر مجھے اُس سے راضی رکھئے۔"

فرمایا اور (درمیان میں) اپنی حاجت کا نام بھی لے (ترجمہ میں تو اُس کا موقعہ بتلا دیا گیا اور اصل دُعا میں اُس کا موقعہ لفظ ھٰذا الامر ہے)

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دعائے استخارہ پر ترغیب دیا کرتے تھے۔ اس پر چند وجوہ سے کلام ہے:۔

صوفیہ نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے کسی کام کے لیے استخارہ کیا اور اُس میں اللہ تعالےٰ نے (کسی جانب) کوئی فیصلہ کر دیا (مثلاً وہ مقصود پورا کر دیا یا اُس سے دل کو ہٹا دیا یا ایسے اسباب پیدا کر دیئے جس سے وہ معاملہ خود ہی ہٹ گیا) اور بندہ اُس فیصلے سے راضی نہ ہُوا تو یہ اُن کے نزدیک کبائر میں سے ہے (یعنی بڑا گناہ ہے) جس سے توبہ کرنا اور باز آنا واجب ہے۔ کیونکہ یہ سوءِ ادب ہے، صوفیہ کا یہ ارشاد بہت ظاہر ہے کیونکہ جب بندۂ مسکین نے اپنے ایسے بڑے آقائے جلیل کی طرف رجوع کیا۔ اور اللہ تعالےٰ سے درخواست کی کہ اُس کے لیے جو صورت مناسب ہو تجویز کر دی جائے پھر یہ اللہ کی تجویز سے کیوں راضی نہیں ہوتا؟ یہ حالت تو نفاق کے مشابہ ہے بلکہ یہی تو عین نفاق ہے کیونکہ اس نے اپنا فقر اپنی احتیاج ظاہر کی (اور زبان سے) معاملہ کو اللہ تعالےٰ کے سپرد کر دیا اور دل میں اُس کے خلاف تھا اس حالت کو اُس کے اس قول سے کیا تعلق اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِیْرُکَ بِعِلْمِکَ (کہ یا اللہ! میں آپ سے تجویزِ خیر طلب کرتا ہوں آپ کے علم کے وسیلہ سے، اللہ سے تجویز کی درخواست کرنا پھر اُس کی تجویز سے راضی نہ ہونا دلگیر ہونا یہی تو نفاق ہے)۔ ایک حدیث میں یہ مضمون وارد ہُوا ہے کہ حق تعالےٰ فرماتے ہیں میں کسی پر اُس شخص سے زیادہ غضب ناک نہیں ہوتا جس نے مجھ سے کسی معاملہ میں استخارہ کیا۔ میں اُس کے متعلق ایک فیصلہ کر دوں پھر وہ میرے فیصلے سے ناگواری ظاہر کرے۔ او کما قال

قولہ بعد شرح الفاظ الحدیث وقد ذکر اھل الصوفۃ انہ من استخارہ فی شیء الی قولہ قضاء فکرھہ او کما قال۔

(۱۱۹) ہر لمحہ فقر و احتیاج و رجوع الی اللہ کو لازم کر لینا چاہیئے

اس میں صوفیہ کے لیے بہت بڑی دلیل ہے جو ہمیشہ کے لیے فقر و احتیاج اور ہر سانس میں اللہ تعالےٰ کی طرف یکسوئی کو اختیار کئے ہوئے ہیں کیونکہ جب ذرا سی دیر کی احتیاج سے (جو استخارہ میں ظاہر کی جاتی ہے) اتنا بڑا فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ بندہ کی دو رکعت نماز اور اُس کے بعد اللہ تعالےٰ کے دربار میں شفیع بن جاتی ہے) تو اگر یہ حالت دائمی ہو جائے تو پھر کیا ہو گا؟ (خود ہی سمجھ لو) ؎

آں دعائے بیخوداں خود دیگر ست — آں دعا زو نیست گفت داور ست
آں دعا حق می کند چوں او فناست — آں دعا بار ا اجابت از خدا ست
چوں خدا از خود سوال و گد کند — پس دُعائے خویشتن چوں رد کند (۱۲)

صوفیہ میں سے ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ جب کسی درویش کو کوئی حاجت پیش آتی وہ اس کے متعلق اللہ تعالےٰ سے التجا کرتے تو وہ اللہ تعالےٰ کے فضل سے (بہت جلد) پوری ہو جاتی۔ اس پر کوئی درویش عرض کرتا کہ حضرت اللہ تعالیٰ کی طرف التجا لے جانا بھی کتنی بڑی دولت ہے تو اُن کا جواب یہ ہوتا تھا کہ تم اس سے ہٹے ہوئے کب ہو، جو اُس کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہو (التجا تو وہ لے جاوے جو اللہ تعالےٰ سے غافل و محجوب ہو اور تم تو ہر وقت

اُس کی طرف متوجہ ہو) ان بزرگوں کے الفاظ میں غور کرو کس طرح اصول شریعت کے موافق حد اعتدال پر کسے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگرچہ اُن میں سے بعضوں کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس موقع کے لیے کیا قاعدہ ہے (کیا جواب مناسب ہے مگر اللہ تعالےٰ وقت پر اُن کی امداد فرماتے ہیں۔ اُن کی زبان سے وہی نکلتا ہے جو موقع کے مناسب ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جس کو جس دروازہ سے رزق دیا جائے اُسی کو لگا رہے اور جب ساری خیر اللہ تعالےٰ کی طرف رجوع ہونے میں ہے تو اس دروازہ سے کسی وقت نہ ہٹنا چاہیئے کہ رجوع کی ضرورت ہو۔ جیسا ان بزرگ نے فرمایا ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد فرمایا ہے من شغله ذكري عن مسألتي اعطيته افضل ما اعطي السائلين جس کو میری یاد مجھ سے سوال کرنے (اور دُعا کرنے) سے روک دے میں اُس کو مانگنے والوں سے بھی زیادہ دیتا ہوں۔ پس اپنی بصیرت کی آنکھ سے دیکھو کہ تم کس کے دروازے پر کھڑے ہو؟ اور کس (عظیم الشان) جہت کی طرف متوجہ ہو رہے ہو (اُس کا ادب ملحوظ رکھ کر دعا کرو اور جو مانگنا ہو مانگو پھر انشاء اللہ محروم نہ لوٹو گے)

قوله فهذا اقوى دليل لاهل الصوفية الى قوله بباب من تقف واى جهة تقصد۔

ف ۱ دعائے استخارہ کے الفاظ کو بجنسہا ادا کرنا اور جس طرح حدیث میں وارد ہیں اُسی طرح یاد کرنا چاہیئے۔ معنی بھی یاد ہوں تو بہت اچھا ہے تاکہ دعا دل سے اضطرار کے ساتھ ہو۔

۲ استخارہ واجبات یا محرمات و مکروہات میں نہیں ہوسکتا کیونکہ واجب کا بجالانا ضروری اور محرم و مکروہ سے بچنا لازم۔ پھر اُن میں استخارہ کا کیا مطلب؟ استخارہ صرف مباحات میں ہُوا کرتا ہے اور مستحبات میں بھی ہوسکتا ہے جبکہ دو مستحب میں سے ایک کو کرنا چاہتا ہو اور یہ معلوم نہیں کہ ان میں سے کونسا میرے واسطے زیادہ بہتر ہوگا۔

۳ مشہور یہ ہے کہ استخارہ میں جس جانب دل مائل ہو اُسی طرف خیر ہوتی ہے۔ اُسی کو اختیار کرنا چاہیئے۔ مگر حدیث میں اُس کا کچھ ذکر نہیں اس لیے استخارہ کے بعد جس شق کو بھی اختیار کرے گا اُس میں خیر ہوگی خواہ وہی جانب ہو جس کی طرف دل زیادہ مائل تھا یا دوسری جانب ہو۔ غرض استخارہ کے بعد جس جانب پر عمل کی توفیق ہوگی اسی میں خیر ہوگی۔

۴ اس میں شک نہیں کہ اگر استخارہ کے بعد کسی جانب دل زیادہ مائل ہُوا کہ استخارہ سے پہلے اُس طرف زیادہ میلان نہ تھا تو بظاہر یہ علامت اس کی ہے کہ اسی جانب کو اختیار کرنا بہتر ہے مگر وجوب اور لزوم کی علامت نہیں اس لیے اُس کے خلاف کو بھی اختیار کرنا جائز ہے۔ کچھ گناہ یا ضرر کا اندیشہ نہیں۔ بعض لوگوں کا جو یہ خیال ہے کہ استخارہ کے بعد جس جانب دل زیادہ مائل ہو اُس کے خلاف کرنا جائز نہیں یا اُس میں ضرر ہوگا غلط ہے اسی طرح جب تک دل کسی ایک طرف مائل نہ ہو استخارہ کو بیکار سمجھتے ہیں یہ بھی صحیح نہیں۔

۵ استخارہ کا مطلب یہ ہے کہ جب دو جائز یا دو مستحب کاموں میں تردد ہو کہ ان میں سے کس کو اختیار کروں تو استخارہ کرکے جس شق کو دل چاہے اختیار کرلے اُس میں ضرر نہ ہوگا۔ پھر جس شق کو اختیار کرلیا اُس کو حق تعالیٰ کی تجویز سمجھ کر اُس سے راضی رہنا چاہیئے اور یقین رکھنا چاہیئے کہ اس میں خیر ضرور ہوگی جو اکثر تو مشاہدہ میں آجائے گی اور اگر کبھی اُس کے مشاہدہ میں نہ آئے تو سمجھے کہ اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہیں اُن کے علم میں میرے لیے خیر ضرور ہے گو میری سمجھ میں نہ آئی ہو۔ استخارہ کے بعد جس شق کو اختیار کرلیا گیا اُس سے ناگواری اور ناراضی اور یہ خیال کہ مجھے دوسری شق اختیار کرنا چاہیئے تھی اُسی میں خیر ہوتی بہت بُری بات ہے جس پر حدیث میں وعید وارد ہوئی ہے۔

✻

باب شصت وسوم ۶۳

حدیث

ما بین بیتہ و منبرہ صلی اللہ علیہ وسلم

"ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر میری حوض پر ہوگا۔"

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر اور منبر کے درمیان جنت کا ایک روضہ ہے اور منبر حوض پر ہے اس کے متعلق چند وجوہ سے کلام ہے ایک یہ کہ اس کا کیا مطلب ہے کہ یہ قطعہ جنت کا روضہ ہے؟ کیا زمین کا یہ ٹکڑا بعینہ دُنیا سے جنت میں منتقل کر دیا جائے گا یا یہ مطلب ہے کہ اس میں (نیک) عمل کرنے سے جنت میں ایک روضہ کا استحقاق ہو جاتا ہے۔ علماء اس باب میں مختلف ہیں کسی نے پہلے قول کو لیا کسی نے دوسرے کو اور واللہ اعلم۔

بہتر یہ ہے کہ دونوں کو جمع کر لیا جائے کیونکہ ان میں سے ہر شق پر دلیل قائم ہے اور نظر دقیق سے بھی ہر ایک کی تائید ہو رہی ہے (تو ان کے ترک کی کوئی وجہ نہیں) اور تیسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہ قطعہ خود جنت ہی کا ٹکڑا ہو جیسا حجر اسود جنت کا پتھر ہے۔ نیل و فرات جنت کی نہریں ہیں اور ہندوستان کے بعضے

عـه اس مضمون کا ترجمہ بطور خلاصہ کے اس لیے کر دیا گیا کہ مفید تحقیق ہے اور چونکہ اس میں کوئی مسئلہ تصوف کا نہیں ہے اس لیے نمبر نہیں دیا ۱۲ ظ

(خوشبودار) پھل (اور پھول) اُن پتوں سے پیدا ہوئے ہیں جو آدم علیہ السلام کے ساتھ (اُن کے بدن پر چپکے ہوئے) جنت سے اُترے تھے۔ غرض حکمت اس کو مقتضی ہوئی ہے کہ اس دُنیا میں بھی جنت کے پانی اُس کی مٹی اُس کے پتھروں اُس کے میووں میں سے کچھ (بطور نمونہ کے) ہو یہ حکم جلیل (اللہ جل شانہ) کی حکمت ہے پس یہ قطعہ اس وقت بھی جنت کے باغوں میں سے ایک روضہ ہے اور آخرت میں بھی جنت کا روضہ ہو جائے گا۔ جیسا پہلے تھا اور اس میں عمل کرنے والے کو جنت کے روضہ کا استحقاق بھی ہوگا۔ یہی زیادہ ظاہر ہے۔ دو وجہ سے ایک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفعت شان کی وجہ سے۔ دوسرے اُس دلیل کی وجہ سے جو ہم نے اُوپر بیان کی ہے اس صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مشابہت ہو گی کہ جیسے اُن کو اللہ تعالےٰ نے جنت کا پتھر عطا فرمایا اسی طرح اپنے حبیب کو جنت کا روضہ عطا فرمایا۔

(۱۲۰) جمادات کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے شرف اور بزرگی حاصل ہوتی ہے

اس میں ایک لطیف اشارہ ہے وہ یہ کہ جب بے جان چیزوں کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے شرف حاصل ہوتا ہے تو اُس کے شرف کا کیا پوچھنا جو اقوال و احوال میں آپ کا متبع ہو فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین کسی کو خبر نہیں کہ اُن کے لیے کیا کچھ آنکھ کی ٹھنڈک کی چیز مخفی رکھی گئی ہے اسی وجہ سے حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم جب کسی اجنبی کو مسجد میں دیکھتے جس کو پہلے سے نہ پہچانتے تھے اُس سے پوچھتے کہ تیرے پاس قرآن کتنا ہے؟ پھر اُس کی حالت کے موافق رعایت کرتے اور اُسی کے مطابق مرتبہ عطا فرماتے

صحابہ کے نزدیک قرآن کے سوا بزرگی کا معیار کچھ نہ تھا

کیونکہ اُن کے نزدیک رفعت اور بزرگی کا معیار قرآن کے سوا کچھ نہ تھا اس ۔۔۔ جو

اسباب فضیلت کے تھے اُس میں تو سب برابر یا قریب قریب تھے اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب دفتر (بیت المال) میں صحابہ کے نام لکھے تو سب سے مقدم اُن کو کیا جو نسب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب تھے پھر اُن کو جو ہجرت میں مقدم تھے پھر اُن کو جو ہجرت میں مقدم تھے۔ پھر باقی لوگوں کو قرآن کے اعتبار سے مقدم و مؤخر کیا کہ جس کے پاس قرآن کا جتنا حصہ ہوتا اسی کے موافق اُس کو درجہ دیا جاتا یہاں تک کہ روایات میں آیا ہے کہ اُن کے بیٹے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے عرض کیا کہ آپ نے عبدالرحمٰن بن ابی بکر کو مجھ پر فضیلت کیوں دی؟ فرمایا اس لیے کہ اُس کے باپ تیرے باپ سے پہلے اسلام لائے تھے۔ ان سب کے بعد اللہ و رسول کے ساتھ محبت کا درجہ ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کو دریافت کیا (کہ قیامت کب آئے گی) تو آپؐ نے فرمایا کہ تو نے اس کے لیے کیا (سامان) تیار کیا ہے؟ اُس نے کہا میں نے قیامت کے لیے کوئی بڑا عمل تو زیادہ نہیں کیا مگر میں اللہ سے اور اُس کے رسول سے محبت رکھتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا بس تو جا تو اُن کے ساتھ ہوگا جس سے تو محبت رکھتا ہے۔

(تنبیہ) مگر دیکھو ایسا نہ ہو کہ تمہاری محبت محض دعوے ہی کی محبت ہو۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین چیزیں جس میں ہوں وہ ایمان کی حلاوت پا لے گا۔ اُن میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ و رسول اُس کو ہر چیز سے زیادہ محبوب ہوں اس حدیث پر شروع کتاب میں کلام گزر چکا ہے۔ غرض بلندی مرتبہ کا معیار ایمان اور اتباع ہے پھر جس کا دل چاہے اپنے کو ذلیل کرے یا معزز بنالے۔

(۱۲۱) دنیا کی جو چیزیں ضروریاتِ انسانی میں داخل ہیں وہ دنیا نہیں، بلکہ ثواب ہی ثواب ہیں جب کہ بقدرِ ضرورت ہوں۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ جو چیزیں ضروریاتِ بشریہ سے ہیں وہ دنیا میں اصلاً داخل نہیں بلکہ ثواب ہی ثواب ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میرا گھر اور

میرا منبر (جس میں گھر اور منبر کو حضور نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اور آپ کی طرف دُنیا منسوب نہیں ہو سکتی تو معلوم ہُوا کہ گھر اور منبر دُنیا میں داخل نہیں) کیونکہ گھر تو بندہ کی ضرورت کی چیز ہے وہ آدمیوں سے اُس کو چھپاتا ہے (اور بعض اوقات لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہونے کی ضرورت ہوتی ہے جیسے بیوی کے پاس جانا اور قضاء حاجت کرنا وغیرہ وغیرہ) اور بارش اور دھوپ کی تکلیف سے بچاتا ہے اور اُس میں خلوت کے ساتھ اپنے رب کی عبادت ہوسکتی ہے۔

اسی طرح دُنیا کے جس سامان کی بھی انسان کو ضرورت ہو جس سے آخرت کے کاموں میں مدد ملتی ہو وہ سب ثواب ہی ثواب ہے بشرطیکہ ضرورت کے موافق ہو (زیادہ نہ ہو) ورنہ خواہشِ نفس کے لیے ہوگا اور نفسانیات میں شامل ہوکر دوسری قسم میں داخل ہو جائے گا۔ اس لیے جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ازواجِ مطہرات کے گھروں کو مسجدِ نبوی میں شامل کیا۔ بعض صحابہ نے فرمایا کاش! ان مکانات کو اُن کے حال ہی پر چھوڑ دیا جاتا (مسجد میں شامل نہ کیا جاتا) تاکہ اس اُمّت کے پچھلے لوگ بھی اپنے نبی کے گھروں کو دیکھ لیتے کہ وہ کس شان کے تھے۔ (پھر ان کی سادگی اور بے تکلفی اور قدرِ ضرورت کے موافق ہونے سے سبق حاصل کرتے) اُن کی بلندی قدِ آدم سے صرف ایک ہاتھ کی لمبائی کے برابر زیادہ تھی۔ اس طرح آپؐ نے فرمایا ہے میرا منبر سو منبر میں سے اگرچہ کچھ ترفع ہے مگر حضورؐ نے منبر صرف دین کی ضرورت کے لیے بنوایا تھا تاکہ تمام حاضرین اللہ تعالےٰ کے احکام کو سُن سکیں اس لیے وہ ثواب ہی ثواب تھا۔

غرض انسان کو جس چیز کی اپنے دین کے لیے احتیاج ہو اور اُس میں دین کی مصلحت ہو وہ دُنیا نہیں ہے اگرچہ ظاہر میں سامان دُنیا کے مشابہ ہو۔ اسی علت کی بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھی اُسی وقت بنوائی جب آپؐ سے عرض کیا گیا کہ سلاطینِ روم کسی کے خط کو بدون مہر کے نہیں پڑھتے (اور دعوتِ اسلام کے لیے سلاطین عالم کے نام خطوط بھیجنے کی ضرورت تھی) تو آپؐ نے اس (دینی) غرض کے لیے انگوٹھی بنوائی۔ اس لیے علماء نے انگوٹھی پہننے میں اختلاف کیا

ہے کہ یہ ہر شخص کے لیے مطلقاً سُنت ہے یا صرف اُن ہی لوگوں کے لیے سُنت ہے جو صاحبِ حکومت ہوں جس نے اُس علت پر نظر کی جس کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھی بنوائی تھی اُس نے تو یہ کہا کہ انگوٹھی پہننا اُس کے لیے سنت ہے جس کو اس کی ضرورت ہو اور ضرورت کا ذکر اُوپر آچکا ہے اور جس نے صرف آپ کے فعل پر نظر کی علت پر نظر نہیں کی اُس نے کہا کہ جو کام رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے وہ مطلقاً سنت ہے اسی لیے کسی نے کہا ہے ؎

الدین بالسنۃ محیاہ — فلا تقصد فی فعلک سواہ
واحذر عوائد سوء — قد انلفت واھلکت محیاہ

(ترجمہ) دین کی حیات سُنت ہے۔ پس اپنے افعال میں سُنت کے سوا کسی چیز کا قصد نہ کرو۔ بُری عادتوں سے بچو جو دین کی حیات کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں "

قولہ وفیہ دلیل علی ان ما ھو من ضرورۃ البشر لیس من الدنیا الی قولہ واھلکت محیاہ ۔



باب شصت و چہارم ۶۴

حدیث

کراھۃ الرسول ان یبیت عندہ ذھب اولبیبی

عقبہ بن الحارث رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عصر کی نماز پڑھی جب آپ نے سلام پھیرا تو جلدی سے کھڑے ہو گئے اور اپنی ازواج میں سے کسی کے پاس تشریف لے گئے پھر باہر تشریف لائے اور لوگوں کے چہرے سے آپ نے محسوس کیا کہ اُن کو آپ کے جلدی اُٹھ جانے سے تعجب ہُوا ہے تو فرمایا کہ مجھے نماز میں یاد آیا کہ ہمارے پاس کچھ سونا ہے تو مجھے پسند نہ ہُوا کہ شام کو یا رات کو وہ ہمارے پاس رہے اس لیے میں نے اُس کے تقسیم کر دینے کا حکم دیا۔

شرح حدیث سے معلوم ہُوا کہ نماز کے اندر جو بات یاد آئے اُس پر عمل کرنا جائز ہے جب کہ وہ بات ایسی ہو جس سے نماز میں (نقصان نہ آتا ہو بلکہ) صلاح و کمال حاصل ہوتا ہو اور نماز کو فاسد کرنے والی بھی نہ ہو اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۲۲) ایک طاعت میں مشغولی کے وقت دوسری طاعت کو سوچنا جائز ہے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ ایک طاعت میں مشغول ہوتے ہُوئے دوسری طاعت کا ارادہ کرنا (یا اُس کو سوچنا جائز ہے مگر اس میں تفصیل کی ضرورت ہے کہ کس چیز

کا یاد کرنا نماز کو فاسد کرتا ہے اور کس کا یاد کرنا فاسد نہیں کرتا جس کے لیے اُن خواطر کا اقسام کا جاننا ضروری ہے جو نماز کے اندر انسان کے دل پر وارد ہوتے ہیں

خواطر و وساوس کے اقسام

اور وہ چار قسم کے ہیں۔ نفسانی، شیطانی، ملکی اور ربانی۔

خواطر ربانی تو نماز کے قبول ہونے کی علامت ہیں اور نماز پڑھنے والوں کا یہ اعلیٰ درجہ ہے (کہ نماز میں اُن کے قلب پر اللہ تعالےٰ کی طرف سے کوئی بات وارد ہو) دُنیا (کی زندگی) کے اعتبار سے یہی مُناجات کی حقیقت ہے (اور آخرت کے اعتبار سے مناجات کی حقیقت اس سے بھی اعلےٰ ہے) اور اس درجے کامیاب ہونے والے کچھ لوگ ہیں جو اس کو پہچانتے ہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ جو اسی شان کے تھے اُن سے جب کوئی مرید یہ کہتا کہ میں نے نماز میں یا نماز کے باہر فلاں غرض کے لیے دُعا کی تھی تو وہ اُس سے دریافت کرتے کہ تو نے دُعا کے قبول ہونے کے متعلق کوئی جواب، اور حضورِ قلب کی حالت میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے کوئی خطاب بھی سنا؟ اگر وہ کہتا کہ ہاں سُنا ہے تو سمجھ جاتے کہ اس کو خصوصیت والوں کے درجات میں سے کوئی درجہ حاصل ہے اور اگر کہتا کہ میں نے تو کچھ نہیں سُنا تو اُس کو عوام میں شمار کرتے اور فرماتے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اخلاص کے ساتھ خلوصِ قلب سے دُعا کرے اور اپنی درخواست کا جواب نہ سُنے یہ تو محال ہے۔ اُن کے نزدیک یہ صورت محالات کی قبیل سے تھی کیونکہ اُن کا حال یہی تھا (کہ اُن کو حضورِ قلب کی حالت میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے خطاب اور جواب مسموع ہوتا تھا اور اس صُورت میں نماز سے قلب کو جس قدر راحت ملے گی ظاہر ہے) اسی حقیقت کی بناء پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جعلت قرة عینی فی الصلوٰة۔ میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔ نیز فرماتے ہیں ارحنا بھا یا بلال اے بلال! ہم کو نماز سے راحت پہنچاؤ۔ کیونکہ مجاہدہ کی پیاس شرابِ مُناجات کی ٹھنڈک سے بُجھ جاتی ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گرمی (شوق و محبت) کو

سکون ہوتا تھا۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اقرب ما یکون العبد من ربہ وھو ساجد فاکثروا فیہ الدعاء فقمنٌ ان یستجاب لکم۔

"بندہ کو اپنے رب کا زیادہ قرب سجدہ میں حاصل ہوتا ہے تو سجدہ میں دعا بہت کیا کرو یہ دعا اس قابل ہے کہ قبول کی جائے"

کیونکہ اس میں قرب و اتصال (کی شان) ہے اس کو اہلِ قرب ہی سمجھتے ہیں اور اُن ہی کے ساتھ یہ حال مخصوص ہے۔ اے اللہ! ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہم کو بھی اس درجہ کا اہل بنا دے ورنہ (کم از کم) ہم کو اُس کی تصدیق سے تو محروم نہ فرمائیے۔

اور خاطر ملکی وہ ہے جو کسی خیر کی طرف انسان کو رغبت دلائے جیسے وہ بات جو اس حدیث میں مذکور ہے۔ پھر یہ خاطر کبھی تو ایسا ہوتا ہے جس پر تم کو عمل کرنا چاہیے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خشوع کا سبب بن جاتا ہے اور یہ بھی نماز کا اعلےٰ درجہ ہے یا اُس سے نماز کے اندر وسوسے منقطع ہو جاتے ہیں اور اس حالت میں نماز کا حُسن ہی زیادہ ہو گا۔ جب تک دل اس میں اتنا مشغول نہ ہو کہ اُس سے نماز (کے ارکان و واجبات) میں خلل واقع ہو جائے کہ اس صُورت میں نماز کا اعادہ کیا جائے گا۔ جیسا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا کہ ایک بار آپ نے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو مغرب کی نماز پڑھائی اور اس میں قرأت نہ کی۔ بعد میں آپ سے اس کے متعلق عرض کیا گیا (کہ آپ نے نماز میں قرأت نہیں کی) فرمایا رکوع اور سجدہ کیسا تھا کہا گیا اچھا تھا۔ فرمایا تو پھر کچھ حرج نہیں۔ میں شام کی طرف ایک لشکر کے تیار کرنے (کے خیال) میں رہا لوگوں کو اُن کے مقامات پر متعین کیا اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے نماز کا اعادہ فرمایا۔ اس لیے علماء میں اختلاف ہوا ہے کہ اگر رکوع و سجود پوری طرح ادا ہو گیا ہو اور قرأت نہ کی گئی ہو تو نماز کا اعادہ واجب ہے یا نہیں (حنفیہ و شافعیہ کے نزدیک اعادہ واجب ہے کیونکہ قرأت بھی رکنِ صلوٰۃ ہے جس کے ترک سے نماز

باطل ہو جاتی ہے) اور اگر رکوع و سجدہ میں کچھ نقصان رہ گیا ہو تو اعادہ (بالاتفاق) ضروری ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک اعرابی سے جس نے نماز میں رکوع و سجود پوری طرح نہ کیا تھا، جلدی جلدی نماز پڑھی تھی) فرمایا ارجع فصل فانک لم تصل لوٹو پھر نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔ کیونکہ اس صورت میں ارکان کے اندر نقص رہ گیا ہے اور اگر خاطر نفسانی ہو تو اگر وہ ایسا خیال ہے جو نماز کے منافی ہے جیسے کسی جائز خواہش کو سوچنا (خواہ کھانے پینے کی قسم سے ہو یا بیوی بچوں کا خیال ہو وغیرہ وغیرہ) تو نماز کا اعادہ مستحب ہے۔ کیونکہ نماز سے اصل مقصود (اللہ تعالےٰ کی طرف توجّہ اور) حضور قلب اور لذاتِ نفس سے الگ ہونا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ان اللہ لا یقبل عمل امرئ حتی یکون قبلہ مع جوارحہ۔ اللہ تعالےٰ کسی شخص کا عمل قبول نہیں فرماتے جب تک اُس کا دل اعضاء کے ساتھ نہ ہو (کہ جس طرح اُس کے اعضاء قیام و رکوع و سجود وغیرہ میں لگے ہُوئے ہیں۔ اسی طرح اس کا دل بھی قیام و رکوع و سجود میں مشغول ہو کہ دل بھی اللہ تعالےٰ کے سامنے بحالتِ قیام عرض معروض کرتا ہو۔ اللہ کے سامنے عجز دنیاز کے ساتھ رکوع و سجود کرتا ہو) اب اگر قلب ان شہوتوں میں مشغول ہوا تو وہ کہاں اور نماز کہاں؟ ہاں اگر یہ نفسانی خطرہ ایسا ہو کہ دل میں آیا پھر الگ کر دیا گیا اور اُس کی طرف التفات نہ ہُوا تو ان شاء اللہ مضر نہ ہو گا۔ بشرطیکہ تکبیر تحریمہ اخلاص کے ساتھ (حضور قلب سے) کہی گئی ہو۔ کیونکہ ہمیں بُرے خیالات کے دفع کرنے کا حکم ہے۔ نماز میں بھی اور نماز سے باہر بھی۔ مگر نماز میں اُن کے دفع کرنے کی زیادہ تاکید ہے۔ اُسی علت کی وجہ سے جو اُوپر مذکور ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے احدث مع الذنب توبۃ السر بالسر والعلانیۃ بالعلانیۃ۔ گناہ کے ساتھ جلدی سے توبہ کرو۔ مخفی گناہ سے مخفی طور سے توبہ کرو اور علانیہ سے علانیہ کرو (پس جب کوئی بُرا خیال دل میں آئے اُس سے فوراً توجہ کو ہٹا لو یہی اُس کی توبہ ہے۔ اور اگر وہ خیال ناجائز شہوت (حرام خواہش) کا خیال ہوا تو نماز بالکل نہ ہو گی۔ کیونکہ طاعت اور معصیت جمع نہیں ہو سکتیں۔ جب ہم سے حضورِ قلب کے فوت ہونے پر یہ کچھ کہا گیا ہے جس کا اُوپر ذکر ہوا (کہ اللہ تعالےٰ ایسی نماز کو قبول نہیں فرماتے) تو اس بُری حالت کا تو کیا پُوچھنا؟ اور اگر شیطانی خطرہ ہوا تو (اُس کی دو حالتیں ہیں) اگر اُس کی طرف دل مائل ہو گیا اُسی میں لگ گیا، اُس کی طرف متوجہ ہو گیا تو نماز فاسد ہے کیونکہ یہ بھی نفسانی خطرہ کی جنس سے ہے جو حرام خواہش کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جو خیال شہوانی ہو وہ نفسانی ہو گا اور جو معصیت کی قسم سے ہو وہ شیطانی ہو گا۔ اور اگر اُس کی طرف التفات نہ ہو اُس سے استغفار کر لیا اور توجّہ کو ہٹا لیا تو اُمید ہے کہ ان شاء اللہ نماز فاسد نہ ہو گی (یہ دوسری قسم ہے)۔

خواطر کی ایک قسم وہ ہے جو بطلان اور جواز کے درمیان ہے یہ وہ خواطر ہیں جو کثرت کے ساتھ دل میں آتے ہیں اور ان کے دفع کرنے سے غفلت کی جاتی ہے اور اُن میں (قصداً) دل کو مشغول بھی نہیں کیا جاتا۔ ان کے متعلق نہ اس پر کوئی دلیل ہے کہ اُن سے نماز فاسد ہو جاتی ہے نہ اُس کے عکس پر کوئی دلیل ہے۔

قولہ منہا جواز الامر علی عمل طاعۃ وھو فی اخری الی قولہ فلا دلیل لنا علی الفساد ولا علی ضدہ۔

ف خواطر نفسانی کی ایک قسم سے اور خواطر شیطانی سے مطلقاً نماز کا فاسد ہو جانا صوفیہ کا مذہب ہے۔ فقہاء کے نزدیک ان سے نماز فاسد نہیں ہوتی ناقص ہو جاتی ہے یعنی کامل درجہ میں قبول نہیں ہوتی اگرچہ درجہ صحت میں قبول ہو جاتی ہے کہ اس شخص کو تارکِ صلوٰۃ شمار نہیں کیا جاتا نمازی مانا جاتا ہے۔ فقہاء کے نزدیک ارکان کے ترک سے نماز فاسد ہوتی ہے اور واجبات کے ترک سے واجب الاعادہ اور ترکِ خشوع سے مستحب الاعادہ ہوتی ہے۔

ف خشوع کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ نماز میں قصداً کوئی دنیوی خیال نہ لایا جائے

بلکہ اپنی طرف سے نماز ہی کی طرف توجہ رکھی جائے۔ اگر بلاقصد وسوسہ آئے تو خشوع کے لیے مضر نہیں اور اعلیٰ درجہ یہ ہے ان تعبد اللہ کانک تراہ اس طرح عبادت کرو جیسے خدا کو دیکھ رہے ہو۔ ان دونوں کے درمیان بہت سے درجات ہیں۔

(۱۲۳) نماز کے بعد کچھ دیر مصلے پر بیٹھنا چاہیئے حدیث سے معلوم ہُوا کہ سیدنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کی عادت یہ تھی کہ نماز کے بعد (کچھ دیر) مسجد میں ٹھہرتے تھے (فوراً مصلےٰ سے کھڑے نہ ہو جاتے تھے۔ یہ اس سے معلوم ہُوا کہ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلدی گھر میں تشریف لے جانے سے تعجب کیا۔ اگر یہ بات حضورؐ کی عادت (شریفہ) کے خلاف نہ ہوتی تو صحابہ اس پر تعجب نہ فرماتے۔

قولہ و فیہ دلیل علی ان عادۃ سیدنا صلی اللہ علیہ وسلم کانت الاقامۃ بعد الصلوٰۃ الی قولہ لم یتعجب منہ۔

ف اور حدیث سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ حضرات صحابہ بھی نماز کے بعد فوراً مسجد سے نہیں جاتے تھے۔ بلکہ کچھ دیر تک اپنی جگہ پر رہتے تھے۔ کیونکہ اس واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب گھر سے واپس تشریف لائے ہیں تو صحابہ بدستور اپنی حالت پر تھے۔ یہاں سے حضرات صوفیہ اور محققین علماء کی تائید ہوگئی جو نماز فجر اور عصر کے بعد کچھ دیر تک تسبیح وغیرہ میں مشغول رہتے ہیں۔ اہلِ ظاہر نے جو اس عمل سے انکار کیا ہے اُس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو اشارات کلام تک رسائی نہیں اُن کا فہم ظاہر حدیث سے آگے نہیں بڑھتا۔

(۱۲۴) جو کسی بات کی طرف دعوت دیتا ہے وہی اُس پر غالب ہوتی ہے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ جو کسی خیر کی طرف بُلاتا ہے اکثر اوقات وہی خیر اُس پر غالب ہوتی ہے تاکہ حال قول کے موافق ہو۔ چنانچہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُوسری حدیثوں میں ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص اپنی نماز کی جگہ بیٹھا رہے ملائکہ

اُس کو دُعا دیتے رہتے ہیں۔ نیز فرمایا ہے کہ ایک نماز کے بعد دُوسری نماز کا انتظار کرنا رباط ہے (یعنی سرحد اسلام کی حفاظت کے مثل ہے) چونکہ حضورؐ نے اس بات کی ترغیب دی ہے تو آپ کی حالت پر بھی اسی کا غلبہ تھا۔ صحابہ نے جب اس کے خلاف دیکھا تو اُن کو تعجب ہُوا۔ قولہ و فی ھذا دلیل علی ان یکون من یدعوالی خیر یغلب ذلک الخیر علیہ الی قولہ فلمارأوا منہ غیر ذلک تعجبوا۔

ف یہاں سے معلوم ہُوا کہ جن باتوں کی دوسروں کو ترغیب دی جائے اُس پر خود بھی اکثر اوقات عمل کرنا چاہیئے۔

(۱۲۵) حقِ صحبت یہ ہے کہ اہلِ صحبت کی تشویش کو زائل کیا جائے

حدیث سے معلوم ہوا کہ عادت کے خلاف کرنے سے دوستوں کو تشویش ہوتی ہے۔ جبکہ اُن کو اس کا سبب معلوم نہ ہو۔ چنانچہ صحابہ نے اسی وجہ سے تعجب کیا۔ نیز یہ بھی معلوم ہُوا کہ صحبت کا حق یہ ہے کہ اہلِ صحبت کی ادنیٰ تشویش کو بھی حتی الامکان دُور کرنے کی کوشش کی جائے۔ کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم (اس واقعہ میں فوراً) واپس تشریف لائے اور صحابہ کو بتلا دیا کہ اس وقت (خلاف عادت) جلدی گھر والوں کے پاس کیوں تشریف لے گئے تھے۔

قولہ وفیہ دلیل علی ان مخالفۃ العادۃ تقتضی التشویش علی الاخوان الی قولہ واخبارھم بسبب سرعۃ رجوعہ الی اھلہ۔

ف اس کا اہتمام حضرات صوفیہ کو سب سے زیادہ ہے اور یہاں سے معلوم ہُوا کہ حسن معاشرت بھی دین کا بڑا جزو ہے۔

(۱۲۶) ظاہری حالت کے موافق برتاؤ کرنا درست ہے

یہاں سے معلوم ہُوا کہ انسان کی ظاہری حالت کے موافق برتاؤ کرنا درست ہے گو اُس نے صاف طور سے اپنی حالت ظاہر نہ کی ہو اور سوال بھی نہ کیا ہو کیونکہ سیدنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب لوگوں کے چہروں میں تعجب کے آثار ملاحظہ فرمائے تو اُن کو اپنے فعل کا سبب بتلادیا۔

کیفیّتِ قلب کا اثر چہرے پر ظاہر ہو جاتا ہے

نیز یہ بھی معلوم ہُوا کہ قلب میں جو کچھ ہوتا ہے اُس کا اثر چہرہ پر ظاہر ہو جاتا ہے اور یہ بات اُسی پر مخفی رہ سکتی ہے جس کے دل میں نور نہ ہو اور نور سے مُراد وہ خاص نور ہے جو وارثانِ رسول کو عطا ہوتا ہے۔ ورنہ یوں تو ہر مُسلمان کو اپنے ایمان کے موافق کچھ نہ کچھ نور حاصل ہوتا ہی ہے (مگر وہ حالاتِ قلبیہ کے ادراک میں کافی نہیں ہوتا۔ اس کے لیے خاص نور کی ضرورت ہے جو کمالِ ایمان سے حاصل ہوتا ہے) یہ اس سے مفہوم ہُوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے چہروں پر نظر ڈال کر اُن کے دلوں کی حالت پر استدلال فرمایا۔ اس کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے المؤمن ینظر بنور اللہ (مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے) جب وہ اللہ تعالےٰ کے نور سے دیکھے گا تو چہرے کی علامات سے اُس پر دل کی حالت مخفی نہ رہے گی۔ اب اگر اس کا ایمان قوی ہُوا تو وہ اصحابِ کشف سے ہوگا جو (دوسروں کے) دلوں کو اپنی بصیرت کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ جیسا چہروں کو سر کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

قولہ وفیہ دلیل علی العمل بما یظھر من الشخص دون افصاح وسوال الی قولہ کما یبصرون الوجوہ باعین رؤسھم۔

ف اس کو فراست کہا جاتا ہے جو احوالِ رفیعہ میں سے ہے مگر مقاصد میں سے نہیں اس لیے جس کو عطا ہو جائے نعمتِ الٰہی کا شکر ادا کرے اور اُس کے فوت سے غمگین نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ حالات اور کیفیات اختیار سے باہر ہیں اور امورِ غیر اختیاریہ کے درپئے ہونا پریشانی کا سبب ہے۔ شارح کے کلام سے شبہ ہوتا ہے کہ قوتِ ایمان کے لیے کشف لازم ہے مگر یہ قاعدہ کلیہ نہیں کیونکہ اہلِ طریق

کا اتفاق ہے کہ ولایت کے لیے کشف لازم نہیں۔ خوب سمجھ لو۔

(۱۶۷) کسی ضرورت سے اپنے نیک عمل کا بیان کرنا ریاء نہیں ہے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ (اپنے کسی) نیک کام کا ذکر کرنا ضرورت کے وقت جائز ہے اور اس سے حالت اخفا نہیں بدلتی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صحابہ کی حالت (تشویش) ملاحظہ فرمائی تو (ازالہ تشویش کی ضرورت سے) اپنا وہ نیک کام ظاہر فرما دیا جو آپ نے گھر جا کر کیا تھا تاکہ اُن کے قلوب مطمئن ہو جائیں کیونکہ بزرگوں نے کہا ہے کہ جو شخص کسی نیک کام کو چھپا کر کرے پھر (بلا ضرورت) اس کو (لوگوں کے سامنے) بیان کردے تو وہ عمل دفترِ علانیہ کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے (کہ اب وہ ثواب نہ ملے گا جو اخفاء عمل سے ملتا ہے بلکہ علانیہ کام کرنے کا ثواب ملے گا) اور اگر اُس کو دوبارہ بیان کردیا تو وہ دفترِ ریاء کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے (اب ثواب باطل ہو کر گناہ لکھا جاتا ہے) اور اگر کسی ضرورت سے ظاہر کیا جائے جیسی یہاں موجود تھی یا اُس کے مشابہ اور کوئی ضرورت ہو اور اظہار سے اپنی تعریف اور ثناء کی نیت نہ ہو تو اُمید ہے کہ نیکی اپنی حالت پر رہے گی (ثوابِ اخفاء باطل نہ ہوگا)

شیطان کا ایک بڑا کید اہلِ توفیق نے تصریح کی ہے کہ شیطان کی چالوں میں سے ایک چال یہ بھی ہے کہ جب بندہ چُھپا کر کوئی کام کرتا ہے تو اُس سے کہتا ہے کہ اس کو لوگوں کے سامنے بیان کردے تاکہ تیری اقتداء کی جاوے اور دوسروں کے عمل کا بھی تجھے ثواب ملے) چنانچہ وہ ایسا ضرور کرتا ہے اور اس طرح ریاء میں مُبتلا ہو جاتا ہے کہ اُس کو خبر بھی نہیں ہوتی بلکہ وہ اس خیال میں رہتا ہے کہ مجھے ثواب ملے گا جو کہ جہل مرکب ہے۔

قولہ وفیہ دلیل علی جواز ذکر المعروف الی فیکون جھلا مرکبا۔

ف اقتداء کے لیے اپنے اعمال کا ظاہر کرنا ہر شخص کا کام نہیں۔ یہ اس کا کام ہے جس کی نظر مخلوق سے اُٹھ جائے اور مدح و ذم اس کے نزدیک برابر ہو جائے۔

(۱۲۸) اپنے مال کو گھر والوں کی تحویل میں رکھنا جائز ہے

حدیث سے معلوم ہوا کہ اپنے مال کو بیوی کے پاس رکھنا جائز ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہمارے پاس کچھ سونا تھا حالانکہ وہ آپؐ کی بیوی کے پاس تھا اس لیے بعض ازواج کے پاس تشریف لے گئے اور اس کا (کسی حدیث سے) پتہ نہیں ملا کہ سیدنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی چیز ایسی بھی تھی جس کی آپؐ نے خود حفاظت کی ہو اور آپ کے سوا گھر والوں میں سے کسی کو اس کا پتہ نہ ہو۔ اگر یہ بھی معلوم ہوا کہ نیک کام میں دوسروں کو نائب کر دینا جائز ہے، چنانچہ حدیث میں آپ کا ارشاد موجود ہے کہ میں نے اُس کے تقسیم کرنے کا حکم دے دیا (قواعد فقہ سے یہ نیابت طاعت مالیہ کے ساتھ مخصوص ہے۔)

قولہ وفیہ دلیل علی ان للرجل ان یترک مالہ عند اھلہ الی قولہ معلن علیہ دون اھلہ " وقولہ فامرت بقسمۃ ۔

ف بعض حضرات صوفیہ کا اسی پر عمل ہے کہ روپیہ پیسہ اپنے پاس نہیں رکھتے گھر والوں کی تحویل میں رکھتے ہیں۔ اگر اُن کے گھر والے دیندار، دیانتدار ہوں تو ایسا کرنا درست ہے۔ جیسا حدیث سے معلوم ہوا ورنہ خود حفاظت کرنا چاہیئے۔ جیسا ولا تؤتوا السفھاء اموالکم سے مفہوم ہوتا ہے کہ بیوقوفوں کو اپنے اموال نہ دو جس کی تفسیر عورتوں اور بچوں سے کی گئی ہے جس کو حفاظتِ مال کا سلیقہ نہ ہو۔

(۱۲۹) دن بھر مال کو اپنی مِلک میں رکھنا خلاف زہد نہیں ہے

حدیث سے معلوم ہوا کہ مال کو دن بھر اپنی مِلک میں رکھنا جائز ہے اس سے مقامِ زہد باطل نہ ہوگا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھے یہ پسند نہ ہوا کہ شام کو یا رات، کو سونا ہمارے پاس رہے اور ایک دن رہنے سے آپ نے کراہت ظاہر نہیں فرمائی اور اس سے زہد کا مستحب ہونا بھی معلوم ہوا چونکہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر صرف کراہت کا اظہار فرمایا ہے اور کراہت کے ارتکاب میں گناہ نہیں ہوتا جس سے مال جمع کرنے کا جواز بھی مفہوم ہو رہا ہے۔ بشرطیکہ (شبہ بھی مطلق نہ کرتا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زہد (باتوں سے نہیں ہوتا) صرف حال سے ہوتا ہے اور حسی ہونا معنوی، زہد معنوی تو یہ ہے کہ دل کو مال سے تعلق نہ ہو اور حسی یہ ہے کہ مال کو علٰحدہ کر دے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر کیا۔

قولہ فیہ دلیل علی جواز ابقاء المال علی ملک صاحبہ طول یومہ الی

قولہ واما الحسی فھو الخروج عنہ کما فعل سیدنا صلی اللہ علیہ وسلم ھنا ۔

(۱۳۰) اُن صوفیہ کی دلیل جو رات کو اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے

اس میں اُن صوفیہ کی بھی دلیل ہے جو کسی معلوم شئے پر رات نہیں گزارتے (یعنی رات کو وہ اپنے علم میں اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے) کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھے یہ ناگوار ہے کہ شام کو یا رات کو ہمارے پاس سونا رہے۔ میں نے اس طریق کے ایک بزرگ کو دیکھا ہے کہ دن میں اُن کے پاس جو کچھ فتوحات آتیں رات کو اُن میں سے کچھ نہ رہتی تھی۔ ایک دن اُن کی زیارت کو بڑی جماعت آگئی اور اُس دن فتوحات بھی بہت ہوئیں تو خادم نے اپنے دل میں کہا کہ اگر میں تمام فتوحات کو شیخ پر ظاہر کر دوں گا تو اس جماعت کے لیے کچھ بھی نہ بچے گا وہ سب کو اپنے پاس سے الگ کر دیں گے اور یہ بہت بڑا مجمع ہے صبح کو ان کے ناشتے کے لیے کچھ نہ ہوگا۔ ہمیں اُن کے واسطے ایک اچھی مقدار شیخ کو اطلاع کئے بغیر بچا لینا چاہیئے جو کل کو اُنھیں کفایت کر سکے۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا (کہ کچھ فتوحات بچالیں) اور باقی کو سامنے کر دیا۔ لوگوں نے کھایا اور جو اُن سے بچا شیخ نے عادت کے موافق فقراء و مساکین میں اُس کے تقسیم کرنے کا حکم دیا۔ جب صبح ہوئی تو اُن کے پاس کچھ فتوحات نہ آئیں اب وہ خادم کھڑا ہوا اور دسترخوان بچھا کر اُس نے بہت سا کھانا مہمانوں کے سامنے رکھ دیا۔ شیخ نے پوچھا یہ کہاں سے آیا؟ اُس نے سارا واقعہ بیان کر کے عرض کیا کہ حضرت اگر میں ایسا نہ کرتا اور آپ

معمول کے موافق سارا بچا ہُوا کھانا خیرات کر دیتا) تو آج اس جماعت کے کھانے کو کچھ بھی نہ ہوتا۔ شیخ نے فرمایا (سبحان اللہ! کیسی اُلٹی سمجھ ہے) تمہاری اس حرکت نے ہی تو ہم کو آج کی فتوحات سے محروم کر دیا (اگر تم سب بچا ہوا کھانا خیرات کر دیتے اور اللہ کے ساتھ جو معاملہ چلا آرہا تھا اُس کو نہ بدلتے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنا معاملہ نہ بدلتے جس نے کل اتنی بڑی جماعت کے کھانے کا اپنے خزانہ سے انتظام کیا تھا وہ آج اس سے عاجز نہ تھا مگر تم نے خلافِ معمول کھانا بچا کر آج کی فتوحات کا دروازہ بند کر دیا) غرض جو کوشش کرتا ہے وہ (مقصود کو) پا ہی لیتا ہے اور جو خلوص سے کام کرتا ہے اُس سے اخلاص کے موافق معاملہ کیا جاتا ہے پس (اخلاص کامل اختیار کرو کیونکہ) پرکھنے والا بڑی گہری نظر والا ہے اور معاملہ ایسے کریم کے ساتھ ہے جو وعدہ کا پُورا اور غنی اور مہربان ہے۔ اس لیے کسی نے کہا ہے کہ جس راستہ سے چاہو پہنچو۔ اللہ تعالیٰ کو حقیقت کا پُورا علم ہے (وہ دلوں کے اسرار اور نیتوں سے خبردار ہیں۔ مخلص اور غیر مخلص مومن اور منافق وہاں نہیں چھپ سکتا) قوله وفيه دليل لاهل العرفة الذين لا يبيتون على معلوم الى قوله فقد بان للحق بالحقيقة علم۔

ف شیخ سے اخفاء حال کر کے معمولاتِ خانقاہ کو بدلنا بڑا جُرم ہے اس سے فتوحات بند ہو جاتی ہیں اور نظام میں بے برکتی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر کسی کو اس مُرید کی طرح آئندہ کے متعلق کوئی وسوسہ پیدا ہو تو اسلم یہ ہے کہ شیخ کو اپنے وسوسے سے مطلع کر کے یہ عرض کر دے کہ میری رائے ہیں کل کے واسطے کچھ بچا لینا مناسب ہے۔ اگر شیخ اس رائے کو قبول کرے، بچالے نہ قبول کرے تو اُس کے قول پر عمل کرے اور اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھے کہ آئندہ آج سے زیادہ فتوحات ہوں گی اور اگر بالفرض فتوحات نہ ہوں تو ایک دن کے فاقہ سے موت تو نہ آجائے گا۔ اتنی سی بات کے لیے شیخ کے معمول کو بدلنا اور اخفاءِ حال سے اُس کو مکدر کرنا ہرگز مناسب نہیں۔

باب شصت و پنجم ۶۵

حدیث

قضاء النافلة في وقت الكراهة

کریب (مولیٰ ابن عباس رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے (ام المؤمنین حضرت) ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے عصر کے بعد دو رکعتیں (نفل) پڑھنے کے متعلق سوال کیا (کہ یہ جائز ہے یا نہیں) حضرت ام سلمہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا تھا کہ آپ اس سے منع فرماتے تھے۔ پھر میں نے (ایک دن) دیکھا کہ آپ نے جب عصر کی نماز پڑھ لی اور میرے گھر میں تشریف لائے تو دو رکعتیں پڑھنے لگے اس وقت میرے پاس انصار کے قبیلۂ بنو حرام کی کچھ عورتیں بیٹھی تھیں تو میں خود آپ کے پاس نہ جا سکی بلکہ) میں نے ایک لڑکی کو آپ کے پاس بھیجا اور اُس کو سمجھا دیا کہ تو حضورؐ کے پہلو میں (آپ کے پاس) جا کر کھڑی ہو جانا۔ پھر عرض کرنا کہ ام سلمہ کہتی ہیں یا رسول اللہ! میں نے تو آپ سے یہ سُنا تھا کہ آپ ان دو رکعتوں سے منع فرماتے تھے اور (اب) میں دیکھتی ہوں کہ آپ (عصر کے بعد) یہ دو رکعتیں پڑھ رہے ہیں؟ اس پر اگر آپ ہاتھ سے اشارہ فرمائیں تو پیچھے ہٹ جانا۔ چنانچہ لڑکی نے ایسا ہی کیا۔ حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے اشارہ فرمایا تو وہ پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی جب آپ نماز سے فارغ ہو گئے تو فرمایا اے ابوامیہ! کی بیٹی (حضرت ام سلمہ مراد ہیں) تم نے عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھنے کے متعلق دریافت کیا ہے تو بات یہ ہے کہ میرے پاس قبیلۂ عبد القیس کے کچھ لوگ آگئے تھے اُنہوں نے مجھے ان دو رکعتوں سے مشغول کر دیا جو ظہر کے بعد

(پڑھی جاتی) ہیں سو یہ دو رکعتیں وہی[ع] (ظہر والی) ہیں (عصر کے بعد والی نہیں ہیں جن سے منع کیا گیا ہے)

شرح ظاہر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر کے بعد نفل نماز جائز ہے جبکہ ظہر کے بعد کی سنتیں فوت ہوگئی ہوں۔ امام شافعی کا مذہب تو یہ ہے کہ عصر کے بعد مطلقاً نفل نماز جائز ہے خواہ ظہر کے بعد کی سنتیں فوت ہوئی ہوں یا نہ ہوئی ہوں۔ مگر حدیث[ع] میں اس قول کے لیے کچھ حجت نہیں۔ دو وجہ سے ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نفل نماز دوسروں کی نفل جیسی نہیں۔ کیونکہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ آپ جب کوئی عمل کرتے تھے اُس پر دوام کرتے تھے تو آپؐ کی نفل نماز دوسروں کی نفل نماز کے مثل (واجب) ہوتی تھی۔ دوسری حدیث کے صریح الفاظ یہ ہیں کہ آپؐ نے فرمایا لوگوں نے مجھے ظہر کی دو رکعتوں سے مشغول کر دیا تھا تو مَیں نے اُن کی قضاء کی ہے اور قوت کلام کا درجہ اہلِ زبان کے نزدیک نص کے برابر ہے اور اس کلام کی قوت اور شوکت بتلا رہی ہے کہ آپ کا یہ فعل اُس نہی کا ناقص یا ناسخ نہیں ہے۔ جو عصر کے بعد نفل نماز پڑھنے کے متعلق پہلے سے موجود تھی بلکہ آپ کا یہ فعل خاص علت کی وجہ سے تھا جو حدیث میں مذکور ہے اور نہی اپنے حال پر باقی ہے۔ اُس کا حکم بھی دائمی ہے اور یہ ایسی بات ہے جس کا کوئی منصف انکار نہیں کر سکتا۔ اس لیے امام مالک (اور ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ) کا مذہب یہ ہے کہ یہ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ آپ نے نوافل کو اپنے ذمہ لازم کر لیا تھا۔ دوسرے ایسا نہیں کر سکتے اُن کو نہی پر عمل کرنا چاہیئے جس کا حکم باقی اور مستمر ہے البتہ لفظ حدیث پر بحث کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کر کے نوافل کو[ع] اپنے ذمہ لازم کر لے۔ پھر کسی عذر کی وجہ سے ظہر کی رکعتیں رہ جائیں اور عذر اتنا ممتد ہو جائے کہ ظہر کا وقت نکل جائے تو اُس کو عصر کے بعد اُن کی قضاء جائز ہے۔ جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں: لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں اچھی اقتداء ہے۔ لیکن اس صورت میں بھی ایک سوال پھر باقی رہے گا وہ یہ کہ عصر کے بعد نوافل ظہر کی قضا کرنا ہر عذر میں جائز ہے خواہ کیسا ہی عذر ہو؟ یا اسی عذر کے ساتھ خاص ہے۔ جو رسول اللہ صلعم کو پیش آیا تھا کہ آپؐ اُن لوگوں کو مسلمان کرنے میں مشغول تھے اُن کے دل میں اصولِ شریعت کو جما رہے تھے جس کے لیے آپ مبعوث ہوئے تھے۔ اگر ہم عموم کے قائل ہوں تو ہر عُذر میں اس فعل کو جائز کہا جائے گا اور اگر اسی عذر کے ساتھ حکم کو خاص کریں تو جب تک کسی کو ایسا ہی عذر واقع نہ ہو اس فعل سے منع کیا جائے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو ایسا عُذر پیش آنا شاذ و نادر ہی ہے خصوصاً اس زمانہ میں تو شاید ہی کسی کو ایسا عذر پیش آتا ہوگا اور اگر پیش بھی آئے تو اُس کی جگہ

ع نسائی اور طحاوی کی روایت میں یہ بھی ہے فقلت یا رسول اللہ افنقضیھا اذا فاتتنا قال لا۔ حضرت ام سلمہ کہتی ہیں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا ہم بھی ظہر کی دو رکعتوں کی (عصر کے بعد) قضاء کر لیا کریں جو کبھی ہم سے فوت ہو جاویں۔ حضورؐ نے فرمایا نہیں۔ کذا فی اعلاء السنن ۱۲ ظ

ع اس حدیث کی شرح میں حضرت شارح رحمۃ اللہ علیہ نے بہت طویل کلام کیا ہے۔ میں نے اس کا خلاصہ یہاں اس لیے بیان کر دیا تاکہ مدعیان اجتہاد کو معلوم ہو جاوے کہ تفقہ اور اجتہاد کسے کہتے ہیں محض حدیث کو اشتر کر لینے سے اجتہاد کا درجہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ پس ائمہ مجتہدین کا قول کسی حدیث صحیح کے خلاف دیکھ کر اُن پر طعن کرنا نری جہالت ہے کیونکہ وہ ظاہر میں ہی خلاف ہوتا ہے حقیقت میں خلاف نہیں ہوتا ہے۔

ع مگر خود یہ مسئلہ محل کلام ہے کہ نوافل کو بطور نذر کے اپنے ذمے لازم کر لینا مناسب ہے یا نہیں؟ سو ظاہر یہ ہے کہ ایسا کرنا بہتر نہیں کیونکہ اگر یہ صورت افضل ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت فجر اور عصر کے بعد نوافل سے منع فرمایا تھا اسی وقت یہ بھی بتلا دیتے کہ اگر کوئی ان اوقات میں نفل پڑھنا چاہے تو وہ نذر کے طور پر اپنے ذمے کچھ رکعتیں لازم کر لیا کرے پھر اُن کو ان اوقات میں پڑھ سکتا ہے۔ صحابہ سے بھی اس کا ثبوت نہیں کہ اُنھوں نے نوافل کو بطور نذر کے اپنے ذمے لیا ہو واللہ تعالیٰ اعلم ملا ظ۔

دوسرے اس خدمت کو انجام دینے والے بہت مل جائیں گے۔ ہاں اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ کسی کو دوسرا اس خدمت کا انجام دینے والا نہ ملے تو (جواز کی گنجائش ہو سکتی ہے مگر) یہ بہت ہی نادر ہے اور (مثل مشہور ہے النادر کالمعدوم) اس کے لیے کوئی حکم نہیں مقرر ہو سکتا۔ اسی بناء پر واللہ اعلم امام مالکؒ وابو حنیفہؒ نے اس حکم کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے (اور نسائی کی حدیث میں جو زیادت ہے وہ اس تخصیص کی صریح مؤید ہے)

(۱۳۱) چھوٹے بڑوں کے فعل پر سوال وارد کر سکتے ہیں

حدیث سے معلوم ہُوا کہ مفضول فاضل پر (یعنی خورد اپنے بزرگ پر) سوال (وارد) کر سکتا ہے جب اُس سے کوئی ایسی بات دیکھے جو اُس کی عادت دائمہ (اور ہمیشہ کے معمول) کے خلاف ہے۔ چنانچہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (اسی بناء پر) استفسار کیا تھا اور (ظاہر ہے کہ) حضور کے زمانے میں اور بعد میں بھی سب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے چھوٹے ہی ہیں۔

قولہ فیہ دلیل علی جواز استفہام المفضول علی الفاضل الی قولہ بالنسبۃ الیہ علیہ السلام مفضولون۔

ف مگر چھوٹوں کو بزرگوں کے کسی فعل پر سوال نہایت ادب سے کرنا چاہیئے جیسا حضرت ام سلمہؓ نے کیا۔ صوفیہ میں بعض حضرات قوال بالمعروف مشہور ہیں وہ اپنے بزرگوں پر بھی گرفت کرتے تھے۔ یہ حدیث اُن کی دلیل ہے مگر بہ درجہ اسی کے لیے ہے جس کو طرق آداب کی رعایت معلوم ہو۔

(۱۳۲) سوال سے پہلے منشاء سوال کی تحقیق لازم ہے

یہ بھی معلوم ہُوا کہ سوال سے پہلے منشاء سوال کی تحقیق کر لینا چاہیئے۔ چنانچہ حضرت ام سلمہ نے عرض کیا کہ مَیں آپ کو عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھتا ہُوا دیکھ رہی ہوں (اس قول سے تحقیق حال ہی

مقصود تھی کہ اگر یہ نماز کوئی اور نماز ہے تو پھر کوئی اشکال نہیں اور منشاء سوال کی تحقیق اس لیے ضرور ہے کہ) شاید وہاں کوئی ایسی بات موجود ہو جو ظاہر بین کی نظر سے مخفی ہو (جس کے معلوم ہو جانے کے بعد سوال وارد ہی نہ ہو) جیسا یہاں (واقعۂ حدیث میں) ہُوا کہ حضرت ام سلمہ نے حضور کی نماز کو عصر کے بعد کی رکعتوں پر محمول کیا تھا۔ جس سے ممانعت ہو چکی تھی۔ تحقیق کے بعد معلوم ہُوا کہ یہ قضاء نماز تھی عصر کے بعد نفل نہ تھی)

سوال میں تاخیر مناسب نہیں

حدیث سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ سوال میں تاخیر مناسب نہیں بلکہ جلدی کرنا ہی بہتر ہے (خصوصاً جب کسی فعل پر سوال ہو تو ابتداء فعل کے ساتھ ہی سوال کرنا چاہیئے۔ تاکہ اگر وہ فعل نسیان یا خطا کی وجہ سے ہو رہا ہے تو اُس کی تلافی ہو سکے۔ کام کر لینے کے بعد بجز استغفار کے تلافی نہ ہو سکے گی) چنانچہ حضرت ام سلمہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خلافِ عادت ایک عمل کرتے ہوئے دیکھا تو اُنہوں نے سوال میں تاخیر نہیں کی نہ اُس کا انتظار کیا کہ آپؐ نماز سے فارغ ہو جائیں تو سوال کروں بلکہ اُسی وقت سوال میں جلدی کی حالانکہ وہ خود بھی مشغول تھیں (کہ مہمانوں کی خاطرداری کی وجہ سے خود دریافت کے لیے نہیں جا سکیں باندی کو بھیجا) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی (نماز میں) مشغول تھے (مگر سوال اس نماز ہی کے متعلق تھا اس لیے مؤخر نہیں کیا گیا۔ اگر کسی اور عمل کے متعلق ہوتا تو نماز سے فراغت تک مؤخر کرنا لازم تھا) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا (کے اس فعل) پر انکار نہیں فرمایا تھا (تو ثابت ہُوا کہ جس عمل میں اشکال واقع ہو اُس پر ابتداء عمل ہی میں سوال کرنا درست ہے)۔

قولہ فیہ دلیل علی ان الاستفہام لایکون الا بعد التحقیق الی قولہ ولم ینکر ھو علیہ السلام علیہا بعد۔

(۱۴۲) نمازی سے اس کی نماز کے متعلق بات کر سکتے ہیں

یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز کی حالت میں نمازی سے ایسی بات کی نسبت سوال کیا جا سکتا ہے جس کا مرتبہ نماز کے بعد رہے۔ چنانچہ حضرت ام سلمہؓ نے نماز ہی میں آپ سے سوال کیا۔ کیونکہ اگر نماز سے فراغت تک سوال کو مؤخر کیا جاتا تو سوال بے فائدہ ہو جاتا (کیونکہ مقصود سوال سے یہ تھا کہ اگر آپ بھول سے یہ نماز پڑھ رہے ہیں تو اس کو ترک کر دیں اور ظاہر ہے کہ یہ مقصود نماز کے بعد حاصل نہ ہو سکتا تھا۔

نماز میں اشارہ سے بات کا جواب دینا درست ہے

یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز میں سوال کا جواب اشارہ سے دیا جا سکتا ہے۔ اس سے نماز فاسد نہیں ہوتی (اور ناقص بھی نہیں ہوتی) بشرطیکہ تھوڑا سا اشارہ ہو (جس میں عمل کثیر کی نوبت نہ آئے) کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب باندی نے (نماز کے اندر) گفتگو کی تو آپ نے دستِ مبارک سے اُس کو اشارہ کیا (کہ پیچھے کھڑی ہو جائے)۔

احکامِ شرعیہ دریافت کرنے کے لیے جاہل کو مقصد بنا سکتے ہیں، بشرطیکہ اُسے آداب بتلا دیئے جاویں

یہ بھی معلوم ہوا کہ احکام شرعیہ دریافت کرنے کے لیے کسی ناواقف (اَن پڑھ) کو قاصد بنا سکتے ہیں بشرطیکہ اُس کو اُن آداب کی تعلیم کر دی جائے جو اس حکم کے (دریافت کرنے کے) متعلق (شرعاً ضروری) ہیں۔ چنانچہ حضرت ام سلمہؓ نے جب اس باندی کو بھیجا تو اُس کو سب کچھ بتلا دیا کہ تجھ کو کیا کہنا چاہیئے اور کس طرح کرنا چاہیئے۔

قولہ وفیہ دلیل علی جواز السوال لمن هو فی الصلوة الی قولہ ما تقول وما تفعل۔

ف احادیث سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ مہمان کی (بڑی) حُرمت ہے (اُس کا احترام کرنا چاہیئے) دیکھو حضرت ام سلمہ کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے (اور بلا واسطہ سوال کرنے) سے اسی بات نے تو روکا کہ وہ ان عورتوں (کی خاطر داری) میں مشغول تھیں جو اُن کی زیارت (اور ملاقات) کو آئی تھیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ عورتوں کا ایک دوسرے کی ملاقات کو جانا جائز ہے بشرطیکہ اس میں کسی حرام یا مکروہ کا ارتکاب نہ ہو۔ کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان باتوں کو دیکھ لیتے جو آپ کے بعد عورتوں نے ایجاد کی ہیں تو اُن کو مسجدوں میں آنے سے روک دیتے تو جب (ان حرکتوں کی وجہ سے) اُن کو مسجدوں سے روک دیا گیا تو اور مقامات سے بدرجۂ اولیٰ روکا جائے گا۔

گھر والوں کے سامنے نفلیں پڑھنے میں ریاء کا اندیشہ نہیں

حدیث سے معلوم ہوا کہ گھر والوں کے سامنے نفل نماز پڑھنا جائز ہے (یعنی اس میں ریا کا اندیشہ نہیں نہ یہ خلوت کے منافی ہے۔ کیونکہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہؓ کے سامنے نماز نہ پڑھی ہوتی تو اُن کو آپؐ کی نماز کا علم ہی نہ ہوتا (پس یہ جو کہا گیا ہے کہ نوافل مسجد میں نہ پڑھے جائیں بلکہ گھر میں پڑھے جائیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ گھر میں گھر والوں سے چھپ کر پڑھے جائیں اور راز اس میں یہ ہے کہ ریاء کا خطرہ وہاں ہوتا ہے جہاں عمل کے دیکھنے والے ایسے لوگ ہوں جن کا اپنے سے افضل ہونا طبعاً گوارا نہیں ہوتا بلکہ اُن پر اپنی فوقیت اور فضیلت کی طبعاً خواہش ہوتی ہے اور اپنے گھر والوں پر فوقیت وفضیلت کی خواہش نہیں ہوتی بلکہ اُن کا فضائل دنیویہ یا دینیہ میں بڑھ جانا انسان کو طبعاً گوارا ہے۔ کسی کی بیوی یا بچے اُس سے بھی زیادہ صاحب ولایت وفضیلت بن جائیں تو اُس سے اُس کو طبعاً خوشی ہوتی ہے ناگواری نہیں ہوتی اس لیے اُن کے سامنے نفلیں پڑھنے میں ریاء نہیں ہوتی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تو مسجد اور گھر ہر جگہ برابر تھی آپ کو کسی جگہ بھی ریا کا خطرہ نہ تھا مگر آپ کا عمل اس طریقہ پر ہُوا کرتا تھا جس کے اتباع میں اُمت کے لیے

بھی کچھ خطرہ نہ ہو خوب سمجھ لو)

قولہ فیہ دلیل علی ان الضیف حرمۃ الی قولہ ماء لمت بہ۔

ف عورتوں کا باہم ایک دوسرے کی ملاقات کے لیے جانا عام حالات میں تو کچھ زیادہ بُرا نہیں بشرطیکہ غیبت و شکایت کی باتیں نہ کریں۔ نماز کو وقت سے مؤخر نہ کریں لیکن تقریبات میں ان کا جمع ہونا مفاسد سے خالی نہیں۔ اکثر بے پردگی بھی ہوتی ہے اور نمازیں بھی برباد ہوتی ہیں۔

(۱۳۵) بلاضرورت نمازی کے پاس کھڑا ہونا مکروہ ہے

حدیث سے معلوم ہُوا بلاضرورت نمازی کے پاس (کھڑا ہونا یا) بیٹھنا مکروہ ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلعم نے باندی کو اشارہ کیا کہ آپ کے پیچھے کھڑی ہو جائے اور معلوم ہے کہ اُس سے کچھ نہ کچھ تشویش (ضرور) ہوتی ہے۔

قولہ فیہ دلیل علی کراھۃ القرب من المصلی الی قولہ تشویش ما۔

ف آج کل لوگوں میں عام مرض ہے کہ کسی سے ملنا ہوتا ہے اور وہ نماز میں مشغول ہے تو اُس کے پاس جاکر بیٹھ جاتے یا کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حضرت حکیم الامت دام مجدہم کو یہ حرکت بہت ناگوار ہوتی ہے۔ یہ حدیث اُن کی حجت ہے۔

(۱۳۶) اگر نمازی سے کوئی ضروری بات نماز ہی کے اندر کہنا ہو تو اُس کے پہلو میں کھڑا ہو کر کہے

یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر نمازی کی حالت میں نمازی سے کچھ کہنا ہو تو اس کا قاعدہ یہ ہے کہ نمازی کے پہلو میں قریب جاکر بات کرے کیونکہ حضرت ام سلمہؓ نے باندی سے یہی فرمایا کہ حضورؐ کے پہلو میں کھڑے ہو کر عرض کرنا۔ قیاس فہمی بھی اسی کو مقتضی ہے کیونکہ اگر یہ شخص پہلو میں کھڑا ہو کر بات کرے گا تو نمازی گوشۂ چشم سے دیکھ کر اسے پہچان لے گا

اور ادنیٰ اشارہ سے جواب دے دیگا۔ اگر سامنے کھڑا ہوگا تو وہ اس کو اپنے آگے سے ہٹلائے گا کیونکہ وہ سامنے گزرنے والا ہوگا اور اس کے لیے دفع کا حکم ہے) اور اگر پیچھے یا کچھ دور کھڑا ہوگا تو بعض دفعہ پہچاننا دشوار ہوگا اور پہچان بھی لیا تو دُور ہونے کی وجہ سے اُس کی بات پر توجہ نہ ہو سکے گی جس سے نمازی کو تشویش (اور پریشانی لاحق) ہوگی اور ایسی حالت میں اشارہ سے جواب دینا بھی بعض دفعہ آسان نہ ہوگا۔

قولہ فیہ دلیل علی ان ادب من یسائی الی قولہ لاتمکن الاشارۃ الیہ الا بمشقۃ

ف سبحان اللہ! یہی آداب ہیں جن کی شریعت نے تشویش اور پریشانی سے بچانے کے لیے تعلیم کی ہے ان آداب کو دیکھ کر بے ساختہ ہر شخص شریعتِ اسلامیہ کی نسبت یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

شریعت نے تو مُسلمانوں کو ادنیٰ ادنیٰ تشویش سے بچانے کا اس قدر اہتمام کیا ہے مگر اب عوام اور خواص سب ہی اُس سے بے پرواہ ہیں اُن کی حرکات سے کسی پر پریشانی کا پہاڑ بھی ٹوٹ پڑے تو پرواہ نہیں کرتے اسی کا نتیجہ ہے کہ باہم وہ اُلفت و محبت باقی نہیں جو کبھی مُسلمانوں کے ساتھ مخصوص تھی فالی اللہ المشتکی۔

(۱۳۷) عورتوں سے علم حاصل کرنا جائز ہے جبکہ اس کی اہل ہوں

حدیث سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ عورتوں سے (شریعت یا طریقت کا) علم حاصل کرنا جائز ہے۔ کیونکہ راوی نے حضرت ام سلمہؓ سے یہ مسئلہ (مذکورہ) دریافت کیا اور اُن پر اعتماد کیا لیکن (عورتوں سے علم حاصل کرنے میں) یہ شرط ہے کہ اُن میں اس کی اہلیت ہو چنانچہ حضرت ام سلمہؓ میں یہ اہلیت (بدرجہ کمال) موجود تھی (اور یہ شرط مردوں سے علم حاصل کرنے میں بھی ہے مگر ان میں بکثرت قابل ہوتے ہیں

اس لیے تصریح کی ضرورت نہیں۔ عورتوں میں قابل کم ہوتی ہیں اس لیے شرط کی تصریح کر دی گئی) اور اس سے حضراتِ سلف (صالحین) رضی اللہ عنہم کا اہتمام بالدین بھی ظاہر ہے (کہ اُن کو دین کا کس قدر اہتمام تھا کہ راوی کو جس بات کا علم نہ تھا اُس کو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا (بے فکری کے ساتھ اُس کو ٹالا نہیں، بلکہ حکم شرعی معلوم کرنے کی فکر میں رہے) اور یہ حضرات سبھی ایسے ہی تھے خدا اُن سے راضی ہو کہ ایک ایک حدیث کے لیے کئی کئی دن کا (بلکہ مہینوں کا) سفر کرتے تھے اسی لیے کسی نے کہا ہے اذا کان لک بالدین اهتمام فقی المعالی لک قدر وان اضعته فما خطرك فی الوجود به خطر۔ جب تک تم کو دین کا اہتمام ہے تو بلند مقامات میں تمہارے لیے عزت ہے اور اگر دین کو برباد کر دیا تو پھر جو حالت بھی تم کو پیش آئے اُس میں خطرہ (ہی خطرہ) ہے۔ قوله وفیه دلیل علی جواز اخذ العلم من النساء الی قوله فما خطرك فی الوجود به خطر۔

ف اس سے اُن صوفیہ کی حجت ظاہر ہو گئی جنہوں نے بعض بزرگ عورتوں سے استفادہ کیا ہے پہلے زمانے میں جب مسلمانوں کے دن پہلے تھے عورتیں علوم ظاہرہ و باطنہ دونوں میں مردوں کی طرح کمال حاصل کرتی تھیں۔ آج کل مسلمان عورتوں نے علم کی طرف سے ایسی غفلت برتی ہے کہ گویا کبھی ان کو علم سے مَس ہی نہ تھا اگر کچھ عورتوں کو علم کا شوق ہوتا بھی ہے تو اسکولوں میں انگریزی پڑھنے کا شوق ہوتا ہے جو روز بروز ترقی پا رہا ہے مگر اس کو علم کہنا ہی علم کی توہین ہے آج کل جہل کا نام لوگوں نے علم رکھ دیا ہے ؎

علمیکہ رہ بحق ننماید جہالت ست

مردوں کو بھی آج کل علم دین کا اہتمام نہیں البتہ اگر کسی کے دس پانچ لڑکوں میں کوئی کودن بے وقوف ہوتا ہے جس سے امتحانات پاس کرنے کی اُمید نہیں ہوتی اور اس لیے اس کی تعلیم پر روپیہ خرچ کرنا بھی گوارا نہیں ہوتا تو مری بکری خواجہ خضر کے نام اُس کو عربی پڑھنے اور علم دین حاصل کرنے کے لیے بھیج دیتے ہیں پھر ہمارے

بھائی شکایت کرتے ہیں کہ آج کل رازی اور غزالی کیوں نہیں پیدا ہوتے۔ بھلا ان نادانوں اور بے وقوفوں کو کوئی رازی اور غزالی کیونکر بنا دے گا۔ جو علم دین کے واسطے چھانٹ چھانٹ کر بھیجے جاتے ہیں۔ قوم کو کچھ تو انصاف کرنا چاہیئے اور اپنی اس غفلت اور بے حسی پر کچھ تو شرمانا چاہیئے کہ دین کے ساتھ اس کا کیا برتاؤ ہو رہا ہے؟ اس بے پرواہی کا نتیجہ بہت کچھ ہمارے سامنے آ چکا ہے تو اس غلطی کا اعادہ نہ ہونا چاہیئے۔



باب شصت وششم ٦٦

حدیث

سبعة اوامر و سبعة نواهی

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہم کو سات باتوں کا حکم فرمایا، اور سات سے منع فرمایا۔ جنازہ[۱] کے ساتھ چلنے کا ہم کو حکم دیا اور بیمار[۲] کی عیادت کا اور دعوت[۳] کرنے والی کی دعوت منظور کرنے کا (مُراد ولیمہ کی دعوت ہے) اور مظلوم[۴] کی مدد کرنے کا اور قسم[۵] پُورا کرنے کا اور سلام[۶] کا جواب دینے کا اور چھینکنے[۷] والے کو دُعاء دینے کا (بشرطیکہ وہ بھی اوّل اللہ تعالےٰ کی حمد کرے یعنی الحمد للہ کہے تو سُننے والوں کو یرحمك اللہ کہنا چاہیئے اگر وہ حمد نہ کرے یا آہستہ کرے تو دُعاء دینا لازم نہیں۔ اور ہم کو چاندی[۱] کے برتن (استعمال کرنے) سے منع فرمایا اور سونے[۲] کی انگوٹھی (پہننے) سے اور حریر[۳] و دیباج[۴] اور پارچہ قسی[۵] و استبرق[۶] اور سُرخ (ریشمی[۷]) رومالوں سے بھی۔

شرح حدیث کا ظاہری مطلب واضح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سات باتوں کا حکم دیا ہے اور سات سے منع فرمایا ہے (مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ امر و نہی کا ان ہی میں انحصار ہو گیا۔ مراد یہ ہے کہ صحابی کو اُس وقت ان امور کے متعلق حکم شرعی ظاہر کرنے کی ضرورت کسی وجہ سے زیادہ معلوم ہوئی تو اُن کے شمار کے ساتھ بیان فرما دیا کیونکہ شمار یاد کر لینے سے مضمون کا یاد کرنا آسان ہو جاتا ہے)

اب سوال یہ ہے کہ جن امور کا اس حدیث میں حکم ہُوا ہے کیا سب کا ایک ہی درجہ ہے؟ اور وہ درجہ کیا ہے؟ وجوب ہے یا استحباب؟ اسی طرح جن امور سے نہی وارد ہُوئی ہے وہ سب حرام ہیں یا مکروہ؟ جواب یہ ہے کہ جن چیزوں کا یہاں امر ہُوا ہے سب واجب نہیں بلکہ بعض واجب ہیں بعض مستحب۔ چنانچہ جنازہ کے ساتھ جانا مستحب ہے کسی کو اس کو واجب کہنا معلوم نہیں ہُوا۔ البتہ اگر جنازہ کا اُٹھانے والا اور نماز پڑھ کر دفن کرنے والا کوئی نہ ہو تو جو لوگ اس حالت سے واقف ہیں اُن پر فرضِ عین ہو جائے گا۔ اسی طرح بیمار کی عیادت مستحب ہے اور اگر کوئی تیمار داری کرنے والا نہ ہو تو فرض کفایہ ہے (اور جن کو علم ہو جائے کہ کوئی بیمار کو نہیں پُوچھتا اُن پر فرضِ عین ہے) دعوت کا قبول کرنا مطلقاً واجب نہیں صرف دعوتِ ولیمہ کا قبول کرنا واجب ہے بشرطیکہ وہاں کوئی ایسا لہو ولعب نہ ہو جو شرعاً حرام ہے۔ اگر ایسی صُورت ہو تو دعوت قبول کرنا جائز نہیں اور جس صُورت میں واجب بھی ہے اُس میں بھی کھانا واجب نہیں۔ صرف شرکت واجب ہے کھانے میں اختیار ہے خواہ کھاؤ یا نہ کھاؤ (اور دُعاء کر کے مبارکباد دے کر واپس آجاؤ کھانے سے عذر کر دو)

اس کے علاوہ اور دعوتوں میں تفصیل ہے بعض کا قبول کرنا مستحب ہے بعض کا مباح بعض کا حرام (تفصیل علماء سے معلوم کی جائے یا کُتب فقہ کی مراجعت کی جائے)

مظلوم کی مدد کرنا واجب ہے اسی طرح قسم کا پُورا کرنا واجب ہے (اگر اپنی ہی قسم ہے تو اُس کے واجب ہونے میں اختلاف نہیں۔ اگر دُوسرے نے قسم دی ہے تو اس میں اختلاف ہے کہ اُس کا پُورا کرنا واجب ہے یا نہیں اور حق یہ ہے کہ اگر اُس نے کسی امرِ واجب کی قسم دی ہے تو پُورا کرنا واجب ہے مثلاً یوں کہے کہ تجھے خدا کی قسم نماز ضرور پڑھا کر اور اگر کسی مستحب کام کی قسم دی ہے تو قسم کا پُورا کرنا مستحب ہے اور مکروہ یا حرام کام کی قسم دی ہے تو اُس کا پُورا کرنا مکروہ یا حرام ہے: سلام کا جواب دینا واجب ہے اس میں کسی کا اختلاف معلوم نہیں ہُوا (البتہ اگر کسی نے

مجمع کو سلام کیا ہے تو ہر اک پر جواب واجب نہیں سب پر فرض کفایہ ہے ایک کا جواب سب کی طرف سے جواب ہو جائے گا اور سب ہی جواب دے دیں تو بہتر ہے اور چھینکنے والے کو دُعا دینا سُنت مؤکدہ ہے جو شرعاً مطلوب ہے (اور بعض کے نزدیک واجب ہے اُسی تفصیل سے جو سلام کے جواب میں گزری اور اسی شرط سے جو پہلے بیان ہو چکی ہے کہ اُس نے حمد بھی کی ہو۔)

اور جن چیزوں سے حدیث میں منع کیا گیا ہے وہ سب حرام ہیں۔ حریر و دیباج اور قسی و استبرق۔ یہ سب ریشمی کپڑوں کی اقسام ہیں جو مردوں کے لیے حرام ہیں اور عورتوں کے لیے جائز ہیں۔ اسی طرح سونے کی انگوٹھی عورتوں کو جائز ہے مردوں کے لیے حرام ہے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ منہی عنہ مامور بہ سے اشد ہوتا ہے (یعنی سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی چیز سے منع کرنا کسی کام کا حکم کرنے سے زیادہ سخت ہے) کیونکہ منہی عنہ تو سب حرام ہوتے ہیں بشرطیکہ نہی بطریق لزوم کے ہو اور مامور بہ سب واجب نہیں ہوتے بعض واجب ہوتے ہیں بعض مستحب تو وہ اخف (اور سہل) ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اذا امرتکم بامر فأتوا منه ما استطعتم وما نهيتكم عنه فلا تقربوا۔ جب میں تم کو کسی کام کا حکم کروں تو جتنا بجا لا سکو بجا لاؤ اور جس سے منع کر دوں اُس کے پاس نہ جاؤ۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ جن باتوں کا امر کیا گیا ہے وہ سب واجب نہیں بلکہ بعض مستحب بھی ہیں۔ اور واجبات سب تمہاری طاقت و استطاعت کے موافق ہیں (طاقت سے زیادہ کو واجب نہیں کیا گیا) اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے لا یکلف اللہ نفسا الا وسعها اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں فرماتے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ واجبات میں سے جس کو تمہارا جی چاہے ادا کرو اور جس کو جی نہ چاہے چھوڑ دو۔ یہ کوئی عقلمند بھی جسے دو کا ایک سے زیادہ ہونا معلوم ہے، نہیں سمجھ سکتا۔ مگر یہ کہ کسی کے دل پر ہوائے نفس ہی غالب ہو گئی ہو (تو وہ جو چاہے سمجھ لے)۔

اور اُوپر جو یہ قید لگائی گئی ہے کہ منہی عنہ سب حرام ہیں بشرطیکہ نہی بطریق لزوم کے ہو، یہ شرط اس لیے ہے کہ بعض دفعہ نہی کے ساتھ کوئی قرینہ ایسا ہوتا ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ نہی کراہت کی وجہ سے ہے یا شفقت کی وجہ سے ہے جیسا (ایک دفعہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (صحابہ کو) وصال سے منع فرمایا تھا (وصال یہ ہے کہ روزہ پر روزہ رکھا جائے۔ درمیان میں رات کو بھی کچھ نہ کھایا جائے) اسی طرح اور جو نہی اس کے مشابہ ہو کہ قرینے سے اس کا شفقت کے لیے ہونا معلوم ہو جائے تو اُس سے حرمت ثابت نہ ہو گی مگر نہی میں ایسا قرینہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے اکثر نہی لزوم ہی کے لیے ہوتی ہے اور امر میں ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ استحباب یا ارشاد کے طور پر حکم ہوتا ہے۔ اس لیے بعض علماء نے کہا ہے کہ امر سے وجوب پر استدلال کرنے کے لیے قرینہ کی ضرورت ہے اور نہی سے استدلال کرنے کے لیے قرینہ کی ضرورت نہیں بلکہ نفی حرمت قرینہ کی محتاج ہے۔

اس میں صُوفیہ کی بھی دلیل ہے کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ آقا کے امر کا مقتضی

(۱۳۸) یہ ہے کہ اُس کی تعمیل کی جائے۔ کسی صُورت سے بھی ہو (خواہ واجب سمجھ کر تعمیل کرو یا مستحب سمجھ کر) کیونکہ غلام کے ذمے تو مولیٰ کے حکم کا بجالانا ہے اس کے سوا کچھ نہیں (غلام کو اس بحث کی ضرورت نہیں کہ امر وجوب کے لیے ہے یا استحباب کے لیے) پھر وہ اس سے آگے ایک قدم اور بڑھاتے ہیں کہ مولیٰ کے حکم کو غلاموں کے حق میں احسان اور عنایت سمجھتے ہیں کہ ان کا اتنا درجہ تو ہوا کہ اُن سے سوال اور خطاب ہُوا۔

جیسا حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُبی سے فرمایا کہ مجھے حکم ہُوا ہے کہ تم کو (فلاں سورۃ) پڑھ کر سناؤں۔ حضرت ابی نے عرض کیا اور میرا وہاں ذکر ہُوا تھا (یعنی اللہ تعالیٰ نے میرا نام لے کر حکم دیا ہے) فرمایا ہاں تمہارا نام بھی لیا اور تمہارے باپ کا بھی۔ یہ سُن کر حضرت ابی اس خوشی میں کہ میرا اتنا درجہ ہو گیا ہے (کہ اللہ تعالیٰ نے میرا نام لیا) رونے لگے

(ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے) اور کبھی خوشی کے جُملہ سے بھی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں ؎

گفتمش در عینِ وصل ایں نالہ و فریاد چیست
گفت مارا جلوۂ معشوق دریں کار داشت

اور اسی لیے (کہ صُوفیہ کو محض حق تعالےٰ سے خطاب اور سوال و جواب کی تمنّا ہے درجاتِ عالیہ کی تمنّا نہیں)

حضرت رابعہ عدویہ نے (ایک بار) جبکہ بعض لوگوں نے اشتیاق موت پر اعتراض کیا کہ موت کا اشتیاق تو اُس کو ہونا چاہیئے جسے یقین ہو کہ مرتے ہی جنّت میں پہنچ جاؤں گا۔ جس کو یہ یقین نہ ہو وہ کیونکر موت کا مشتاق ہو سکتا ہے) فرمایا تو کیا وہ مجھے دھمکائیں گے بھی نہیں یُوں بھی نہ کہیں گے کہ یا امۃ السوء فعلت کذا و کذا۔ اے بُری بندی! تُو نے ایسا ایسا کیا تھا لوگوں نے کہا ہاں (اگر مواخذہ ہُوا تو یہ تو ہو گا ہی) فرمایا تو میرا مقصود یہی ہے (مَیں اس سے زیادہ کی طالب نہیں بس وہ مجھ سے خطاب کریں پھر چاہے گالیاں ہی دے لیں ؎

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی
جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

؎

احبک حبین حب الھوی
وحب لانک اھل لذاکا
فاما الذی ھو حب الھوی
فشغلی بذکرک عما سواکا
واما الذی انت اھل لہ
فکشفک لی الحجب حتیٰ اراکا

مَیں آپ سے دو طرح کی محبّت رکھتا ہوں۔ ایک عاشقانہ (جس کا منشاء دل

کا آپ پر آجانا ہے) دُوسری محبّت اس لیے کہ واقعی آپ محبّت کے قابل ہیں۔ سو پہلی محبّت کا اثر تو یہ ہے کہ آپ کی یاد میں مستغرق ہو کر مَیں نے سب کو (دل سے) بُھلا دیا ہے اور دُوسری محبّت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ آپ میرے آگے سے پردے اُٹھا دیں تاکہ آپ کو (جی بھر کے دیکھ لوں) یا یہ مطلب ہے کہ دُوسری محبّت اس لیے ہے کہ آپ نے میرے سامنے سے پردے اُٹھا دیئے ہیں یہاں تک کہ مَیں آپ کو نگاہِ بصیرت سے دیکھ رہا ہوں اور مشاہدۂ قلب نے بتلا دیا کہ واقعی آپ ہی محبّت کے قابل ہیں دُوسرا کوئی اس قابل نہیں مگر یہ کہ وہ آپ ہی تک پہنچانے والا ہو مانع نہ ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم)

قولہ وفیہ دلیل لاھل الصوفۃ الیٰ قولہ حتیٰ اراکا



باب شصت وہفتم

حدیث

وفاۃ الرسولؐ وفضل ابی بکرؓ

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے (وفاتِ نبویہ کے قصہ میں) روایت ہے کہ حضرت ابوبکر (صدیق) رضی اللہ عنہ (حجرۂ نبویہ) سے باہر آئے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں کے سامنے تقریر کر رہے تھے (جس کا ذکر آگے آئے گا) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اُن سے کہا بس بیٹھ جاؤ۔ اُنہوں نے (بیٹھنے سے) انکار کیا (اور برابر تقریر کرتے رہے) تو ابوبکر صدیقؓ نے خطبہ دیا جس میں توحید و رسالت کی شہادت تھی تو سب لوگ اُن کی طرف متوجہ ہو گئے اور حضرت عمر کو چھوڑ دیا (یعنی اُنکی طرف متوجہ نہ رہے) شہادت توحید و رسالت کے بعد حضرت صدیقؓ نے فرمایا۔

اما بعد۔ تم میں سے جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا ہو تو (وہ سُن لے کہ) محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی تو وفات ہو چکی اور جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہو تو (وہ جان لے کہ) اللہ زندہ ہے وہ کبھی نہ مرے گا۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل إلی الشاکرین۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم رسول ہی تو ہیں (خدا تو نہیں ہیں) اُن سے پہلے اور بھی بہت رسول گزر چکے ہیں تو کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل ہو جائیں تم اپنی ایڑیوں کے بل (دین سے) لوٹ جاؤ گے اور جو (دین سے) پھرے گا وہ اللہ تعالےٰ کا کچھ نقصان

نہ کرے گا اور (جو اس حالت میں صبر و شکر کرے گا تو) اللہ تعالےٰ شاکرین کو ضرور جزا دے گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ (اس آیت کو سُن کر) بخدا لوگوں کی یہ حالت ہوئی کہ گویا وہ جانتے ہی نہ تھے کہ اللہ تعالےٰ نے اس آیت کو بھی نازل کیا ہے۔ یہاں تک کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کو پڑھا (تب اُن کو یہ آیت یاد آئی) پھر تو لوگوں نے اس آیت کو سُن کر یاد کر لیا۔ اس کے بعد ہر شخص اسی آیت کو پڑھتا ہوا پھرتا تھا۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ صحابہؓ نے حضرت ابو بکرؓ کو حضرت عمرؓ پر ترجیح دی۔ اس آیت کے متعلق چند باتیں بیان کرنے کی ہیں۔

(۱۳۹) عارف اپنے مقام خاص کے مقتضا پر کلام کرتا ہے

یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ اس نازک موقعہ پر ان دونوں حضرات میں اختلاف کیوں ہوا۔ حالانکہ دونوں جس درجہ پر ہیں ظاہر ہے۔ پھر اس کی کیا وجہ کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آیت کو تلاوت کیا تو صحابہ کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا اس آیت کو اس وقت سے پہلے کبھی سُنا ہی نہ تھا۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں حضرات کے اختلاف کا سبب اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکتا جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ دونوں کی حالت اس وقت کیا تھی اور دونوں کا خاص مقام کیا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔ پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی گفتگو اور حالت تو اس وقت یہ تھی کہ جب ان کو سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر دی گئی اور صحابہ رضی اللہ عنہم اس اندوہناک خبر سے گھبرا گئے تو حضرت عمرؓ نے تلوار نیام سے نکال لی اور فرمایا اگر کسی کی زبان سے یہ بات نکلی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی ہے تو اس تلوار سے اُس کا خاتمہ کر دوں گا (حضورؐ کی وفات نہیں ہوئی بلکہ) اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو (بطور معراج کے) اُٹھا لیا ہے آپؐ ابھی واپس آئیں گے اور بعض لوگوں کو قتل

کر دیں گے۔ بعض کے ہاتھ کاٹ دیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (وفات کی خبر سُننے کے بعد) نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے نہ آپ کو دیکھا (بلکہ خبر سُنتے ہی تلوار نکال کر لوگوں کو اس قسم کی گفتگو سے منع کرنے لگے) اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اس وقت (ایک ضرورت سے) مدینہ کے باہر گئے ہوئے تھے جب اُن کو یہ خبر پہنچی تشریف لائے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے۔ آپ کے چہرۂ مبارک کو کھول کر دیکھا۔ حضورؐ کی آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اور فرمایا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ آپ زندگی میں بھی پاکیزہ تھے مرنے کے بعد بھی پاکیزہ ہیں اس کے بعد باہر آئے اور حضرت عمرؓ بار بار اپنی اُسی بات کو دُہرا رہے تھے۔ حضرت صدیقؓ نے اُن کو بیٹھ جانے کا حکم دیا (مگر وہ نہ مانے) پھر حضرت صدیق نے وہ خطبہ شروع کر دیا جس کا مضمون حدیث میں مذکور ہے (یہ تو اُن حضرات کی اُس وقت کی حالت تھی) اور اُن کی الگ الگ خاص حالت وہ تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں بتلائی ہے انا مدینۃ السخاء و ابو بکر بابھا و انا مدینۃ الشجاعت و عمر بابھا و انا مدینۃ الحیاء و عثمان بابھا و انا مدینۃ العلم و علی بابھا۔ (میں سخاوت کا شہر ہوں ابو بکر اس کا دروازہ ہیں، میں شجاعت کا شہر ہوں عمر اس کا دروازہ ہیں، میں حیاء کا شہر ہوں عثمان اس کا دروازہ ہیں، میں علم کا شہر ہوں علی اس کا دروازہ ہیں۔

ف اس حدیث کی صحت میں محدثین کو کلام ہے اور (ظاہر ہے کہ) شجاعت سے مراد دین میں شجاعت (اور پختگی) ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو فاروق کا خطاب دیا کیونکہ اللہ تعالےٰ نے اُن کے اسلام لانے کے دن ہی حق اور باطل میں فیصلہ کر دیا تھا کہ اُسی دن سے) اللہ تعالیٰ کی عبادت اعلانیہ ہونے لگی اور (یہ بھی ظاہر ہے کہ) سخاوت کی زیادتی یقین کی قوت ہی سے ہو سکتی ہے اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ابو بکر زیادہ نماز اور روزے کی وجہ سے تم پر فوقیت نہیں لے گئے بلکہ ایک چیز کی وجہ سے بڑھ گئے جو اُن کے

دل میں ڈالی گئی ہے اور وہ چیز کیا ہے؟ قوتِ یقین ہی تو ہے اور جس کا یقین قوی ہو گا اُس کو حوادث کی قوت و شدت سے حرکت و اضطراب نہیں ہو سکتا۔ (وہ ہر حالت میں کوہ وقار بنا رہتا ہے) وہ اپنے ہر کام کو یقین پر مبنی کرتا اور تمام حالات کی پوری تحقیق کر لیتا ہے اور جس کا مقام قوتِ دین ہو گا جس کا (دوسرا) نام شجاعت ہے وہ اپنے ہر کام میں پوری احتیاط اور قوت کو ملحوظ رکھے گا (تمام حالات کی پوری تحقیق کے درپے نہیں ہوتا بلکہ عمل میں ہر محتمل پہلو کی رعایت کا اہتمام کرتا ہے) چونکہ حضرت عمر شجاعت اور قوتِ دین کے مقام پر تھے جب اُن سے کہا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی ہے اور لوگوں کی حالت اضطراب کا مشاہدہ کیا تو وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس نہیں گئے بلکہ ہر احتمال پر نظر کی۔ اُن کو یہ بھی احتمال ہوا کہ حقیقۃً آپؐ کی وفات ہو گئی ہو اور یہ بھی احتمال ہوا کہ بطور معراج کے وفات ہو اور آپ واپس آ جائیں گے اور وقتی حالت کا مقتضا یہ تھا کہ اس واقعہ کو اسی پہلو پر محمول کیا جائے جس میں پوری احتیاط ہو یعنی معراج کی حالت پر، تاکہ لوگوں میں جو اضطراب اور زلزلہ سا پیدا ہو گیا ہے وہ زائل ہو جائے اور (اس احتمال پر نظر کر کے) اُن میں کسی قدر سکون پیدا ہو جائے۔ پھر (بعد تحقیق کے) اگر یہی پہلو صحیح نکلا جس پر واقعہ کو محمول کیا گیا تھا تو سبحان اللہ اور اگر دوسرا پہلو نکلا کہ حقیقۃً آپ کی وفات ہو چکی ہے تو یہ حقیقت سکون کی حالت میں اُن کے سامنے آئے گی کیونکہ صدمہ کی بات پر جب کچھ مُدت گزر جاتی ہے نفس کو سکون ہو جاتا اور دل مضبوط ہو جاتا اور (کسی قدر) مطمئن ہو جاتا ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے الصبر عند الصدمۃ الاولیٰ (صبر وہ ہے جو صدمہ کی ابتدائی حالت میں ہو۔ اسی وقت مستقل مزاج اور غیر مستقل کا فرق ظاہر ہوتا ہے اور جب صدمہ پر مُدت گزر جاتی ہے تو اُس وقت تو سب کو بے اختیار صبر آ جاتا ہے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے جس میں کچھ شُبہ نہیں۔ اسی بات نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے سے روکا بلکہ اُنہوں نے لوگوں کے سامنے

تقریر شروع کر دی تاکہ اُن کا اضطراب اور زلزلہ کم ہو جائے) اگر وہ پہلے حضورؐ کے پاس پہنچ جاتے اور حقیقی وفات کا مشاہدہ کر لیتے جیسا حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے مشاہدہ کیا تو اُن کو اس بات کے کہنے کا موقعہ نہ رہتا (جس سے لوگوں کو اضطراب کی حالت میں سنبھال لیا گیا) کیونکہ اب یہ بات جھوٹ ہوتی اور حضرت عمر اس سے بہت دور تھے۔ (کہ جھوٹ بات مُنہ سے نکالیں اور تحقیق سے پہلے جو کچھ اُنہوں نے کہا اُس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی حضورؐ کی وفات محقق نہیں ہوئی احتمال ہے کہ یہ بھی معراجی حالت ہو اور ممکن ہے کہ اس احتمال کے سوا دوسرا احتمال ان کے ذہن ہی میں نہ آیا ہو کیونکہ اُن کا خیال یہ تھا کہ حق تعالےٰ نے ھوالذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ میں جس غلبہ کی خبر دی ہے، وہ حضورؐ کے سامنے ہی ہوگا جیسا آیت سے متبادر یہی ہے اور وہ غلبہ ابھی تک ظاہر نہیں ہُوا تو ابھی حضورؐ کی وفات نہیں ہو سکتی۔)

حضرت عباسؓ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے قریب حضورؐ کی زیارت کر کے وہ باہر آئے تو فرمایا کہ موت کے وقت بنو ہاشم (کے آدمیوں میں سے) جس قسم کی بُو آیا کرتی ہے مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں سے وہی اس وقت آرہی ہے تو یہ حضرات تو وفات سے پہلے ہی موت کی بُو سے علامت کو پہچان لیتے تھے تو کیا حقیقی وفات کے بعد آپ کو دیکھ کر اُنہیں کچھ شبہ ہو سکتا تھا؟ یہ ناممکن ہے پس حضرت عمر (اسی لیے خبر وفات سُن کر حضورؐ کے پاس نہیں گئے بلکہ آپ) نے احتیاط کا پہلو اختیار کیا جو اُن کی اپنی اصلی حالت کا مقتضا تھا۔ جب صاحب یقین بزرگ تشریف لائے تو وہ اس حادثۂ عظیم سے مضطرب نہیں ہوئے۔ اُنہوں نے حقیقتِ حال معلوم کرنے سے پہلے کوئی بات نہیں کرنی چاہی (سیدھے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے آپؐ کا چہرہ مبارک کھول کر دیکھا جب ان کو محقق ہو گیا کہ واقعی سچ مچ آپؐ کی وفات ہو گئی ہے تو غور کیا کہ اس کے وقت کے متعلق اللہ تعالےٰ کا حکم اُن کو اور سب مُسلمانوں کو کیا ہے؟ تو فوراً قرآن کی آیت دل

میں آئی جس میں اس حالت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد محکم موجود تھا جو قرآن میں تلاوت کیا جاتا ہے۔ پس وہ حکم کے سامنے جُھک گئے اور دل سے منقاد ہو گئے۔ پھر باہر آکر لوگوں کو بھی اللہ کے حکم کے سامنے جُھک جانے کی ترغیب دی۔ غرض دونوں بزرگوں نے اپنے مقامِ رفیع کے مقتضیٰ پر عمل کیا (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے دونوں حضرات کی باتوں میں حکمت اور مصلحت رکھی تھی حضرت عمرؓ کی بات سے تو منافقین دم بخود رہ گئے اُن کو یہ موقعہ نہ ملا کہ فوراً دشمنانِ دین کو اطلاع کر کے بھڑکا دیتے اور حضرت صدیقؓ کے زبردست بلیغ خطبہ سے مُسلمانوں کے دل مضبوط ہو گئے۔ اضطراب جاتا رہا اور مردانہ وار اس صدمہ کو برداشت کر کے حکم الٰہی کی تعمیل میں سرگرم ہو گئے۔ اسی لیے حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب میں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے یہ آیت پڑھتے سُنا تو میرے پیر مجھے نہ اُٹھا سکے (فوراً گر پڑا)

کمال یقین کی علامت یہ ہے کہ نازک موقعہ پر بھی سُنّت نبویہ کو ہاتھ سے نہ جانے دے

اس واقعہ سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دین کی قوت اور یقین کی عظمت معلوم ہوتی ہے کہ وہ ایسے نازک موقعہ پر بھی مستقل رہے اور اتنے مستقل رہے کہ اپنے کلام کو اسی قاعدہ سے شروع کیا جو سُنت نبویہ کا مقتضا تھا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ مہتم بالشان امور میں کلام کو اللہ سبحانہ کے ذکر و ثناء سے شروع کرتے تھے۔

فیہ دلیل علی قوۃ ابی بکرؓ فی الدین الی قولہ بذکر اللہ سبحانہ والثناء علیہ

باہم ایک دوسرے کا ادب کرنا بھی دین کا جُزء ہے

اس سے حضراتِ صحابہ کا باہم ایک دُوسرے کا ادب ملحوظ رکھنا بھی معلوم ہُوا۔ یہ بھی دین کا جزو ہے چنانچہ حضرت صدیقؓ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ تم بیٹھ جاؤ (تاکہ میں کچھ بولوں) اس سے زیادہ کچھ نہیں

کہا کہ تم غلط کہہ رہے ہو۔ حضرت کی وفات معراجی نہیں بلکہ حقیقی وفات ہے تم نے دیکھا نہیں ہے میں حضورؐ کو دیکھ کر آیا ہوں وغیرہ وغیرہ) اور بیٹھ جانے کو اس لیے کہا کہ اُن کی تقریر کے ساتھ اپنی تقریر شروع کر دینا ادب کے خلاف تھا۔ مطلب یہ تھا کہ بس تم کو جو کہنا تھا کہہ چکے اب میں کچھ کہنا چاہتا ہوں آپ بیٹھ جائیں)

قولہ وفیہ دلیل علی۔ تادب الصحابۃ الی قولہ ولم یزد علیہ فیما قال شیٔا

ضرورتِ دین کے لیے ترکِ ادب بھی ادب ہی ہے

نیز اسی سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ ادب کی رعایت اسی وقت تک ہے جب تک دین کی ضرورت (فوت) نہ ہو اور اگر (ادب سے) دین کی ضرورت (فوت ہوتی) ہو تو اب ادب کی رعایت نہ ہوگی بلکہ اس وقت ترکِ ادب ہی ادب ہو گا دیکھو جب حضرت عمرؓ نے حضرت صدیق رضؓ کی بات نہ مانی (اور خاموش نہ ہونے) اور حالت نازک تھی تو انہوں نے سیدھے منبر پر جاکر) اپنا خطبہ شروع کر دیا اور دین کی (ضرورت کی وجہ) سے اُن کا ادب چھوڑ دیا۔ (کیونکہ گفتگو کا ادب یہ ہے کہ جب تک ایک شخص بول رہا ہے دوسرا اپنی تقریر شروع نہ کرے مگر صورتِ حال کی نزاکت اور دینی ضرورت نے حضرت صدیقؓ کو مجبور کر دیا کہ حضرت عمرؓ کی گفتگو کے ساتھ ہی اپنی تقریر شروع کر دیں پھر بھی اتنا ادب ملحوظ رکھا کہ حضرت عمرؓ مسجد کے سامنے گفتگو کر رہے تھے حضرت صدیق نے وہاں تقریر شروع نہیں کی بلکہ مسجد کے اندر منبر نبویؐ پر تقریر فرمائی) اور اسی دینی ضرورت نے حضرت عمرؓ کو حضرت صدیق کا ادب ملحوظ رکھنے سے روکا تھا کہ جب اُنہوں نے ان سے خاموش ہونے کو فرمایا خاموش نہیں ہوئے (برابر بولتے رہے کیونکہ وہ اپنے نزدیک اپنی گفتگو کو دینی ضرورت پر مبنی سمجھ رہے تھے کہ اس وقت منافقین کو دبانے کے لیے یہی کہنے کی ضرورت ہے کہ حضورؐ کا وصال نہیں ہُوا جب سب کی زبانیں بند ہو جائیں گی اس کے بعد تحقیق کی جائے گی کہ حضورؐ کی واقعی وفات ہو گئی یا بیماری سے غشی آگئی ہے)

قولہ وفیہ دلیل علی۔ تادب الصحابۃ رضی اللہ عنہم بعضھم مع بعض الی قولہ ویسکت حین اشار الیہ بالسکوت۔

ف بعض لوگ ادب کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے بزرگ کے خلاف کوئی بات زبان سے نہ نکالے۔ یہ صحیح ہے مگر خلاف کا مطلب یہ ہے کہ ایسی بات نہ کہے جس سے ظاہر ہو کہ کہنے والا اپنے بزرگوں کا مخالف ہے ان کو بزرگ نہیں سمجھتا یہ مطلب نہیں کہ شرعی مسائل میں ان کی رائے سے اختلاف بھی نہ کرے۔ اگر مسائل شرعیہ میں اختلاف کو بھی بے ادبی میں داخل کیا جائے گا تو کیا نعوذ باللہ امام محمد بن حسن اور امام ابو یوسف بے ادب تھے جنہوں نے اپنے شیخ امام ابو حنیفہ سے بہت سے مسائل میں اختلاف کیا ہے حاشا وکلا یہ ہرگز بے ادبی میں داخل نہیں اسی طرح یہاں سمجھو کہ حضرت عمر کے نزدیک اس بات کی ضرورت تھی جو وہ کہہ رہے تھے اس لیے حضرت صدیق کے خاموش کرنے سے خاموش نہ ہوئے اور حضرت صدیق رضؓ کے نزدیک حضرت عمر کی بات کی ضرورت اس وقت تک تھی جب تک حقیقت واضح نہ ہوئی تھی۔ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد صحابہ کو سنبھالنے اور اطمینان کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل اور کفن دفن میں مشغول ہونے کی ضرورت تھی اس لیے آپ نے حضرت عمرؓ کو خاموش رہنے کے لیے فرمایا کہ اب تمہاری بات کا وقت نہیں رہا میں حقیقت پر مطلع ہو کر آیا ہوں۔ اب اس کے مقتضا پر عمل کرنا لازم ہے۔ پس ہر اک نے دینی ضرورت کو ادب پر مقدم کیا۔

ہمارے اکابر کا عمل بھی حضرات شیخین کی اس سنت پر تھا کہ وہ ضرورت دینیہ کو ادب پر مقدم کیا کرتے تھے اور مسائل شرعیہ میں اپنے بزرگوں سے بعض امور میں اختلاف کرتے تھے مگر تہذیب کے عنوان سے تاکہ اختلاف رائے مخالفت کی حد تک نہ پہنچ جائے۔ افسوس! آج کل اس طرز پر لوگ نہیں چلتے۔ اختلاف رائے کو مخالفت و مخاصمت کا بہانہ بنا لیتے ہیں اور تقریر و تحریر میں دوسرے کے ایمان و نیت پر بھی حملہ کرنے سے نہیں چوکتے۔ یہ لوگ دائرہ علم و تقوے سے خارج ہیں فالی اللہ المشتکی۔

(۱۴۲) پریشانی کے وقت کلام مختصر اور دلیل مستحکم بیان کرنی چاہیئے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ فصاحت و بلاغت اور دین کی پختگی کا مقتضا یہ ہے کہ مشکلات کے وقت کلام موجز (مختصر) کیا جائے اور حجت (و دلیل) مؤثر و مستحکم بیان کی جائے۔ دیکھو حضرت صدیق کا یہ خطبہ من کان منکم یعبد محمدا فان محمدا قد مات الخ کس قدر بلیغ اور غایت درجہ بلیغ ہے مگر مختصر بھی ہے (طویل نہیں اور قاعدہ ہے کہ جس پر حقیقت منکشف ہو جاتی ہے وہ زیادہ لمبی چوڑی باتیں نہیں کیا کرتا چند جملوں ہی میں حقیقت کو واضح کر دیتا ہے) اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ دین و احکام کے لیے سب سے بڑی قطعی حجت کتاب اللہ ہے اگر یہ بات نہ ہوتی اور اسی پر حق کا مدار نہ ہوتا تو صحابہ سب کے سب سر خم نہ کر دیتے اور ان ہی آیتوں کو بار بار نہ دُہراتے۔

قوله وفيه دليل على ان من الفصاحة والبلاغة الى قوله يكررون الآى۔

(۱۴۳) حق واضح کرنے کے لیے کلام کو حق و باطل میں تقسیم کرنا بھی جائز ہے

نیز یہ بھی معلوم ہُوا کہ کلام کو حق و باطل پر تقسیم کرنا بھی جائز ہے تاکہ حق اچھی طرح واضح ہو جائے دیکھو حضرت صدیق نے ایسا ہی کیا ہے فرمایا کہ تم میں جو کوئی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا ہو تو سُن لے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مر چکے ہیں اور جو اللہ وحدہٗ کی عبادت کرتا ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ حی و قیوم ہیں وہ نہیں مر سکتے۔ حالانکہ حضرت صدیقؓ کو قطعاً معلوم تھا کہ صحابہ میں سے کوئی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرنے والا نہ تھا مگر آپ نے ایسی بات کو جو یقیناً محال تھی ایسی بات سے ملا کر بیان کیا جو سب کے نزدیک محقق اور یقینی تھی تاکہ اسی طرح حق مؤکد اور اہل حق ثابت قدم ہو جائیں۔ قوله فيه دليل على جواز تقسيم الكلام بين

الحق والباطل الى قوله تاكيدًا للحق وتنبيها لاهله۔

ف یہ بھی حضرات صوفیہ کی دولتوں میں سے ایک دولت ہے کہ اللہ تعالیٰ بوجہ قوتِ دین اُن کے فصاحت و بلاغت کلام بھی عطا فرماتے ہیں۔ چنانچہ مولانا رومی، مولانا جامی، شیخ سعدی، حافظ شیرازی وغیرہم کی فصاحت و بلاغت معلوم ہے۔ ہمارے زمانہ میں حضرت حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہ کی فصاحت و بلاغت کو دُنیا نے مشاہدہ کیا ہے کہ حضرت کے برابر مؤثر بیان کسی کا نہ ہوتا تھا بلاغت اسی کا نام ہے، رنگینیٔ الفاظ کا نام نہیں وقل لهم فى انفسهم قولا بليغا حضرت کی شان میں یہ شعر بالکل سچا ہے ؎

ومن لبيان فى القلوب مؤثر ۔۔۔ وبعدك قول القائلين فضول

"اب ایسا بیان کون کرے گا جو دلوں میں اثر کرتا چلا جائے۔ آپ کے بعد تو بولنے والوں کی باتیں فضول ہی سی ہیں"

اس مقام پر حضرت صدیق کو حالانکہ قطعاً معلوم تھا کہ صحابہ سب کے سب اللہ ہی کی عبادت کرنے والے ہیں مگر حضورؐ کی خبر وفات سُن کر جو اُن کے ہوش اُڑ گئے اور ایک حالتِ اضطراب پیدا ہو گئی اس پر اس عنوان سے تنبیہ فرمائی کہ یہ حالت تو اُس کی ہونی چاہیئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا ہو اور جو اللہ کی عبادت کرتا ہے اس کو اس قدر پریشان و مضطرب نہ ہونا چاہیئے۔ اہلِ بلاغت سمجھ سکتے ہیں کہ اس موقعہ کے لیے اس سے بہتر عنوان حقیقت کو واضح کرنے والا اور گرتوں کو سنبھالنے والا نہیں ہو سکتا تھا۔ احقر نے اپنے قصیدۂ نعتیہ "وسيلة الظفر" میں اسی واقعہ کو اس عنوان سے بیان کیا ہے ؎

ماكان اثبته لكل مهمة ۔۔۔ كادت تزدل لها ذوات صخور
من كان يعبد احمد افو دبكم ۔۔۔ مات الحبيب ولات حين نكير
من كان يعبد ربه فهو الا له ۔۔۔ الواحد القيوم خير نصير
هذا الثبات فهل سمعت بمثله ۔۔۔ هذا الوقار وكان خير وقور

حضرت صدیقؓ ہر مشکل موقعہ پر جہاں پہاڑ بھی ہلنے کو ہو جائیں بڑے ہی ثابت
قدم تھے اُن کے اس بلیغ خطبہ پر تعجب کرو جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی وفات کے موقعہ پر دیا تھا جبکہ بڑے بڑے صابر گھبرا اُٹھے تھے فرمایا جو رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا ہو وہ سُن لے کہ محبوب تو مر چکے اب اس سے انکار
کی گنجائش نہیں اور جو رب محمد کی عبادت کرتا ہو وہ سُن لے کہ اللہ واحد قیوم
زندہ ہے اور بڑا اچھا مددگار ہے۔ یہ ہے ثبات قدم تم نے کہیں اس کی نظیر سُنی ہے
یہ ہے وقار و استقلال اور واقعی حضرت صدیق بڑے صاحب استقلال تھے۔ حضرت
صدیق میں یہ استقلال ان کے مقام یقین کا ثمرہ تھا اور اسی لیے ان کو سب سے پہلا
خلیفہ منتخب کیا گیا کہ اس وقت ایسے ہی صاحب استقلال کی مسلمانوں کو ضرورت
تھی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے قبائل عرب میں ایک ہلچل پیدا
ہو گئی اور بعضے مرتد ہو گئے تھے تو رخنۂ ردّت کو بند کرنے کے لیے بڑے صاحب
استقلال خلیفہ کی ضرورت تھی چنانچہ حضرت صدیق نے سب سے پہلے اسی فتنہ کا سر
کچلا اور اللہ نے ان کی مدد کی۔ آپ نے مرتدین کو ذرا مہلت نہیں دی حالانکہ
وقت نازک تھا۔ فارس اور روم کی طرف سے مدینہ پر حملہ کا خطرہ تھا۔ چنانچہ اسی
نزاکتِ حال کو دیکھ کر حضرت عمرؓ نے یہ مشورہ دیا تھا کہ مرتدین عرب کو اس وقت چھوڑ
دیا جائے ان کو بعد میں دیکھ لیا جائے گا پہلے بیرونی دشمنوں کا انتظام کیا جائے
تاکہ لوگوں کی گھبراہٹ کو سکون ہو جائے وہ اس سے پریشان ہیں کہ اپنے ملک میں
بھی جنگ کریں اور باہر والوں سے بھی مقابلہ کریں۔ حضرت صدیق نے اس مشورہ
کو سختی کے ساتھ رد کیا کہ آستین کے سانپ سے غفلت برتنا ہرگز مناسب نہیں ان کی سرکوبی
سب سے پہلے ضروری ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ لوگ اس میں آپ کا ساتھ نہ دینگے۔
حضرت صدیق نے فرمایا بخدا میں مرتدین سے ضرور قتال کروں گا چاہے صرف ہوا
ہی میرے ساتھ ہو اور کوئی نہ ہو۔ یہ بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے
ہوا کو اُن کی مدد کے لیے بھیج دیا کہ دفعۃً تمام مسجد ہوا سے بھر گئی اور جو لوگ حضرت

صدیق کی رائے کے خلاف تھے اُن کے چہروں پر خاص طور سے ہوا نے کنکریاں
ماریں جس سے گھبرا کر وہ سب مسجد سے باہر نکل گئے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ اللہ
تعالےٰ نے اس قتال میں حضرت صدیقؓ کا شرح صدر کر دیا تو میں سمجھ گیا کہ یہی حق ہے
پھر اللہ تعالےٰ نے میرا بھی شرح صدر کر دیا۔ چنانچہ ایک سال میں مرتدین کا فتنہ فرو ہو
گیا۔ پھر حضرت صدیق نے ایک ہاتھ فارس کی طرف بڑھایا ایک ہاتھ روم کی طرف
اور دونوں طاقتوں سے مقابلہ شروع ہو گیا۔ نقشۂ جنگ حضرت صدیق ہی نے
بنا دیا تھا۔ اس کی تکمیل بعد میں ہوئی۔ حضرت عمرؓ کا مقام شجاعت اور شدت
فی الدین تھا تو حضرت صدیق کے بعد مسلمانوں کو اُن کی حاجت تھی تاکہ حضرت صدیقؓ
کے بنائے ہوئے نقشہ پر جرأت کی ساتھ بڑھتے چلے جائیں۔ چنانچہ آپ کے زمانے
میں بڑی بڑی فتوحات ہوئیں۔ اسلام تمام اطراف میں پھیل گیا اور بلند ہو گیا۔
پھر قاعدہ ہے کہ ہر چیز کو کمال کے بعد زوال ہوتا ہے تو حضرت عثمان کی خلافت
کی طرف مسلمان محتاج ہوئے کیونکہ ان کی خلافت میں چھ سال کے اندر بہت زیادہ
فتوحات ہوئیں اور سلطنتِ اسلام کمال درجہ پر پہنچ گئی پھر آخری ۶ سال میں زوال
کے آثار پیدا ہونے لگے اور زوال شروع ہونے کے وقت مقام صبر و تسلیم و حیاء
کی ضرورت ہے اور یہ حضرت عثمان کا خاص مقام ہے۔ انہوں نے رعایا کی آزادی
اور قلتِ اطاعت اور بے باکی اور قلتِ احترام خلیفہ پر کہ یہی زوال کا سرچشمہ ہے۔
غایت حلم سے کام لیا جو کمال حیاء کا مقتضا ہے پھر باغیوں کی بغاوت پر صبر و تسلیم
سے کام لیا خود اپنی جان دے دی۔ مگر مسلمانوں کے مقابلہ میں ہتھیار نہیں اٹھائے
اور جس نے ایسا کرنا چاہا اس کو روک دیا اس میں اُمت کو سبق تھا کہ جب رعایا
میں بے باکی و آزادی پیدا ہونے لگے اس وقت خلیفہ کو حلم سے کام لینا چاہیئے۔
اور رعایا باغی ہو جائے تو اپنی اسلامی برادری سے جنگ نہ کرنا چاہیئے۔ پھر حضرت علیؓ
کی خلافت کے مسلمان محتاج ہوئے کیونکہ ان کا مقام علم تھا امت کو ضرورت تھی کہ باغیوں
کے متعلق مفصل احکام کا علم ہو۔ اگر ہر خلیفہ اسی طرح قتل ہوتا رہا تو نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

لوگ بغاوت کیا کریں گے اور خلیفہ کو قتل کر دیا کریں گے تو خلیفہ اور خلافت کا رُعب جاتا رہے گا اور بہت جلد حکومت اسلام کا خاتمہ ہو جائے گا اس وقت حضرت علی نے اہلِ تاویل سے قتال کیا اور مسلمانوں کو تفصیل کے ساتھ اہلِ تاویل اور مارقین و خارجین کے احکام سے مطلع کر کے قولاً و عملاً حق کو واضح فرما دیا تھا کہ آئندہ کے لیے احتمال و اجمال باقی نہ رہے۔ غرض ہر شخص کا ایک مقام معلوم ہے اور مسلمانوں کو سب ہی کی ضرورت تھی۔ اللہ تعالےٰ ان حضرات کی برکت سے ہم پر بھی فضل فرمائیں اور ایسے اعمال کی توفیق دیں جن سے ہم اُن کے قریب پہنچ جائیں اور قیامت میں اُن ہی کے ساتھ ہمارا حشر ہو اور متقین کی جماعت میں بلا محنت و مشقت کے عافیت کے ساتھ اپنے فضل سے داخل فرما دیں آمین (اس تقریر کا اکثر حصہ حضرت شارح کے کلام سے ماخوذ ہے چونکہ اس میں کوئی مسئلہ تصوف کا نہ تھا مگر مضمون عجیب تھا اس لیے فائدہ کے ضمن میں بیان کر دیا گیا) سبحان اللہ حضرت شارح نے بڑی خوبی سے مقاماتِ خلفاء اربعہ پر روشنی ڈالی ہے۔ مگر امام حسن رضی اللہ عنہ کا بیان رہ گیا کہ وہ بھی خلیفۂ راشد ہیں اور ان ہی کی خلافت پر تیس سالہ مدتِ خلافت علی منہاج السنۃ تمام ہوئی ہے تو کہنا چاہیئے کہ حضرت علیؓ کے بعد مسلمانوں کو امام حسن کی خلافت کی طرف احتیاج ہوئی جن کا خاص مقام سیادت تھا جس کا مقتضا یہ ہے کہ جب قومی نزاعات کا طاقت سے خاتمہ نہ ہو تو سردار اپنے مصالحانہ روش سے اس کا خاتمہ کر دے۔ چنانچہ امام حسنؓ نے مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کو اپنی شانِ سیادت سے صلح و اتفاق و اتحاد کی طرف واپس کر دیا۔ اپنے کو خلافت سے معزول کر کے حضرت معاویہ کو خلافت سونپ دی۔ اسی لیے اس سال کو عام الجماعت کہا جاتا ہے کہ اس سال مسلمان پھر سے متفق و متحد اور مجتمع ہو گئے جس کی برکت سے صدیوں تک خلافتِ اسلامی باقی رہی اور ترقی کرتی رہی واللہ تعالےٰ اعلم بالصواب۔

(۱۴۵) مصائب میں بڑی تسلّی قرآن کی تلاوت وتکرار سے ہوتی ہے

حدیث سے معلوم ہوا کہ مصائب میں تسلّی کا سب سے بڑا ذریعہ بار بار قرآن (کی آیات) کو دُہرانا (اور بکثرت پڑھنا) ہے یہی حق ہے اور کُھلی ہوئی بات ہے۔ حق تعالےٰ فرماتے ہیں و ننزل من القرآن ما هو شفاء ورحمة للمؤمنين۔ ہم قرآن میں وہ چیزیں نازل کرتے ہیں جو مؤمنین کے لیے شفاء اور رحمت ہیں اس کی ایک شانِ وقایہ بھی ہے کہ غم اور پریشانی کے وقت اس سے تسلّی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ (اسی لیے) صحابہ نے بار بار اس آیت کو دُہرانا شروع کر دیا (جو حضرت صدیق نے اپنے خطبہ میں پڑھی تھی) کہ ایک شخص بھی ایسا نہ رہا جس کی زبان سے وہ آیت نہ سُنی گئی ہو۔ کیونکہ اس آیت کو سُن کر اُنہیں اللہ کا حکم تو معلوم ہو گیا تھا پھر بار بار دُہرانے اور تکرار کرنے میں اس کے سوا کیا فائدہ تھا کہ وہ اس سے اپنے رنج و غم میں تسلّی حاصل کرنا چاہتے تھے۔

قوله فيه دليل على ان اكبر التسلى فى المصائب ترداد كتاب الله الى قوله الا التسلى بها على ما هم فيه من الحزن والبرحاء۔

ف ذکر اللہ سے اطمینان و تسلّی حاصل ہونا صوفیہ کا مشاہدہ ہے وہ الا بذکر الله تطمئن القلوب کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کرتے ہیں اور ذکر اللہ کی اعلیٰ فرد نماز اور تلاوتِ قرآن ہے اور مصیبت کے وقت خصوصیت کے ساتھ آیت انا للہ و انا الیہ راجعون کا تکرار اور معنی و مطلب سمجھ کر بار بار پڑھتے رہنا بڑی تسلّی کا ذریعہ اور دل کو سنبھالنے والا ہے۔

(۱۴۶) مخاطب کو اسکی مصلحت کی بات بتلانا چاہیئے اگرچہ وہ جانتا بھی ہو

یہاں سے معلوم ہوا کہ جس بات میں مخاطب کی مصلحت ہو اسے بتلانی چاہیئے اگرچہ ہم کو معلوم ہو کہ وہ اس بات کو پہلے سے جانتا ہے کیونکہ حوادث پیش آنے

کے وقت انسان کا دل حادثہ سے ایسا پریشان ہو جاتا ہے کہ جانی پہچانی بات سے بھی غافل ہو جاتا ہے۔ دیکھو صحابہ کو سبھی کو یا اکثر کو یہ آیت معلوم تھی اس کے نزول کا دن اور شان نزول بھی معلوم تھا مگر حادثہ (وفات نبویؐ) کے دفعتہً پیش آجانے سے قلوب ایسے پریشان ہو گئے کہ اسی آیت سے ذہول ہو گیا جو پہلے سے جانی ہوئی تھی۔ پھر اس شخص کا تو کیا حال ہو گا جسے پہلے سے کچھ بھی خبر نہ تھی اور ایسی مصیبت کا سامنا ہو گیا جو تحمل سے باہر ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: من عزی مصابا فله اجر المصاب۔ جس نے مصیبت زدہ کو تسلی دی اسے بھی اس مصیبت زدہ کے برابر ثواب ملتا ہے۔ کیونکہ یہ اس کو وہ باتیں یاد دلاتا ہے جو اس وقت یاد کرنی چاہئیں جس سے اس کا غم ہلکا ہو جاتا ہے تو اس کی تسلی سے جتنا اس کا غم ہلکا ہو گا اسی قدر اس کو ثواب ملے گا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر اس کو یہ مصیبت پیش آتی اور اس پر صبر کرتا تو جتنا ثواب اس وقت ملتا وہی مصیبت زدہ کو تسلی اور دلاسا دینے سے ملے گا کہ اس نے اس کو صابر بنا دیا ہے اور کسی کو صابر بنا دینے کا بھی وہی حکم ہے جو خود صبر کرنے کا ہے: لقوله عليه السلام الدال على الخير كفاعله اسی کے مناسب بعض حکماء کا یہ قول ہے جو حکمت پر مشتمل ہے کہ آدمی چار قسم کے ہیں ایک تو وہ جو عالم ہے اور اس کو اپنا عالم ہونا بھی معلوم ہے (یہ مطلب نہیں کہ علم کا مدعی ہے بلکہ اس کو احکام شرعیہ مستحضر ہیں اور ان پر نظر ہے اور جانتا ہے کہ اس وقت کے متعلق شریعت کا یہ حکم ہے) اس سے علم حاصل کرو۔ دوسرا وہ جو جاہل ہے اور اسے اپنا جاہل ہونا معلوم ہے اس کو بتلاؤ اور تعلیم دو۔ تیسرا وہ جو جاہل ہے مگر اُسے اپنے جہل کی خبر نہیں (بلکہ اپنے کو عالم سمجھتا ہے) اس سے دور بھاگو کہ اس کی فلاح کی اُمید نہیں یوں کسی کو خلافِ عادت فلاح نصیب ہو جائے تو اور بات ہے۔ چوتھا وہ جو عالم ہے مگر اسے اپنا عالم ہونا معلوم نہیں (یعنی پریشانی یا اور کسی وجہ سے احکام وقتیہ اُس کے ذہن میں حاضر نہیں رہے اس لیے وہ حالتِ حاضرہ کے متعلق اپنے

کو جاہل سمجھتا ہے) تو اس کو یاد دلاؤ اس سے تم کو بھی نفع ہو گا (اور اس کو بھی)۔

قوله وفيه من الفقه ان يذكر الشخص بالشئ الذى له فيه مصلحة الى قوله فذكروه تنتفعوا به۔

ف حضرات صوفیہ کا اس پر پورا عمل ہے وہ برابر موت اور قیامت و جنت و نار کی یاد دہانی کرتے رہتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو خصوصاً سالکین کو ان چیزوں کا علم ہے مگر غلبۂ اشغال دنیویہ کی وجہ سے ان سے ذہول ہو جاتا ہے۔

(۱۴۷) امتحان کے وقت دل کی حالت کھل جاتی ہے

یہاں سے معلوم ہُوا کہ امتحان کے وقت انسان کے دل کی حالت کھل جاتی ہے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات جو (مسلمانوں کے لیے) بڑی مصیبت تھی اُس نے سب لوگوں کے دلوں کی حالت کو واضح کر دیا کچھ لوگ (جو برائے نام مسلمان ہوئے تھے) مرتد ہو گئے اور بہت لوگ (جو سچے مسلمان تھے) ثابت قدم رہے۔ بعض لوگ کسی قدر فتنہ میں مُبتلا ہوئے پھر واپس آگئے تو آزمائش سے زبانی دعوؤں کی حقیقت کُھل جاتی اور اللہ تعالےٰ کے اس ارشاد کی تصدیق ہو جاتی ہے الٓمٓ ۞ احسب الناس ان يتركوا ان يقولوا آمنا وهم لا يفتنون ولقد فتنا الذين من قبلهم فليعلمن الله الذين صدقوا وليعلمن الكذبين ۞ الم۔ کیا لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ان کو اتنا کہہ دینے پر کہ ہم ایمان لے آئے چھوڑ دیا جائے گا اور ان کی آزمائش نہ کی جائے گی۔ (ضرور آزمائش ہو گی) اور ہم نے ان سے پہلے لوگوں کی بھی آزمائش کی ہے پھر یقیناً اللہ تعالےٰ سچوں کو جھوٹوں سے الگ کر کے رہیں گے۔

اس میں صُوفیہ کی حُجت ہے جنہوں نے اپنے طریق کو امتحان اور صبر ہی پر قائم کیا ہے کہ انسان راحت اور تکلیف ہر حالت میں ثابت قدم رہے اسی لیے فرماتے ہیں جس کو یہ خوشی حاصل کرنا ہو کہ اس کو کبھی کسی ناگواری کا سامنا نہ ہو تو کسی ایسی

چیز سے دل کو وابستہ نہ رکھے جس پر فناء کا اندیشہ ہو (مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی سے دل کو اور اپنی توقعات کو وابستہ نہ کرے) کیونکہ اللہ کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے (مراد غیر اللہ ہے اور غیر اللہ وہ ہے جو تعلق مع اللہ سے مانع ہو پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دل کو وابستہ کرنا منع نہیں کہ آپ سے وابستگی تو اللہ تعالےٰ سے وابستگی ہے مگر حضورؐ سے اللہ تعالےٰ کے برابر وابستگی نہ ہوگی۔ کیونکہ آپ بھی تو واسطہ ہی ہیں اصل مقصود تو حق تعالےٰ ہیں۔ پس اصل اور واسطہ میں فرق ہونا چاہیئے اسی طرح مشائخ طریق کا تعلق اللہ تعالےٰ سے مانع نہیں بلکہ موصل ہے مگر وہ بھی معرفت رسول کا واسطہ ہیں تو یہاں بھی اصل اور واسطہ کا فرق ہونا چاہیئے۔ خوب سمجھ لو)

قولہ وفیہ من الفقہ ان عندالامتحان یعرف المرأ ما احتوی علیہ جنانہ الخ قولہ لان ماسواہ عزوجل مفقود۔

ف صوفیہ کے طریق کا امتحان پر مبنی ہونا یہ ہے کہ مشائخ طریق طالبین کے امتحان کرتے ہیں کبھی طلب دیکھنے کے لیے سختی کرتے ہیں کبھی انقیاد و تواضع کا امتحان کرنے کے لیے سختی کرتے ہیں۔ ایسے مواقع پر طالب صادق ہی ٹھہرتا ہے جھوٹا نہیں ٹھہرتا۔ دوسرے یہ کہ صوفیہ خود اپنا امتحان بھی کرتے ہیں۔ بعض دفعہ کسی غریب آدمی کی خدمت کر کے دیکھتے ہیں کہ نفس میں ناگواری پیدا ہوئی یا اپنے حال پر رہا۔ بعض دفعہ عمدہ لباس پہن کر غور کرتے ہیں کہ نفس میں تکبر پیدا ہوا یا اپنے حال پر رہا وغیرہ وغیرہ۔ مگر شریعت کے خلاف کام کر کے نفس کو آزمانا جائز نہیں۔ مثلاً عورتوں کو گھورنے لگے کہ دیکھوں نفس میں شہوت پیدا ہوئی یا نہیں وعلیٰ ھذا القیاس۔ شریعت نے جس کام سے منع کر دیا ہے اس کا ارتکاب امتحان کیواسطے بھی حرام ہے اور جن بزرگوں سے ایسا منقول ہے یا روایت غلط ہے یا غلبۂ حال تھا جس کی تقلید جائز نہیں۔

ف ایک بار حضرت مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا کہ اگر راحت چاہتے ہو تو اللہ کے سوا کسی سے توقع نہ رکھو۔ پھر فرمایا کہ مجھ سے بھی توقع نہ رکھو۔ یہ وہی بات ہے

جو حضرت شارحؒ نے یہاں بیان فرمائی ہے اور اس کا مطلب اُوپر لکھ دیا گیا کہ اصلی توقع اللہ تعالےٰ سے رکھنا چاہیئے۔ باقی سب سے اسی قدر تعلق اور توقع رکھی جائے جو واسطہ کے مناسب ہے۔ کیونکہ یہ حضرات اصل مقصود نہیں بلکہ مقصود تک پہنچانے والے ہیں پس فرق مراتب کا لحاظ ضروری ہے لا الٰہ الا اللہ لا رب سواہ۔

ف امتحان کیوقت دل کی اصلی حالت کا کھُل جانا مشاہد ہے بعض لوگ اسی وقت تک اللہ اور رسول کے عاشق ہیں جب تک راحت و آرام میں ہیں اور اگر کبھی کوئی مصیبت پیش آگئی تو ایسے کلمات زبان سے نکالتے ہیں کہ ایمان ہی رخصت ہو جاتا ہے۔ آج کل مسلمان ایسی آزمائش کے دَور سے گُزر رہے ہیں۔ بعض جگہ پر مسلمانوں پر سخت مظالم و مصائب کا نزول ہو رہا ہے۔ اللہ تعالےٰ ہمارے اور سب مسلمانوں کے ایمان کو سلامت و محفوظ رکھے۔

اللھم انا نسئلک العفو والعافیۃ فی الدنیا والآخرۃ۔



باب شصت و ہشتم ۶۸

حدیث

جواز بکاء الرحمۃ علی المیت

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صاحبزادی نے آپ کے پاس پیام بھیجا کہ میرا ایک بچہ مر رہا ہے آپ ہمارے پاس تشریف لائیے۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ اس سے میرا سلام کہو اور (میری طرف سے) کہدو کہ رسول اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ ہی کا ہے جو وہ لے لیں اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ دے دیں اور اللہ کے پاس ہر چیز کی مدت مقرر ہے۔ پس تم صبر کرو اور اللہ سے ثواب کی امید رکھو۔ صاحبزادی نے پھر پیام بھیجا کہ میں آپ کو قسم دیتی ہوں آپ ضرور تشریف لائیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوگئے اور حضرت سعد بن عبادہ اور معاذ بن جبل اور ابی بن کعب اور زید بن ثابت اور بہت لوگ آپ کے ہمراہ چلے (جب گھر پر پہنچے) تو بچہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا اور اس کا سانس اکھڑ رہا تھا۔ راوی کا گمان ہے کہ صحابی نے یہ بھی فرمایا کہ اُس کا سانس پرانی مشک کی طرح (بول رہا) تھا تو یہ حال دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی (مبارک) آنکھیں (آنسوؤں سے) بہہ پڑیں تو حضرت سعد نے کہا یا رسول اللہ! یہ کیا؟ فرمایا یہ رحمت ہے، جس کو اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں ودیعت کیا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے رحم دلوں ہی پر تو رحمت فرماتے ہیں۔

شرح ظاہر حدیث اس پر دال ہے کہ رحمت کی وجہ سے رونا جائز ہے اس حدیث پر چند وجوہ سے گفتگو ہے۔

(۱۴۸) کسی کی موت کے وقت بزرگوں کو بلانا چاہیئے

موت کی تکلیف کے وقت بزرگوں کو بلانا چاہیئے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی نے حضور کو بلایا کہ اُن کے بیٹے کی موت کے حادثہ میں تشریف لائیں اور (ظاہر ہے کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وقت میں اور ہر زمانے میں تمام لوگوں سے افضل ہیں۔

قولہ منہا استحضار ذوی الفضل عند معالجۃ الموت الی قولہ افضل العباد۔

(۱۴۹) مصیبت زدہ کی تسلی کی جائے

مصیبت زدہ کو صبر کی تلقین کی جائے اور اس کو تسلی دی جائے

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاحبزادی سے فرمایا فلتصبر ولتحتسب پس صبر کرو اور ثواب کی طلب کرو۔

قولہ فیہ دلیل علی مراجعۃ صاحب المصیبۃ بالتصبر الی قولہ ولتحتسب۔

ف یہ امور صوفیہ کے اخلاق میں داخل ہیں اُن کی وصیت ہے کہ میت کے پاس نزع کے وقت کسی عاقل و صالح کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ ہمارے حاجی صاحب کے ایک مرید کا انتقال ہونے لگا تو وہ نزع کی حالت میں اپنے تجارتی کاروبار سے متعلق باتیں کرنے لگے۔ لوگ کلمہ کی تلقین کرتے تھے مگر وہ اپنی دکان اور تجارت کی باتوں میں مشغول تھے۔ اُن کے بھائی بہت ہوشیار سمجھدار تھے۔ اُنہوں نے کان پر منہ لگا کر کہا بھائی صاحب! کیا باتیں کر رہے ہو؟ حاجی صاحب تم کو دیکھنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔ بس حاجی صاحب کا نام سن کر فوراً ذہن دوسری طرف منتقل ہوگیا۔ کہا حاجی صاحب کے لیے قالین بچھاؤ تعظیم سے بٹھلاؤ بس پھر جو ذکر و شغل حاجی صاحب نے بتلا رکھا تھا اس میں مشغول ہوگئے اور ذکر اللہ کرتے کرتے ختم ہوگئے۔ پس بزرگوں کو کسی کی موت کے وقت بلانے میں بڑی مصلحت ہے اُن سے میت

کو بھی قوت حاصل ہوتی ہے اور اہل میت کو بھی تقویت ہوتی ہے۔

(۱۵۰) حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کسی کو بلایا جائے تو اس کو یہ بھی بتلا دیا جائے کہ کیوں بلایا جا رہا ہے (کیا کام ہے) چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی نے اس طرح پیام بھیجا کہ میرا بچہ مر رہا ہے آپ تشریف لائیے تو انہوں نے تشریف آوری کی درخواست بعد میں کی پہلے بچہ کی حالت سے اطلاع دی۔

قولہ وفیہ دلیل علی ان من السنۃ ان یخبر الذی یستدعی الی قولہ الا بعدما اخبرتہ بموت ابنہا۔

ف حسن معاشرت اور ادب کلام بھی اسلام کا بڑا جزو ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ دوسرے کو اصلاً پریشانی اور کلفت نہ ہو المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ میں ادب کلام بھی داخل ہے کہ بات صاف ہونی چاہیئے، ہر معاملہ صاف ہونا چاہیئے۔ اس جزو کی طرف عوام تو عوام بہت سے خواص کو بھی توجہ نہیں حضرت اقدس حکیم الامۃ قدس سرہ[ع] نے اپنے تجدیدی کارناموں میں جہاں اور بہت سی عظیم الشان اسلامی خدمتیں انجام دی ہیں اُن ہی میں سے ایک کارنامہ یہ ہے کہ باب حسن معاشرت کو زندہ فرمایا۔ اس کے لئے آداب المعاشرت" کے نام سے مستقل کتاب تالیف فرمائی۔ "بہشتی زیور" اور "تعلیم الدین" میں سلیقہ کی باتوں اور آداب کے لیے ابواب قائم فرمائے۔ اپنے قیمتی ملفوظات میں شب و روز اس پر تنبیہ فرمائی۔ انتہا یہ کہ وصال سے چند گھنٹے پہلے قریب مغرب کے دریافت فرمایا کیا وقت ہے؟ (کیونکہ حضرت کو محسوس ہو گیا تھا کہ مغرب کے بعد وصالِ محبوب کی گھڑیاں آنے والی ہیں) کسی نے جواب دیا، دس منٹ باقی ہیں۔ فرمایا مغرب کے آنے میں یا جانے میں؟ عالم نزع میں بھی ادبِ کلام کی تعلیم زبان فیض ترجمان سے جاری رہی کہ اتنا کہنا کافی نہیں کہ دس منٹ باقی ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیئے تھا کہ مغرب کے آنے میں دس منٹ باقی ہیں۔ اللہ اللہ اصلاح و تعلیم اور پابندیٔ اصول اخیر لمحۂ حیات تک بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹی۔ واقعی آپ کے لیے بجا طور پر اللہ تعالیٰ نے قلوب رجال میں لقب حکیم الامۃ مجدد الملت القا فرمایا تھا۔ ایک حکیم اُمت اور مجدد کی یہی شان ہونا چاہیئے تھی کہ جس کام کے لیے دُنیا میں تشریف لائے تھے آخری وقت تک اس کو انجام دیتے رہیں۔ حقوق العباد اور امانات کا جس قدر اہتمام تھا زبان کی طاقت سلب ہونے سے پہلے اس پر بھی تنبیہ فرما گئے۔ مفصل حالات و واقعات کے لیے احقر کا رسالہ حیاتِ اشرف ملاحظہ ہو جو انشاء اللہ عنقریب کسی رسالہ میں شائع ہو جائے گا۔

بہرحال حدیث میں کلام کے اس ادب پر تنبیہ ہے کہ جب کسی کو بُلایا جائے تو اُس کو وجہ بھی بتلا دی جاوے کہ کیوں بلایا جا رہا ہے؟ محض اتنا کہنا کافی نہیں کہ آپ کو بُلایا ہے اس سے سُننے والے کو پریشانی ہوگی کہ نہ معلوم کیوں بلایا ہے اور جس کام کو بُلایا ہے وہ ایسا کام ہے بھی یا نہیں جو بدون جائے نہ ہو سکتا ہو اسی طرح بعض لوگ حضرت حکیم الامۃ

ع آہ آج بجائے دام مجدہم اور دامت برکاتہم کے حضرت کے نام کیساتھ قدس سرہ اور نور اللہ مرقدہ قلم سے لکھا جا رہا ہے کیا کہوں اس وقت دل پر کیا گذری ہے ؎

تفطر قلبی اذ رأیتک راحلا — وکادت لہا شم الجبال تزول

کسے وہم تھا کہ نہ ہوں گے وہ کسے تھا گمان کہ رہیں گے ہم — ظفر آہ کیسے گئے ہیں وہ کہ چراغِ دل ہی بجھا گئے

وہ حکیم امت مصطفےٰ وہ مجدد طرق ہدیٰ — وہ جو بانٹتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ سے آنے والی رات کو دوشنبہ کی مغرب کے بعد عشاء کے وقت آفتاب رشد و ہدایت غروب ہو گیا۔ دریائے حکمت و معرفت زیرِ زمین مخفی ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اب کون محبت و شفقت کے لہجہ سے مولوی ظفر کہہ کر مجھے پکارے گا۔ کون دست شفقت سر پر پھیرے گا اور کون علمی و عملی کوتاہیوں پر تنبیہ کرے گا اور کون علومِ ظاہرہ اور احوالِ باطنہ کی گتھیوں کو سلجھائے گا اور کون اپنی بابرکت مجلس اور قیمتی ملفوظات سے تاریک دلوں کو منور کرے گا ہائے ہائے انا للہ وانا الیہ راجعون ؎

فدتہ نفوسنا لو کان یبقی — لکان لنا بہ ظل ظلیل

اب بجز اس کے کہ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(حاشیہ ص سے آگے) حضرت کے تذکرہ سے دل بہلائیں اور حضرت کے لیئے ارفع درجات اور ترقی مقامات کی دُعا کریں اور حضرت کی تالیفات و تعلیمات کو مشعلِ راہ بنائیں تسلی کی کیا صورت ہے۔ باقیات صالحات میں علاوہ مواعظ و تصنیفات کے دو ازواجِ محترمہ اور دو چھوٹے بھائی زندہ ہیں۔ اہلِ سلسلہ کو ان سب کا احترام کرنا اور ان کے ادائے حقوق کا اہتمام کرنا چاہیئے۔ والسلام ۷ ظ

قدس سرہٗ سے صرف اتنا عرض کرتے کہ تعویذ دے دو یا ایک تعویذ کی ضرورت ہے تو صاف فرما دیتے کہ میں تمہاری بات سمجھا نہیں۔ جب وہ اپنی غلطی پر متنبہ ہو کر عرض کرتا کہ فلاں کام کے لیے تعویذ کی ضرورت ہے تو فرماتے کہ تم نے پہلے اس طرح کیوں نہیں کہا تھا؟ جاؤ آدھ گھنٹہ کے بعد پوری بات کہہ کر تعویذ مانگنا۔ آپ نے دیکھا کہ اس آداب کی تعلیم حدیث میں موجود ہے۔ مگر حدیث پڑھنے والے ان احکام کو اس سے نہیں سمجھتے بس آمین رفع یدین اور قرأت فاتحہ وغیرہ اختلافی مسائل ہی پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ ان اتفاقی مسائل پر توجہ نہیں کرتے۔

(۱۵۱) چھوٹا بڑے کو قسم دے سکتا ہے

حدیث سے معلوم ہوا کہ چھوٹا اپنے بڑے کو بھی قسم دے سکتا ہے۔

چنانچہ حضورؐ کی صاحبزادی نے دُوسری مرتبہ جو پیام بھیجا اس میں قسم دے کر عرض کیا کہ آپ کو قسم ہے ضرور تشریف لائیے۔ اس کو باب حلف اور یمین میں شمار نہ کیا جائے گا بلکہ طلب اور رغبت میں داخل کیا جائے گا۔ یہاں ایک سوال تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے پیام کے بعد محض قسم دینے کی وجہ سے تشریف لے گئے یا اور کوئی وجہ تھی یا دوسری وجہ کے ساتھ یہ بھی ایک وجہ تھی۔

دُوسرا سوال یہ ہے کہ پہلی بار کے بلانے پر آپ کیوں تشریف نہیں لے گئے حالانکہ آپؐ تو غیروں کے ساتھ بھی رحمت اور حُسنِ خلق کا معاملہ فرماتے تھے اپنی بیٹی کے ساتھ تو اور زیادہ اس کا ظہور ہونا چاہیئے تھا۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلی بار بُلانے پر نہ جانا اس لیے تھا کہ آپؐ کو یہ مسئلہ بتلانا تھا کہ ایسے موقعہ پر بلایا جائے تو جانا واجب نہیں اس کو دعوتِ نکاح اور دعوتِ ولیمہ پر قیاس نہ کیا جائے (کہ وہاں دعوت کے بعد جانا ضروری ہے) دُوسرے آپ کو یہ بھی خیال ہُوا ہوگا کہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک جو آپ کا (بلند) درجہ ہے کہیں اس کی وجہ سے صاحبزادی کو یہ گمان نہ ہو کہ آپؐ کے آنے سے بچے کی موت ٹل جائے گی یا کچھ دنوں کے لیے مؤخر

ہو جائے گی۔ اس لیے اوّلاً آپ نے اُن کو بتلا دیا کہ اس معاملہ میں کسی کا کچھ دخل نہیں۔ چنانچہ کہلا بھیجا ان للہ ما اخذ ولہ ما اعطی وکل عندہ باجل مسمی اللہ تعالےٰ جو کچھ لے لیں وہ بھی ان ہی کا ہے جو کچھ دیں وہ بھی ان ہی کا ہے اور ہر شخص کی ایک مدت اُن کے یہاں مقرر ہے۔ پھر ان کو اس موقعہ و حالت کے احکام بھی بتلا دیئے کہ تم کو صبر کرنا اور ثواب حاصل کرنے میں کوشش کرنا چاہیئے۔

امام مالکؒ نے مؤطا میں (اسی کے مناسب) ایک روایت بیان فرمائی ہے کہ ایک عالم کو اپنی بیوی سے بہت محبت تھی، اُس کا انتقال ہو گیا تو اُن کو سخت صدمہ ہُوا حتیٰ کہ لوگوں سے ملنا جُلنا چھوڑ دیا (افادۂ علمی کا دروازہ بند کر دیا) حالانکہ (کمال) علم و فضل کی وجہ سے لوگ اُن کے (بہت) محتاج تھے۔ اب یہ حال ہو گیا کہ ان کے پاس سوالات آتے تو خادم سوالات کو لے کر گھر میں جاتا اور ان پر جواب لکھوا کر لاتا اور لوگوں کے حوالہ کر دیتا۔ جب کچھ مدت تک یہی حال رہا تو ایک عابدہ نیک بی بی کو بھی اطلاع ہوئی وہ اُن کے دروازہ پر پہنچی اور خادم سے کہا کہ مجھے ایک ضروری بات پُوچھنی ہے مگر بالمشافہ پوچھوں گی بواسطہ نہیں کہہ سکتی۔ خادم نے کہا کہ میں تم کو اندر نہیں بھیج سکتا۔ چنانچہ سب لوگ تو (اپنا اپنا جواب لے کر) چلے گئے۔ یہ بی بی دروازہ ہی پر بیٹھی رہیں۔ خادم نے نرمی سے ان کو بھی جانے کے لیے کہا مگر وہ وہاں سے نہ ٹلیں اور کہا مجھے حضرت سے ملنا ضروری ہے جب دیر تک بیٹھی رہیں تب خادم نے (مجبور ہو کر) شیخ کو اس کی اطلاع دی انھوں نے گھر میں آنے کی اجازت دی تو عرض کیا حضرت میرے کچھ پڑوسی ہیں جن سے میں نے کسی شادی میں جانے کے لیے چند زیورات عاریت لئے تھے انھوں نے مجھے وہ زیورات عاریت دیدیئے۔ پھر اُس شادی کے بعد بھی ایک مدت تک میرے ہی پاس وہ زیورات چھوڑ دیئے کہ ان کو استعمال کئے جاؤں اور اپنا بناؤ سنگار کرتی رہوں۔ پھر اب وہ مجھ سے اپنے زیورات طلب کرتے ہیں مگر میرا دل واپس کرنے کو نہیں چاہتا (کیونکہ مدت تک پاس رکھنے سے مجھے اُن کی محبت سی ہو گئی ہے) شیخ نے فرمایا کہ اب تم کو ان کا اپنے پاس رکھنا

جائز نہیں۔ کیونکہ وہ تو عاریت تھے (تمہاری ملک نہ تھے) اور عاریت کو بجنسہ ادا کرنا لازم ہے۔ اللہ تعالے کا حکم ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے۔ کہا حضرت! میں نے تو ایک دن کے لیے مانگے تھے انہوں نے برسوں میرے پاس رکھ چھوڑے (اب کیونکر دوں اب تو مجھے اُن سے محبت ہو گئی ہے) فرمایا اب تو واپسی میں اور جلدی کرنا چاہیئے کیونکہ انہوں نے احسان پر احسان کیا (کہ ایک دن کی جگہ برسوں تمہیں استعمال کرنے کی اجازت دی) ان بی بی نے کوشش کی کہ وہ کچھ تو گنجائش نکال دیں مگر وہ سختی پر سختی کرتے چلے گئے (کہ اب انکار کی اصلاً گنجائش نہیں) تو ان بی بی نے عرض کیا حضرت! پھر آپ کی بیوی بھی تو اللہ تعالے کی عاریت ہی تھی جو چند روز کے لیے اللہ تعالے نے آپ کو دی تھی۔ پھر اپنی چیز لے لی۔ تو آپ کا یہ رنج وغم اور لوگوں سے الگ ہو کر بیٹھ جانا کس لیے؟ (آپ نے اللہ کی امانت کو خوشی کے ساتھ کیوں واپس نہیں کیا؟ رنج وغم کو لے کر کیوں بیٹھ گئے؟) اس پر ان بزرگ نے اپنی حالت میں غور کیا اور سمجھ گئے کہ مَیں نے غلطی کی) اور بی بی کا شکریہ ادا کیا اور اسی وقت سے گھر کے باہر آنے لگے (اور افاداتِ علمی کا دروازہ کھول دیا سبحان اللہ! حضرات سلف کی عورتیں بھی کیسی سمجھدار تھیں کہ بڑے بڑے علماء کو سبق دیتی تھیں اور اس زمانے کے علماء بھی کیسے تھے کہ ایک عورت کے متنبہ کرنے سے اپنی غلطی کا اقرار کر لیتے تھے۔ اب تو ہم اپنے شیخ کے کہنے سے بھی اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتے فالی اللہ المشتکی من فساد القلوب۔)

غرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلی بار بُلانے پر نہ جانا اس لیے تھا کہ اپنے اور پرائے سب کو یکساں طور پر حکم شرعی سے مطلع فرما دیں (کہ ایسی دعوت پر جانا لازم نہیں) اور دوبارہ بُلانے پر تشریف لے جانا اپنی بیٹی کی قسم پُورا کرنے کے لیے بھی تھا اور اسی شفقت و رحمت کے مقتضاء پر عمل کرنے کے لیے بھی جو آپ کی فطرت میں ودیعت تھی اور صاحبزادی کے لیے بھی جبکہ اس بات سے اطمینان ہو گیا جس کا پہلے احتمال ہُوا تھا اس میں اہلِ طریق کی بھی دلیل ہے جو (دلداری اور

جبر قلوب کے قائل ہیں (مگر دلداری کے لیے یہ حدود بھی ہیں جن پر حدیث میں متنبہ کیا گیا ہے کہ اول مفسدہ محتملہ کا انسداد کر دیا جائے پھر دلداری کی جائے۔)

قولہ وفیہ دلیل علی جواز القسم علی الفاضل الی قولہ یقولون بجبر القلوب۔

(۱۵۲) اہلِ فضل کے کرم سے قطعی طور پر نا اُمید نہ ہونا چاہیئے

حدیث میں اس پر اشارہ ہے کہ اہل فضل کے فضل (وکرم) سے قطعی طور پر نا امید نہ ہونا چاہیئے۔ اگرچہ وہ (ایک دو بار) جواب بھی دے چکے ہوں۔ چنانچہ حضورؐ کی صاحبزادی نے قاصد کو دوبارہ بھیجا۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی بار انکار فرما چکے تھے (مگر وہ اس انکار سے قطعی مایوس نہ ہوئیں۔ دوبارہ پھر درخواست کی) یہ تو مخلوق کے فضل وکرم کی طمع تھی تو اس ذات کے فضل وکرم کی طمع کیسی ہونی چاہیئے جس کا مثل ہی کوئی نہیں؟ اسی لیے حدیث قدسی میں آیا ہے کہ گنہ گار بندہ (ایک دفعہ) اللہ جل جلالہٗ سے دعا کرتا ہے وہ اعراض فرماتے ہیں۔ وہ دوبارہ پھر دُعا کرتا ہے اللہ تعالے اب بھی اعراض فرماتے ہیں وہ پھر دُعا کرتا ہے تو اللہ تعالے فرماتے ہیں۔ اے فرشتو! کیا تم میرے اس بندہ کو نہیں دیکھتے؟ (کیسا بار بار مجھے پکار رہا اور درخواست کر رہا ہے؟) وہ جانتا ہے کہ میرے سوا کوئی نہیں جس کو پکارے (اور جس سے کچھ مانگے) مَیں تم کو گواہ کرتا ہوں میں نے اس کو بخش دیا اور اُس کی دعا قبول کی۔

ف ہم نے اللہ والوں کے فضل وکرم کا کُھلی آنکھوں مشاہدہ کیا ہے جو ان کو لگا لپٹا رہتا ہے وہ محروم نہیں رہتا ؎

تا دمِ آخر دمے آخر بود — کہ عنایت با تو صاحب سر بود

بحمد اللہ وہ دمِ آخر میں بھی امیدواروں کو بشارتِ عالیہ ومبارک باد سے کامیاب فرما دیتے ہیں والعادف تکفیہ الاشادۃ دھی ابلغ من صریح العبادۃ جب اللہ والوں کے فضل وکرم کا یہ حال ہے تو اللہ تعالے کے فضل وکرم کا کیا پوچھنا؟ ان سے تو کسی حال بھی مایوسی جائز نہیں برابر عرض ومعروض میں لگا رہنا

چاہیئے۔ انشاء اللہ محروم نہ رہے گا۔ افسوس ہے کہ آج کل ہم لوگوں نے دُعاء کی طرف سے بہت غفلت کر رکھی ہے حالانکہ حدیث شریف میں بڑی تاکید سے ارشاد ہوا ہے لن یھلک مع الدعاء احد۔ دعا کے ساتھ ہرگز کوئی ہلاک نہیں ہو سکتا۔

دوستو! دعا کا التزام رکھو اور یہ جان کر دعا کرو کہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جس کو پکارا جائے۔ کوئی نہیں جس سے کچھ مانگا جائے۔ کوئی نہیں جس کو حاجت روا سمجھا جاوے۔ کوئی نہیں جس سے مدد طلب کی جائے۔ انشاء اللہ محروم نہ رہو گے۔

(۱۵۴) حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غمی کے گھر میں بدون بلائے جانا جائز ہے بخلاف ولیمہ (وغیرہ خوشی کے مواقع) کے (کہ وہاں بدون بلائے نہ جانا چاہیئے) یہ اس سے معلوم ہوا کہ سعد بن عبادہ و معاذ بن جبل و ابی بن کعب اور زید بن ثابت اور چند صحابہ رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل کھڑے ہوئے حالانکہ حضورؐ نے ان سے کچھ فرمایا نہ صاحبزادی نے اُن کو بلایا نہ ان حضرات نے اجازت طلب کی۔

ف افسوس ہے آج کل رنج و غم کے گھر جانے کے لیے بھی بعض لوگ بلانے کے منتظر رہتے ہیں۔ حالانکہ گھر والا اس وقت خود اپنی پریشانی اور غم میں مبتلا ہوتا ہے اُس کو کسی کے بلانے کی فرصت کہاں ہوتی ہے؟ مسلمان آج کل ترقی کے تو طالب ہیں مگر اس کی بنیاد کو جو کہ اتفاق و اتحاد ہے خود اپنے ہاتھوں ہی سے کاٹتے جاتے ہیں ؎

پھوٹ مسلم کو کر رہی ہے تباہ　　آہ! لوہے کو کھا رہا ہے زنگ
اُڑ کے وہ آسماں پر پہنچے　　ہم ابھی تک اُڑا رہے ہیں پتنگ

(۱۵۴) موت کی شدت یا خفت شقاوت یا سعادت کی علامت نہیں

حدیث سے معلوم ہوا کہ موت کی شدت اور خفت کو شقاوت یا سعادت کی علامت نہ سمجھنا چاہیئے کیونکہ یہ بچہ (جس کی موت کا حال حدیث میں ہے) مکلف

نہ تھا (بلکہ معصوم تھا) بایں ہمہ اس پر موت کی شدت ہو رہی تھی۔ اس میں جو کچھ حکمت ہے اس کو اللہ تعالےٰ ہی جانتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موت فجاءۃ (اچانک کی موت) کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ دو گھروں میں سے ایک میں جلدی پہنچا دیتی ہے (تو اس کو بری علامت نہ سمجھنا چاہیئے اور بعض احادیث میں جو ایسی موت سے پناہ مانگی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں انسان کو وصیت وغیرہ کا موقعہ نہیں ملتا۔ نیز ایسی موت سے زندوں کے دلوں پر سخت چوٹ لگتی ہے اُن کے دل دہل جاتے ہیں) نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مومن کا کوئی درجہ باقی رہ جاتا ہے جس پر وہ اپنے عمل سے نہیں پہنچا تھا تو اس پر موت میں سختی کی جاتی ہے تاکہ اس درجہ پر پہنچ جائے۔

ف اس سے معلوم ہوا کہ مجاہدہ اضطراریہ سے بھی ترقی ہوتی ہے ففیہ حجۃ لمن قال بہ۔

(۱۵۵) ادب یہ ہے کہ بڑا آدمی گفتگو کی ابتداء کرے

دین میں ادب یہ ہے کہ بڑا آدمی پہلے گفتگو کرے۔ چنانچہ اس موقعہ پر حضرت سعد بن عبادہ نے اول گفتگو کی۔ حالانکہ جو کچھ انہوں نے دیکھا تھا سب ہی دیکھ رہے تھے مگر ایک نے دوسرے کا ادب کیا۔ کیونکہ اُن کی عادت سے یہ بات معلوم ہے کہ گفتگو شروع وہی کرتا تھا جو سب سے مقدم (و معظم ہو) پس حضرت سعد بن عبادہ نے گفتگو کا افتتاح کیا (کیونکہ وہ اپنے قبیلہ کے سردار تھے) نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ سوال میں ادب (و تہذیب) کی رعایت ضروری ہے اور یہ کہ سوال سے پہلے بزرگوں کا نام بھی (ادب سے) لیا جائے۔ چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ ماھذا؟ یارسول اللہ! یہ کیا ہے؟ تو پہلے حضورؐ کا نام ادب سے لیا پھر ادب سے سوال کیا اور سوال میں بھی اختصار ملحوظ رکھا اس لفظ پر کچھ زیادتی نہیں کی۔

(۱۵۶) آنسو نکلنے کی عام وجہ صحیح نہیں بلکہ اسکی حقیقت رحمت و رقت ہے

حدیث سے معلوم ہوا کہ آنسوؤں

کی حقیقت اور اُن کے سبب کے متعلق جو باتیں لوگوں نے بیان کی ہیں سب لغو ہیں لوگوں نے اس کے متعلق پانچ چھ باتیں یا اس کے قریب بیان کی ہیں جن میں سے ایک بات کو (عام طور سے) اچھا سمجھا گیا ہے کہ گناہوں کی شرمندگی سے دل کو پسینہ آتا ہے (وہ آنسوؤں کی شکل میں آنکھوں سے نکلتا ہے) اسی سے اور باتوں کو بھی بنایا گیا ہے مگر مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں بتلا دیا ہے کہ یہ بھی اللہ کی پیدا کی ہوئی ایک چیز ہے جس کو رحمدل بندوں کے دل میں ودیعت کر دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد فانما یرحم اللہ من عبادہ الرحماء (کہ اللہ تعالٰے اپنے بندوں میں سے رحمدلوں ہی پر رحم فرماتا ہے) اس بات کو بتلاتا ہے کہ یہ آنسو اس رحمت کی وجہ سے نکلتے ہیں جو رحمدل مومنوں کے دلوں میں رکھی ہوئی ہے تو جیسا کہ علوم میں سمجھ (کی طاقت) اس نور سے پیدا ہوتی ہے جو علماء کے قلوب میں ہوتا ہے اسی طرح یہ آنسو ان رحمدلوں کی آنکھ سے بہتے ہیں جن کے دلوں میں رحمت ہے، یہ بھی حکیم کی ایک حکمت ہے۔

فانما یرحم اللہ من عبادہ الرحماء سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالٰے اسی پر رحمت فرماتے ہیں جن کے دلوں میں رحمت (کا مادہ) ہے یعنی رحم والوں کے سوا کسی پر رحمت نہیں فرماتے۔ اب یا تو اس کو ظاہر ہی پر رکھ جائے اور کلام کے حصر پر نظر کر کے دوسروں سے رحمت کی نفی کر دی جائے اور یہ بھی احتمال ہے کہ حصر مقصود نہ ہو بلکہ اہلِ رحمت کے لیے حکم رحمت کو ثابت کرنا مراد ہو۔ دوسروں سے نفی مراد نہیں۔ جیسے بولتے ہیں انما الجمیل یوسف بس حسین تو یوسف علیہ السلام ہیں۔ جس سے ان کے لیے حسن وجمال ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے۔ دوسروں سے نفی کا قصد نہیں ہوتا (اہل بلاغت کی اصطلاح میں یوں کہنا چاہیئے کہ حصر حقیقی مراد نہیں بلکہ حصر اضافی ہے یعنی دوسروں سے خاص درجہ حسن کی نفی مقصود ہے مطلق حسن کی نفی نہیں۔ اسی طرح یہاں پر رحمدلوں کے لیے خاص درجہ کی رحمت ثابت کر کے بے رحموں سے اس درجہ کی نفی کی گئی ہے مطلق رحمت

کی نفی نہیں کی گئی) اور کبھی ایسے کلام سے (جس میں لفظ انما لایا گیا ہو) صرف استحقاق کا بتلانا مقصود ہوتا ہے) حصر کا قصد نہیں ہوتا نہ حقیقۃً نہ اضافۃً) جیسے حق تعالٰے کا یہ ارشاد ہے ان الذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ اولئک یرجون رحمۃ اللہ۔ بے شک جو لوگ ایمان لے آئے اور مہاجر ہو گئے اور جنہوں نے اللہ کے راستہ میں جہاد کیا یہی لوگ اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں۔ (یہاں بھی کلام میں حصر ہے کیونکہ خبر کے معرفہ ہونے سے معنی حصر پیدا ہو جاتے ہیں مگر) مطلب یہ ہے کہ ان کو وعدۂ الٰہی کی امید کا حق ہے اور دوسرے جو رحمت کے امیدوار ہیں وہ بلاوجہ امیدوار ہیں تو یہاں بھی دونوں معنی کا احتمال ہے (ایک یہ کہ حصر مقصود ہو مگر حصر حقیقی نہیں بلکہ اضافی ہے کہ یہی لوگ اپنی اُمید میں حق بجانب ہیں۔ دوسرے گو امیدوار ہیں مگر اُن کی امید بلا سبب ہے دوسرے یہ کہ) مقصود (حصر نہیں بلکہ) ان لوگوں کے لیے خصوصیت کے ساتھ استحقاقِ رحمت کا حکم بیان کر دیا گیا۔ دوسروں سے نفی مقصود نہیں اور یہی زیادہ ظاہر ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالٰے کی رحمت کے کچھ جھونکے (وقتاً فوقتاً) ہوتے ہیں جس کو اللہ چاہتے ہیں (ان کی ہوا) پہنچا دیتے ہیں (اس کے لیے مہاجرین ومجاہد ہونا شرط نہیں بلکہ ایمان بھی شرط نہیں۔ بعض دفعہ کافر کو بھی رحمت کا جھونکا لگ جاتا ہے تو اس کو ایمان کی توفیق ہو جاتی ہے) خواہ اس میں رحمت (کا مادہ) ہو یا نہ ہو۔

نیز حدیث میں آیا ہے کہ (قیامت کے دن) انبیاء ورسل اور ملائکہ اور علماء و صالحین شفاعت کریں گے پھر حق تعالٰے فرمائیں گے انبیاء شفاعت کر چکے ملائکہ شفاعت کر چکے نیک بندے شفاعت کر چکے۔ اب ارحم الراحمین کی شفاعت باقی ہے پھر اللہ تعالٰے ایک مٹھی بھر کر (اور بعض روایات میں ہے کہ تین دفعہ دونوں ہاتھ بھر کر) بعض ایسے آدمیوں کو جہنم سے نکالیں گے جن کو (انبیاء ورسل کے خیال میں) قرآن نے جہنم میں محبوس کر دیا تھا۔ یعنی یہ وہ لوگ ہوں گے جن کو سب کے سب کافر سمجھ کر جہنم میں چھوڑ دیں گے۔ اسی لیے کوئی اُن کی شفاعت نہ کرے گا مگر وہ واقع میں کافر

نہ تھے مومن تھے۔ لیکن ایمان اتنا کمزور اور مخفی تھا کہ انبیاء و ملائکہ کو بھی اُن کے ایمان کا پتہ نہ لگے گا۔ ارحم الراحمین عالم الغیب ان کو خود اپنی رحمت سے بلا کسی کی شفاعت کے جہنم سے نکالیں گے۔ اس سے ثابت ہوا کہ رحمتِ مطلقہ رحمدلوں کے واسطے مخصوص نہیں۔ البتہ اگر رحمت سے مراد ایمان ہو اور ایمان سے مراد ایمانِ کامل ہو تو یہی لوگ حقیقت میں رحمت کے مستحق ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اس رحمت کے ساتھ اہلِ ایمان ہی مخصوص ہیں یعنی کاملین اور ایسی رحمت سے خشوع پیدا ہوتا ہے اور اللہ تعالے نے اپنی کتاب میں خشوع کی مدح فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہے والذین ھم فی صلوتھم خاشعون پس حدیث اپنے ظاہری معنی پر محمول ہوگی کیونکہ اس صورت میں حکم ان ہی لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جن کا ذکر کیا جا رہا ہے اور دوسروں سے جن میں ایمان نہیں مطلقاً رحمت کی نفی ہے اور مومنین سے مطلقاً نفی نہیں بلکہ خاص رحمت کی نفی ہے۔ ورنہ مطلق رحمت ان کے لیے یقیناً ثابت ہے۔ اللہ تعالے فرماتے ہیں:

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذلک لمن یشاء۔ اللہ تعالیٰ اس گناہ کو معاف نہیں فرمائیں گے کہ ان کے ساتھ (کسی کو) شریک کیا جائے اس کے سوا (اور گناہوں کو) جس کے لیے چاہیں گے معاف فرما دیں گے (پس ہر مومن کے لیے استحقاقِ مغفرت ثابت ہے اور مغفرت بھی رحمت کا ایک فرد ہے۔)

یہاں ایک سوال ہے وہ یہ کہ ایک حدیث میں ہے کہ جب آدمی کا نفاق کامل ہو جاتا ہے تو اس کی آنکھیں اس کے اختیار میں ہوتی ہیں جب چاہتا ہے ان کو بہا لیتا ہے۔ بظاہر دونوں حدیثوں میں تعارض ہے کیونکہ آنسو آنسو برابر ہیں (ایک حدیث میں ان کا سبب رحمت کو قرار دیا گیا دوسری میں نفاق پر مبنی کیا گیا) جواب یہ ہے کہ ہاں ظاہر میں تعارض معلوم ہوتا ہے مگر شرط پر نظر کرنے کے بعد کچھ تعارض نہیں رہتا۔ کیونکہ جس آنسو کا سبب کمال نفاق فرمایا گیا ہے یہ وہ ہے جو بلا وجہ اپنے

اختیار سے نکالا جائے اور رونے کے موقعہ پر روک لیا جائے جیسے ہر زمانے میں لوگ ان مسکینوں کی حالت سے مشاہدہ کرتے رہتے ہیں جو حلقے بنا کر لوگوں کو جمع کرتے ہیں پھر اپنی حالت بیان کرتے ہیں کہ ہم ایسے تھے ہم ویسے تھے اور یہ تمام بیان غلط اور جھوٹ ہوتا ہے جس کا جھوٹ ہونا ان لوگوں کو جو اُن کے اصول و فروع سے واقف ہیں اچھی طرح معلوم ہوتا ہے پھر جب وہ اپنا پورا حال بیان کر چکتے ہیں تو بے تحاشا رونے لگتے ہیں۔ بارش کی طرح اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ یہ حال دیکھ کر ناواقف لوگ گمان کرتے ہیں کہ اُس نے جو کچھ کہا سچ کہا ہے (بھلا جھوٹ باتیں کرکے بھی کوئی اس طرح رویا کرتا ہے) پھر اس پر ترس کھا کر ہر طرف سے صدقہ و خیرات کی بارش ہونے لگتی ہے۔ ایسے واقعات ان لوگوں سے بہت منقول ہیں۔ چنانچہ وہ کتاب جو بنو ساسان کی طرف منسوب ہے جس میں اُن کے حالات (عروج و نزول) کا ذکر ہے وہی اس کے ثبوت کو کافی ہے (کہ رونا اختیاری بھی ہوتا ہے کیونکہ جو لوگ اس کتاب کو پڑھ کر روتے ہیں ان کا رونا بناوٹی ہے) لوگ اُن کی حالت کا برابر معائنہ کرتے ہیں اور جس رونے کی اس حدیث میں خبر دی گئی ہے (کہ اُس کا منشاء رحمت ہے) یہ وہ ہے جو کسی سبب سے پیدا ہو۔ مثلاً موت کو یاد کرکے یا کسی کے حال پر ترس کھانے سے۔ جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنسو اس موقعہ پر نکلے جبکہ آپ نے بچہ کو موت کی سختی برداشت کرتے ہوئے دیکھا۔ حالانکہ وہ کمسن (معصوم) تھا یا اللہ کے خوف سے رونا آئے یا اور کسی حالت کے سوچنے سے رونے لگے۔ جیسا منقول ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے تو وہ بہت زیادہ رو رہی تھیں۔ پوچھا اے فاطمہ کیوں رو رہی ہو؟ عرض کیا کچھ نہیں قبر میں جانے کو سوچ کر رونے لگی (کہ دیکھئے وہاں کیا حال ہو؟ اللہ! اللہ نبی کی صاحبزادی کو تو قبر کا اتنا فکر اور ہم لوگ آج کل کیسے بے فکر ہیں) تو یہ سب ایک ہی قسم کا رونا ہے۔ جس کو ایمانِ کامل کی حقیقت مقتضی ہے اور یہیں سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں کہ یہ اللہ کی رحمت ہے انوع

پر اشارہ کیا ہے، جنس پر اشارہ نہیں فرمایا (مطلب یہ ہے کہ جو رونا میرے اس رونے کی قسم سے ہو اُس کا منشاء رحمت ہے یہ مطلب نہیں کہ ہر رونے کا منشاء رحمت ہے۔ اب دونوں حدیثوں میں کچھ تعارض نہ رہا) جس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ سعد بن عبادہ اور جو صحابہ اُس وقت تھے ان میں سے کسی کی آنکھ سے بھی آنسو نہیں نکلا صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی روئے اور آپؐ کے رونے کا منشاء کمال ایمان تھا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالاتفاق سب سے زیادہ کامل ایمان والے ہیں۔ اسی لیے آپؐ نے اپنے صاحبزادہ ابراہیم (علی ابیہ وعلیہ السلام والتحیۃ) کے انتقال کے وقت فرمایا تھا تدمع العین ویحزن القلب ولا نقول مایسخط الرب۔ "آنکھیں رو رہی ہیں دل غمگین ہے مگر (زبان و دل) سے ہم ایسی بات نہ کہیں گے جو اللہ تعالےٰ کو ناراض کرے" کیونکہ موقعہ پر رونا اور غم کرنا ایمان کا مقتضٰی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ کی ناراضی کے اسباب کو ترک کرنا ایمان کا مقتضٰی ہے۔

ف حقیقت یہ ہے کہ علامہ کی طویل تقریر سے بھی یہ مقام پوری طرح حل نہیں ہُوا۔ یہ اشکال ہنوز باقی ہے کہ اگر ایسے مواقع پر رونا کمال ایمان کا مقتضٰی ہے تو کیا یہ حضرات صحابہ ان صوفیوں سے بھی ناقص الایمان تھے جن کے رونے کو شارح نے کمال ایمان میں داخل کیا ہے اور اس کا کوئی قائل نہیں ہو سکتا۔ حضرات صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے ضرور ناقص تھے مگر دوسروں کی نسبت سے ہرگز ناقص نہ تھے۔ پس اگر ایسے موقعہ پر رونا صوفیہ کے کمال ایمان کی دلیل ہے تو یہ دلیل صحابہ میں کیوں نہ پائی گئی۔ جو کچھ میری سمجھ میں حدیث کا مطلب آیا ہے وہ عرض کرتا ہوں۔ فان کان صوابا فمن اللہ و رسولہ وان کان خطاء فمن نفسی۔ میرا خیال یہ ہے کہ حضرات صحابہ بھی اس وقت دل سے ضرور روئے اُن کے دلوں پر بھی رقت طاری ہوئی مگر اُنہوں نے یہ سمجھ کر کہ رونا کمالِ صبر کے منافی ہے شدتِ ضبط سے کام لیا اس لیے اُن کی آنکھوں سے آنسو نہیں نکلے۔ جب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روتے ہُوئے دیکھا تو دریافت کیا کہ یہ کیا (کیونکہ وہ تو رونے کو مطلقاً صبر کے خلاف سمجھتے تھے) حضورؐ نے بتلا دیا کہ آنکھوں سے آنسو نکل آنا صبر کے خلاف نہیں صبر کے خلاف جزع فزع ہے کہ چلا کر روئے اور زبان سے بیان کرے اور ایسے موقعہ پر آنکھوں سے آنسو نکل آنا جبکہ اپنے عزیز کا انتقال ہو رہا ہو دلی ہمدردی اور رحمت کا مقتضٰی ہے۔ بعض دفعہ دلی ہمدردی اور رحمت کے غلبہ سے آنسو نکل آتے ہیں۔ پس حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ آنکھوں سے آنسو کا نکلنا رحمت ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسے موقعہ پر اگر آنسو بہنے لگیں تو اُن کا منشاء قلبی رحمت ہے اور اس سے حضرات صحابہ بھی خالی نہیں دل اُن کے بھی پسیج رہے تھے مگر وہ ضبط سے کام لے رہے تھے۔ حضورؐ نے بتلا دیا کہ اتنے ضبط کی ضرورت نہیں زبان کو اور دل کو قابو میں رکھنا چاہیئے کہ دل میں اللہ کی شکایت پیدا نہ ہو، اس کے حاکم و حکیم ہونے کو دل میں مستحضر رکھے اور زبان سے کوئی بے جا بات نہ نکلنے پائے۔ پس اب حدیث پر کوئی اشکال باقی نہ رہا۔ کیونکہ حاصل یہ ہُوا کہ شرط کمال ایمان ایسے موقعہ پر دل سے رونا دل کا پسیجنا ہے اور صحابہ اس سے محروم نہ تھے آنکھوں سے آنسو نکلنا شرط کمال ایمان نہیں کیونکہ وہ اختیار میں نہیں اور امور غیر اختیاریہ پر کمال ایمان موقوف نہیں ہو سکتا لیکن اگر اس موقعہ پر آنسو نکل آئیں تو یہ بھی مذموم نہیں نہ صبر کے خلاف ہے بلکہ اُسی رحمتِ قلبی کا اثر ہے جو شرطِ کمال ایمان ہے اور یقیناً دل میں اپنے عزیزوں، قرابت داروں اور بچّوں کے ساتھ ہمدردی و رحمت کا ہونا کمال ایمان کا مقتضٰی ہے۔ ان کی وفات پر دل ضرور پگھلنا چاہیئے ورنہ قساوت ہوگی وابعد الناس من اللہ القلب القاسی سنگدل آدمی اللہ تعالیٰ سے بہت دُور ہے۔ اس تقریر کے بعد یہ اشکال بھی حدیث پر نہ رہا کہ دُوسری حدیث میں تو آنسوؤں کو کمال نفاق سے مسبب بتلایا ہے۔ کیونکہ حضورؐ کے اس ارشاد کا کہ یہ آنسو رحمت کے ہیں یہ مطلب نہیں کہ ہر آنسو رحمت ہی سے نکلتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسے موقعہ پر آنسوؤں کا نکل آنا رحمتِ قلب کی وجہ سے ہوتا

ہے۔ نیز حدیث میں آنسوؤں کی حقیقت کا بیان نہیں محض سبب قریب کا بیان ہے۔ شارع علیہ السلام کو ان چیزوں کی تحقیق سے کچھ غرض نہیں بلکہ سبب قریب بتلا دینا مقصود تھا تاکہ اس کو صبر کے خلاف سمجھنے کا شبہ دفع ہو جائے۔ واللہ اعلم

(١٥٧) اس میں صوفیہ کی بھی دلیل ہے کہ وہ گریہ زاری بہت کرتے ہیں۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے گریہ کو اس رحمت کا اثر قرار دیا ہے جو قلوب میں رکھی گئی ہے۔ چنانچہ بعض صوفیا سے منقول ہے کہ وہ بہت رویا کرتے تھے جس سے اُن کی آنکھوں میں آشوب ہو گیا۔ لوگ کسی طبیب کو لائے اُس نے کہا میں اس شرط سے علاج کر سکتا ہوں کہ جب تک آشوب کا اثر باقی رہے آپ رونا موقوف کر دیں۔ فرمایا ایسی آنکھ کس کام کی جس سے رویا نہ جائے۔ بخدا میں اس شرط کو منظور نہیں کر سکتا اور مجھے تمہاری دوا کی بھی ضرورت نہیں بلکہ روتے روتے مر جاؤں گا اور بھلا غمزدہ کی تسلی کا سامان آنسوؤں کے سوا بھی کسی چیز میں ہے؟

ف اُوپر بتلایا جا چکا ہے کہ رحمت کا اثر حقیقت میں دل کا رونا ہے۔ آنسوؤں سے رونا ضرور نہیں۔ اگر کسی کا دل روتا ہو آنسو نہ نکلتے ہوں اس کو پریشان نہ ہونا چاہیئے کیونکہ مقصود حاصل ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر دل کے رونے کے ساتھ آنکھیں بھی رونے لگیں تو اس میں ظاہر و باطن کا اجتماع ہے اور یہ صورت افضل ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں گزر چکا ہے ورجل ذکر اللہ خالیا ففاضت عیناہ کہ قیامت میں جن سات شخصوں کو عرش کا سایہ نصیب ہو گا ان میں ایک وہ شخص بھی ہے جس نے اللہ تعالٰی کو تنہائی میں یاد کیا تو اس کی آنکھیں بہنے لگیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالٰی کو آنکھ کا رونا بھی پسند ہے اسی لیے ایک حدیث میں ہے فان لم تبکوا فتباکوا کہ اگر تم کو رونا نہ آئے تو رونے کی صورت ہی بنا لیا کرو۔ اسی وجہ سے صوفیہ کو گریہ وزاری محبوب ہے اور اس میں وہ اپنی آنکھیں جاتی رہنے کی بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔ ١٢ مترجم

(١٥٨) موت کو یاد رکھنا چاہیئے جو یقیناً آنے والی ہے

اس حدیث کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس یقینی سخت وقت کو یاد رکھا جائے (یعنی موت کو) جس سے کوئی بھی نہیں بچ سکتا اور اس کے حملے سے پہلے سامان کی تیاری کر لی جائے، کیونکہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے کسی عزیز سے موت کو نہیں روک سکے اور خود اپنے سے بھی نہیں روک سکے تو دُوسروں کا کیا پوچھنا؟ جس سے اللہ تعالٰی کے اس ارشاد کی تصدیق ہوتی ہے کل نفس ذائقة الموت کہ ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ بعض حکماء نے خُوب فرمایا ہے ؎

ولو کانت الدنیا تدوم لاھلھا	لکان رسول اللہ حیا و باقیا
فحسبک یا ھذا اذا کنت عاقلا	مقیلا وکن فیھا لزادک داعیا

اگر دُنیا (کی زندگی) کسی کے لیے ہمیشہ رہا کرتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور زندہ باقی رہتے۔ پس اگر تو عاقل ہے تو تجھے اتنا کافی ہے کہ دُنیا کو قیلولہ[ع] کی جگہ سمجھ اور اس میں اپنے توشۂ راہ کو محفوظ کر لے اور بدون سامان کے موت کے منہ میں جانے سے بچا رہ کہ تیرے ہاتھ تقوے سے خالی ہوں اور موت کا وقت آ جائے تم اللہ کا تابعدار بندہ بن جا کیونکہ موت یقیناً کسی نہ کسی وقت دفعتہً آ جائے گی۔ قولہ و ھنا اشارة وھی ان اھل الفضل لا یقطع الایاس منھم الی قولہ فالحمام لک مفاجئی۔

ف مراقبہ موت و ذکر موت صوفیہ کا خاص شعار ہے، یہی چیز ہے جس نے اُن کی نگاہ میں دُنیا کو حقیر کر دیا ہے۔ اسی نے اُن کے لیے ترک لذات و مجاہدات کو آسان کر دیا ہے۔ اس پر بعض[ع] نوجوانوں نے اعتراض کیا ہے کہ صوفیہ

ع قیلولہ دوپہر کے لیٹنے کو کہتے ہیں جو عموماً تھوڑی دیر کے لیے ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ راحت کم کرو کام زیادہ کرو۔ ١٢

ع مثلاً ڈاکٹر زکی مبارک مصری مصنف کتاب الاخلاق عند الغزالی ١٢ –

نے اسلام کا جو نمونہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے یہ وہ اسلام نہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے پیش فرمایا ہے۔ وہ اسلام تو فتوحات اور حصولِ سلطنت کا دین ہے جس کے لیے علائق دُنیا کا بقا لازم ہے اور صوفیہ نے جو اسلام پیش کیا ہے اس میں ترک علائق دُنیا لازم ہے جو رہبانیت ہے اور دونوں میں بڑا فرق ہے۔ جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مُسلمانوں کو دُنیا کی محبت اور اُس کے علائق دل میں باقی رکھ کر فتوحات اور حصولِ سلطنت کی ہرگز تعلیم نہیں دی، بلکہ قلب کو حب دُنیا اور اس کے علائق سے پاک کرنے کے بعد جہاد کی تعلیم دی ہے۔ اسی لیے حدیث میں وارد ہے واللہ اعلم بمن یقاتل فی سبیلہ اللہ ہی خُوب جانتا ہے کہ اس کے راستے میں جہاد کرنے والا کون ہے؟ یعنی جو شخص نام ونمود یا محبت قوم وحمیت وطن کے لیے قتال کرتا ہے وہ مجاہد فی سبیل اللہ نہیں۔ اب ہم کو بتلایا جائے کہ یہ درجہ اخلاص وخلوص کو اُس شخص کو کیونکر حاصل ہو سکتا ہے جس کا دل حبِ دُنیا اور علائق دُنیا سے پاک نہیں۔ پس صُوفیہ جہاد فی سبیل اللہ کے مُنکر نہیں بلکہ نام ونمود اور غرض نفسانی کے لیے جہاد کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلے اپنی وہ حالت بناؤ جو صحابہ کی تھی رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ واقام الصلوۃ وایتاء الزکوۃ یخافون یوما تتقلب فیہ القلوب والابصار۔ وہ ایسے لوگ تھے جن کو بیع وشراء (اور دُنیا کے تمام کاروبار) اللہ کی یاد سے نماز کی پابندی سے زکوٰۃ دینے سے غافل نہیں کرتے تھے۔ وہ اس دن سے ڈرتے تھے جس میں آنکھیں اور دل اُلٹ پلٹ ہو جائیں گے الذین مکناھم فی الارض اقاموا الصلوۃ وآتوا الزکوۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین پر سلطنت عطا کر دیں تو نماز کی پابندی کریں، زکوٰۃ دیں نیک کاموں کا امر کریں۔ بُرے کاموں سے روکیں۔ یعنی جہاد سے اُن کی غرض محض اللہ کا بول بالا کرنا اور زمین کو فواحش اور فساد سے پاک کرنا تھی۔ واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعداءً فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا

اُن پر اللہ کا یہ انعام تھا کہ وہ پہلے ایک دُوسرے کے دُشمن تھے۔ پھر اُن کے دلوں میں ایسی اُلفت پیدا ہو گئی کہ اللہ کے فضل سے سب بھائی بھائی ہو گئے اور یہ صفت بدوں اتفاق کے نہیں ہو سکتی اور اتفاق خود غرضی اور ذاتی مفاد سے قطع نظر کرنے کے بعد پیدا ہوتا ہے اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ محبت دنیا وعلائق دُنیا سے پاک پاک ہو جائے اس لیے ارشاد ہے لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ۔ کوئی شخص اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بھائی کے واسطے وہی نہ چاہے جو اپنے واسطے چاہتا ہے۔ صحابہ کی یہی شان تھی ویؤثرون علیٰ انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ۔ وہ اپنے اُوپر دُوسروں کو ترجیح دیتے تھے اگرچہ خود ان کو کیسا ہی فاقہ ہو اور یہ سب کچھ اللہ تعالےٰ کے واسطے کرتے تھے۔ وطنیّت یا قومیّت کے جذبہ سے نہ کرتے تھے۔ صوفیہ مسلمانوں کو ایسا مجاہد بنانا چاہتے ہیں جو محض اللہ تعالےٰ کے واسطے کام کرنے والے ہوں۔ مگر لوگ اُن کی تعلیم کا مضحکہ اُڑاتے اور دوسرے طریقوں سے کامیاب ہونا چاہتے ہیں۔ اور برابر ناکامی کا مُنہ دیکھتے ہیں۔ یہ کتنا غلط ہے کہ صوفیہ محققین رہبانیت کی تعلیم دیتے ہیں۔ بتلایا جائے کہ مُسلمانوں کے عروج کا وہ کون سا زمانہ ہے جس میں صوفیہ جہاد سے الگ ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ ہندوستان میں تو صوفیہ نے بڑے بڑے کارنامے کئے ہیں اور تاریخ گواہ ہے کہ اُن ہی کے دم سے ہندوستان میں اسلام کی اشاعت زیادہ ہوئی ہے۔

ف یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ صوفیہ نے جو مجاہدۂ نفس اور ترک لذات وترک علائق کی تعلیم دی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان ساری عمر ترکِ لذات اور ترکِ علائق ہی میں گزار دے۔ بلکہ تھوڑے دنوں کے لیے ایسا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اللہ تعالےٰ کی یاد دل میں اچھی طرح پیوست ہو جائے۔ کسی کام میں اللہ تعالےٰ کی یاد سے غفلت نہ ہو۔ کسی کام میں خواہشِ نفس کا میل نہ ہو جو کام ہو اللہ تعالےٰ کے لیے ہو۔ قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی

للہ رب العالمین اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ کچھ دنوں کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ترک علائق اختیار فرمایا ہے۔ کان یخلوا فی غار حراء یتحنث فیھا۔ آپ نبوت سے پہلے غارِ حراء میں خلوت کے لیے جایا کرتے تھے۔ مسلمانوں کی کل زندگی تمام تر مجاہدات اور ترکِ علائق ہی میں گزری۔ جب یہ حالت پیدا ہو جائے کہ بیع وشراء اور دُنیا کا کاروبار اللہ تعالےٰ کی یاد سے غافل نہ کر سکیں اور دست بکار و دل بہ یار کی شان ہو جائے تو اب ترکِ علائق اور خلوت وغیرہ کی حاجت باقی نہیں رہتی بلکہ اب صوفیہ اس کو خدمتِ خلق کی تعلیم فرماتے ہیں۔ فرمائیے اس میں کونسی بات خلافِ سُنت ہے؟

ف یہ تو نوجوانوں کے شُبہ کا جواب تھا باقی اس میں شک نہیں کہ جن صوفیہ کے طرزِ عمل سے ان نوجوانوں کو تصوف پر اعتراض پیدا ہُوا ہے وہ بھی تصوف کی اصل حقیقت سے دُور جا پڑے ہیں۔ اُنہوں نے محض اذکار واشغال و مراقبات ہی کا نام تصوف رکھ لیا ہے۔ حالانکہ یہ امورِ مستحبہ محض واجبات و فرائض کی تکمیل کے لیے تصوف میں اختیار کئے جاتے ہیں۔

جب واجبات و فرائض میں شانِ احسان پیدا ہو جائے تو اب ایک خاص وقت خلوت کاملہ کا مقرر کر کے بقیہ اوقات میں واجبات و فرائض اور خدمتِ خلق بجا لانا چاہیئے۔

جس کی صُورت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہمارے لیے دو نمونے ہیں۔ ایک مکی زندگی دُوسرے مدنی زندگی، جہاں مسلمان برسرِ حکومت ہوں وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کو مشعلِ راہ بنانا چاہیئے۔ جہاں برسرِ اقتدار نہ ہوں وہاں مکی زندگی کو رہبر بنانا چاہیئے اور ظاہر ہے کہ مکی زندگی میں بھی باوجود حکومت نہ ہونے کے جمود محض نہ تھا، بلکہ تبلیغ احکام و اشاعتِ اسلام میں سعی و سرگرمی برابر جاری تھی۔ یہ جو صوفیہ اور علماء میں اس وقت جمود محض ہے کہ ایک جماعت نے خانقاہوں کو سنبھال

رکھا ہے۔ ایک نے مدارس کو اور تبلیغ و اشاعتِ اسلام سے کسی کو بھی سروکار نہیں۔ یہ جمود بے شک خلافِ سُنت ہے۔ صوفیہ کو لازم ہے کہ اپنی خانقاہوں سے اصحاب نفوس قدسیہ کو مختلف مقامات میں تبلیغ احکام و اشاعتِ اسلام کے لیے تعینات کریں۔

عُلماء پر فرض ہے کہ ایک جماعت مبلغین کی تیار کر کے اطراف وجوانب میں روانہ کرتے رہیں جن کا کام تحصیلِ چندہ نہ ہو، بلکہ خدمت اسلام و تبلیغ احکام ہو۔ اگر اس فریضہ کو اچھی طرح ادا کیا جائے تو اُمید ہے کہ مکی زندگی مدنی زندگی میں تبدیل ہو جائے گی۔



باب شصت و نہم ۶۹

حدیث

الرؤیا فی تعذیب العصاۃ

سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز (صبح) پڑھ کر ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کرتے تھے کہ تم میں سے رات کو کسی نے خواب تو نہیں دیکھا؟ اگر کوئی دیکھتا تھا تو عرض کر دیا کرتا تھا آپ کچھ تعبیر ارشاد فرمادیا کرتے۔ عادت کے موافق ایک بار ہم سے پوچھا کہ رات کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے؟ ہم نے عرض کیا کوئی نہیں۔ فرمایا آج کی رات میں نے دیکھا ہے کہ دو شخص میرے پاس آئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر ارضِ مقدس[ع] کی طرف لے چلے۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک شخص بیٹھا ہوا ہے اور دوسرا کھڑا ہے اس کے ہاتھ میں لوہے کا زنبور ہے۔ اس بیٹھے ہوئے کے کلّے کو اس سے چیر رہا ہے یہاں تک کہ گدی تک جا پہنچتا ہے۔ پھر دوسرے کلّے کے ساتھ بھی یہی معاملہ کر رہا ہے اور وہ کلّہ اُس کا درست ہو جاتا ہے پھر اُس کے ساتھ ایسا ہی کرتا ہے۔ میں نے پوچھا یہ کیا بات ہے؟ وہ دونوں شخص بولے آگے چلو۔ ہم آگے چلے۔ یہاں تک کہ ایک آدمی پر گزر ہوا جو لیٹا ہوا ہے اور اُس کے سر پر ایک شخص بڑا بھاری پتھر لیے کھڑا ہے۔ اس سے اس کا سر زور سے پھوڑتا ہے۔ جب وہ پھر مارتا ہے پتھر لڑھک کر دُور جا گرتا ہے وہ اُس کو اُٹھانے کو جاتا ہے تو لوٹ کر واپس نہیں

[ع] مراد بیت المقدس ہے۔ قالہ الشارح ۱۲ ظ

آنے پاتا کہ اس کا سر اچھا خاصا جیسے پہلے تھا ویسے ہی ہو جاتا ہے اور وہ پھر اس کو اسی طرح پھوڑتا ہے۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ وہ دونوں بولے آگے چلو۔ ہم آگے چلے اور ایک غار پر پہنچے جو تنور کی طرح تھا نیچے سے چوڑا اُوپر سے تنگ اس میں آگ جل رہی ہے اور بہت سے ننگے مرد اور ننگی عورتیں اس کے اندر (بھرے ہوئے) ہیں جس وقت آگ اُوپر کو اُٹھتی ہے وہ سب بھی اُوپر کو اُٹھتے ہیں۔ یہاں تک کہ نکلنے کے قریب ہو جاتے ہیں۔ جب آگ نیچے کو بیٹھ جاتی ہے وہ بھی نیچے چلے جاتے ہیں۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ وہ دونوں بولے آگے چلو۔ ہم آگے چلے یہاں تک کہ ایک نہر پر پہنچے جس میں خون بھرا ہے ایک شخص اس میں کھڑا ہے نہر کے درمیان کنارہ پر دوسرا شخص کھڑا ہے اس کے سامنے پتھر پڑے ہیں۔ جب وہ پہلا شخص کنارہ کی طرف آتا اور نہر سے نکلنا چاہتا ہے دوسرا اس کے منہ پر پتھر مارتا ہے اور جہاں سے آتا ہے اسی جگہ لوٹا دیتا ہے۔ جب وہ نکلنے کا ارادہ کرتا ہے اسی طرح پتھر منہ پر مار کر واپس کر دیتا ہے۔ میں نے کہا یہ کیا ہے؟ بولے آگے چلو۔ ہم آگے چلے۔ یہاں تک کہ ایک سرسبز باغ میں پہنچے جس میں بڑا درخت تھا اُس کی جڑ میں ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے پاس بہت سے بچے تھے اور درخت کے پاس ہی ایک اور شخص تھا جن کے سامنے آگ تھی وہ اس کو بھڑکا رہا ہے۔ یہ دونوں مجھے لے کر درخت پر چڑھے اور ایک گھر میں لے گئے جس سے زیادہ خوبصورت مکان میں نے نہیں دیکھا اور اس میں بوڑھے اور جوان مرد بھی تھے عورتیں بھی تھیں بچے بھی تھے۔ پھر اُس سے نکال کر دُوسرے گھر میں لے گئے، وہ پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت تھا۔ اس میں بھی کچھ بڈھے تھے کچھ جوان تھے۔ میں نے کہا کہ تم دونوں نے مجھے رات بھر گھمایا۔ اب یہ بتلاؤ کہ میں نے جو کچھ دیکھا ہے یہ کیا تھا؟ بولے ہاں اب بتلاتے ہیں۔ وہ شخص جس کا کلّہ چیرا جا رہا ہے وہ جھوٹا آدمی ہے جس کی جھوٹی بات لوگ سن کر تمام جہان میں پھیلاتے ہیں۔ اس سے قیامت تک ..

یہی معاملہ ہوتا رہے گا اور جس کا سر پھوڑا جا رہا ہے یہ وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کا علم عطا فرمایا۔ وہ اس کو چھوڑ کر رات بھر سوتا ہے اور دن میں بھی عمل نہیں کرتا۔ اس سے قیامت تک یہی معاملہ ہوتا رہے گا اور جن لوگوں کو آپ نے تنور میں دیکھا ہے وہ زانی ہیں۔ اور جس کو آپ نے خُون کی نہر میں دیکھا ہے وہ سُود خور ہے اور درخت کی جڑ میں جن بزرگ کو دیکھا ہے وہ ابراہیم علیہ السلام ہیں اور ان کے گرد جو بچے دیکھے یہ لوگوں کی اولاد ہیں (جو بچپن میں انتقال کر گئے ان کی پرورش حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں) اور جو شخص آگ بھڑکا رہا ہے وہ مالک داروغہ جہنم ہے اور جس گھر میں آپ پہلے گئے تھے وہ عام مؤمنین کا مقام ہے اور یہ دُوسرا گھر شہداء کا ہے اور میں جبرائیل ہوں۔ یہ دوسرے میکائیل ہیں۔ اب ذرا اپنے سر کو اُوپر اُٹھائیے۔ مَیں نے سر اُٹھایا تو اپنے اُوپر بادل کی طرح ایک چیز دیکھی۔ کہا یہ آپ کا گھر ہے۔ مَیں نے کہا۔ مجھے اپنے گھر میں جانے دو۔ کہا ابھی آپ کی کچھ عُمر باقی ہے جس کو آپ نے پُورا نہیں کیا۔ اگر آپ کی عُمر پوری ہو جاتی تو اپنے گھر میں پہنچ جاتے۔

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ نماز کے بعد صحابہ سے دریافت فرمایا کرتے تھے کہ کسی نے خواب تو نہیں دیکھا؟ اور آپ اُن کی خوابوں کی تعبیر بھی دیا کرتے تھے اور یہ بھی معلوم ہُوا کہ جس دن حضورؐ نے اپنے اس خواب کو بیان فرمایا اُس دن کسی نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا، اس پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۱۵۹) خواب کا اور اُس کی تعبیر کا اہتمام

یہاں چند سوالات ہیں (۱) نماز سے مراد پانچوں نمازیں ہیں یا کوئی ایک نماز۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ صحابہ کے خواب دریافت فرمایا کرتے تھے اس میں کیا حکمت ہے؟

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنا یہ خواب کس لیے بیان فرمایا؟

جواب یہ ہے کہ بظاہر نماز سے صبح کی نماز مراد ہے۔ کیونکہ حدیث کے یہ الفاظ من رأی منکم اللیلۃ رؤیا۔ آج رات تم میں سے کسی نے خواب دیکھا ہے؟ صبح کی نماز کے بعد ہی بولے جا سکتے ہیں۔ اس سے یہ علمی مسئلہ بھی مستنبط ہُوا کہ امام نمازیوں کی طرف منہ کر کے اپنی جگہ پر بیٹھ سکتا ہے۔ اس میں کچھ حرج نہیں یہ بھی قیام کے قائم مقام ہے بلکہ (جن نمازوں کے بعد سنت موکدہ نہ ہو ان میں امام کا اپنی جگہ پر نمازیوں کی طرف منہ کر کے بیٹھنا) یہی سنت ہے اس سے اُن لوگوں کا رد ہو گیا جو کہتے ہیں کہ امام کو اپنی جگہ سے کھڑا ہو جانا لازم ہے۔ یہاں تک کہ بعضے متقشف امام نماز سے فارغ ہوتے ہی ایسے (گھبرا کر) کھڑے ہوتے ہیں جیسے کوئی چوٹ کی تکلیف سے کھڑا ہوتا ہے اور اس کو وہ دین سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس طرح دو عظیم الشان خیر اُن سے فوت ہو جاتی ہیں۔ ایک تو ملائکہ کا استغفار کرتا رہنا جب تک نماز کی جگہ بیٹھا رہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ملائکہ ہر اس شخص کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں جو اپنی نماز کی جگہ میں بیٹھا رہے جب تک حدث نہ کرے وہ کہتے رہتے ہیں اللّٰھم اغفرلہ اللھم ارحمہ - اے اللہ! اس کی مغفرت فرما۔ اے اللہ! اس پر رحم فرما۔ دُوسرے اس سُنت کی مخالفت ہوتی ہے جو اسی حدیث میں صراحۃً مذکور ہے کہ حضورؐ جب نماز سے فارغ ہوتے ہماری طرف مُنہ کر کے بیٹھتے تھے۔ اس میں یہ نہیں ہے کہ نماز پڑھ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اگر حضورؐ کھڑے ہو کر متوجہ ہُوا کرتے تو حدیث میں اس کا ذکر ضرور ہوتا کیونکہ حضرات صحابہ نے اس سے بھی چھوٹی باتوں کو بیان کیا ہے، تاکہ اُمت آپ کی اقتداء کرے (اگر اس جگہ قیام ثابت ہوتا تو صحابہ ضرور بیان فرماتے) مَیں اُندلس میں جن بڑے مقتدا علماء سے ملا ہوں ان کو نماز کے بعد قیام کرتے ہوئے نہیں دیکھا بلکہ وہ بدون قیام کے ہی لوگوں کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتے تھے (مترجم کہتا ہے کہ ہمارے اکابر علماء کا عمل بھی علماء اندلس کے مطابق ہے ۱۲)

رہا سوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس فعل پر دوام فرمانا (کہ ہمیشہ روزانہ لوگوں سے یہ پُوچھتے تھے کہ آج رات کسی نے خواب دیکھا ہے ؟) اس کی وجہ یہ ہے کہ خواب اجزاء نبوّت سے ہے (مگر ایک جزو کے وجود سے کل کا وجود نہیں ہو جاتا۔ کل کا وجود جملہ اجزاء کے اجتماع سے ہوتا ہے۔ مثلاً کسی شخص کو قرآن کا ایک جزو یاد ہو جائے تو اس کو حافظ قرآن نہ کہا جائے گا۔ جب تک پُورا قرآن حفظ نہ ہو خوب سمجھ لو) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو اس کے اہتمام (اور نگہداشت) کی ترغیب دیتے تھے۔ کیونکہ جب حضورؐ کو اس کا اہتمام تھا تو ہم پر آپ کا اتباع واجب ہے اگرچہ خواب نبوت کے اجزاء میں سے بھی نہ ہوتا چہ جائیکہ وہ نبوت کے اجزاء میں سے ہے (تو اب تو زیادہ اہتمام چاہیئے)۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اور مُسلمانوں کے لیے ابتداء خیر اسی سے ہُوئی ہے۔ کیونکہ نبوت سے (۶ ماہ) پہلے آپؐ سوتے ہوئے سچّے خواب دیکھتے تھے (جو کہ نبوّت کی تمہید تھی) جیسا کتاب کے شروع میں پہلی ہی حدیث سے معلوم ہو چکا ہے وحسن العہد من الایمان اپنے رفیق[1] سے اچھا برتاؤ کرنا بھی ایمان میں داخل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر حسن عہد کی (رعایت) کرنے والا کون ہوگا ؟ آپؐ کا ایمان تو سب سے زیادہ قوی اور کامل ہے۔ رہا آپ کا (خواب سُن کر) تعبیر دینا۔ سو اس میں صحابہ کو تعلیم تھی ان کو تعبیر خواب کا طریقہ بتلانا تھا۔ کیونکہ جس کو یہ علم آجائے وہ بھی اس کے حق میں اللہ تعالےٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ جیسا حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا ہے ذلکما مما علمنی ربی۔ یہ علم (تعبیر) اُن علوم میں سے ہے جن کی میرے رب نے مجھے تعلیم دی ہے اور انسان کو جو بات

[1] یہی وجہ تھی کہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ آخر عمر تک تسبیح ہاتھ میں رکھتے رہے۔ کسی نے پوچھا کہ حضرت اب تو آپ کو تسبیح کی حاجت نہیں رہی تو فرمایا اسی کی برکت سے تو حاجت نہیں رہی تو کیا اب اس رفیق کو چھوڑ دوں ؟ او کما قال ۱۲ ظ

معلوم ہو جائے جس کا پہلے اُسے علم نہ تھا وہ اس کے حق میں ایک نعمت ہے۔

رہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی خواب بیان کرنا تو (اس کی وجہ ظاہر ہے کہ) آپ کا خواب وحی ہے۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا ہر خواب باجماع علماء وحی ہوتا ہے اور وحی کو چھپانا آپ کو جائز نہ تھا۔ کیونکہ وہ تو اللہ تعالےٰ کی طرف سے بندوں کے لیے ایک حکم ہے اور حکم الہٰی کا پہنچانا رسول اللہ پر لازم ہے)۔ دوسرے اس خواب میں جیسا انشاء اللہ ہم بتلائیں گے سمجھ دار کے لیے بہت سے احکام ضروریہ اور فوائد مہمہ ہیں۔ تو حضورؐ نے ان احکام اور فوائد پر (اُمّت کو) مطلع کرنا چاہا۔

قولہ صلاۃ ھل المراد بہا العموم وھی الخمس او واحدۃ منہا الی قولہ فازداد الاخبار بتلک الاحکام والفوائد۔

ف یہاں سے صوفیہ کے اس عمل کی کہ وہ بھی اپنے متعلقین کے خوابوں کو اہتمام سے سُنتے اور ان کی تعبیر دیتے ہیں اصل معلوم ہو گئی۔ کیونکہ جن لوگوں کا سلوک موافق نبویہ طے ہوتا ہے ان کو حصولِ نسبت سے پہلے رؤیائے صالحہ صادقہ بکثرت نظر آتے ہیں۔ بعض دفعہ ان خوابوں میں عجیب عجیب علوم القاء ہوتے ہیں تو مشائخ ان خوابوں سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس سالک کا سلوک سنت نبویہ کے موافق ہے اور عنقریب اس کو نسبت مع اللہ حاصل ہو جائے گی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس زمانۂ فساد میں بعضے ذاکرین جھُوٹ بھی بولتے ہیں اور جھُوٹے خواب گھڑ کر شیخ کے سامنے پیش کرتے ہیں اور بعضے جھوٹ تو نہیں بولتے مگر اُن کے خواب پریشاں خیالات ہوتے ہیں۔ اس لیے مشائخ اہلِ تحقیق آج کل کے خوابوں پر زیادہ توجہ نہیں فرماتے۔ خصوصاً جب کہ یہ دیکھا جائے کہ لوگ اچھا خواب دیکھ کر ہی اپنے حُسنِ حال پر قانع ہو رہے ہیں تو سختی کے ساتھ خواب پر توجہ کرنے سے منع فرماتے ہیں۔

حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہٗ فرماتے تھے کہ میں نے لوگوں کے ہزارہا خوابوں میں سے ایک دو کو اس قابل پایا کہ اس کو خواب کہا جا سکے ورنہ سب

اضغاث احلام پریشان خیالات ہی پائے۔ اھ

بعض بھولے بھالے مشائخ جو اپنے زمانہ کی حالت سے واقف نہ تھے محض سنت صوفیہ سمجھ کر اپنے متعلقین کے خواب روزانہ اہتمام سے سُنا کرتے تھے اور اُن کے متعلقین ایسے جھوٹے جھوٹے خواب روزانہ تصنیف کیا کرتے تھے کہ جن کے نہ سر نہ پاؤں۔ مگر وہ سب کی تصدیق کرتے تھے اور اگر کوئی مرید یہ کہتا کہ میں نے خواب میں فلاں بزرگ کو دیکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اپنے پیر سے اتنی رقم لے کر ہمارے مزار پر آؤ تو یہ حضرت فوراً وہ رقم اس کے حوالہ کر دیتے تھے۔ پس خواب کے معاملہ میں شیخ کو اس قدر بھولا نہ بننا چاہیئے۔ اگر حکیم الامتؒ کے سامنے کوئی ایسا خواب بیان کرتا۔ اول تو کسی کو اس قسم کی جرأت ہی نہ تھی تو وہ یقیناً یہ جواب دیتے کہ وہ بزرگ جب خود مجھے حکم دیں گے اُس وقت رقم دوں گا۔ اس کی کیا وجہ ہے خواب میں تم سے تو کہہ گئے اور مجھ سے کچھ بھی نہ کہا۔

ف اللہ کی نعمتوں کو چھپایا نہیں جا سکتا بطور شکر کے ان کا اظہار لازم ہے واما بنعمۃ ربک فحدث۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا اظہار کرتا ہوں کہ اس ناچیز کے خوابوں کی بابت حضرت اقدس سیدی مُرشدی مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ ماشاء اللہ مولوی ظفر احمد کے خواب تو واقعات ہوتے ہیں اور حضرت سیدی حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ نے بندہ کے بعض خواب اپنی مجلس میں بطور استدلال کے بیان فرمائے اور متعدد خواب تربیت السالک میں نقل کرائے ہیں اور الحمد للہ کہ بندہ کو حق تعالیٰ نے علم تعبیر سے بھی مناسبت عطا فرمائی ہے۔ اللھم فلک الحمد ولک الشکر حمداً کثیراً کما تحب وترضیٰ۔

ف مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مرضِ وفات میں مجھ سے فرمایا کہ مولانا ایسی تدبیر کرو کہ مجھے نیند آئے کیونکہ آج کل مجھے جب نیند آتی ہے اچھا خواب آتا ہے اور اچھا خواب نبوت کا چالیسواں حصہ ہے۔ بعض لوگوں کو خواب میں ایسی ترقی ہوتی ہے جو ریاضت و مجاہدہ سے بھی نہیں ہوتی۔ ان پر خواب میں علوم صحیحہ کا القا ہوتا ہے۔ چنانچہ آج کل میرے اُوپر خواب میں علوم کا القا ہوتا ہے۔ پھر فرمایا کہ یہ تحریک تبلیغ (ابطرز خاص) بھی خواب میں مجھ پر منکشف ہوئی تھی۔

(۱۶۰) گُناہ کا خیال آنے پر اُن وعیدوں کو یاد کرنا چاہیئے

اس حدیث میں ان لوگوں کے لیے جن کو اس پر ایمان اور تصدیق حاصل ہے ایک بڑا فائدہ ہے بشرطیکہ تصدیق حقیقی ہو (کہ سچے دل سے وہ حضورؐ کے اس خواب کو وحی الٰہی سمجھتے ہوں) وہ فائدہ یہ ہے کہ اگر کسی وقت نفس یا شیطان کی طرف سے (اُن گناہوں میں سے جن کا عذاب یہاں مذکور ہے) کسی گُناہ کا ارادہ دل میں آئے اس وقت اس ہلاکت خیز منظر کو یاد کرے تو نفس سرکشی سے رُک جائے گا اور ایسے ہی فوائد کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اس تفصیل سے مطلع فرمایا ہے۔ کیونکہ جس شخص کو عذاب کا محض اجمالی علم ہو مقدار و کیفیت کی خبر نہ ہو وہ اُس کے برابر نہیں جو تفصیل سے باخبر ہے اس کو پہلے سے زیادہ خوف ہوگا۔

چنانچہ ایک عابد زاہد کا قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان سے بعضے شیطان آدمیوں کو حسد تھا وہ ان کی بابرکت حالت سے (دل ہی دل میں) جلتے تھے تو چاہا کہ (کسی ترکیب سے) ان کو لوگوں کی نظروں سے گرا دیں تو اُنہوں نے ایک بہت ہی حسین جمیل عورت کو (اس کام کے لیے) تیار کیا۔ اُس کو خُوب پٹی پڑھا دی کہ تو پہلے اس سے یہ کہنا پھر آہستہ آہستہ اپنی طرف مائل کرنا اس کے بعد اُس کو بنا سنوار کر عابد کے پاس لے گئے (اور وہاں جا کر) آپس میں جھگڑنے اور لڑنے لگے جیسے یہ عورت اُن میں سے ایک کی بیٹی ہے اور اُس کے بارے میں جھگڑا ہے (شوہر کہتا ہے کہ اس کو میرے گھر کیوں نہیں بھیجتے؟ باپ کہتا ہے کہ ابھی یہ رُخصت کے قابل نہیں اور تُو نے بھی تو میری شرطیں پوری نہیں کیں وغیرہ وغیرہ)

پھر لڑائی جھگڑے کے بعد) عابد کے پاس آئے (اور کہنے لگے) کہ حضرت آج ایک رات کے لیے آپ اس لڑکی کو اپنے گھر کے ایک کونہ میں جگہ دے دیں کل کو (جب ہمارا فیصلہ ہو جائے گا) ہم اُسے لے جائیں گے اور اسی قسم کی دُوسری باتیں بنائیں۔ عابد نے انکار کیا تو یہ لوگ اصرار پر اصرار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ (مجبور ہو کر) عابد نے اُن کی بات مان لی اور عورت کی صُورت تک نہ دیکھی (ویسے ہی بدون دیکھے اُس سے کہہ دیا کہ جا گھر میں کسی جگہ آرام کر۔

جب رات زیادہ گزر گئی اور یہ عابد برابر اپنی عبادت میں مشغول رہا (عورت کی طرف ذرا بھی التفات نہ کیا) تو وہ بناؤ سنگار کے ساتھ دفعۃً اس کے پاس پہنچی اور یہ ظاہر کیا کہ مجھے تو گھر میں تنہا ڈر لگتا ہے۔ آپ کے پاس تنہا رہنا چاہتی ہوں۔ مقصود یہ تھا کہ اپنا چہرہ عابد کو دکھلائے اور مُنہ کھول کے اُسی کے پاس بیٹھے (تاکہ صُورت دیکھ کر اس کی شہوت کو ہیجان ہو) چنانچہ پاس بیٹھ کر اس نے (اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے) عابد کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا۔ پھر کُھلے لفظوں میں مقصود ظاہر کر دیا (کہ میں تو آپ پر عاشق ہوں تمنائے وصال مجھے یہاں کھینچ کر لائی ہے۔ یہ لڑنے جھگڑنے والے میرے باپ یا شوہر کچھ نہیں ہیں بلکہ سب میرے دوست آشنا ہیں۔ میں نے ہی اُن سے درخواست کی تھی کہ اس بہانے سے مجھے آپ تک پہنچا دیں) اور بے حیائی کے کام پر اُس کو اُبھارنے لگی۔

جب عابد نے اُس کی طرف سے اس قسم کی کوشش (اور کشش) دیکھی تو کہا اچھا تھوڑی دیر کی مجھے مُہلت دے۔ پھر چراغ میں تیل ڈالا اور اس میں موٹی سی بتی ڈالی۔ جب اس کی لو تیز ہو گئی تو اُس میں اپنی اُنگلی دے دی اور کچھ دیر تک برابر اُسے آگ میں رہنے دیا۔ جب اُنگلی خوب جلنے لگی اور آگ کی تکلیف، ناقابلِ برداشت ہو گئی تو عابد چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا

عورت پر اُس کی اِس حالت سے اور اللہ تعالےٰ کے ساتھ اُس کے سچے معاملے سے رُعب طاری ہو گیا اور وہ بھی گُناہ کے ارادے سے رُک گئی۔

جب صُبح ہوئی اور وہ شیطان آدمی اُسے اپنی ساتھ لے گئے تو رات کی کیفیت دریافت کی۔ عورت نے سارا ماجرا سُنا دیا (اور بتلا دیا کہ واقعی اس شخص کا معاملہ خُدا کے ساتھ سچا ہے اس کو پریشان کرنا اچھا نہیں) تو وہ شیطان بھی اپنے ارادہ سے باز آ گئے۔ کسی نے (اسی مضمون کو) شعر میں اس طرح ادا کیا ہے ؎

نفسی علی البرد لیس تقویٰ ولا علی ایسر الحرارۃ

فکیف تقویٰ لحر نار وقودها الناس والحجارۃ[ع]

میرے نفس کو نہ سردی کی سہار ہے نہ تھوڑی سی گرمی کی۔ تو اس کو اُس آگ کی کیونکر سہار ہو گی جس کا ایندھن[ع] آدمی ہیں اور پتھر۔

قولہ وفیہ فائدۃ کبریٰ الی قولہ الناس والحجارۃ۔

ف حضراتِ صُوفیہ کرام کی یہی تعلیم ہے کہ جب گناہوں کی طرف نفس کا میلان ہو تو ان آیات واحادیث کا مطالعہ کیا جائے جن میں گناہوں پر وعید اور عذاب شدید مذکور ہے اور نفس پر یاس وقنوط کا غلبہ ہونے لگے تو آیاتِ رحمت اور ثوابِ جنت کو یاد کر کے خوف کو معتدل کرنا چاہیئے۔ یہ حدیث ان کی مؤید ہے۔

(١٦١) قیام لیل واجب ہے یا مستحب

حدیث کا یہ جملہ کہ "جس کا سر پھوڑا جا رہا ہے یہ وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالےٰ نے قرآن کا علم عطا فرمایا ہے تو وہ رات کو اس سے اعراض کر کے سوتا ہے اور دن میں بھی اُس پر عمل نہیں کرتا قیامت تک اُس سے یہی معاملہ ہوتا رہے گا" محل اشکال ہے۔ سوال یہ ہے کہ قیام لیل

ع وقود کا ترجمہ عام طور سے ایندھن کیا جاتا ہے اسکا صحیح ترجمہ سلگاؤ ہے یعنی جس سے آگ سُلگائی جاتی ہے جیسے سُتلی اور باریک چپٹی وغیرہ کہ جس طرح دُنیا کی آگ ان چیزوں سے سُلگتی ہے دوزخ کی آگ آدمیوں اور پتھروں سے سُلگتی ہے، نعوذ باللہ من حرالنار ومن غضب الجبار ونسئل العفو والعافیۃ من العزیز الغفار فی الدنیا وفی دار القرار آمین ١٢ ظ۔

(رات کو بعد عشاء کے نماز میں قرآن پڑھنا) مستحب ہے اور ترک مستحب پر عذاب نہیں ہوتا تو ترک قیام لیل پر عذاب کیسے ہوگا ؟

جواب یہ ہے کہ قیام لیل کے واجب ہونے (نہ ہونے) میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض اُس کے وجوب کے قائل ہیں مگر وہ بقدر فواق ناقہ کو واجب کہتے ہیں (زیادہ نہیں قدر فواق ناقہ اتنی مُدت کو کہتے ہیں جس میں دُودھ نکالنے سے پہلے اُونٹنی کے بچہ کو تھن سے لگایا جاتا ہے تاکہ وہ دُودھ اُتار دے۔ پھر جلدی سے اُس کو الگ کر دیتے ہیں اور یہ مدت عادۃً دو تین منٹ سے زیادہ نہیں ہوتی جس میں کم از کم دو تین رکعت ادا ہو سکتی ہیں۔ ان کی دلیل یہ حدیث ہے لابد من قیام باللیل ولوقدر فواق ناقۃٍ قیام لیل ضروری ہے اگرچہ فواق ناقہ کے برابر ہو) اس قول پر تو کسی سوال اور بحث کی ضرورت ہی نہیں بلکہ یہ حدیث بھی اُن علماء کی ایک دلیل ہے (جو قیام لیل کو واجب کہتے ہیں)

ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ قیام لیل مستحب ہے۔ جمہور (فقہاء و علماء) اسی طرف ہیں۔ اس قول پر بے شک وہ سوال وارد ہوگا (کہ ترک مستحب پر عذاب کیوں ہُوا ؟) سو اس کے دو جواب ہیں۔

ایک یہ کہ جب کسی کو کبائر پر عذاب ہوگا تو اُن کے ساتھ صغائر پر بھی عذاب ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتے ہیں :-

ان تجتنبوا کبائر ما تنھون عنہ نکفر عنکم سیاٰتکم۔

"اگر تم اُن بڑے گناہوں سے بچتے رہو جن سے تم کو منع کیا جا رہا ہے تو ہم تمہاری سئیات (صغائر) کو معاف کر دیں گے"

جس سے (بطور مفہوم مخالف کے) معلوم ہُوا کہ اگر کبائر سے نہ بچا گیا تو (صغائر معاف نہ ہوں گے۔ کیوں کہ اُن کے معاف ہونے کی شرط کبائر سے بچنا ہے بلکہ اس صُورت میں) سب پر عذاب ہوگا اور متفق علیہ مستحب کو چھوڑنا مختلف فیہ مستحب کے چھوڑنے کے برابر نہیں (بلکہ دونوں میں فرق ہے متفق علیہ

مستحب کا چھوڑنا تو گناہ کی کسی قسم میں داخل نہیں اور مختلف فیہ مستحب کا چھوڑنا ایک قول پر تو کچھ نہیں مگر دُوسرے قول پر گناہِ کبیرہ ہے) اس لیے ہم نے ترک قیام لیل کو صغائر میں شمار کر لیا ہے۔ اگرچہ اکثر علماء کے نزدیک وہ مستحب ہے۔ مگر بعض علماء اُس کو واجب بھی کہتے ہیں۔

دُوسرا جواب یہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن (سب سے پہلے) بندہ کی نماز کو دیکھا جائے گا۔ اگر اُس کو (اچھی طرح) بجا لایا ہو فبہا اور اگر نماز میں نقص ہُوا تو اللہ تعالےٰ (فرشتوں سے) فرمائیں گے۔ میرے بندہ کے اس عمل کو (اچھی طرح) دیکھو۔ اگر اُس نے کچھ نوافل بھی ادا کئے ہوں تو اُن سے اُس کی نماز (کی کمی) کو پُورا کر دو۔ اسی طرح تمام اعمال کے ساتھ معاملہ ہوگا کہ اگر فرائض کو کامل طور سے نہ ادا کیا گیا ہو اور اُس جنس کی نوافل موجود ہوں اُن سے فرض کی تکمیل کر دی جائے گی اور یہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے (محض) فضل و رحمت (کا معاملہ) ہے۔

تو جب اس شخص نے قیام لیل کو ترک کر دیا جس سے اُن نمازوں کی تلافی ہو سکتی تھی جو اُس نے دن میں ضائع کی تھیں تو ترک قیام لیل پر عذاب دیا گیا۔ کیونکہ اُس نے وہ کام نہیں کیا جس سے فرض کی تلافی ہو جاتی تو اس پر عذاب ہونا دراصل اُس کی ذات کی وجہ سے نہیں بلکہ عذاب تو درحقیقت فرض کے نقصان پر ہوگا مگر قیام لیل سے اُس نقصان کی تلافی ہو کر عذاب ٹل جاتا ہے۔ جب عذاب کو ٹلانے والا کام بھی نہ ہُوا تو اُسی کی طرف عذاب کو منسوب کر دیا گیا اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں :-

ان ناشئۃ اللیل ھی اشد وطاٗ و اقوم قیلا۔

"رات کا اُٹھنا (نفس کو) بہت پامال کرتا ہے اور بات کو بہت صاف (اور سیدھا) کرتا ہے"

(تجربہ ہے کہ رات کو اُٹھنے میں بڑا مجاہدہ نفس پر ہے اور اُس وقت جو

کچھ پڑھا جاتا یا دُعا کی جاتی ہے یا ذکر کیا جاتا ہے سب دل سے نکلتا ہے اس لیے قیام لیل کی بڑی فضیلت ہے اور یہ عمل ایسا ہے جس سے فرض نمازوں کی کوتاہی کی تلافی ہو جاتی اور عذاب ٹل جاتا ہے تو جس نے فرائض میں کوتاہی کر کے اس افضل ترین مستحب کو بھی ترک کر دیا ہو اُس کے عذاب کو ترک فرض کے ساتھ اس مستحب کے ترک پر بھی حوالہ کیا جائے گا) اور یہ جواب زیادہ ظاہر ہے۔ واللہ اعلم ؛ اسی لیے علماء نے ہر فرض کے ساتھ اسی نوع کے نوافل کی تکثیر کو مستحب فرمایا ہے۔ کیونکہ ممکن ہے فرض میں کچھ کمی رہ جائے (تو نوافل سے پُوری ہو جائے گی)۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ نام عنہ باللیل (وہ رات کو قرآن سے اعراض کر کے سوتا ہے) کا مطلب یہ ہے کہ وہ سو کر رات کی نمازیں فوت کرتا ہے تو گو لفظ عام ہے مگر مراد خاص ہے (یعنی قیام لیل مستحب کا ترک مراد نہیں بلکہ نماز فرض کا ترک مراد ہے کہ رات کو قرآن کے احکام سے اعراض کر کے عشاء سے پہلے سو رہتا ہے اور صُبح کے بعد تک سوتا رہتا ہے۔ نہ عشاء کی نماز پڑھتا ہے نہ صبح کی۔ اس صُورت میں عذاب ترک فرض پر ہُوا نہ ترک مستحب پر)۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ مقصود بطور کنایہ کے یہ ہے کہ اس شخص کو خدا نے قرآن کا علم دیا تھا پھر وہ نہ دن میں اُس پر عمل کرتا تھا نہ رات میں لم یعمل فیه بالنهار سے دن میں عمل نہ کرنے کو بتلایا گیا اور نام عنه بالليل سے رات میں عمل نہ کرنا مُراد ہے ، کیونکہ کسی چیز سے اعراض کر کے سو رہنا کمال ترک پر دلالت کرتا ہے۔

قوله وهنا بحث وهو كيف يقع العذاب على ترك القيام بالليل الى قوله لانه ابلغ فى الترك ۔

ف اور پانچواں جواب یہ ہے کہ یہ حدیث معراجِ جسمانی سے مقدم ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح نبوت سے پہلے سچے خواب بطور

تمہیدِ نبوت کے نظر آتے تھے اسی طرح معراجِ جسمانی سے پہلے خواب میں چند بار معراج روحانی ہوتی ہے تاکہ طبیعت معراج جسمانی کی متحمل ہو جائے۔ یہ حدیث بھی غالباً معراج روحانی سے متعلق ہے اور معراج جسمانی سے پہلے قیام لیل ہی فرض تھا۔ جیسا سورۃ المزمل کی تفسیر سے واضح ہے۔ معراج جسمانی کے بعد جب پانچ وقت کی نمازیں فرض ہوگئیں قیام لیل کی فرضیت منسوخ ہوگئی۔ پس اگر مان لیا جائے کہ یہ عذاب ترک قیام لیل ہی کی وجہ سے ہُوا تو یہ حکم اُس وقت ہے جبکہ قیام لیل فرض تھا۔

اور چھٹا جواب یہ ہے کہ قیام لیل جمہور کے نزدیک بھی واجب ہے مگر قیام لیل سے مُراد تہجد نہیں جو عشاء کے بعد کچھ دیر سو کر جاگنے کے بعد ادا کی جاتی ہے۔ کیونکہ حدیث شریف میں وارد ہے ما كان بعد العشاء فهو من قيام الليل۔ نماز عشاء کے بعد جو نماز بھی ہو وہ قیام لیل میں شامل ہے اور نماز عشاء کے بعد نماز وتر حنفیہ کے نزدیک واجب ہے ، تو جو شخص عشاء کے بعد نماز وتر ادا کرے گا اُس کو تارک قیام لیل نہیں کہا جائے گا۔ تارک قیام لیل وہ ہے جو عشاء پڑھ کر سو جائے اور وتر نہ پڑھے ۔ حنفیہ کے علاوہ دُوسرے ائمہ نے اگرچہ وتر کو واجب نہیں کیا مگر فرائض کے بعد آکد السنن (تمام سُنتوں سے زیادہ موکد) فرمایا ہے جس کے ترک کی وہ بھی اجازت نہیں دیتے تو اختلاف محض لفظی ہے۔ تمام سُنن مؤکدہ سے زیادہ مؤکد جو شے ہوگی وہ واجب ہی ہوگی۔ پس وعید ترک مستحب پر نہیں بلکہ ترک واجب پر ہے ۔

ہمارے اکابر حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے رسالہ مالا بدّ منہ میں نماز تہجد کو سنن مؤکدہ میں شمار کیا ہے اور مواظبت نبویہ سے اس پر استدلال کیا ہے اور غالباً اُن سے پہلے ابن ہمامؒ نے بھی یہی کہا ہے ۔ حضرت حکیم الاُمّت قدس سرہٗ کا بھی کچھ مدت تک یہی قول تھا۔ لیکن جب احقر نے اعلاء السنن میں دلائل سے ثابت کیا کہ یہ قول خلاف اجماع ہے۔ فقہاء

اربعہ میں سے کوئی بھی اس طرف نہیں گیا جملہ فقہاء نے تہجد کو نوافل میں ہی شمار کیا ہے اس لیے یوں کہنا چاہیئے کہ تہجد تو سُنت غیر مؤکدہ ہے مگر قیام لیل بقدر وتر واجب ہے تو حضرت نے اس تحقیق کو پسند فرمایا۔ اہلِ علم اس بحث کو تفصیلاً اعلاء السنن میں ملاحظہ فرمائیں گے تو زیادہ لُطف آئے گا۔

ف اس میں شک نہیں کہ صوفیہ کو تہجد کا بہت زیادہ اہتمام ہے اور اسی لیے حدیث کے اس فائدہ پر تنبیہ کردی گئی کہ اسی سے صوفیہ کے اس اہتمام کی دلیل نکلتی ہے۔ اُن کا قول ہے کہ جس کو جو نعمت ملی ہے وقت تہجد ہی میں ملی ہے۔ عارف فرماتے ہیں ؎

ودش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند
وندران ظلمت شب آبِ حیاتم دادند

اس لیے تہجد کا اہتمام ضرور کرنا چاہیئے۔ اگر پچھلی رات کو اُٹھنے کی ہمت نہ ہو تو عشاء کے بعد ہی کچھ نفلیں زیادہ پڑھ لی جائیں کہ اگر تہجد حاصل نہ ہو تو قیام لیل ہی حاصل ہو جائے۔ قیامِ لیل اور تہجد کا ثواب قریب ہی قریب ہے۔ قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیام لیل کا بھی امر ہے۔ یاایھا المزمل قم الیل الا قلیلا۔ اور تہجد کا بھی امر ہے۔ ومن اللیل فتھجد بہ نافلۃ لک۔ تہجد یہ ہے کہ عشاء کے بعد کچھ دیر سو کر بیدار ہو جائے اور وضو وغیرہ کر کے نماز میں مشغول ہو جائے۔

قیامِ لیل کے لیے عشاء کے بعد سونا ضروری نہیں۔ فرضِ عشاء کے بعد جو نماز بھی پڑھی جائے گی قیام لیل میں داخل ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ قیام لیل کی افضل صورت تہجد ہے۔ مگر جس کو سونے کے بعد بیدار ہونے کی ہمت نہ ہو اُس کے لیے عشاء کے بعد ہی کچھ نفلیں پڑھ لینا مناسب ہے کہ یہ بھی قائم مقام تہجد کے ہے۔ چنانچہ حضرات صحابہ نے قیام لیالی رمضان (تراویح) کے لیے عشاء کے بعد ہی کا وقت رکھا۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامِ رمضان آخر شب میں کیا تھا مگر چونکہ سب لوگوں کا آخر شب میں جمع ہونا دشوار تھا اس لیے تراویح کا وقت بعد عشاء کے رکھا گیا۔ اس سے معلوم ہُوا کہ عشاء کے بعد نفلیں پڑھ لینا بھی تہجد کے قائم مقام ہے اگرچہ اُس کے برابر نہ ہو۔ تو جسے افضل صُورت کی ہمت نہ ہو اُسے بالکل بھی تو تہجد سے محروم نہ ہونا چاہیئے۔ اور پہلے ایک حدیث گزر چکی ہے کہ جو شخص رات کو سُورۂ بقر کی دو آیتوں کے ساتھ قیام کرے تو یہ دو آیتیں اُس کے لیے تمام رات کے قیام سے کفایت کریں گی "

تو جو لوگ عشاء کے بعد تہجد پڑھنا چاہیں اُن کو دو رکعتوں میں سورۂ بقرہ کی یہ دو آیتیں بھی ضرور پڑھ لینا چاہئیں (آمن الرسول سے آخر سورۃ تک) انشاءاللہ وہ تمام رات کی شب بیداری کرنے والوں میں داخل ہوں گے۔ بشرطیکہ حدیث پر سچے دل سے یقین واعتماد ہو۔ اسی واسطے میں نے لفظ انشاءاللہ استعمال کیا ہے ورنہ مجھے بحمداللہ اس میں ذرا بھی شبہ اور شک نہیں۔

(۶۲) علم کو حال بنانا چاہیئے جس کا طریقہ یہ ہے کہ اُس کو ہر دم مستحضر رکھے

اس حدیث کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں جو کچھ وعدہ اور وعید مذکور ہے اُس پر ایمان (اور یقین) کیا جائے اور نجات کا سامان کرنے کے لیے کام کیا جائے۔ اسی فائدہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اس کے مضامین پر مطلع فرمایا۔ اسی وجہ سے اہل طریق (صوفیہ کرام) کو دُوسروں پر فضیلت حاصل ہے۔ کیونکہ وہ علم کو حال بنا لیتے ہیں (کسی حدیث یا آیت کو پڑھ کر سرسری طور سے نہیں گزر جاتے بلکہ اُس میں اس قدر تامل اور فکر کرتے ہیں کہ وہ دل پر جم جاتی اور ہر دم اُس کا مضمون مستحضر اور پیشِ نظر رہتا ہے۔ علم کو حال بنانے کا یہی مطلب ہے اس کا ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ قلب اُس حدیث یا آیت کے اثر سے رنگین ہو جاتا ہے

اور یہی علم سے مقصود ہے ورنہ محض لفظی علم ہوگا)۔

چنانچہ ایک طالب علم کا واقعہ ہے کہ وہ بہت دنوں تک اپنے شیخ (کی مجلس سے غائب رہا پھر (ایک مدت کے بعد) آیا تو شیخ نے فرمایا برخوردار! اتنی مدت تک ہم سے دُور دُور کیوں رہے؟ کہا حضرت میں نے آپ سے دو آیتیں سُنی تھیں اُن پر عمل کر رہا تھا تاکہ اُن کو اپنا حال بنالوں۔ چنانچہ میں نے اس غرض کے لیے نفس کے ساتھ مجاہدہ کیا۔ یہاں تک کہ خدائے تعالیٰ نے مجھ پر فضل فرمایا اور ان دو آیتوں کو میرا حال بنادیا یا اسی کے قریب کچھ اور الفاظ تھے۔

شیخ نے فرمایا برخوردار وہ دو آیتیں کون سی ہیں؟ کہا۔ ایک تو یہ آیت ہے:
فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ۔ جو ذرہ برابر نیکی کرے گا اُس کو دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر بدی کرے گا اُس کو بھی دیکھ لے گا۔

دوسری یہ آیت ہے وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا ویعلم مستقرھا ومستودعھا۔ زمین میں چلنے والا کوئی جاندار نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کے ذمے اُس کا رزق ہے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اُس کے قرار کی جگہ کو بھی اور اُس کی ودیعت گاہ کو بھی (جہاں وہ بطور امانت رہتا ہے)۔

بعض نے مستقر کی تفسیر ماں کے رحم سے اور مستودع کی تفسیر باپ کی پُشت سے کی ہے اور ہو سکتا ہے کہ مستقر سے مراد وہ گھر ہو جہاں انسان رات کو قرار پکڑتا ہے اور مستودع سے مُراد جائے دفن ہو جہاں مرنے کے بعد رکھا جائے گا۔ واللہ اعلم۔ تو میں نے نفس کے ساتھ اس بات کے لیے مجاہدہ کیا کہ نیک کاموں کا التزام کرے اُن میں سے ذرہ برابر بھی نہ چھوٹنے پائے اور بُرے کاموں کو چھوڑ دے۔ اُن میں سے ذرہ برابر کا بھی ارتکاب نہ کرے اور میں نے یقین کے ساتھ جان لیا کہ زمین پر چلنے والوں میں سے ایک جاندار میں بھی ہوں تو میرا رزق اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔ وہ مجھے بھی جانتے ہیں اور میرے

ٹھکانے کو بھی تو اب میں نے رزق کے ساتھ نفس کے تعلق اور لگاؤ کو قطع کر دیا اللہ تعالیٰ کے وعدۂ جمیلہ پر بھروسہ کرکے۔ کیونکہ وہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتے چنانچہ حق تعالیٰ عزّوجل نے اب میرے لیے رزق کو آسان کر دیا ہے۔ وہ اپنے حسن لطف اور وعدہ کے موافق مجھے روزانہ رزق پہنچاتے ہیں۔

شیخ نے کہا برخوردار من! مبارک ہو تم تو عابدین سے فوقیت لے گئے۔ آقاؤں کا غلاموں سے یہی تو مقصود ہے کہ غلام اپنے آقا ہی کے ہوکر رہیں اِدھر اُدھر نظر نہ کریں، اسی لیے کسی کہنے والے نے کہا ہے:

اذا کان وعدک بالرزق لا یخلف وطلبک الامر من غیرہ لا یعرف
وحسبی تصدیق وعدک لا یخلف واشتغالی بامر غیرہ منی لا یعرف۔

جب رزق کے متعلق اللہ تعالیٰ نے تجھ سے وعدہ خلافی نہیں کرسکتے اور کسی دُوسرے سے بھی کوئی چیز طلب نہیں کی جا سکتی تو مجھے اُس وعدے کی تصدیق کافی ہے جو خلاف نہیں ہو سکتا اور آئندہ ما سوا اللہ تعالیٰ کے کام میں مشغولی میری طرف سے نہیں ہو گی۔

ف۔ صاحبِ حال کے لیے تارکِ اسباب ہونا ضروری نہیں

علم کو حال بنانا تو سب کے نزدیک ضروری ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث و قرآن کے وعدے اور وعید میں دل پر جم جائیں کہ ہر دم مستحضر اور پیش نظر رہیں، مگر حال کا یہ اثر کہ ہر صاحب حال تارک اسباب بھی ہو جائے ضروری اور لازم نہیں۔ حضرات صحابہؓ سے زیادہ کامل الیقین کون ہو سکتا ہے؟ مگر تم دیکھو گے کہ اجلۂ صحابہ بلکہ قریب قریب تمام تر صحابہ اسباب معاش میں مشغول تھے۔ کوئی تاجر تھا کوئی کاشت کار، کوئی صنعت و حرفت سے روزی کماتا تھا۔ کوئی بیت المال سے وظیفہ لیتا تھا۔

بہرحال شریعت کا یہ مقصود نہیں کہ مسلمان اُن اسبابِ معاش کو ترک کردیں

جو قدرت نے کسی حکمت سے اس عالم اسباب میں حصول رزق کے لیے مقرر فرمائے ہیں۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ اسباب کو مؤثر نہ سمجھیں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے قبضہ میں نفع و ضرر کی طاقت نہیں ہے اور جن اہلِ حال پر ترک اسباب کا داعیہ غالب ہوتا ہے اُن کو بھی اسباب یقینیہ کے ترک جائز نہیں۔ صرف اسباب ظنیہ کا ترک جائز ہے۔ تفصیل کے لیے تربیت السالک حکیم الامتؒ ملاحظہ ہو۔

ف۔ ترکِ اسباب کے شرائط

ترک اسباب ظنیہ کے جواز کی چند شرطیں ہیں :-

(۱) قلب پر ترک اسباب کا شدید تقاضا ہو جس کی مخالفت دشوار ہو جائے یا شیخ کا حکم ہو۔

(۲) مخلوق سے نظر بالکل اُٹھ جائے۔ کسی شخص کے بغرض ملاقات آنے پر یہ خیال دل میں نہ آنے پائے کہ یہ مجھے کچھ ہدیہ دے تو اچھا ہے۔

(۳) ایسا نہ ہو کہ ترکِ اسباب کے بعد ہر ہدیہ قبول کرنے لگے بلکہ قواعد شرعیہ سے جو ہدیہ واقعی ہدیہ ہو قبول کیا جائے ورنہ رد کر دیا جائے۔

(۴) تارک اسباب کا عزم اور حوصلہ اس قدر بلند ہونا چاہیئے کہ سلاطین و اغنیاء سے زیادہ اپنے کو غنی سمجھے۔ کیونکہ اُن کی حاجتیں تو دُوسروں کے ہاتھ میں ہیں اور متوکل کی ہر حاجت خود اسی کے ہاتھ میں ہے کہ جہاں کوئی ضرورت پیش آئی ہاتھ اُٹھا کر اللہ تعالیٰ سے دُعا کی اور حاجت پُوری ہو گئی۔

(۵) صاحبِ اہل و عیال کو ترک اسباب جائز نہیں مگر یہ کہ اُس کے اہل و عیال بھی اسی کی طرح صاحبِ حال ہوں اور اگر ترکِ اسباب کے وقت صاحب عیال نہ تھا۔ پھر حق تعالیٰ کی طرف سے بابِ فتوحات مفتوح ہو جانے کے بعد صاحب اہل و عیال بن گیا تو اس میں کچھ کراہت نہیں۔ گو اُس کے اہل و عیال صاحبِ حال نہ بھی ہوں۔ کیونکہ باب فتوحات مفتوح ہو جانے کے بعد

ظن غالب یہ ہے کہ اُس کے اہل و عیال کو ترک اسباب سے پریشانی کا سامنا نہ ہوگا اور ان احکام کا مدار ظن غالب ہی پر ہے۔

(۶) اگر کسی کے ترک اسباب سے اُس کے اہل و عیال کو تنگی اور پریشانی فاقہ وغیرہ کی پیش آنے لگے تو اُس پر اسباب میں مشغول ہونا واجب ہے۔ مگر یہ کہ اہل و عیال سب بالغ ہوں اور وہ بھی اس کی طرح صاحبِ حال ہوں تنگی اور فاقہ پر راضی ہوں تو اور بات ہے۔ اگر وہ اس پر راضی نہ ہوں تو ان کو اپنی موافقت پر مجبور کر کے پریشان کرنا جائز نہیں بلکہ اسباب کا اختیار کرنا واجب ہے۔ اگر ایسا نہ کرے گا گناہ گار ہوگا اور اہل و عیال کو اپنے نفقہ کے لیے قاضی کی عدالت میں اس پر دعوے کرنے کا حق ہے۔ تفصیل کے لیے احیاء العلوم باب التوکل ملاحظہ ہو۔"

ف ۔ شرائط توکل و ترک اسباب پر نظر کرنے کے بعد نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کا یہ کہنا کہ صوفیہ توکل کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ تعطل کی تعلیم دیتے ہیں بالکل غلط ہے جس حالت میں صوفیہ محققین توکل بصورت ترک اسباب کی اجازت دیتے ہیں اُس وقت یہ شخص ترک اسباب پر مجبور اور اختیار اسباب سے معذور ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ معطل نہیں ہوتا بلکہ سلاطین سے زیادہ غنی اور مستغنی ہوتا ہے۔ چنانچہ اُن کے واقعات اس پر شاہد ہیں۔ ایک دفعہ محمد شاہ تغلق نے اپنے امراء وزراء اور اہل دربار کو منع کر دیا تھا کہ حضرت نظام الدین اولیاء کے یہاں کوئی نہ جانے پائے نہ کوئی اُن کو ہدیہ نذرانہ پیش کرے۔ اُس کا خیال یہ تھا کہ سلطان جی کا لنگر جو اسقدر وسیع ہو رہا ہے کہ دونوں وقت تین چار ہزار درویش کھانا کھاتے ہیں اور مخلوق برابر اُن کی طرف کھچی چلی آ رہی ہے۔ اس کا مدار میرے امراء وزراء و اہلِ دربار کے ہدایہ پر ہے۔ اگر یہ ہدایہ اور نذرانے بند ہو گئے تو لنگر بند ہو جائیگا اور لنگر بند ہو جانے کے بعد مخلوق کا میلان بھی اس طرف کم ہو جائیگا۔ چنانچہ ایک مہینہ تک تمام ہدایہ اور نذرانے بند رہے لیکن لنگر پھر بھی بند نہ ہُوا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ ترقی پر تھا۔

معلوم ہُوا کہ ان حضرات کی فتوحات کا مدار انسانوں کے ہدایہ وغیرہ پر نہیں۔ اگر ساری مخلوق اپنا ہاتھ روک لے جب بھی اُن کے کام انشاء اللہ بند نہ ہوں گے۔ اللہ تعالےٰ کسی دُوسری مخلوق کو اُن کی خدمت کے لیے مسخر کردیں گے۔ وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم۔ یہ تو قدیم واقعہ ہے اور ہمارے سامنے کا واقعہ یہ ہے کہ ایک زمانہ میں جبکہ تحریکِ خلافت کا ہندوستان میں بہت زور تھا اور حضرت حکیم الامتہ[۲] شرکت ہنود کی وجہ سے اُس سے الگ تھے تو بعض اہلِ خلافت نے یہ کوشش کی کہ حضرت مولانا کی خدمت میں جو لوگ ہدایہ اور نذرانے بھیجتے ہیں اُن کو اس سے روک دیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اُس سال ہمیشہ سے بھی زیادہ ہدایہ اور نذرانے آئے کہ پہلے تو اوسط ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کا تھا اُس سال تین سو روپیہ ماہوار کا اوسط ہوگیا۔ پھر اللہ تعالےٰ نے جو زیادتی کی تھی وہ برابر بڑھتی ہی رہی یہاں تک کہ اخیر میں ایک ہزار روپیہ ماہوار کا اوسط ہوگیا تھا۔ حالانکہ دُنیا جانتی ہے کہ حضرت قدس سرہٗ کے یہاں قبول ہدایہ سے زیادہ رد ہدایہ کا اوسط تھا۔ وہ ہدایہ قبول کم کرتے تھے واپس زیادہ کرتے تھے۔ کیونکہ شرائطِ قبول سخت تھیں جن کی پابندی کرنے والے تھوڑے ہی ہوتے تھے اس پر بھی کسی کے کم کرنے سے اُن کی آمدنی کم نہیں ہوتی تھی۔ سچ ہے۔ ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا و یرزقہ من حیث لا یحتسب ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ ان اللہ بالغ امرہ قد جعل اللہ لکل شئی قدراہ ۔



باب ہفت

حدیث

لاحسد الا فی اثنتین

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول لاحسد الا فی اثنتین رجل آتاہ اللہ مالا فسلطہ علی ھلکتہ فی الحق و رجل آتاہ اللہ حکمۃ فھو یقضی بھا و یعلمھا الناس ۔

(ترجمہ) ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا کہ قابلِ رشک دو ہی (شخصوں کی) حالتیں ہیں۔ ایک وہ جس کو اللہ تعالےٰ نے مال دیا ہو پھر اُسے (راہِ) حق میں خرچ کرنے کی توفیق دی ہو۔ دُوسرے وہ جس کو اللہ تعالےٰ نے دین کی سمجھ دی ہو (یعنی قرآن و حدیث کا علم دیا ہو) پھر وہ اس کے موافق فیصلہ کرتا ہے اور لوگوں کو اُسکی تعلیم (بھی) دیتا ہے۔

شرح ظاہر حدیث تو یہ ہے کہ ان دو صفتوں میں حسد جائز ہے ان کے ماسوا کسی اور صفت میں جائز نہیں۔ اس پر چند وجوہ سے کلام ہے:-

(۱۶۳) حسد اور غبطہ کے احکام یہاں حسد سے کیا مُراد ہے؟ بظاہر حقیقی معنی مراد نہیں، بلکہ مجازاً غبطہ (اور رشک) مُراد ہے۔ جس کے متعلق حق تعالےٰ فرماتے ہیں۔ وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون۔ رشک کرنے والوں کو اسی میں رشک

کرنا چاہیئے۔ حسد کی حقیقت یہ ہے کہ جو شی عادۃً ایک سے دُوسرے کی طرف مُنتقل ہو سکتی ہے۔ اُس کا اپنی طرف منتقل ہونا اور دُوسرے سے زائل ہونا چاہے یہ جائز نہیں۔ اسی کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

للرجال نصیب مما اکتسبوا و للنساء نصیب مما اکتسبن واسئلو الله من فضله -

" مردوں کے لیے اُن کی کوشش (اور کسب) سے حصّہ ہے اور عورتوں کے لیے اُن کی کوشش (اور عمل) سے حصّہ ہے (تو ایک دُوسرے کی حالت کی تمنّا نہ کرے) اور اللہ سے اُس کا فضل مانگو "

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے کسی کو کوئی نعمت دی ہو تو اُس شخص سے اُس نعمت کو طلب نہ کرو بلکہ اللہ تعالےٰ سے دُعا مانگو کہ جس طرح اُس کو نعمت دی ہے تم کو بھی اپنے فضل سے عطا فرمائے۔ کیونکہ جس کے پاس بھی کوئی نعمت ہے وہ اللہ کا فضل و احسان ہے۔ خُدا کے ذمّے نہ کسی کا کچھ آتا ہے نہ کسی کا کوئی استحقاق ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اذا حسدت فلا تبغ۔ اگر تم کو کسی سے حسد پیدا ہو تو حد سے نہ بڑھو۔ کیونکہ ہم بتلا چکے ہیں کہ حسد میں ایک سے دُوسرے کی طرف نعمت کا منتقل ہونا مطلوب ہوتا ہے اور (انتقال کی دو صُورتیں ہیں) کبھی اس طرح سے انتقال ہوتا ہے کہ صاحبِ نعمت کو پہلے سے بھی زیادہ خیر حاصل ہو جائے۔ مثلاً ایک شخص نے دُوسرے کے پاس کپڑا دیکھا اُس کو تمنّا ہوئی کہ یہ کپڑا مجھے مل جائے اور اُس سے مانگ بھی لیا۔ خُدا نے کپڑے والے کو اُس سے بھی بہتر (کپڑا یا اور) کوئی چیز عطا فرمادی اور اُس نے یہ کپڑا حاسد کو صدقہ کر دیا یا اُس کے ہاتھ بیع کر دیا۔ اس صُورت میں حاسد کا مقصود بھی پُورا ہو گیا اور محسود کی نعمت میں ترقی ہو گئی (ایسے انتقال کی تمنّا حسد حرام نہیں۔)

دُوسری صورت یہ ہے کہ دُوسرے کی نعمت کا اپنی طرف منتقل ہونا اس

طرح چاہے کہ اُس کو ضرر اور نقصان پہنچے۔ مثلاً کسی کے پاس دینوی ساز و سامان دیکھ کر یہ تمنّا کی جائے کہ یہ سامان میرے پاس آجائے اور محسود مر جائے یا قتل ہو جائے یا شہر سے نکال دیا جائے وغیرہ وغیرہ ایسے انتقال کی تمنّا جائز نہیں) یہی مطلب ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اذا حسدت فلا تبغ کا کہ حسد میں حد سے تجاوز نہ کرو۔ یعنی دُوسرے کے نقصان کی تمنّا نہ کرو۔ مناسب تو یہ ہے کہ کسی سے حسد بالکل ہی نہ کیا جائے (اُس کی نعمت کا اپنی طرف منتقل ہونا ہرگز نہ چاہو) اگر کسی کی کوئی چیز تم کو پسند ہو اللہ تعالےٰ سے دُعا مانگو کہ وہ اپنے فضل سے تم کو بھی یہ نعمت عطا فرما دے۔ اگر اس پر قُدرت نہ ہو اور تمہارا دل اُسی چیز کا بعینہٖ طالب ہو تو اُس کے ضرر اور نقصان کی تمنّا نہ کرو کہ یہ حد سے تجاوز ہے اور (یہی وہ حسد ہے جو) بہت بڑا گُناہ ہے۔

مَیں نے تاریخ میں (ایک واقعہ) دیکھا ہے کہ ایک شخص کو اللہ تعالےٰ نے دُنیا کا ساز و سامان بہت کچھ دیا تھا۔ اُس کو دیکھ کر ایک مسکین نے گلی کوچوں میں بازاروں میں یہ صدا لگانی شروع کی کہ اے اللہ! مجھ پر بھی رزق کا دروازہ اسی طرح کھول دے جیسا فلاں شخص پر کھول دیا ہے اُس مالدار کا نام لے کر پُکارتا۔ تو اُس نے مسکین کو بُلا کر کہا کہ تُو میرے پیچھے کیوں پڑ گیا؟ تجھے اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگنے کے واسطے یہی بات رہ گئی کہ مجھ جیسا ہونا چاہتا ہے۔ اگر تُو میرا نام لینا نہیں چھوڑے گا تو میری شہرت زیادہ ہو جائے گی (دُنیا میں میری تونگری کا چرچا ہو جائے گا) جس سے ممکن ہے کسی وقت مجھے تکلیف کا سامنا ہو جائے (چور یا ڈاکو میرے درپے ہو گئے تو بڑی مصیبت ہو گی)۔ مسکین نے کہا مَیں تو اپنی صدا کو نہیں بدلوں گا۔ مَیں نہ تجھے گالی دیتا ہوں نہ بُرا کہتا ہوں (اللہ تعالےٰ سے دُعا کرتا ہوں) تو جو میرے جی میں آئے گا، دُعا کروں گا (دُعا سے کسی کو روکنے کا حق نہیں) اُس نے کہا اچھا بتلا تُو روزانہ

اپنے واسطے کتنی رقم چاہتا ہے۔ مسکین نے کوئی مقدار بتلائی۔ مالدار نے کہا کہ اتنی مقدار روزانہ تجھ کو میرے یہاں سے پہنچ جایا کرے گی تو اپنے گھر میں بیٹھ۔ نہ میرا نام لے نہ کسی سے سوال کر۔

چنانچہ مرتے دم تک اُس نے یہ احسان جاری رکھا ایک دن بند نہیں کیا تو اس طرح کی دُعا بھی پُکار پُکار کر بازاروں گلیوں میں کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ اس میں دُوسرے کی نعمت کی طلب اُس کو ضرر پہنچا ہے کہ خواہ مخواہ چور ڈاکو اُس کے پیچھے لگ جائیں۔

قوله هل هذا الحسد هنا حقيقة او مجازا الى قوله فبقي يجري عليه ذلك المعروف حتى توفي۔

ف ۔ یہاں سے معلوم ہُوا کہ یہ جو حسد کی حقیقت مشہور ہے کہ دُوسرے کی نعمت کا زوال چاہا جائے یہ تو صحیح ہے مگر طلب زوال مطلقاً گُناہ نہیں۔ گناہ یہ ہے کہ طلب زوال دُوسرے کے ضرر کے ساتھ ہو۔ اگر ضرر کے ساتھ طلب زوال نہ ہو تو یہ حسد حرام میں داخل نہیں گو خلاف اُولیٰ ضرور ہے۔ غبطہ اور رشک میں دُوسرے سے زوالِ نعمت کی تمنا نہیں ہوتی صرف اپنے لیے اُس جیسی نعمت کی طلب ہوتی ہے۔ یہ جائز ہے اور اس میں بھی تفصیل ہے جو تفسیر بیان القرآن میں تحت آیت ولا تتمنوا ما فضل الله به بعضكم على بعض۔ مذکور ہے وہاں ملاحظہ کرلی جائے۔

ف ۔ چونکہ حسد بھی اُن امراضِ قلبیہ سے ہے جس کے ازالہ کا صُوفیہ کو بہت اہتمام ہے اس لیے اس تحقیق کو بیان کر دیا گیا۔ افسوس ہے کہ آج کل اس مرض سے اکثر صُوفیہ بھی خالی نہیں۔ الّا ماشاء اللہ جہاں کسی کی طرف لوگوں کا رجوع زیادہ ہوا اور لوگ اس کے درپے ہُوئے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ تصوف کی بُنیاد اخلاص پر ہے اور حسد کے ساتھ اخلاص کبھی حاصل نہیں ہو سکتا اس لیے اس مرض سے غافل نہ ہونا چاہیئے۔

(۱۶۴) حکمت سے مُراد قرآن و حدیث کی فہم ہے

بظاہر یہاں حکمت سے مُراد کتاب اللہ کی سمجھ (قرآن و حدیث کی فہم) ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔ ومن يؤت الحكمة فقد اوتي خيرا كثيرا جس کو حکمت دی گئی اُس کو بڑی خیر دیدی گئی۔ علماء نے (اس کی تفسیر میں) فرمایا ہے کہ حکمت سے مراد کتاب اللہ کا فہم ہے۔ اس کی دلیل خود اسی حدیث کے اس لفظ میں موجود ہے کہ وہ اس کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور (وجود و ظہور) اسلام کے بعد کوئی شخص اپنے فیصلہ میں ثواب کا مستحق جب ہی ہو سکتا ہے کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق فیصلہ کرے اور کتاب اللہ کی فہم میں سُنتِ رسول کی بھی فہم داخل ہے۔ کیونکہ دونوں حکمت کا مصداق ہیں اور دونوں کے ساتھ فیصلہ کرنے کا ایک ہی حکم ہے۔ یہی وہ دو قیمتی دینی چیزیں ہیں جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لن تضلوا ما تمسکتم بهما کہ جب تک تم ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے اور اگر دُوسروں کو بھی ان کی تعلیم دی جائے یہ تو درجۂ کمال ہے۔ کیونکہ جو شخص اللہ کی طرف سے (ان کی) فہم دیا گیا ہو اور اس پر خود بھی عمل کرتا ہو اور دوسروں کو تعلیم دیتا ہو وہ تو اعلےٰ مقامات پر فائز ہے۔ یہی لوگ انبیاء علیہم السلام کے وارث ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب آدمی مرجاتا ہے تو اُس کا عمل ختم ہو جاتا ہے مگر تین چیزوں کا ثواب ختم نہیں ہوتا۔

ایک ولد صالح (نیک لڑکا یا لڑکی) جو اُس کے لیے دُعا کرتا رہے۔ دوسرے صدقہ جاریہ (مسجد و مدرسہ و سرائے مُسافرخانہ۔ کنواں نہر وغیرہ جو اس کے بعد بھی چلتے رہیں)۔ تیسرے وہ علم جس سے اُس کی موت کے بعد لوگ نفع حاصل کرتے رہیں اور ان تینوں میں اعلیٰ (وافضل) علم ہے اور وہ علم جس میں یہ اجر عظیم (حاصل ہوتا) ہے وہ کتاب وسُنت ہی کا علم ہے۔ یا وہ جو اُن سے

مستنبط ہو (یعنی علم فقہ)۔

حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص فرض نماز پڑھتا رہے اور (اس کے بعد کسی جگہ) بیٹھ کر خیر کی تعلیم دیتا رہے اُس کو آسمانی بادشاہت میں عظیم (بڑا سردار) کا لقب دیا جاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کتاب (وسُنت) کی فہم سے کیا مُراد ہے؟ اگر اوامر و نواہی اور حلال و حرام کا سمجھنا مراد ہے اور کچھ نہیں تو یہ حکمت تو متقدمین کو حاصل ہو چکی۔ پچھلوں کے لیے اس کا کچھ حصّہ باقی نہیں رہا۔ کیونکہ اصول قائم ہو چکے احکام ثابت (و مدون) ہو چکے (اب پچھلوں کا کام صرف اتنا ہے کہ ان ہی قواعد و اصول و فروع سے نئے نئے حادثات کا حکم معلوم کرتے رہیں اور گو یہ بھی حکمت ہی میں داخل ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ اعلیٰ درجہ کی حکمت مجتہدین اور اُن کے اصحاب کے حصّہ میں آ چکی ہے) یا یہ کہ اوامر و نواہی کا علم حاصل کر کے احکام کی حکمتوں (اور ان کے اسرار) کو بھی معلوم کیا جائے۔ قرآن کی امثال و قصص کے فوائد کو سمجھا جائے کہ ہر ہر مثال اور قصّے میں کیا حکمت (اور کیا راز مخفی) ہے؟

اگر یہ مراد ہے تو یہ حکمت تو قیامت تک ختم ہونے والی نہیں۔ اس سے پہلے اور پچھلے سب اپنی قسمت کے موافق حصّہ لے سکتے ہیں۔ اسی کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے۔ لا تنقضی عجائبہ و لا یخلق علی کثرۃ الرد و لا یشبع منہ العلماء۔ قرآن کے عجائب ختم نہیں ہوں گے وہ باوجود بار بار پڑھنے کے پرانا نہیں ہوتا (ہر دفعہ تازہ بہ تازہ معلوم ہوتا ہے) اور علماء اس سے سیر نہیں ہو سکتے (بلکہ برابر نئے نئے علوم حاصل کرتے رہیں گے)۔

اس کی مثال مُوسٰے علیہ السّلام کے قصّہ میں حق تعالےٰ کا یہ ارشاد ہے:
فلما تراء الجمعان قال اصحاب موسیٰ انا لمدرکون قال کلا ان معی ربی سیہدین ۝ فاوحینا الی موسیٰ ان اضرب بعصاک البحر فانفلق فکان کل فرق کالطود العظیم ۝

جب دونوں جماعتیں ایک دُوسرے کو دیکھنے لگیں (یعنی بنی اسرائیل اور قوم فرعون) تو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کہا یقیناً ہم تو پکڑ لیے گئے (کیونکہ آگے سمندر ہے اور پیچھے دُشمن) فرمایا ہرگز نہیں کیونکہ یقیناً میرے ساتھ میرا پروردگار ہے۔ وہ مجھے (نجات کا) طریقہ بتلائے گا۔ پس ہم نے (فوراً) وحی بھیجی کہ اے موسیٰ! اپنے عصا کو سمندر پر مارو۔ (اُس کا مارنا تھا) کہ فوراً سمندر پھٹ گیا اور اُس کا ہر حصّہ بڑے پہاڑ کی مانند (کھڑا) ہو گیا (اور درمیان میں خشک راستہ بن گیا)۔ اب معلوم کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ نے یہ واقعہ کس لیے بیان فرمایا اور اس سے کیا بات سمجھی گئی جس میں ہم کو (موسیٰ علیہ السلام) کی تقلید کرنا چاہیئے؟

میرے علم میں علماء متقدمین نے اس حقیقت سے تعرض نہیں کیا، حالانکہ ہم کو اس قصّہ کا مخاطب بنایا گیا ہے اور یہ واقعات بے فائدہ ہمارے سامنے نہیں بیان کئے گئے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں: فاقصص القصص لعلہم یتفکرون۔ ان واقعات کو (لوگوں کے سامنے) بیان کیجئے تاکہ وہ (اُن میں) غور کریں۔ پس واللہ اعلم۔ اس قصّہ کا فائدہ یہ ہے کہ چونکہ موسیٰ بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر بدون حکمِ خداوندی کے نہیں نکلے تھے۔ پھر سمندر اُن کے سامنے حائل ہو گیا اور پیچھے سے (دُشمن کی) جماعت پہنچ گئی۔ ایک نے دُوسرے کو دیکھ لیا تو عادت جاریہ کے موافق بنی اسرائیل کو یقین ہو گیا کہ وہ پکڑ لیے گئے تو موسیٰ علیہ السلام سے (نجات کا طریقہ) معلوم کرنا چاہا کہ شاید اُن کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس وقت کے لیے کوئی خاص ہدایت ہو جس پر دُشمن کا سامنا ہونے کے وقت عمل کرنے کا حکم ہو کیونکہ اُن کا یہ کہنا کہ "ہم تو پکڑے گئے" جبکہ موسیٰ علیہ السلام بھی وہ سب کچھ دیکھ رہے تھے جو انہوں نے دیکھا تھا کہ آگے سمندر ہے اور پیچھے دُشمن ہے اس سے مقصود بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ موسیٰ علیہ السّلام کے پاس جو کچھ (طریقہ نجات کا) ہو اُسے معلوم کیا جائے (صورتِ حال سے ان کو مطلع کرنا مقصود نہ تھا کیونکہ

صورتِ حال تو اُن کے سامنے بھی تھی۔ پس یہ جملہ خبریہ حقیقت میں انشائیہ استفہامیہ تھا) پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھی کوئی چیز نہ تھی جس سے وہ دُشمن کا مقابلہ کرتے۔ بس اُن کے پاس اس یقین کے سوا کچھ نہ تھا کہ جب خُدا نے اُن کو (مصر سے) نکلنے کا حکم دیا۔ پھر اس حکم کی تعمیل کی توفیق رہی وہ اُن کے ساتھ ہے اور وہ اُن کو دشمن کے حوالہ نہ کرے گا۔

موسیٰ علیہ السلام نے عادات جاریہ وغیرہ پر نظر نہ کی۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ کی قدرت عادت کی پابند نہیں۔ وہ جو چاہے کرسکتے ہیں جس طرح چاہیں کرسکتے ہیں۔ اس لیے اُنھوں نے (قوتِ یقین کے ساتھ) جواب دیا کلا ان معی ربی سیھدین ہرگز نہیں (ہمیں کوئی نہیں پکڑ سکتا) کیونکہ میرا خُدا میرے ساتھ ہے وہ مجھے (نجات کا) راستہ بتلائے گا۔ گو موسیٰ علیہ السلام کے پُرزور جواب کا حاصل یہ تھا کہ اے قوم! میرے پاس تم سے زیادہ کوئی چیز بجز قوتِ ایمان کے نہیں ہے۔ مجھے اپنے رب پر پُورا اور سچا یقین ہے کہ وہ مجھے میری اور تمہاری سب کی نجات کا راستہ بتلائے گا۔ چنانچہ وہ جواب سے فارغ بھی نہ ہُوئے تھے کہ فوراً وحی نازل ہوئی فاوحینا الیٰ موسیٰ ان اضرب بعصاک البحر کہ اپنے عصا کو سمندر پر مارو۔ اس میں فاء تعقیب بتلا رہی ہے کہ جواب کے ساتھ ہی وحی نازل ہوئی اور یہ کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے ساتھ اپنے تعلق (خاص) کی خبر دی اُسی وقت اُن کو (طریق نجات کی) ہدایت ہُوئی جیسا باعظمت و جلال ہستی کی شان کے لائق ہے۔ جب کوئی کمزور اسی پر بھروسہ کرے (اور اُس کی پناہ میں آجائے تو وہ اپنی شان کے مناسب مدد کیا کرتا ہے) چنانچہ اس کے بعد اُن کا اور اُن کے دُشمن کا جو انجام ہُوا وہ اللہ تعالےٰ نے خود ہی بیان فرما دیا ہے (کہ موسیٰ علیہ السلام کے لیے سمندر کا پانی پھٹ کر خشک راستہ بن گیا اور دُشمن اُس میں گھُسا تو پانی برابر ہوگیا اور فرعون اپنے لشکر سمیت غرق ہوگیا۔ اسی طرح اے مخاطب! جس کے سامنے یہ قصّہ بیان کیا گیا ہے اگر تُو بھی اپنے پروردگار کے حکم کی پوری طرح تعمیل

کرے گا جیسا تجھ کو حکم ہُوا ہے اور خُدا کے سوا کسی چیز سے اپنے دل کو نہ اٹکائے گا تو وہ ہر ضرورت کے موقعہ پر نصرت و کامیابی سے تیری مدد کرے گا۔ ایسے موقع پر تجھ کو عادت جاریہ پر نظر کرکے گھبرانا نہ چاہیئے جیسا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کیا (بلکہ یقین کے ساتھ یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ میرے ساتھ ہے وہ ضرور نجات کا راستہ اپنی قدرت سے خلافِ عادت پیدا کر دے گا) پس تجھ کو اپنے ایمان میں موسوی العقل ہونا چاہیئے (اور عقل موسوی کا فیصلہ یہی تھا کہ عادت اور اسباب کوئی چیز نہیں۔ اللہ تعالےٰ خلافِ عادت بھی سب کچھ کرسکتے ہیں) تو تیری ہوائے نفسانی کا فرعون اللہ کی مہربانی سے دریائے ہلاکت میں غرق ہوجائے گا اور ایسے ہی ہر وہ شخص بھی (تباہ ہوجائے گا) جو تیرے ساتھ برائی کا قصد کریگا۔ کیونکہ حق تعالےٰ قرآن حکیم میں ارشاد فرماتے ہیں وکان حقا علینا نصر المؤمنین ایمان والوں کی مدد کرنا ہمارے ذمّے حق ہے۔

قرآن میں موسیٰ علیہ السلام کا یہ قصّہ اسی وعدہ کی تصدیق کے لیے بیان کیا گیا ہے کیونکہ جو قصّہ وعدہ کے بعد بیان کیا جاتا ہے اُس سے وعدہ کی تصدیق و تاکید ہی مقصور ہوتی ہے۔ نیز اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں ان تنصروا اللہ ینصرکم اگر تم اللہ کی مدد کروگے وہ تمہاری مدد کرے گا۔" اور بندہ کی طرف اللہ تعالیٰ کی مدد یہی ہے کہ اُس کے امر کا اتباع کرے اور جس چیز سے منع کیا ہے اُس سے دُور رہے (اور یہ حقیقت میں خود اپنی مدد ہے کیونکہ اوامر و نواہی الٰہیہ کی پابندی میں بندہ ہی کا نفع ہے۔ اللہ تعالیٰ کا تو کچھ نفع نہیں مگر یہ اُن کا لُطف و کرم ہے کہ اس کو اللہ کی مدد فرمایا)۔

اس قصّہ میں ایک اور بھی لطیف اشارہ ہے وہ یہ کہ جماعت میں اگر ایک شخص بھی بحکم الٰہی کی تعمیل کرنے والا ہو باقی سب اُس شخص کے مطیع ہوں تو سب کی مدد (اللہ کی طرف سے) کی جائے گی۔ کیونکہ بنی اسرائیل میں موسیٰ علیہ السلام جیسا صاحبِ یقین اُن کے سوا کوئی نہ تھا مگر چونکہ وہ سب اُن کے مطیع تھے تو اس

عجیب وغریب نصرت کی برکت سب ہی کو حاصل ہو گئی ۔

اس میں ایک اور بھی اشارہ ہے جو اس مضمون (سابق) کو مؤکد کر رہا ہے وہ یہ کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے تعمیلِ حکم میں سبقت کی (کہ اللہ کے حکم سے مصر سے نکل پڑے) تو اُنہوں نے سچے یقین کے ساتھ سمجھ لیا کہ حکم دینے والا اپنے بندہ کا ساتھ نہیں چھوڑے گا جو اُس کے حکم کی تعمیل کر رہا ہے کیونکہ یہ تو وعدہ خلافی ہے اور وعدہ خلافی جناب حق میں محال ہے۔ پس جو شخص یہ جانتا ہو کہ میں حکمِ الٰہی کے موافق کر رہا ہوں جیسا اُن کا حکم ہے (ویسا ہی کر رہا ہوں) اور تعمیلِ حکم کا منشا محض ایمان اور طلبِ ثواب ہے تو اُس کو نصرت الٰہی میں شک نہ کرنا چاہیئے اور کچھ بھی وسوسہ اور شُبہ دل میں نہ لائے ۔ اگر اُس کے دل میں شک نے راہ لی تو تصدیق میں ضعف ہو گا اور تصدیق ہی کا نام ایمان ہے اور ایمان کی کمزوری خود اپنے نفس کے ساتھ خیانت ہے۔ گو اس کو شعور نہ ہو اور یہ دُشمن کی چال ہے ۔ (شیطان اسی طرح انسان کو فریب دیا کرتا ہے) بعض دفعہ اس شک ہی کی وجہ سے نصرت میں دیر ہوتی ہے اور اس تاخیر کی وجہ سے اس کا ضعف یقین بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ شقاوت عظمیٰ (بڑی بدبختی) کا سبب بن جاتا ہے اور یہ بھی دشمن کی ایک بڑی چال ہے (کہ اسی طرح وہ مومن کو کفر تک پہنچانا چاہتا ہے)۔

اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں اُن لوگوں کی تعریف کی ہے جو حکم الٰہی کی تعمیل کرتے ہُوئے یقین پر جمے رہے۔ جیسا ہم نے ابھی بتلایا ۔ پھر اُن کا کیسا عُمدہ انجام ہُوا ۔ تو ہم کو بھی اس بات میں اُن کی تقلید کرنا چاہیئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ۔ الذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم فزادھم ایمانا و قالوا حسبنا اللہ و نعم الوکیل فانقلبوا بنعمۃ من اللہ و فضل لم یمسسھم سوء واتبعوا رضوان اللہ واللہ ذو فضل عظیم ۔ "یہ مومن وہ ہیں جن سے لوگوں نے کہا کہ تمہارے مقابلہ کو (قریش نے) بہت بڑا لشکر جمع کیا ہے اُن سے ڈرو (اور میدانِ بدر کا رُخ نہ کرو) تو اس خبر نے اُن کے یقین وایمان کو (اور بھی) بڑھا دیا اور اُنھوں نے جواب دیا کہ ہمیں اللہ تعالےٰ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔ پس (اس یقین کا) انجام یہ ہُوا کہ وہ اللہ تعالےٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ (کامیاب) واپس ہوئے اُن کو ذرا بھی کلفت نے نہ چھوا اور اس کے بعد اللہ تعالےٰ کی رضامندی اُن کو حاصل ہوئی اور اللہ تعالےٰ بڑے فضل وکرم والے ہیں ۔

ف ۔ قرآن کی امثال وقصص سے ایسے فوائد معلوم کرنا جن سے مسلمانوں کو اپنی حالت کی اصلاح واستقامت میں مدد ملے علم اعتبار کہلاتا ہے۔ یہ بھی ایک قسم کا استنباط ہے۔ جیسا آیاتِ احکام سے فقہاء استنباط کرتے ہیں اس کو قرآن کی تفسیر نہیں کہنا چاہیئے بلکہ عبرت ونصیحت حاصل کرنے کے لیے ان فوائد سے مستفید ہونا چاہیئے۔ بعض ناواقفوں نے صوفیہ کے ان اشارات و اعتبارات کو قرآن کی تفسیر سمجھ لیا ہے یہ اُن کی غلطی ہے۔ تفسیر وہی ہے جو لغت عرب اور محاورات عرب کے موافق کلام کا مدلول ہے۔ اس سے زیادہ جو کچھ ہو گا استنباط و اعتبار کہلائے گا ۔

ف ۔ قرآن وحدیث میں جہاں حکمت کا لفظ آتا ہے اُس سے مراد دین کی سمجھ ہے یا ہر وہ بات جو دین کے لیے نافع ہو۔ فلسفہ کو حکمت کہنا اور فلاسفہ کو حکماء کہنا بعد کی اصطلاح ہے ۔

ف ۔ قرآن کی امثال وقصص سے اس قسم کے فوائد و لطائف استنباط کرنا جو اس مقام پر مذکور ہیں حضرات صوفیہ کے ساتھ مخصوص ہے اور یہی وہ حکمت ہے جو قیامت تک ختم نہ ہو گی ۔ یہاں سے تصوف کی اہمیت ظاہر ہے۔ واللہ تعالےٰ اعلم ۔

(۱۶۵) تمنّائے خیر بھی مُفید ہے گو وہ خیر حاصل نہ ہو

شاید اس جگہ کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ ہمیں دُنیا یا آخرت میں اُس

سے کیا فائدہ ہوگا کہ ہم کسی ایسے مالدار کی حالت کی تمنا کریں جو مواقع خیر میں اپنا مال خرچ کرتا ہے یا کسی عالم کی حالت کی تمنا کریں جو علم سے فیصلہ کرتا اور دُوسروں کو تعلیم بھی دیتا ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ ہر شخص میں اس کی اہلیت نہیں تو جو شخص بھی لکھنا پڑھنا نہیں جانتا وہ کیونکر ایک عالم کی حالت کی تمنا کر سکتا ہے جبکہ وہ جانتا ہے کہ میں کسی طرح اُس کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا۔

جواب یہ ہے کہ (تمنا تو محال کی بھی ہو سکتی ہے اور یہ تو امورِ ممکنہ ہیں اُن کی تمنا بدرجہ اولیٰ ہو سکتی ہے پس) اگر یہ شخص اللہ کے ساتھ اخلاص سے معاملہ کرکے (سچے دل سے) اُس کی حالت کی تمنا کرے گا اِس کو اس کے برابر ثواب ملے گا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دُنیا چار شخصوں کے لیے ہے (یعنی دُنیا میں چار قسم کے آدمی ہیں) ایک وہ جس کو اللہ تعالےٰ نے مال بھی دیا علم بھی دیا وہ اس مال (کے حاصل کرنے اور خرچ کرنے) میں اپنے خدا سے ڈرتا ہے۔ (حرام طریقہ سے کمانے اور حرام کاموں میں خرچ کرنے سے بچتا ہے) اُس سے اپنی قرابت کے ساتھ صلہ رحمی کرتا ہے اور جانتا ہے کہ اس میں اللہ تعالےٰ کا بھی حق ہے (زکوٰۃ وصدقہ وغیرہ اور اُن حقوق کو پُوری طرح ادا کرتا ہے) یہ تو سب سے افضل (واعلیٰ) درجہ میں ہے۔ ایک وہ جس کو اللہ تعالےٰ نے علم تو دیا مال نہیں دیا تو وہ سچی نیت کے ساتھ اللہ سے کہتا ہے کہ اگر میرے پاس مال ہوتا میں بھی فلاں (مالدار عالم صالح) کی طرح کام کرتا۔ ان دونوں کا ثواب برابر ہے۔

ایک وہ ہے جس کو اللہ تعالےٰ نے مال دیا علم نہیں دیا اور وہ جہل کی وجہ سے مال میں گڑبڑ کرتا ہے۔ نہ اُس (کے کمانے اور خرچ کرنے) میں اللہ تعالےٰ سے ڈرتا ہے اور نہ اُس سے صلہ رحمی کرتا ہے۔ نہ اُس میں وہ اللہ تعالےٰ کا کچھ حق جانتا ہے یہ سب سے بدتر درجہ میں ہے۔ ایک وہ ہے جس کو اللہ تعالےٰ نے نہ علم دیا نہ مال دیا اور وہ (اپنے دل میں) یوں

کہتا ہے کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو مَیں بھی فلاں (جاہل مالدار) کی طرح کام کرتا (مزے اُڑاتا اور عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتا) تو یہ اپنی نیت کے ساتھ ہے۔ ان دونوں کا گُناہ برابر ہے۔

اس حدیث میں علم سے مراد یہ ہے کہ مال میں اللہ تعالےٰ کا حق معلوم ہو اور اتنا علم تو قریب قریب ہر شخص کو ہوتا ہی ہے بجز معدودے چند کے اور جب یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالےٰ کا بھی مال میں حق ہے مگر اُس کے ادا کرنے کا طریقہ معلوم نہیں تو اس کو عُلماء سے دریافت کرکے اُن کے فتوے کے موافق عمل کرنا چاہیئے۔ پس اوّل تو یہ جاننا ضروری ہے کہ مال میں اللہ تعالےٰ کا حق ہے پھر اُس کے ادا کرنے کا عزم ہونا چاہیئے۔ پھر اُس کا طریقہ دریافت کرنا چاہیئے۔ پھر طرق واجبہ اور مستحبہ میں مال خرچ کرنا چاہیئے۔ جس کو یہ علم حاصل ہو اُس کو عالم کہا جائے گا (کیونکہ حقوق مال کے متعلق جتنا علم ضروری ہے وہ اس کو حاصل ہے)۔

اس حدیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی اُمت کے ساتھ بے انتہا خیر خواہی واضح ہے کہ آپ اُن کو ہر اُس چیز کی ہدایت فرماتے ہیں جس سے دونوں جہان میں نفع حاصل ہے۔ چنانچہ ان دو چیزوں میں حسد (اور رشک) کو جائز فرمایا تاکہ رشک کرنے والے کو بھی یہ بلند درجہ حاصل ہو جائے جس کے حاصل ہونے کا طریقہ اُس کو معلوم نہ تھا (کیونکہ مفلس اور بے علم آدمی کیونکر سمجھ سکتا ہے کہ مجھے افلاس اور جہل کی حالت میں بھی مالداروں اور عالموں کی برابر درجہ مل سکتا ہے) رحکایت ہے کہ بنی اسرائیل پر ایک دفعہ سخت قحط ہُوا تو اُن کا ایک عابد ریت کے ٹیلہ پر سے گزرا اور دل سے یہ تمنا کی کہ اگر میرے پاس ریت کے اس ٹیلہ کے برابر غلّہ ہوتا تو بنی اسرائیل پر صدقہ کر دیتا۔ سچی نیت سے تمنا کی تھی اور اللہ تعالےٰ کے ساتھ اُس کا معاملہ سچا تھا تو اُس زمانے کے نبی پر اللہ تعالےٰ نے وحی نازل کی کہ فلاں عابد سے کہہ دو کہ مَیں نے اُس کا صدقہ

قبول کر لیا ہے۔ پس سیّدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے چاہا کہ ہم کو بھی لطیف پیرایہ میں عمدہ تعلیم سے خیر کے وہ تمام خزانے بتلادیں جو پہلی اُمتوں نے حاصل کئے تھے۔ اس طرح اگر کسی شخص کی عمر علم حاصل کرنے کے قابل نہیں رہی وہ اگر کسی عالم کی حالت کی تمنّا کرے گا اُس کو اس نیت اور عزم کا ثواب ملے گا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے نیۃ المؤمن ابلغ من عملہ مومن کی نیت اُس کے عمل سے زیادہ (اللہ کے یہاں) پہنچنے والی ہے۔ ایک دین دار بزرگ کا واقعہ ہے کہ وہ اپنے ایک بیمار بھائی کے پاس (بیمار پُرسی کو) گئے تو بیمار نے کہا قصد کر لیجئے کہ ہم سب مل کر حج کو چلیں گے۔ پھر سب ملکر جہاد کریں گے۔ پھر سب مل کر سرحدِ اسلام کی حفاظت کریں گے۔ بزرگ نے کہا بھائی صاحب! آپ کی حالت تو یہ ہے کہ (بستر سے لگے ہُوئے ہیں اور ارادے یہ ہیں) کہا اگر زندہ رہے تو ارادہ پُورا کر کے رہیں گے اور مر گئے تو ہم کو نیت کا ثواب ملے گا جبکہ سچّی نیت ہو (سچے دل سے ارادہ ہو) یہ لوگ ہیں وہ جو اللہ تعالےٰ اور رسول اللہ کی بات کو سمجھتے ہیں۔

پھر اس کے ساتھ اس تمنّا سے دو باتیں اور بھی حاصل ہوں گی۔ ایک اپنی عمر برباد جانے پر ندامت ہوگی (کہ مَیں نے فلاں عالم کی طرح اپنی عمر کو تحصیلِ علم میں کیوں خرچ نہ کیا) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے "الندم توبۃ" ندامت ہی کا نام توبہ ہے۔ دُوسرے اس کو اہلِ خیر سے محبّت ہوگی دُوسروں سے اُن کو افضل سمجھے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے المرأ مع من احب۔ آدمی اُسی کے ساتھ ہوگا جس سے محبّت کرے گا۔ (مراد حبِ عقلی ہے حبِ طبعی نہیں۔ پس اگر کسی کو کسی کافر یا فاسق عورت سے عشق بلا اختیار ہو جائے مگر عقلاً وہ اللہ و رسول اور اہل اللہ سے محبّت رکھتا ہے تو وہ اہلِ اللہ کے ساتھ ہی رہے گا انشاء اللہ تعالےٰ) اور کبھی کسی بات میں جو اُن سے سُنے گا اُس کو ان کی اتباع بھی نصیب ہو جائے گی۔

اس میں اور اُن میں کسی قدر مناسبت (اور موافقت) ہو جائے گی والتشبہ بالکرام فلاح اور بزرگوں کے ساتھ مشابہت حاصل کرنا بھی فلاح (اور کامیابی) ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کا معاملہ اللہ کے ساتھ سچّا ہُوا تو بطور خرق عادت کے اللہ تعالےٰ اُس کے لیے علم کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔ جیسا فتوح الشام میں یوقنا رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مذکور ہے کہ وہ عربی زبان بالکل نہ جانتے تھے جب مُسلمانوں نے اُن کا قلعہ فتح کر کے اُن کو قید کر لیا تو صُبح کو وہ عربی بولنے لگے اور قرآن حکیم کی چند سُورتیں حفظ پڑھنے لگے اور اسلام لے آئے۔ مُسلمانوں کے امیر نے پُوچھا کہ یہ حالت تم کو کیونکر عطا ہوئی؟ تو بتلایا کہ مَیں نے رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تھا۔ آپؐ نے مُجھ کو عربی زبان سکھلادی اور قرآن کی سورتیں یاد کرائیں۔ پھر مُسلمانوں کو اُن کے اسلام سے بہت نفع پہنچا۔

یہ حکایت ہم نے صرف اس لیے بیان کی ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ علم بطور خرق عادت کے بھی حاصل ہو سکتا ہے (تو اُس کی تمنّا لغو اور بے فائدہ نہیں ہو سکتی) یا اللہ تعالےٰ اس (تمنّا کرنے والے) کو اُس کی برکت سے اُسی طرح مال دے دیتے ہیں جیسا مال دار کو دیا ہے (تو یہ تمنّا بھی بے فائدہ نہیں۔ کیونکہ مال تو صُبح و شام آنے جانے والا ہے۔ کُچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ دم کے دم میں کسی مفلس کو مال دار بنا دے خصوصاً جبکہ اُس کی نیت یہ ہو کہ مال حاصل ہونے پر نیک کاموں میں خرچ کرے گا۔ غریبوں کی امداد کرے گا۔ قرابت داروں کے ساتھ صلۂ رحمی کرے گا)۔

اگر بطور خرق عادات کے یہ مالدار نہ بھی ہُوا تو اس نیت کا ثواب تو اُس کو ملتا رہے گا۔ پس ہم نے جو بات اُوپر کہی تھی وہ (اچھی طرح) واضح ہو گئی کہ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اپنی اُمّت کے ساتھ غایت شفقت اور حسنِ تعلیم پر دلالت ہے (کہ حضورؐ نے اپنی اُمّت کو وہ تمام باتیں

بتلادی ہیں جن سے اُن کو دونوں جہانوں میں فائدہ حاصل ہو) اس حدیث سے چند علمی مسائل اور بھی معلوم ہوگئے۔

ایک یہ کہ حدیث و قرآن کے سمجھنے میں پُوری کوشش کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ان دونوں ہی میں بڑی خیر و برکت ہے۔ دُوسرے یہ کہ جس کو اپنے ماتحتوں پر کچھ بھی ولایت (اور حکومت) حاصل ہو اُس کو سوچنا چاہیئے کہ وہ اُن کو کس طرح اپنے حسنِ تعلیم سے خیر (اور نفع) پہنچا سکتا ہے تاکہ سیّدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء (اس سُنّت میں بھی) ہو جائے: اگر اور کسی پر زور نہ ہو تو اپنے نفس پر تو ہر شخص کا زور ہے (تو کم از کم اپنے آپ ہی کو نفع اور خیر پہنچانے کے طریقے سوچا کرے)۔

حدیث میں اس پر بھی اشارہ ہے کہ علم سے پُورا نفع بدون عمل کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ویقضی بھا کہ "ایک شخص کو اللہ تعالےٰ نے علم دیا ہے تو وہ اُس کے موافق فیصلہ کرتا ہے" (معلوم ہُوا کہ عالم کی حالت قابلِ رشک اُسی وقت ہے جب وہ اُس پر عمل کرتا ہو)۔

اور اس میں صوفیہ (کے اس عمل) کی بھی دلیل ہے کہ اُن میں سے ہر شخص دُوسرے سے یہ سوال (پہلے) کرتا ہے کہ تمہارا مقام (آج کل) کون سا ہے؟ اور اللہ تعالےٰ کے ساتھ تعلق کیسا ہے؟ یہ سوال وہ اس لیے کرتے ہیں تاکہ اس ترقی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع نصیب ہو۔ (کیونکہ حضورؐ یہی چاہتے ہیں کہ مُسلمان برابر ترقی میں رہے تنزل نہ ہونے پائے۔ اگر عمل سے ترقی نہ کر سکے نیت خیر ہی سے ترقی کرے) اور تاکہ ایک کو دُوسرے کی حالت پر رشک ہو (تو وہ بھی اُس مقام کے لیے کوشش کرے جو دُوسرے کو حاصل ہے۔ اگر وہ مقام حاصل نہ بھی ہُوا تو کوشش اور نیت کی برکت سے ہی اُس کے برابر ہو جائے گا)۔

اسی لیے (کسی عارف نے) فرمایا ہے جب میرا نفس آپ کا (غلام) ہو جائے اور آپ میرے ہو جائیں تو مَیں دونوں جہان کا مالک ہوں۔ دونوں جہان میرے ہیں۔

قوله وقد يقول السامعون او بعضهم داى فائدة لنا الى قوله فانا صاحب الدادين وهمالى۔

ف۔ واقعی فقہاء اور صُوفیہ ہی سچے حکماء ہیں۔ دیکھو اس حدیث سے اُن عجیب و غریب فوائد کو معلوم کرنا کتنی بڑی حکمت ہے جو اللہ تعالےٰ نے صُوفیہ کو عطا فرمائی ہے۔ اے اللہ! میری تمنا سچے دل سے یہ ہے کہ میری بقیہ عمر درسِ قرآن اور درسِ حدیث میں تمام ہو اور عافیت اور راحت و طمانیت اور دل جمعی بدرجۂ اتم مجھے عطا ہو۔ زندگی دُنیا میں بھی اور موت کے وقت بھی اور موت کے بعد قبر میں بھی اور میدانِ حشر میں بھی اور اے اللہ! مجھے اور میرے اہل و عیال و احباب کو بھی یہ دولتیں عطا ہوں۔

ربنا اغفر لنا ذنوبنا واسرافنا فی امرنا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین۔



باب ۱۷۱

حدیث

فضل الصدقة

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص نے (اپنے دل میں) کہا میں (آج) ضرور کچھ صدقہ کروں گا۔ وہ اپنے صدقہ (خیرات کا مال) لے کر نکلا اور ایک چور کے ہاتھ میں دے دیا۔ صبح کو لوگوں میں چرچا ہُوا کہ (رات) ایک چور کو صدقہ دیا گیا ہے۔ اُس نے کہا اے اللہ! آپ ہی کے لیے حمد ہے۔ میں (آج پھر) ضرور صدقہ کروں گا وہ (رات کو) پھر صدقہ لے کر نکلا اور ایک زناکار عورت کو دے دیا۔ صبح کو لوگوں میں چرچا ہُوا کہ آج رات ایک زانیہ پر صدقہ کیا گیا ہے۔ اُس نے کہا اے اللہ! آپ ہی کے لیے حمد ہے۔ میں (آج پھر) ضرور صدقہ کروں گا وہ (رات کو) پھر صدقہ لے کر نکلا اور ایک غنی کو دے دیا۔ صبح کو چرچا ہُوا کہ آج (رات) غنی کو صدقہ دیا گیا ہے۔ اُس نے کہا اے اللہ! آپ ہی کے لیے حمد ہے چور (کے صدقہ) پر اور زانیہ (کے صدقہ) پر اور غنی (کے صدقہ) پر، تو اُس کے پاس پیام پہنچا کہ تیرا چور کو صدقہ دینا (بیکار نہیں گیا)۔ اُمید ہے کہ وہ چوری سے باز آجائے اور زانیہ پر صدقہ (بھی بیکار نہیں گیا) اُمید ہے کہ وہ زنا سے بچ جائے اور غنی پر صدقہ (بھی بیکار نہیں گیا) اُمید ہے کہ اُس کو عبرت ہو جائے اور وہ بھی اللہ کی دی ہُوئی نعمت سے خرچ کرنے لگے"۔

شرح ظاہر حدیث سے معلوم ہُوا کہ اللہ تعالٰے کے ساتھ حُسنِ معاملہ کو جاری رکھنا رفعت درجات کا سبب ہے۔

(دیکھو اُس شخص نے اللہ تعالٰے کے ساتھ جو معاملہ کیا تھا کہ میں صدقہ کروں گا اُس پر برابر جما رہا۔ ایک صدقہ کے بے محل صَرف ہونے کے بعد دوبارہ اور سہ بارہ صدقہ کرتا رہا تو اُس کے درجاتِ قرب میں ترقی ہوتی رہی اور ہر صدقہ قبول ہوتا رہا کوئی بھی بیکار نہ گیا اگرچہ بظاہر بے محل صرف ہُوا تھا)۔

(۱۶۶) صدقۂ نافلہ چُھپا کر دینا چاہیئے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ چُھپا کر صدقہ کرنا افضل ہے پہلی شریعتوں میں بھی یہ حکم ہماری شریعت کی طرح تھا کیونکہ سیاقِ حدیث بتلا رہا ہے کہ یہ صدقہ رات کو کیا گیا تھا (اور بعض الفاظ میں اس کی تصریح بھی ہے) منها الدليل على صدقة السر الى قوله فاصبح الناس ـــــ يتحدثون ـ

ف صوفیہ کو اس کا بہت اہتمام ہے مگر یہ حکم صدقۂ نافلہ کے لیے ہے۔ فرض کا اخفاء بہتر نہیں اُس کو علانیہ دینا چاہیئے جیسا نماز میں نفل کا اخفا افضل ہے اور فرض کا جماعت کے ساتھ ادا کرنا لازم ہے۔

(۱۶۷) اپنے دل سے نیک عمل کے متعلق باتیں کرنا جائز ہے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ اپنے دل سے اچھے کام کے متعلق باتیں کرنا جائز ہیں۔ کیونکہ اس شخص نے کہا تھا کہ میں آج ضرور صدقہ کروں گا اور حدیث میں یہ ذکر نہیں کہ کسی سے کہا تھا۔ تو معلوم ہُوا کہ اُس نے اپنے دل سے کہا تھا اور اس میں فائدہ یہ ہے کہ نیت اچھی طرح محقق (اور مضبوط) ہو جاتی ہے۔ وفيه دليل على جواز مفاوضة المرأمع نفسه الى قوله تحقيق النية ـ

ف ۔ اس سے فقہاء حنفیہ کے اس قول کی دلیل واضح ہو گئی کہ نماز وغیرہ میں زبان سے بھی نیت کر لینا اچھا ہے۔ اہلِ ظاہر نے اس کو بدعت کہا ہے مگر اُنہوں نے

اس حدیث میں غور نہیں کیا۔

(۱۶۸) عمل میں اخلاص کا اہتمام ہی کامیابی کا وسیلہ ہے

حدیث سے معلوم ہوا کہ عمل کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کرنا اور آمیزش (نفس و غرض) سے پاک کرنا ہی کامیابی کا بڑا وسیلہ ہے۔ دیکھو (اُس شخص نے خالص رضائے حق کے لیے عمل کیا تو، اُس پر کیسا فضل ہُوا اور کیسی بشارت دی گئی کہ امید ہے ایسا ہو، امید ہے ایسا ہو، امید ہے ایسا ہو۔ جب اُس نے اپنی سی کوشش خرچ کر دی اور مقدر سے جو کچھ پیش آیا اُس پر راضی رہا (تو اللہ تعالیٰ نے اُس کا ہر صدقہ قبول فرمایا اور اسی کے برمحل ہونے کی بشارت دی) اور یہاں سے معلوم ہُوا کہ صدقہ کے لیے مصرفِ خیر کا تلاش کرنا پہلی شریعتوں میں بھی مطلوب تھا جیسا ہماری شریعت میں ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تخیروا الصدقاتکم اپنے صدقات کے لیے مصرفِ خیر تلاش کرو اور اس حدیث میں بھی ہے کہ جب اُس شخص نے سُنا کہ اس کا صدقہ غیر مستحق کے پاس پہنچا ہے تو اُس نے صدقہ کا اعادہ کیا۔ وفیہ دلیل علی ان تحقیق العمل للہ تعالیٰ الیٰ قولہ فی غیر مستوجب لہا۔

ف - اس حدیث کی شرح میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ صدقہ نفل تھا یا فرض۔ حضرت شارح کی رائے یہ ہے کہ یہ صدقہ فرض نہ تھا بلکہ مستحب تھا کیونکہ تیسری دفعہ بھی اُس کا صدقہ بے محل صرف ہُوا تھا۔ پھر اُس نے اعادہ نہیں کیا۔ اگر فرض ہوتا تو پھر اعادہ کرتا۔ مگر یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہوگا۔ حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ جب صدقہ کرنے والا اچھی طرح سوچ سمجھ کر یہ گمان کر کے کسی کو صدقہ دے کر یہ فقیر محتاج اور مستحق ہے بعد میں معلوم ہو کہ مستحق نہ تھا تو صدقہ ادا ہو جائے گا خواہ فرض ہو یا نفل البتہ اگر بعد میں یہ معلوم ہو کہ صدقہ لینے والا اس کا بیٹا یا غلام یا بیوی یا شوہر ہے تو فرض کا اعادہ لازم ہے کیونکہ صدقہ گھر ہی میں لوٹ آیا

ہے باہر نہیں گیا اور اگر صدقہ نافلہ ہو تو اعادہ لازم نہیں۔ کیونکہ صدقۂ نفل ہر شخص پر ہو سکتا ہے خواہ اولاد و اصول ہی کیوں نہ ہوں اور اُس شخص نے جو صدقہ کا اعادہ کیا تو یہ عزیمت تھی اور عزیمت پر عمل کرنا افضل ہے یا ممکن ہے پہلی اُمتوں کے لیے اس صُورت میں اعادہ لازم ہو۔ آج کل صدقہ کے لیے مصرف تلاش کرنے میں بہت کوتاہی ہو رہی ہے۔ عام طور سے صدقات و زکوٰۃ کا روپیہ سائلوں کو یا چندہ مانگنے والوں کو دے دیا جاتا ہے۔ حالانکہ اُس کے زیادہ مستحق وہ لوگ ہیں جو خود نہ اپنے واسطے سوال کرتے ہیں نہ کسی مدرسہ اور انجمن کے واسطے چندہ کرتے ہیں۔ للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضربا فی الارض یحسبہم الجاھل اغنیاء من التعفف ط -

مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مرضِ وفات میں فرمایا کہ زکوٰۃ کا درجہ ہدیہ سے کمتر ہے (گو زکوٰۃ فرض اور ہدیہ سُنت مگر بعض دفعہ سُنت فرض سے بڑھ جاتی ہے جیسے تلاوتِ قرآن سُنت ہے اور اُس کا سُننا اُس شخص پر جس کو آواز پہنچ رہی ہے فرض ہے مگر تلاوت کا درجہ سماع سے زیادہ ہے۔ اسی طرح ابتداءً سلام کرنا سُنت ہے اور اُس کا جواب دینا فرض ہے۔ مگر ابتداءً سلام کا درجہ جواب سے بڑھ کر ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ فرض ہے مگر وہ مال کو پاک کرنے والی ہے اور ہدیہ سُنت ہے مگر وہ قلبِ مُسلم کو خوش کرنے کے واسطے ہے اس لیے اس کا درجہ زکوٰۃ سے بڑھا ہوا ہے۔

پھر فرمایا زکوٰۃ دینے والوں پر مصرف کا تفقد لازم ہے۔ جو شخص جس قدر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے صبر کرتا ہے اسی قدر اہلِ موال پر بقدر اُس کے صبر کے اُس کی امداد لازم ہو جاتی ہے یہ ہیں اصل مصارف زکوٰۃ کے۔ مگر یہ اہلِ اموال سائلین کو اور چندہ والوں کو دے کر سمجھتے ہیں کہ زکوٰۃ ادا ہو گئی۔

پھر فرمایا کہ جس شخص کے مال میں زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد برکت نہ ہو سمجھ لو کہ اُس نے زکوٰۃ مصرف میں نہیں دی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے:

یمحق اللہ الربٰو ویربی الصدقات ۔ اللہ تعالےٰ سُود کو مٹا دیتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں اور اللہ کا وعدہ سچا ہے ۔

(۱۶۹) ظاہر پر ہی حکم لگایا جائے گا حدیث سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ حکم ظاہر پر لگایا جائے گا جب تک اُس کے خلاف پر دلیل قائم نہ ہو اور یہ کہ تمام ادیان (سابقہ) میں اُسی پر عمل تھا کیونکہ یہ شخص رات کو نکلا اور ان لوگوں کو (جن پر صدقہ کیا گیا) بظاہر مسکین سمجھا تو اُس نے اُن کی ظاہری حالت کے موافق عمل کیا اور صدقہ دے دیا ۔ جب اُس کے گمان کے خلاف ثابت ہُوا تو اُس نے عمل کا اعادہ کیا ۔

حدیث میں اس پر بھی تنبیہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالےٰ کے لیے سچے دل سے کوئی چیز خیرات کرے اور مال حلال طیب ہو تو اللہ تعالےٰ اُس کو ضائع نہیں فرماتے بلکہ اُس کی خیرات کو اُس کی تجویز سے بہتر مصرف میں پہنچا دیتے ہیں ۔ جیسا حدیث کے آخر میں بشارت کے مضمون سے واضح ہے اور اُس میں جو اُمید کا لفظ ہے یہ شک کے واسطے نہیں بلکہ یقین کے واسطے ہے کیونکہ یہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے خبر ہے ۔ جس سے مقصود تسلی ہے اور تسلی یقینی خبر ہی سے ہو سکتی ہے (مگر محاورات شاہی میں وعدہ کے موقع پر امید ہی کا لفظ اختیار کیا جاتا ہے تاکہ مخاطب یہ نہ سمجھے کہ اُس کا حق بادشاہ پر ہے بلکہ وعدۂ شاہی کو محض فضل و کرم سمجھے ۔

عجیب حکایت اس موقعہ کے مناسب ایک شخص کی حکایت ہے کہ اُس کے دل میں یہ بات آئی کہ اللہ کے لیے سو دینار (اشرفیاں) خیرات کرو ۔ وہ ایک بزرگ کے پاس گیا اور عرض کیا حضرت مجھے بتلائیے یہ خیرات کس کو دوں ؟ فرمایا کل کو سویرے شہر پناہ پر پہنچ جاؤ جو شخص سب سے پہلے تم کو ملے اُس کو دے دو ۔ اُس نے ایسا ہی کیا تو سب سے پہلے ایک شخص ملا ، جو دُنیا دار (مالدار) مشہور تھا اور اُس کی حالت سے بھی ایسا ہی ظاہر ہوتا تھا (لباس اور ظاہری شان سے فقیر مسکین معلوم نہ ہوتا تھا) اُس نے دل میں کہا کہ اس غنی کو

صدقہ کیونکر دوں ؟ پھر خیال کیا کہ شیخ مجھ سے زیادہ جاننے والے ہیں (اُن کے ارشاد پر عمل کرنا چاہیئے) چنانچہ مال اُس کے حوالے کر دیا ۔ مال دینے کے بعد دل میں خلجان پیدا ہوا تو اُس نے کہا بہتر ہے میں بھی اُس کے پیچھے رہوں گا دیکھوں یہ کیا کرتا ہے ؟ چنانچہ دُور سے اُس کے پیچھے ہو لیا (کہ اُس کو خبر نہ ہو) تو دیکھا کہ اُس نے ایک ویرانہ میں جا کر اپنے کپڑے کے نیچے سے کوئی چیز نکال کر پھینکی ہے ۔ اُس نے وہاں جا کر دیکھا تو مری ہوئی مُرغی تھی ۔ پھر اُس کے پاس چلا یہاں تک کہ وہ گھر میں داخل ہو گیا تو اُس نے دروازہ کے پیچھے کھڑا ہو کر کان لگائے اور سُنا کہ وہ اپنے بال بچوں سے کہہ رہا ہے خوش ہو جاؤ اللہ تعالےٰ نے تمہارے لیے فتوحات بھیجی ہیں اور سارا قصہ بیان کیا ۔

وہ سب خوش ہو گئے ۔ پھر وہ بازار گیا اور گھر والوں کے لیے کھانا خریدا ۔ یہ بھی اُس کے پیچھے رہا اور ساتھ ہی لوٹا تو کھانے کو دیکھ کر بال بچوں کی خوشی بھی دیکھی ۔ اُن کی باتیں بھی سُنیں تو معلوم ہُوا کہ سب فاقہ سے تھے ۔ اُس نے اس پر بس نہ کیا ، بلکہ جب یہ شخص کھانے پینے سے فارغ ہو کر باہر آیا تو قسم دے کر اُس کا حال پوچھا ۔ اُس نے کہا تین دن سے ہمارے گھر میں کسی نے کچھ نہیں کھایا (سب فاقہ سے تھے) میرے پاس کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی جس کو بیچ کر کھانا لاتا ۔ صرف یہ کپڑے بدن پر ہیں جن سے اپنی پردہ پوشی کرتا ہوں (اور یہ لوگ اس شاندار لباس کو دیکھ کر مجھے مالدار سمجھتے ہیں) ۔

آج میں گھر سے نکلا کہ شاید کوئی چیز مل جائے جس کے ذریعہ ان کا فاقہ توڑوں ، تو میں نے وہ مُرغی مری ہوئی پائی جس کو تم نے مجھے پھینکتے ہوئے دیکھا ۔ میں نے (دل میں) کہا اللہ کا شکر ہے آج ہم اس سے کچھ سہارا کر لیں گے کل کو اللہ تعالےٰ اور کچھ دے گا ۔ میں اُس کو لے کر جا رہا تھا کہ تم نے مجھے وہ رقم دی تو اب مردار ہمارے واسطے حرام تھا ۔ میں نے اُس کو پھینک دیا اور تمہارے عطیہ سے کھانا خریدا) اب تو یہ شخص بڑا خوش ہُوا اور جا کر شیخ سے سارا قصہ بیان کیا ۔

فرمایا برخوردارِ من! جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچائی کا معاملہ کرتا ہے اُس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی سُنت (اور عادت) یہی ہے کہ اُس کے واسطے سب سے بہتر اور عمدہ حالت تجویز فرماتے ہیں"۔ قولہ وفیہ دلیل علی۔ ان الحکم للظاهر الی قولہ خیر الامور واحسنها"۔

ف - عزیزِ من! تمام تر مدار سچائی اور خلوص پر ہے اس کے لیے اہلِ طریق نے یہ ریاضات و مجاہدات تجویز فرمائے ہیں جو صُوفیہ میں رائج ہیں۔ مگر سمجھ لو کہ ریاضات و مجاہدات خود مطلوب نہیں بلکہ اُن کے ذریعہ صدق و خلوص کی تحصیل مطلوب ہے۔ اگر یہ حاصل نہ ہو تو ریاضات و مجاہدات سب بیکار ہیں اور یہ حاصل ہو جائے تو سب کارآمد ہیں اور اگر بدون مجاہدہ و ریاضت کے کسی کو یہ دولت مل جائے تو اُس کو مجاہدہ و ریاضت کی اصلاً حاجت نہیں۔ بس تقوےٰ و کثرتِ ذکر کافی ہے۔

ف - ظاہر پر حکم لگانا صُوفیہ کے یہاں بھی معمول ہے۔ پس جو لوگ مشائخ کے اعمال و احکام کو حقیقت پر مبنی سمجھتے ہیں۔ غلط ہے حقیقت الامر کی خبر اللہ تعالیٰ ہی کو ہے لا یعلم الغیب الا ھو اور معصوم بجز نبی کے کوئی نہیں خواہ کتنا ہی بڑا ولی ہو، صوفیہ کو اپنے مشائخ کے ساتھ محبت و عقیدت تو لازم ہے مگر عقیدت کو حد سے نہ بڑھانا چاہیئے۔ جب عقیدت حد سے بڑھ جاتی ہے شخصیت پرستی پیدا ہو جاتی ہے جو تعلیمِ اسلام کے خلاف ہے۔

(١٧٠) تسلیم و رضا کی برکت

حدیث سے تسلیم و رضا کی برکت بھی معلوم ہوگئی۔ کیونکہ اس شخص کی کوشش بناہر ہر دفعہ ناکام رہی۔ مگر وہ تنگدل نہ ہوا اور ہر دفعہ تسلیم و رضا کی شان سے اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا رہا اور اپنے معاملے کا اعادہ کرتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اُس کو بشارت سے نوازا گیا۔ وفیہ دلیل علی۔ برکۃ التسلیم والرضا الی قولہ فاعقبہ تلک البشارۃ۔

ف - تسلیم و رضا کا دُوسرا نام تفویض ہے کہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے اور اُس کی رضا پر راضی رہے۔ صوفیہ کی یہ خاص شان ہے ؎

غیر تسلیم و رضا کو چارۂ ۔۔۔ درکفِ شیرِ نرِ خونخوارۂ

(١٧١) مالداروں میں حرص زیادہ ہوتی ہے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ اکثر مالداروں میں حرص کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ دیکھو اُس شخص نے آخر میں جس کو صدقہ دیا وہ غنی تھا۔ مگر اُس نے صدقہ لے لیا۔ حالانکہ وہ اُس کا مستحق نہ تھا اور اگر مالداروں میں حرص زیادہ نہ ہوتی تو اُن کے پاس مال ہی نہ جمع ہوتا (الا ماشاء اللہ) وفیہ دلیل علی ان غلبۃ الشح فی الغالب من۔ الاغنیاء الی قولہ ما اجتمع المال لهم فی الاغلب منهم۔

ف - عام طور پر لوگوں کا خیال یہ ہے کہ مالداروں میں حرص نہیں ہوتی۔ کیونکہ اُن کے پاس تو بہت کچھ ہے اُن کی نیت بھری ہوئی ہے۔ دل غنی ہے۔ مگر واقعہ یہ نہیں جو مالدار باقاعدہ زکوٰۃ و صدقات ادا کرتے ہیں اُن کا تو دل غنی ہوتا ہے مگر جو زکوٰۃ نہیں نکالتے اُن میں غریبوں سے زیادہ حرص ہوتی ہے۔ اس لیے اہلِ اموال کے ہدایا میں غرباء کے ہدایا سے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

اسی طرح عام خیال یہ ہے کہ بڈھوں کی نظر جوانوں سے زیادہ پاک ہوتی ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ بڈھوں میں شہوت زیادہ ہوتی ہے گو جُھوٹی ہی شہوت ہو۔ جوانوں میں شہوت کم ہوتی ہے مگر جب ہوتی ہے سچی ہوتی ہے۔ جیسے بُڈھوں کو بھُوک زیادہ لگتی ہے گو اُن سے کھایا نہیں جاتا بہت تھوڑا کھاتے ہیں اور یہ جھُوٹی بھوک ہے جو اُن کو بار بار ستاتی ہے۔ اُن کو بھوک کی سہار نہیں ہوتی اور جوان کو بھُوک زیادہ نہیں لگتی۔ اپنے وقت پر لگتی ہے اور سچی بھوک لگتی ہے۔ پس بُڈھوں سے جوان عورتوں کو زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے مگر یہ کہ بالکل گور کا حریرہ ہوگیا ہو تو وہ غیر اولی الاربۃ من الرجال میں داخل ہوگا۔ یہاں

سے اُن لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو اپنی عورتوں کو پیروں کے سامنے بے پردہ لاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ حضرت تو بُوڑھے ہو گئے ہیں ان سے پردہ کی کیا ضرورت ہے اور اُن مشائخ کی غلطی بھی واضح ہو گئی جو عموماً مالداروں کے ہدایا کو خلوص پر مبنی سمجھتے ہیں۔

(۱۷۲) بندگی کو قطع نہ کرو اگرچہ بظاہر قبول کی امید نہ ہو !

اس حدیث میں صُوفیہ کے اس قول کی بھی دلیل ہے کہ خدمت کو قطع نہ کرو اگرچہ بظاہر اُس کے قبول ہونے کی اُمید نہ ہو یا قبول نہ ہونا محقق بھی ہو جائے۔ کیونکہ غلام کو اپنے مولیٰ کی خدمت سے چارہ نہیں۔

دوّیم خدمت ہی سے قبول کی اُمید کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے واقعات میں مذکور ہے کہ اُن میں ایک عابد نے برسوں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تو اُس زمانے کے نبی پر وحی آئی کہ میرے فلاں بندہ سے کہہ دو جتنی چاہے عبادت کرے وہ جہنمی ہے۔ نبی نے اس کو یہ پیغام پہنچا دیا۔ اُس نے کہا میرے پروردگار! کے فیصلہ پر آفرین ہے۔ پھر اپنے گھر واپس آیا اور پہلے سے بھی زیادہ عبادت کرنے لگا اور عرض کیا خداوندا! مَیں تو آپ کی عبادت اُس وقت بھی کرتا تھا جبکہ میرا خیال تھا کہ مُجھ میں کچھ بھی اہلیت نہیں تو اب کیونکر عبادت نہ کروں جبکہ آپ نے اپنے فضل سے مجھے اپنے دوزخ کا اہل بنا دیا ہے (دوزخ بھی تو آپ ہی کی ہے نسبت اب بھی باقی ہے تو مجھ میں کچھ تو اہلیت ہے کہ آپ کے ساتھ کسی قدر تعلّق ہوگیا) چنانچہ وہ عبادت میں سرگرم رہنے لگا اور پہلے سے زیادہ کام کرنے لگا تو اللہ تعالےٰ نے اُن ہی پیغمبر کے پاس پھر وحی بھیجی کہ اُس عابد سے کہہ دو جو چاہے (عمل) کرے وہ جنتی ہے۔ کیونکہ اُس نے اپنے کو کسی قابل نہیں سمجھا (حقیر و ذلیل جانا) اللہ اللہ خدا کو تواضع کس قدر پسند ہے۔ یہی راستہ سب سے زیادہ نزدیک ہے مگر تواضع سے زیادہ دشوار بھی

کوئی چیز نہیں۔ تکبّر اور ریا سب سے اخیر میں صدیقین کے دماغ سے باہر ہوتی ہے)۔ کسی بزرگ نے خُوب کہا ہے۔ لئن اردتم منی السلو عنکم فلیس لی منکم بدو ان ابعدتم۔ اگر آپ یہ چاہیں کہ مَیں آپ سے اپنے دل کو خالی کرلوں تو مجُھے تو آپ سے چارہ نہیں خواہ آپ رد کریں (یا قبول کریں)۔

قولہ وفیہ دلیل لاھل الصوفۃ الذین یقولون لا تقطع الخدمۃ الی قولہ وان ابعدتم۔

ف ۔ اس شخص نے تو وحی آنے پر بھی عبادت کو قطع نہ کیا حالانکہ وحی علم قطعی کا موجب ہے۔ پھر کسی کو اپنے کشف یا الہام پر اعتماد کر کے عبادت قطع کرنے کا کیا حق ہے؟ ایک بزرگ کے پاس اُن کا مرید آیا اور عرض کیا کہ جب مَیں ذکر کرنے بیٹھتا ہوں یہ آواز آتی ہے کہ تُو کافر ہے۔ بزرگ نے فرمایا یہ دشنامِ محبت ہے محبوبوں کی عادت ہے، عشاق کو پریشان کیا کرتے ہیں۔ کام میں لگے رہو اور اس آواز پر التفات نہ کرو۔ (غالبًا کافر سے مُراد کافر بالطاغوت تھا) مگر مرید گھبرا گیا وہ معنی مشہور پر ہی محمول کرنے لگا) شاید کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ ایک بار وحی میں اُس کو جہنمی کہا گیا دوبارہ جنتی کہا گیا اور دونوں میں مستقبل کی خبر ہے تو ان متعارض خبروں کو کیونکر جمع کیا جائے گا اور اگر ایک کو ساقط کیا جائے تو کلامِ الٰہی میں خطا و کذب لازم آئے گا۔ تعالی اللہ عن ذلک علوا کبیرا۔

جواب یہ ہے کہ ہر شخص کے لیے ایک جگہ جہنّم میں بنی ہوئی ہے ایک جگہ جنت میں۔ اگر ایمان نصیب ہوگیا تو اُس کو جہنم کی جگہ پہلے دکھلائی جاتی ہے کہ اگر تم ایمان نہ لاتے تو تمہارا ٹھکانہ یہاں ہوتا۔ مگر اب یہ جگہ کسی کافر کو دی جائے گی اور تمہارا ٹھکانہ جنّت میں ہے۔ پھر اُس کو جنت کا درجہ دکھلایا جاتا ہے تاکہ زیادہ خوشی اور قدر ہو۔ اسی طرح کافر کو پہلے جنّت کا ٹھکانا دکھلایا جاتا ہے کہ اگر تو ایمان لاتا یہاں پہنچتا مگر اب تیرا ٹھکانہ جہنم میں ہے۔ پھر اس کو جہنّم کا درجہ دکھلایا جاتا

ہے تاکہ حسرت اور غم زیادہ ہو۔

پس پہلی بار جو وحی میں کہا گیا کہ جو چاہے کر تو جہنمی ہے۔ اس سے جہنمی حقیقی مراد نہیں بلکہ مجازاً جہنمی مراد تھا کہ تیری جگہ جہنم میں بھی تجویز کی ہوئی ہے۔ اگر ایمان نہ لاتا اور دوسری وحی میں جنتی سے حقیقی جنتی مراد ہے۔ پس تعارض نہ رہا۔ مجازاً ہر مومن کو جہنمی اور ہر کافر کو جنتی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ہر شخص کی جگہ جنت اور دوزخ دونوں میں نامزد ہے۔ رہا یہ کہ مجازاً جہنمی کہنے کی ضرورت کیا تھی؟ جواب صوفیہ کے مذاق پر تو یہ ہے کہ یہ دشنامِ محبت تھی جو عشاق کے امتحان کے واسطے دی جاتی ہے اور اللہ تعالےٰ کو تو امتحان کی ضرورت نہیں مگر بندوں کو اس قسم کے واقعہ سے عاشق کے صدق و خلوص کا علم ہو جاتا ہے اور فقہاء کے مذاق پر جواب یہ ہے کہ لوگوں کو یہ مسئلہ بتلانا مقصود تھا کہ اگر کسی کو اپنے جہنمی ہونے کا یقین بھی ہو جائے پھر بھی عبادت اور تعلق مع اللہ کو قطع نہ کرے کیونکہ اللہ تعالےٰ تمہارے یقین کے خلاف بھی کر سکتے ہیں۔ نیز یہ بھی بتلانا تھا کہ خدا کو تواضع پسند ہے۔

ف ۔ اس شخص کے اس قول سے کہ اب کیونکر عبادت نہ کروں جبکہ آپ نے اپنے فضل سے مجھے اپنی دوزخ کا اہل بنا دیا ہے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نانوتوی کے ایک قول کی تائید ہو گئی۔ مولانا کے زمانے میں ریاست رامپور میں ایک ذاکر مشاغل کو بحالتِ قبض یہ یقین ہو گیا کہ میں شیطان ہوں۔ غریب بہت پریشان ہُوا اور اسی پریشان کے عالم میں رامپور ہی کے ایک بزرگ سے ملنے گیا۔ اُن سے اپنا حال عرض کیا کہ حضرت میں تو شیطان ہوں۔ اُنہوں نے بجائے تسلی اور دستگیری کے جواب دیا کہ اگر تُو شیطان ہے تو لاحَولَ وَلا قوّۃ اِلّا باللہ۔ اُس کو یقین ہو گیا کہ میں واقعی شیطان ہو گیا ہوں کہ اتنا بڑا بزرگ بھی مجھ پر لاحول پڑھتا ہے۔ واپس آ کر اُس نے خودکشی کر لی۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس واقعہ کی اطلاع پہنچی تو فرمایا کہ ہم تو فلاں صاحب کو بزرگ اور عارف سمجھتے تھے مگر معلوم

ہُوا کہ وہ تو کورے ہی ہیں۔ اگر وہ شخص میرے پاس آتا اور مجھ سے کہتا کہ میں شیطان ہو گیا ہوں تو میں یہ جواب دیتا کہ پھر کیا ہُوا شیطان بھی تو اُسی کا ہے نسبت اب بھی قطع نہیں ہوئی۔ اس جواب کے ساتھ ہی اُس کا قبض مبدل بہ بسط ہو جاتا اور ہلاکت سے بچ جاتا (سمعتہ من سیدی حکیم الامۃ) اور یہاں سے معلوم ہُوا کہ اگر وحی سے بھی کسی کو جہنمی کہا جائے پھر بھی وہ جنتی ہو سکتا ہے۔ اگر ایمان و عمل صالح پر جادہ ہے تو صرف کسی بزرگ یا شیخ کے بُرا کہنے سے کسی کو بُرا نہیں کہا جا سکتا۔ جب تک خود اُس کے اعمال بُرے نہ ہوں۔ اہلِ طریق اس معاملہ میں بہت غلو کرتے ہیں کہ شیخ کے اقوال کو آیت و حدیث سمجھ کر فیصلہ کرنے لگتے ہیں خود تحقیق نہیں کرتے حالانکہ مشائخ بھی بشر ہیں بشریت سے بری نہیں۔ اُن کی بہت سی باتیں بشریت سے ناشی ہوتی ہیں جن کو جاننے والے جانتے ہیں۔

ف ۔ چور کے متعلق جو کہا گیا کہ اُمید ہے وہ اس صدقہ کی وجہ سے چوری سے باز آ جائے۔ یہ تو ظاہر ہے کیونکہ انسان عموماً تنگی اور فقر ہی کی وجہ سے چوری کرتا ہے اور چور کا چوری سے رُک جانا بڑی چیز ہے۔ کیونکہ مسلمان اس کے ضرر سے بچ جائیں گے تو اس کا ثواب صدقہ سے بھی افضل ہے اور زانیہ کے متعلق جو کہا گیا کہ شاید وہ زنا سے توبہ کر لے یہ بھی اسی وجہ سے ہے کیوں کہ بعض عورتوں کو زناکاری پر فقر و احتیاج ہی برانگیختہ کرتا ہے جس کی تکلیف کو وہ برداشت نہیں کر سکتیں اور زنا کے ذریعہ روپیہ کماتی ہیں۔ ایسی عورت کو جب کچھ رقم دے دی جائے گی تو وہ اس حرکت سے باز آ جائے گی ہمیشہ کو نہیں تو کچھ دنوں کو سہی اور کسی کے ذریعہ زانیہ کا زنا سے توبہ کر لینا صدقہ سے بھی بڑھ کر ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لان یھدی اللہ بک رجلا واحدا خیر لک من حمر النعم۔ تمہارے ذریعہ سے اللہ تعالےٰ اگر کسی ایک آدمی کو بھی ہدایت کر دیں یہ تمہارے واسطے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے (جو عرب کا قیمتی مال ہے) ہاں جو عورتیں غلبۂ شہوت کی وجہ سے زنا کرتی ہیں اُن

کو صدقہ دینے سے یہ اُمید نہیں کہ زنا سے باز آ جائیں گی (قالہ الشارح فی دجہ) اور گو اس مضمون کو مسائلِ تصوف سے تعلق نہیں مگر اُوپر جو مصرف زکوٰۃ کی تحقیق اور تفقد کی تاکید کی گئی ہے اُس سے تعلق ہے اور عموماً بہت لوگ اس سے غافل ہیں۔ لوگ زنا کار عورتوں کو صدقہ نہیں دیتے۔ نہ چوروں کو حالانکہ اُن کو صدقہ دینا زیادہ ثواب ہے کہ شاید وہ گناہوں سے توبہ کریں۔

مولانا جمال الدین مرحوم وزیر ریاست بھوپال کو کسی نے خبر دی کہ آج بھوپال میں ایک بڑی خوب صُورت رنڈی آئی ہے تو فوراً آپ نے اپنے منشی کو اُس کے پاس بھیجا کہ تم کو وزیر صاحب بُلاتے ہیں۔ وہ وزیر صاحب کے یہاں پہنچ گئی۔ آپ نے اُس کو ایک دو منزلہ مکان پر ٹھہرا دیا اور کھانے پینے اور دیگر ضروریاتِ رہائش کا انتظام کر دیا۔ اُس کی روزانہ فیس پانچ سو روپیہ تھی۔ یہ فیس بھی ہر دن اُس کو پہنچاتے رہے اور نوکروں سے کہہ دیا کہ اس کے پاس کوئی آئے جائے تو اُس کو روکا نہ جائے مگر مجھے اطلاع دی جائے کہ کون آیا اور کون گیا؟ وزیر صاحب کے مکان پر کس کی مجال تھی جو اُس سے ملنے آتا۔ غرض ایک مہینہ تک اُس کو اپنے مکان پر رکھا۔ روزانہ فیس دی۔ مگر کسی کو اُس کے پاس پہنچنے نہ دیا۔ ایک مہینہ کے بعد اُس نے خود ہی اجازت طلب کی کہ میں بھوپال سے باہر جانا چاہتی ہوں۔ تو آپ نے اُس کو اجازت دے دی اور وہ اسی دن بھوپال سے باہر چلی گئی۔ لوگوں کو معلوم تھا کہ مولانا جمال الدین وزیر بڑے نیک اور متقی ہیں۔ اُنھوں نے اس رنڈی کو اپنے مکان پر صرف اس لیے رکھا ہے تاکہ بھوپال کے نوجوان خراب نہ ہوں مگر ظاہر میں اُن کا یہ فعل ایسا تھا جو کسی متقی سے نہیں سُنا گیا تو شہر میں بہت کچھ چہ میگوئیاں ہوئیں جب وہ رنڈی چلی گئی تو رئیسہ بھوپال نے مولانا سے پُوچھا سُنا ہے آپ نے مہینہ بھر تک رنڈی کو اپنے مکان میں رکھا اور روزانہ فیس بھی دی۔ فرمایا ہاں صحیح ہے۔ میں نے یہ سوچا کہ اگر یہ بازار میں رہی تو میری ریاست کے نوجوان لڑکے گناہ کر کے تباہ و برباد ہوں گے اُن کی صحت بھی خراب ہو گی اور رقم بھی ضائع ہو گی تو میں نے اُس کو اپنے گھر پر ایک دو منزلہ کمرہ دے دیا تاکہ ریاست کا کوئی آدمی اُس سے ملوث نہ ہو اور خُدا کے فضل سے ریاست کی ملازمت سے میں نے بہت کچھ روپیہ کما لیا ہے تو میں نے ریاست کے جوانوں کو بچانے کے لیے ایک مہینہ میں پندرہ ہزار روپے اس پر خرچ کر دیئے۔ مجھے یہ رقم کچھ بھی معلوم نہیں ہوئی اور میری ریاست کے آدمی اس بلا سے محفوظ رہ گئے۔

رئیس پر مولانا کے اس بیان پر بہت گہرا اثر ہُوا اور کہا مولانا واقعی آپ نے ریاست کی خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ یہ تو آپ نے ایسا کام کیا جس کی طرف کسی کا خیال ہی نہیں جاتا پھر مولانا کو ایک بڑی رقم نذر کی اور خلعت شاہانہ سے نوازا۔ مولانا جمال الدین مرحوم کی نظر اس نکتہ پر پہنچ گئی کہ زانیہ کو صدقہ دینا افضل ہے تاکہ وہ بھی زنا سے بچیں اور مسلمان نوجوان بھی اس بلا سے بچے رہیں۔

افسوس ہے آج کل اہل اموال کو اس طرف توجہ نہیں۔ اُن کو لازم ہے کہ اسمبلی کے ذریعے یہ قانون مُسلمانوں کے واسطے پاس کرائیں کہ ہر مسلمان مرد، عورت کو سینما، تھیٹر وغیرہ دیکھنا جُرم ہے۔ ہر مسلمان مرد عورت کو شراب کی خرید و فروخت اور استعمال جُرم ہے اور ہر مُسلمان عورت کے لیے زنا کاری کو ذریعہ کسبِ معاش بنانا جُرم ہے۔

قانونی طور پر ان افعال کو جُرم قرار دیا جائے اور ان پر سزائے تازیانہ یا قید خانہ مقرر کرائی جائے اور مُسلمان ریاستوں کو بھی اپنی ریاست میں مُسلمانوں کے واسطے اسی قسم کے قانون پاس کرنا چاہیئے۔ نیز زناکار عورتوں کو شادی پر مجبور کیا جائے اور جب تک شادی نہ ہو، صدقات و خیرات سے اُن کی خبر گیری کی جائے۔

مجھے یاد ہے کہ حضرت حکیم الامتہ رحمتہ اللہ علیہ کے پاس ایک رنڈی کا خط آیا کہ میں نے آپ کی کتاب بہشتی زیور پڑھ کر زنا سے توبہ کر لی ہے مگر اب اس

پیشہ کے میرے پاس کوئی ذریعہ کسب معاش کا نہیں۔ دُعا کیجئے کہ میں اپنی توبہ پر قائم رہوں۔ حضرت اقدس نے جواب دیا کہ میں تمہارے واسطے دُعا کرتا ہوں اور جب تک تمہاری شادی نہ ہو جائے ماہوار پندرہ روپیہ برابر تمہارے پاس پہنچتے رہیں گے۔ چنانچہ بہت دنوں تک یہ رقم جاتی رہی۔

(۱۷۲) مُسلمان کے پاس جو کچھ بھی ہے عطیۂ حق تعالیٰ ہے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ دُنیا کا تمام سامان جو کچھ بھی (انسان کے پاس) ہے، اللہ تعالےٰ کی طرف سے اپنے بندوں کو عطیہ ہے۔ خدا تعالیٰ پر کسی کا کچھ حق نہیں۔ اس کی دلیل حدیث کا یہ جُملہ ہے فینفق مما اعطاہ اللہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اُسے عطا فرمایا ہے اُس میں سے خرچ کرے۔ تو سب کو عطیہ قرار دیا گیا ہے۔ یہی اہلِ سُنت کا مذہب ہے اور یہی حق ہے۔

حدیث سے اس صدقہ کرنے والے کی فضیلت بھی معلوم ہوئی (کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُس کے فعل کو صحابہ کے سامنے بیان فرمانا اس کی دلیل ہے کہ حضورؐ اُس کے اتباع کی ترغیب دے رہے ہیں کہ دُوسروں کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے) اور فضیلت کی وجہ یہ ہے کہ اس شخص نے شریعت اور حقیقت دونوں کو جمع کر دیا۔ کیونکہ جب اُس نے صدقہ کی اور تقدیر اُس کی تجویز سے موافق نہ ہُوئی (کہ جس کو صدقہ کا مستحق سمجھا تھا وہ مستحق ثابت نہ ہُوا) تو اُس نے اللہ تعالےٰ کی حمد کی اور تسلیم و رضا سے کام لیا یہ تو حقیقت پر مبنی عمل تھا اور اسی کی برکت سے اُس کا عمل سالم رہا (ضائع نہ ہُوا جیسا بعد میں پیامِ الٰہی نے بتلایا) اور شریعت کا ادب یہ تھا کہ اُس نے صدقہ کا اعادہ کیا اور تین بار اعادہ کیا۔

ہر دفعہ میں شریعت و حقیقت کو جمع کرتا رہا اور یہ بڑا بلند حال ہے جیسا پہلے بھی کئی جگہ بتلایا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ ہم کو بھی اپنے فضل سے بلا مشقت

کے یہ حال (رفیع) عطا فرمائیں۔ (آمین)۔

قوله فيه دليل على ان جميع متاع الدنيا هبة من الله الى قوله من الله علينا بها بلا محنة بمنه۔

ف۔ شریعت اور حقیقت دونوں کو جمع کرنا اہلِ طریق کا خاص وظیفہ ہے ؎

بر کفے جامِ شریعت بر کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نہ داند جام و سندان باختن

اہلِ طریق کو عُلماء ظاہر سے اسی امر میں امتیاز ہے کہ وہ شریعت اور حقیقت دونوں کو جمع کرتے ہیں۔ علماء ظاہر صرف شریعت کا اظہار کرتے ہیں حقیقت کا نہیں۔



باب ۴۲

حدیث
صدقة المرأة من مال زوجها

"عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا انفقت المرأة من طعام بیتها غیر مفسدة کان لها اجرها بما انفقت ولزوجها اجرہ بما کسب و للخازن مثل ذلک لاینقص بعضهم اجر بعض شیئا"

(ترجمہ) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب عورت اپنے گھر کے کھانے میں سے کچھ خرچ کرے بشرطیکہ گھر کو بربادی نہ لگائے تو عورت کو خرچ کرنے کا ثواب ملے گا اور شوہر کو کمانے کا ثواب ملے گا اور خزانچی کے لیے بھی یہی حکم ہے۔ ایک دُوسرے کے ثواب کو ذرا بھی کم نہ کرے گا۔"

شرح ظاہر حدیث کا مطلب واضح ہے مگر دونوں جگہ مالک کی اجازت شرط ہے۔ کیونکہ کسی کا مال بدون اُس کی اجازت کے خرچ کرنا جائز نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لا یحل مال امرأ مسلم الا عن طیب نفس منہ۔ کسی مسلمان کا مال بدون اس کی خوشی کے حلال نہیں۔ ہاں اجازت میں زبان سے ہی ہونا شرط نہیں بلکہ عرف وعادت بھی کافی ہے۔ جیسے سائل کو روٹی کا ٹکڑا دے دینا یا کسی کو نمک یا آگ یا پانی دے دینا یا روٹی کے لیے خمیر دے دینا کہ

عرفاً ان چیزوں میں تنگی نہیں کی جاتی بلکہ عورت کو اجازت اور وسعت ہوتی ہے اور ان چیزوں کا دینا مستحب بھی ہے۔ حدیث میں اس شخص کے متعلق جو کسی کو نمک دیدے وارد ہوا ہے کہ اُس کو اس شخص کے برابر ثواب ملے گا جو اس کھانے کو صدقہ کردے جو اسی نمک سے تیار ہوا ہے۔

خمیر دینے والے کے بارے میں بھی ایسا ہی وارد ہوا ہے۔ اسی طرح کوئی کسی کو آگ دے دے تو جتنا کھانا اُس آگ پر پکایا جائے گا اُس کے صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا اور کسی کو ہانڈی دے دے تو جتنا کھانا اس ہانڈی میں پکے گا (جب تک بھی پکتا رہے گا) اُس کے صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا۔ اس کے متعلق بہت احادیث ہیں جن سے تھوڑی سی چیز کے دینے پر بہت ثواب بیان کیا گیا ہے۔ ان چیزوں سے انکار کرنا مروّت اور حسنِ معاشرت کے بھی خلاف ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے بعثت لاتمم مکارم الاخلاق میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ تو عرفاً عورت کو ان چیزوں کے دینے کی اجازت ہوتی ہے۔ اس لیے ان چیزوں کا مانگنا معیوب نہیں اور ان میں بخل کرنا سخت معیوب شمار ہوتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ما وقی به المرأ عرضه کتب له صدقة۔ جس چیز کے ذریعے انسان اپنی آبرو کو بچائے اس میں بھی اس کو صدقہ کا ثواب ملتا ہے۔ مگر یہ کہ مالک یا شوہر کی طرف سے کوئی علامت ایسی پائی جائے جو عرف کے صریح خلاف ہو۔ اس صورت میں اصل پر عمل کیا جائے گا اور عورت کو ان چیزوں کا دینا ممنوع ہو گا یا اسکی مرضی سے زیادہ دینا منع ہو گا۔

یہاں سوال یہ ہے کہ جب مال شوہر کا ہے تو عورت کو کس بات کا ثواب ملیگا؟ جواب یہ ہے کہ عورت بھی اپنے شوہر کی خزانچی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے الخازن الذی یعطی ما امر به طیبة به نفسه احد المتصدقین کہ جب خزانچی اُس چیز کو خُوش ہو کر دیدے جس کے دینے کا اُسے حکم

ہُوا ہے تو وہ بھی صدقہ کرنے والوں میں سے ایک ہوگا (تو عورت کو بھی خزانچی کی طرح صدقہ کا ثواب ملے گا۔ رہی خزانچی کے لیے ثواب کی علت تو) کیونکہ جب اُس نے خوشی سے دے دیا اور جس کو دینے کے واسطے کہا گیا تھا اُس کو پریشان نہ کیا بلکہ حکم کے ساتھ فوراً ہی دے دیا تو اُسے مسلمان کا دل خوش کرنے کا ثواب ملے گا۔ کیونکہ دیر کرنے میں (ایک تو لینے والے کو پریشانی ہوتی ہے دوسرے) یہ بھی احتمال ہے کہ دینے والے کی نیت بدل جائے تو دیر کرنا محتاج کے حرمان کا سبب اور جلدی کرنا احسان کا سبب ہوگا۔ کیونکہ دے دینے کے بعد اگر مالک کی نیت بدلے گی تو یہ بہت بعید ہے کہ وہ اُس کے ہاتھ میں سے واپس لینے کی کوشش کرے تو چونکہ خزانچی خوشی کے ساتھ جلدی دے دینے میں مالک کی اعانت نیک کام میں کر رہا ہے اس لیے ثواب کا مستحق ہوگا۔ پھر خزانچی جس قدر سہولت اور عجلت کے ساتھ رقم دے گا اسی قدر لینے والے کو خوشی اور فرحت ہوگی جس سے احسان میں زیادتی ہوتی ہے اور جس چیز سے احسان میں زیادتی ہے وہ بھی احسان ہی ہے۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا فائدہ واضح ہوگیا کہ خزانچی بھی صدقہ کرنے والوں میں سے ایک ہے (جب کہ خوشی کے ساتھ وہ رقم دے دے جس کے دینے کا اُسے حکم ہُوا ہے)۔

نیز ایک اور حقیقت بھی ہے وہ یہ کہ نفس انسانی کی فطرت میں حرص اور بخل ہے۔ اُس کے قبضہ میں دُنیا کا جو سامان بھی ہو وہ اُس کو اپنے ہاتھ سے نکالنا نہیں چاہتا۔ اگرچہ وہ یہ بھی جانتا ہو کہ یہ اُس کی مِلک نہیں ہے، تو جب وہ کچھ خرچ کرے گا ثواب ملے گا۔ کیونکہ خرچ کرنے میں نفس کی طبعی حالت کی مخالفت اور حکم الٰہی کی موافقت ہے۔

دیکھو تمام عالم جانتا ہے کہ جو کچھ اُن کے پاس دُنیا کا سامان ہے وہ سب اللہ تعالےٰ کی مِلک ہے اور اُن کے ہاتھ میں بطور عاریت کے (امانت) ہے

اور اُس میں سے تھوڑی مقدار کے خرچ کرنے کا اُن کو حکم ہُوا ہے جس پر بہت ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے اور باقی میں برکت کا اور اگر خرچ نہ کریں تو عذاب کی وعید ہے اور باقی مال سے برکت کے اُٹھ جانے کی دھمکی ہے۔ پھر بھی صدقہ واجبہ ادا کرنے والے بہت کم ہیں۔

اسی طرح خزانچی جانتا ہے کہ اُس کے قبضہ میں جو کچھ ہے مالک کا ہے اور اگر وہ مالک کے حکم کے بعد کسی کو دینے میں دیر کرے گا مجرم ہوگا اور اگر جلدی کرے گا سہولت سے دے دے گا تو ثواب ملے گا پھر بھی تم بہت کم لوگوں کو ایسا پاؤ گے جو لوگوں کو پریشان کئے بغیر رقم دے دیں، کیونکہ اُن کو مال کے ساتھ تعلق طبعی ہو جاتا ہے۔

اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ انسان جب تک ستر شیطان کے جبڑے کلّے نہیں توڑ لیتا اُس وقت تک صدقہ نہیں کرتا (مطلب یہ کہ شیطان اُس کے مال پر دانت بھینچے بیٹھے رہتے ہیں۔ جب یہ صدقہ کا ارادہ کرتا ہے وہ اس کو روکتے ہیں اُن کا منہ توڑ کر یہ صدقہ کر پاتا ہے۔"

(الشیطان یعدکم الفقر و یأمرکم بالفحشاء واللہ یعدکم مغفرۃ منہ وفضلا ط)

مگر مالک اور خزانچی میں فرق یہ ہے کہ مالک تو یہ سمجھتا ہے کہ مال اُس کے ہاتھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ قیامت تک اُس کا حساب اسی کے ذمے رہے گا اور خزانچی یہ سمجھتا ہے کہ مالک اُس کو معزول کر کے اپنا مال واپس لے سکتا ہے اور اگر مال اُس کے پاس بھی رہا تو اُس کا فائدہ مالک ہی کو پہنچے گا۔ پھر بھی حرص و طمع کی وجہ سے کسی کو دینے میں حیلہ و حجت کرتا ہے۔ اس میں بھی حکیم کی حکمت ہے۔

(ھذا خلاصۃ ما ذکرہ الشاد ح فی شرحہ)

(۱۷۳) مخالفتِ نفس میں ثواب ہے بشرطیکہ شرعاً ممنوع نہ ہو !

اس حدیث سے صُوفیہ کے طریق کی خُوبی (اور فضیلت) ظاہر ہے کیونکہ (اُن کا عمل اسی پر ہے کہ) جس کام میں نفس کی مخالفت ہو اور شرعاً ممنوع نہ ہو اس میں ثواب ہے۔ اس قاعدہ کی قواعد شرعیہ کے موافق جس قدر بھی تحقیق کروگے انشاء اللہ صحیح پاؤگے کہیں ٹوٹے گا نہیں۔ اس لیے اہلِ طریق نے مخالفتِ نفس کو اپنا دستور العمل بنا لیا ہے یہاں تک کہ ایک نصرانی راہب نے اسی واسطے اسلام قبول کر لیا کہ اُس نے مخالفتِ نفس کا عہد کر رکھا تھا تو ایک مُسلمان عالم نے اُس کی حسنِ عبادت دیکھ کر تعجب کیا۔

نصرانی راہب نے اُن سے پوچھا۔ آپ نے میرا حال کیسا پایا ؟
فرمایا۔ بہت اچھا ہے مگر ایک بات کی کسر ہے۔ کہا وہ کیا ؟ فرمایا بس یہ کہ تم مُسلمان نہیں ہو۔

نصرانی نے کچھ دیر کے لیے سر جھکا لیا پھر اسلام لے آیا۔ اس پر اُس کے گرجا والے شور کرنے لگے۔ اُس نے کہا، بتلاؤ مجھے تمہارے اندر یہ مرتبہ کس چیز سے حاصل ہُوا ؟

سب نے بالاتفاق کہا کہ مجاہدہ اور مخالفتِ نفس کی وجہ سے۔ کہا اسی چیز نے مجھے اسلام پر مجبور کیا۔ کیونکہ جب اس عالم نے میرے سامنے اسلام کا ذکر کیا تو میرے نفس نے اس کو قبول نہ کیا۔ اس سے مَیں سمجھ گیا کہ اسلام حق ہے اور مَیں نے جو کچھ پایا ہے نفس کی مخالفت سے پایا ہے تو مَیں نے مخالفتِ نفس ہی کے لیے اسلام قبول کر لیا اور سمجھ گیا کہ اسلام دین برحق ہے کیونکہ نفس حق ہی سے بھاگتا ہے۔ اس کے بعد اُس کا اسلام بہت اچھا ہوگیا۔

" قوله فيه دليل لحسن طريق اهل الصوفة الى قوله وحسن اسلامه "

ف ۔ اصل مجاہدہ مخالفتِ نفس ہی ہے۔ کیونکہ نفس اکثر شہوات و محرمات کی طرف راغب ہوتا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ کھانا پینا اور سونا بھی چھوڑ دو کہ نفس تو ان کاموں کی طرف بھی راغب ہے۔ کیونکہ یہ رغبت شہوت حرام نہیں بلکہ مامور بہا ہے۔ اسی طرح بیوی بچوں کی محبت اور دلداری بھی رغبت حرام نہیں بلکہ مامور بہا ہے۔ ان چیزوں میں مخالفت نفس جائز نہیں۔ البتہ ان میں حدود کی رعایت لازم ہے۔ حد سے زیادہ رغبت میں نفس کی مخالفت کی جائے اور اس کے حدود کا اجمالی علم حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے واعظ " حفظ الحدود " اور "حقوق البیت" کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے اُن کو پیشِ نظر رکھا جائے۔



باب ٧٣

حدیث

اتلاف اموال الناس

بخاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص لوگوں کا مال اس نیت سے (قرض) لے کہ اُن کو ہضم کر جائے گا اللہ تعالےٰ اُس کو برباد کر دیں گے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہُوا کہ جس شخص کے پاس قرض ادا کرنے کا کوئی سامان نہ ہو اُس کو قرض لینا جائز نہیں۔ اسی طرح جس کے بیوی بچے ہوں اُس کو اپنا تمام مال صدقہ کرنا بھی جائز نہیں۔ کیونکہ اس صُورت میں وہ اپنے بال بچوں کا حق ہضم کر کے اُن کو پریشان کرے گا) مگر یہ کہ وہ صبر کے ساتھ معروف ہو، اپنے نفس پر دُوسروں کو ترجیح دیتا ہو اگرچہ خود فاقے سے ہو۔ جیسا حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے کیا کہ اپنا سارا مال صدقہ کر دیا (اور گھر پر اللہ اور رسول کے نام کے سوا کچھ نہ رکھا) اسی طرح انصار نے مہاجرین کو ترجیح دی (خود تنگی اُٹھائی مہاجرین کو راحت پہنچائی) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال ضائع کرنے سے منع کیا ہے (خواہ اپنا مال ہو یا دُوسروں کا) پس کسی کو یہ جائز نہیں کہ صدقہ کے بہانہ سے لوگوں کا مال ضائع کرے (یعنی صدقہ کرنے کے لیے لوگوں سے قرض لے اور قرض لے کر ادا نہ کرے۔ صدقہ کے لیے بھی قرض لینا ایسے شخص کو جائز نہیں جس کے پاس ادائے قرض کا سامان نہ ہو۔ یہ حدیث محدثین کی اصطلاح میں تعلیق یا معلق کہلاتی ہے اور بخاریؒ کی تعلیقات حجت ہیں جبکہ جزم کے

ساتھ مذکور ہوں کیونکہ وہ دُوسرے طرق سے موصول ہوتی ہیں۔

شرح اگرچہ حدیث کا لفظ عام ہے مگر لوگوں کا مال لینے سے مُراد قرض لینا ہے۔ کیونکہ قرض لینے کی چند شرطیں ہیں جن کی بہت لوگ رعایت نہیں کرتے جس کی وجہ سے لوگوں کے اموال ضائع ہو جاتے ہیں۔ فقہاء نے قرض لینے کے لیے جو شرطیں بیان فرمائی ہیں وہ یہ ہیں :-

(۱) اس کے پاس اتنا سامان ہو جس سے ہر حال میں قرض کو ادا کر سکے۔

(۲) یا مضطر ہو کہ اُس پر تین وقت کا فاقہ گزر چکا ہے جس کی وجہ سے دُوسروں کے مال میں اُس کا حق واجب ہو گیا ہو۔ کیونکہ ایسے محتاج کو اگر کوئی دینے سے انکار کرے تو اُس کو لڑ کر اُس سے کھانا وغیرہ لینا جائز ہے۔ اگر مالدار مارا گیا تو وہ بُرا مقتول ہو گا اور مضطر مارا گیا تو شہید ہو گا۔ پھر علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ فراخی میسّر آنے کے بعد مضطر کو وہ مال جو اُس نے جبراً دُوسرے سے لیا ہے واپس کرنا واجب ہے یا نہیں (حنفیہ کا قول یہ ہے کہ واپس کرنا واجب ہے اور یہی قول جمہور کا ہے) خلاصہ یہ کہ قرض لینے کی چار صُورتیں ہیں جن میں سے تین جائز ہیں۔ ایک ناجائز ہے۔

(۱) یہ کہ اُس کے پاس اتنا سامان موجود ہو جس سے قرض کو ہر حال میں ادا کیا جا سکے (زندگی میں بھی مرنے کے بعد بھی) یہ تو بالاتفاق جائز ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ اُس کے پاس قرض ادا کرنے کا سامان نہیں۔ مگر اُس نے قرض دینے والے سے اپنا حال بیان کر دیا کہ میرے پاس اس قرض کے ادا کرنے کا کچھ سامان نہیں اگر کچھ میرے پاس آ گیا ادا کر دوں گا۔ ورنہ مجھ سے مطالبہ نہ کیا جائے۔ یہ بھی جائز ہے گو بعض علماء کا اس کے جواز میں اختلاف ہے مگر ظاہر یہی ہے کہ جائز ہے۔

(۳) اس کے پاس قرض ادا کرنے کا سامان نہ ہو مگر اس میں وہ اوصاف مجتمع ہوں جو صدیق اکبر اور مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم میں موجود تھے۔ یعنی

صبر و توکّل اور کثرتِ سخاوت اور بدون ضرورت شرعیہ کے قرض نہ لے اور ضرورت سے زیادہ قرض نہ لے ۔ اس صُورت میں بھی قرض لینا جائز ہے۔ قواعد شرعیہ اس کے جواز پر دلالت کرتے ہیں ۔

(۴) اس کے پاس قرض ادا کرنے کا سامان نہ ہو، نہ ضرورت شرعیہ موجود ہو نہ مال والے سے اپنا فلاس بیان کرے اس صُورت سے قرض جائز نہیں اور یہی صُورت ہے جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بددُعا دی ہے۔ کیونکہ شرعی ضرورت کو بہت لوگ نہیں جانتے۔ عوام ہی نہیں بلکہ علماءِ ظاہر بھی نہیں جانتے۔ اُنہوں نے اپنے واسطے کچھ قاعدے خود بنا لیے ہیں جن کو شرعی ضرورت میں شمار کر لیا ہے (مثلاً مہمان نوازی اور لنگر خانے کا جاری کرنا کہ جب) ہم سے کوئی ملنے آتا ہے تو اُس کو کھانا کیسے نہ کھلایا جائے حالانکہ مہمان وہ ہے جو قرابت کی وجہ سے ملنے آئے یا اُس کا مقصود صرف ملاقات ہو۔ کوئی اور غرض دنیوی یا دینی نہ ہو جیسے طلب اصلاحِ نفس یا تعلیم و تلقین ذکر حاصل کرنا یا کسی مقدمہ وغیرہ کے لیے دُعا کرانا یا تعویذ وغیرہ لینا کہ ان اغراض کے لیے آنے والا مہمان نہیں ہوتا اور جو مہمان ہو اُس کے لیے بھی تکلف کرنا اُس وقت تک جائز ہے جبکہ وسعت ہو ورنہ جو کچھ گھر میں موجود ہو وہی مہمان کے سامنے پیش کر دینا چاہیئے۔ اس سے زیادہ تکلف نہ کیا جائے اور اگر فاقہ ہو تو مہمان سے کہہ دینا چاہیئے کہ میرے یہاں آج فاقہ ہے تم بھی فاقہ کرو۔ جب خداتعالیٰ دے گا ہم بھی کھائیں گے تم بھی کھانا۔ مگر تم دیکھو گے کہ علماء بھی ان شرائط کا لحاظ نہیں کرتے مہمان نوازی اور لنگر خانے کے لیے قرض پر قرض لیتے رہتے ہیں اور اس طریقہ سے لوگوں کا مال لینا اپنے لیے مباح سمجھتے ہیں اور دل میں یوں کہتے ہیں کہ ہم مضطر ہیں لوگوں کے مال میں ہمارا حق واجب ہو چکا ہے۔ ہم کو قرض لینے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ جو کچھ ہم لے رہے ہیں ہمارا حق ہے ۔

اس پر امام بخاریؒ نے یہ قید بڑھا کر تنبیہ کی ہے کہ بدون سامان ادا کے قرض لینا اُسی شخص کو جائز ہے جو صبر کے ساتھ معروف ہو۔ یہ نہیں کہ ضرورت کے

وقت خود اپنے دل سے یہ سمجھ لے کہ مَیں قرض لے کر نفس کو مجاہدہ میں ڈالوں گا اور لوگوں کے تنگ کرنے پر صبر کر لوں گا۔ یہاں تک کہ ان کا حق ادا ہو جائے اس شخص سے کہا جائے گا کہ یہ سب حدیث النفس ہے اور نفس بڑا خیانت کرنے والا ہے۔ صابر وہ ہے جس کو عام طور پر لوگ صابر سمجھتے ہوں۔ یہ نہیں کہ خود اپنے دل سے اپنے کو صابر سمجھنے لگے (اور ضرورت شرعیہ وہ ہے جس کو شریعت کے جاننے والے فقہاء ضرورت کہیں۔ خود تمہارا اپنے دل سے کسی ضرورت کو شرعی ضرورت قرار دینا کافی نہیں) پھر معروف بالصبر ہونے کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ یہ صبر ایثار کی شان سے ہو اور ایثار بھی اللہ تعالےٰ کے واسطے ہو کہ اللہ تعالےٰ کی رضا کو اپنی ذاتی ضرورتوں پر مقدّم کرتا ہو۔ یہ نہیں کہ شہرت کے واسطے یا غرض نفسانی کے واسطے صبر کرتا ہو یا مجبوری کا صبر ہو کہ اس کے پاس کچھ ہے نہیں (اس حالت میں صبر نہ کرے تو کیا کرے) اس حالت میں صبر نہ کرنے یا کم صبر کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ صبر کرنا، صبر نہ کرنے سے اچھا ہے۔ اگرچہ ایسا صبر کرنے والا مردوں کی صف میں کھڑا نہیں ہو سکتا اور نہ اُس کو اہلِ وفا میں شمار کیا جائے گا۔

صابر وہ ہے جو صبر کے ساتھ ایثار میں بھی معروف ہو کہ دُوسروں کو اپنے اُوپر ترجیح دیتا ہو، اگرچہ خود فاقہ اور احتیاج اور تنگی میں مُبتلا ہو۔ ان شرطوں کو دیکھو اور ان میں غور کرو۔ کیا اس زمانے میں اُن کا وجود کسی میں ممکن ہے ؟ (بالکل نہیں) مگر یہ کہ شاذ و نادر (کسی ایک دو میں ہوں تو ہوں) پس ہم نے جو قرض کی چار صُورتیں بیان کر کے تین کو جائز اور ایک کو ناجائز بتلایا ہے یہ فقہی تقسیم ہے کیونکہ احکام بیان کرنے والے پر تمامی احکام کا بیان کر دینا ضروری ہے۔ گو اُن میں سے کوئی صُورت نادر ہی کیوں نہ ہوں جس کا وقوع ممکن نہ ہو۔ اسی لیے یہ تقسیم بیان کر دی گئی۔ ورنہ ہماری حالت کے اعتبار سے تو صرف دو ہی صُورتیں جائز ہیں اور دو ناجائز ہیں۔ کیونکہ تیسری صُورت جس

میں حضرت صدیق اکبر اور حضرات مہاجرین و انصار کے ایثار کو دلیل میں بیان کیا گیا ہے آج کل جائز نہیں کیونکہ اُس کی شرطیں اس زمانہ میں عام طور سے مفقود ہیں۔ (ھذا خلاصة ما ذکرہ الشارح فی شرحه۔)

(۱۷۴) بلا ضرورت قرض لینا ہی ممنوع ہے

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اپنا اور) دوسروں کا مال ضائع کرنے سے عموماً منع فرمایا ہے تو تم کو اس عموم کی تخصیص کا حق نہیں کہ یوں کہنے لگو کہ میں تو صدقہ کرنے کے لیے قرض لے رہا ہوں اور یہ اضاعت مال میں داخل نہیں۔ بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) یہ بھی سراسر اضاعت ہے۔ جب تک تم دوسرے کو صاف صاف نہ بتلادو کہ میں یہ قرض صدقہ کرنے کے واسطے لے رہا ہوں۔ (میرے پاس اس کے ادا کرنے کا کوئی سامان بھی نہیں) اگر اللہ تعالیٰ نے میرے پاس کچھ بھیجدیا تمہارا قرض ادا کردوں گا ورنہ مجھ پر کوئی مطالبہ تمہارا نہ ہوگا۔ اگر وہ اس پر راضی ہوجائے تو خیر ورنہ صدقہ کے واسطے بھی قرض لینا جائز نہیں۔

اس میں علاوہ اس کے کہ تم اپنی رائے سے شارع علیہ السلام کے عام لفظ کو خاص کررہے ہو ایک علت اور بھی ہے وہ یہ کہ تمہارے ذمہ پر تو ایک حق لازم ہوگیا اور جو صدقہ تم نے کیا ہے اُس کا قبول ہونا یا نہ ہونا محتمل ہے تو جو حق ثابت ہوچکا ہے اُس سے ایک مشکوک اور محتمل چیز کیونکر تم کو بری کرسکتی ہے۔ (پس یہ خیال لغو ہے کہ اگر قیامت میں قرض دینے والے نے مطالبہ کیا تو میں وہ ثواب اُس کو دے دوں گا۔ جو صدقہ سے مجھے ملا ہے۔ کیونکہ ثواب ملنا قبول ہونے کی فرع ہے اور قبول ہونا محتمل ہے) تو شرعاً و عقلاً (کسی طرح) یہ صورت جائز نہیں۔ تم کو اس خطرناک صورت کے ارتکاب پر اُن حکایات سے جرأت نہ کرنا چاہیئے جو بعض بابرکت حضرات سے منقول ہیں۔ مثلاً ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ اُن کے زمانے میں سخت قحط ہوا تو انہوں نے بہت سا مال قرض لے کر اور اُس سے غلہ خرید کر مسکینوں کو تقسیم کردیا۔ جب مال والے اپنے مال کا مطالبہ کرنے آئے بزرگ نے

وضو کرکے دو رکعتیں پڑھیں اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ مجھے ان لوگوں کے سامنے ذلیل و رسوانہ کیجئے۔ پھر فرمایا بوریا اُٹھا کر دیکھو کیا اُس کے نیچے کچھ نظر آتا ہے؟ اُنہوں نے بوریا اُٹھایا تو اُس کے نیچے بہت مال تھا فرمایا اپنے مال کے برابر لے لو۔ اُنہوں نے (شمار کیا تو) اُس کو برابر سرابر پایا۔ تو ان بزرگ کے واقعہ میں چند احتمالات ہیں ایک یہ کہ اُن کا (رزق کے بارے میں) حق تعالیٰ کے ساتھ خاص معاملہ تھا انہوں نے اُسی کے موافق عمل کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے من رزق من باب فلیلزمه جس کو جس دروازے سے روزی ملتی ہو اُسی کو چمٹا رہے اور اہل توفیق (میں بزرگان دین) نے فرمایا ہے کہ جس شخص کے لیے اللہ تعالیٰ خرق عادت کے طور پر کوئی دروازہ خیر کا کھول دیں تو شرعاً وہ اُسی کے ساتھ مخصوص ہے (دوسروں کو اس کی تقلید جائز نہیں) اور یہ بھی احتمال ہے کہ وہ بزرگ مستجاب الدعوات ہوں (اُن کی دُعا قبول ہوتی ہو، رد نہ ہوتی ہو اور اُن کو اللہ تعالیٰ کا معاملہ اپنے ساتھ معلوم ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ جب اُن کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچا تھا تو اُن کا صدقہ قبول ہوگیا اور جب اللہ تعالیٰ نے صدقہ قبول کرلیا تو وہ حاجت کے وقت اپنے بندہ کو ضائع کرنے والے نہیں تھے حاشا و کلا (اور صدقہ کا قبول ہوجانا صدق نیت اور خلوص سے معلوم ہوسکتا ہے)۔

پس جس شخص کو یہ حالت نصیب نہ ہو اُس کو ان جیسے بزرگوں کی تقلید (ایسے افعال میں) جائز نہیں۔ کیونکہ ان حضرات کے حالات (و کرامات) کو تو تسلیم کیا جائیگا مگر اُن کی تقلید نہیں کی جائے گی اور نہ اُن پر اعتراض کیا جائے گا۔ کیونکہ (ہمارے اندر) وہ حال نہیں جو ان اعمال کا سبب ہے۔ اسی لیے بعض اہل طریق کا ارشاد ہے جب تم نے اپنا سب کام اللہ تعالیٰ کے سپرد کردیا اور تمہارا دل اُس کے دروازہ سے چمٹ گیا اور تمہارا ہاتھ دُنیا سے رُک گیا اور تمہارا حال اللہ تعالیٰ کے امر و نہی سے گھر گیا (یعنی تمہارا کوئی حال مرضی الٰہی کے خلاف نہ ہوا) تو تم دنیا سے الگ ہو اگرچہ دُنیا میں لگے رہے۔ غرض صحت حال کی علامت اُنہوں نے یہ بتلائی ہے

کہ ہر طرح امر و نہی سے گھرا ہُوا ہو۔ یہی سب باتوں کا خلاصہ ہے (یعنی تصوف کا حاصل ہے) اور یہی وہ امر حق ہے جس پر تمام اہلِ حال و اہلِ قال (صوفیہ و علماء متفق ہیں (سب کے نزدیک کمال اس کا نام ہے کہ بندہ اللہ تعالےٰ کی ادامر و نواہی کی تعمیل میں بدرجۂ کمال لگا رہے) اللہ تعالےٰ ہم کو بھی اُن میں سے کرے جن پر یہ انعامات ہوئے ہیں۔ انہ ولی حمید قولہ اذا منع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اضاعۃ مال الغیر عموما الی قولہ ولی حمید۔

ف ۔ حضرت حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہٗ فرماتے تھے کہ میرے پاس ایک بزرگ پنجاب کے آئے جن پر چار ہزار روپیہ قرض ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے ایک رئیس کے نام سفارش چاہتے تھے۔ مَیں نے سفارش کر دی۔ پھر دریافت کیا کہ آپ کے ذمے اتنا قرضہ کیونکر ہُوا؟ کہا میرے یہاں لنگر خانہ ہے جتنے بھی مُرید آتے ہیں لنگر خانہ سے کھانا کھاتے ہیں۔ پہلے تو ایسا ہوتا تھا کہ لوگ کھاتے بھی تھے اور نذرانہ بھی دیتے تھے۔ اب کچھ دنوں سے یہ ہو رہا ہے کہ لوگ لنگر خانہ سے ہفتوں کھانا کھا جاتے ہیں اور کچھ دیتے نہیں اس لیے قرضہ ہو گیا۔

یہ حکایت بیان کر کے حضرت نے فرمایا کہ مَیں نے اسی واسطے اپنے یہاں لنگر خانہ نہیں رکھا۔ بس جو آتا ہے اُس کو بتلا دیا جاتا ہے کہ قیام کی جگہ یہ ہے اور طعام کا انتظام فلاں فلاں کرتے ہیں اُن سے معاملہ طے کر لو۔ لنگر خانہ کر کے کون یہ دردِ سر مُول لے کہ کس نے کتنے دن کھایا اور کس نے کیا دیا؟ اب اگر کوئی مجھے کچھ بھی نہ دے تو مجھے وسوسہ نہیں آتا اور جو دیتا ہے بڑے نخروں سے لیتا ہوں کہ اس میں ہدیہ کی شرائط بھی موجود ہیں یا نہیں؟ لنگر خانہ کرنے کے بعد یہ تھوڑا ہی ہوتا ہے کہ ہدیہ میں شرائط و خلوص کی تحقیق کی جائے الحمد ماشاء اللہ۔ دیکھئے یہ بیچارے لنگر خانہ کر کے کس قدر پریشان ہُوئے اور مریدوں نے بھی غضب ہی کیا کہ آئے کھا گئے اور دیا دلایا کچھ بھی نہیں۔ جب اُن کو معلوم تھا کہ شیخ کے پاس نہ زمین ہے نہ جائیداد ہے اور نہ کوئی اور آمدنی ہے، لنگر خانے کا مدار مریدوں ہی کے نذرانہ

پر ہے۔ ایسی حالت میں ہفتوں ٹھہر کر کھا جانا اور بدوں نذرانہ دیئے چلے جانا شیخ کو تکلیف ہی دینا ہے۔ چنانچہ بے چاروں کو اپنے مذاق کے خلاف ایک رئیس کے پاس سفارش لے جانے کی نوبت آ گئی۔

مَیں کہتا ہوں یہ بھی غنیمت ہے کہ ان بزرگ کو قرض ادا کرنے کی تو فکر ہُوئی۔ بعضے تو اس کی بھی پرواہ نہیں کرتے اور یہ سمجھ کر کہ ہم نے تو صدقہ کے واسطے قرض لیا ہے اگر ادا نہ ہُوا تو کیا ہے قیامت میں قرض والا مواخذہ کرے گا تو وہ ثواب اُس کو دے دیں گے جو صدقہ سے ہم کو ملا ہو گا۔ سبحان اللہ! اور اگر ثواب ہی نہ ملا ہو بلکہ عذاب لکھا گیا ہو تو کیا دے دو گے؟ یہ سب نفس کے بہلنے ہیں جن سے وہ گناہ کو ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ مگر اللہ تعالےٰ کے سامنے یہ بہانے اور بے ہُودہ دلیلیں نہیں چل سکتیں۔

پس سالکین کو قرض سے بہت بچنا چاہیئے۔ حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہٗ نے اپنی وصیت میں تحریر فرمایا ہے کہ بندہ کے ذمے قرض کبھی نہیں ہوتا۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو قرض اپنی وسعت و ہمت سے زیادہ نہ کیا جائے اور فکر کر کے جلد ادا کیا جائے تاکہ حدیث کی وعید سے محفوظ رہیں۔



باب ۴۷

حدیث

الامر بالصدقة علی کل مُسلم

ابی بردہ اپنے باپ (بردہ) سے روایت کرتے ہیں (رضی اللہ عنہما) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر مُسلمان کے ذمّہ صدقہ ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر کوئی (صدقہ کے لیے کوئی چیز) نہ پائے (یعنی مفلس غریب ہو تو وہ کیونکر صدقہ کرے) فرمایا اپنے ہاتھوں سے (کچھ) کام کرے جس سے اپنے کو بھی نفع پہنچائے اور صدقہ بھی کرے۔ عرض کیا اگر کوئی (اُس کی بھی طاقت) نہ پائے (کہ اُس کو کوئی دست کاری نہیں آتی ہو) فرمایا وہ کسی حاجت مند پریشان کی مدد کرے۔ عرض کیا اگر اُس کا بھی موقع نہ پائے (خواہ اس وجہ سے کہ اُس کے سامنے کوئی محتاج مصیبت زدہ نہیں ہے یا جس قسم کی مدد کی اُس کو ضرورت ہے اُس سے یہ عاجز ہے) فرمایا تو وہ نیک کام کرتا رہے بُرے کاموں سے بچتا رہے یہی اُس کے لیے صدقہ ہے۔

شرح حدیث کا ظاہر یہ ہے کہ اُس میں صدقہ کا امر ہے اور صدقہ کرنے کے لیے کوئی ذریعہ اختیار کرنے کا بھی حکم ہے اور بظاہر یہ امر استحبابی ہے وجوبی نہیں۔ دُوسری احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں منجملہ ان کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے لاصدقة الاعن ظهر غنی۔ صدقہ نہیں ہے مگر غنا کے بعد۔ اور یہاں ہر مُسلمان کا صدقہ بیان کیا گیا ہے تو یہ واجب نہیں نیز

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاشت کی دو رکعتوں کی بابت فرمایا کہ وہ اس صدقہ کو ادا کرتی ہیں (جو یہاں مذکور ہے) جبکہ صدقہ پر قدرت نہ ہو اور اس حدیث کے آخر میں جو حضورؐ نے یہ فرمایا ہے کہ نیک کام کرتا رہے بُرے کاموں سے بچتا رہے یہی اُس کے لیے صدقہ ہے تو یہ مستحب نہیں بلکہ واجب ہے خواہ صدقہ کرے یا نہ کرے۔ کیونکہ بُرا کام کرنا اور اچھا کام چھوڑنا کسی حال میں جائز نہیں۔ لیکن (یہ بھی کہا جا سکتا ہے) یہاں نیک کاموں سے مُراد وہ اعمال ہیں جو واجب سے زیادہ ہیں (اسی طرح بُرے کاموں سے مراد وہ اعمال ہیں جو کبائر کے علاوہ ہیں اور واجبات سے زیادہ کام کرنا اور کبائر کے علاوہ صغائر سے بھی بچنا) یہ صدقہ ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اچھی بات بھی صدقہ ہے اور راستہ سے تکلیف کی چیز ہٹا دینا بھی صدقہ ہے اور اپنے مُسلمان بھائی سے بشاشت اور خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا بھی صدقہ ہے۔ اوکما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور اس سے معلوم ہُوا کہ دین سارے کا سارا ہی مطلوب ہے۔ فرض بھی اور مستحب بھی اور دونوں کا شریعت میں پورا اہتمام ہے۔ حدیث میں صدقہ کی فضیلت پر بھی دلالت ہے (هذا خلاصة ماذكره الشارح فی شرحه۔)

(۱۷۵) تصوّف کی بُنیاد سخاوت اور ایثار پر ہے

اسمیں صوفیہ (کے طریق) کی بھی دلیل ہے، جنہوں نے اپنے طریق کی بُنیاد سخاوت اور ایثار پر ہی قائم کی ہے۔ چنانچہ اُن میں سے ایک جماعت سے منقول ہے کہ وہ اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ رات کو اُن کے گھر میں صدقہ کی کوئی چیز رہے (بلکہ رات سے پہلے پہلے اُس کو خیرات کر دیتے تھے) فيه دليل اهل الصوفة الی قوله من الصدقة المعلومة فی بیوتهم۔

(۱۷۶) لوگوں میں فقیر کم اور غنی زیادہ ہیں

حدیث سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ لوگوں میں (فقیر کم اور) غنی

زیادہ ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اطلاق کے ساتھ ہر مسلمان پر صدقہ لازم فرمایا ہے حالانکہ یقیناً بعض ایسے بھی تھے جن کے پاس کچھ بھی نہیں (تو اس کی وجہ بظاہر یہی ہے کہ لوگوں میں زیادہ تر غنی ہوتے ہیں غرباء کم اس لیے آپ نے اوّل مطلقاً ہر شخص پر صدقہ لازم فرمایا۔ شاذ و نادر کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ جب صحابہ نے عرض کیا کہ کسی کے پاس صدقہ کرنے کے لیے کچھ نہ ہو تو اس وقت فقیروں کا حکم بیان کر دیا گیا)۔

بعض علماء نے مساکین کی قلت پر اس بات سے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے صدقہ واجبہ میں صرف چالیسواں حصّہ فرض کیا ہے اور وہ بھی مطلقاً نہیں، بلکہ بقدر نصاب مال ہونے پر واجب کیا ہے کہ چاندی پانچ اوقیہ (دو سو درہم یعنی ساڑھے باون تولہ) ہو اور سونا بیس دینار (یعنی ساڑھے سات تولہ) ہو اور علیم رحیم (جس کا علم بھی کامل ہے اور رحمت بھی کامل ہے) اپنے (غریب) بندوں کے لیے ایسی مقدار مقرر نہیں کر سکتا جو اُن کے واسطے کافی نہ ہو حالانکہ وہ ان کا شمار بھی جانتا ہے اور حالت سے بھی باخبر ہے الا یعلم من خلق وھو اللطیف کیا جس نے پیدا کیا ہے وہ بھی نہ جانے گا حالانکہ وہ بڑا باریک بین اور پُوری طرح باخبر ہے تو چونکہ اللہ تعالےٰ کو معلوم تھا کہ مساکین کم ہوں گے اور یہ بھی معلوم تھا کہ (جتنے بھی ہوں گے) ان کو (اغنیاء کی دولت کا) چالیسواں حصّہ کافی ہو جائے گا تو یہی مقدار فرض کر دی گئی اور اغنیاء سب کے سب اس مقدار زکوٰۃ کو جو اللہ تعالےٰ نے اُن پر واجب کی ہے نکالتے رہیں تو کبھی کسی مسکین کو بھیک مانگنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

قولہ فیہ دلیل علی ان الیسارۃ فی الناس اغلب الی قولہ

ما احتاج مسکین لان یسأل احدا۔

ف ۔ اس دلیل کا یہ مقدمہ تو یقیناً صحیح ہے کہ اغنیاء مسلمین کی دولت کا چالیسواں حصّہ اور زمینداروں کی پیداوار زمین کا عُشر غرباء مُسلمین کے لیے کافی

ہے اور اگر اغنیاء زکوٰۃ و عشر نکالتے رہیں تو کسی مسلمان مسکین کو بھیک مانگنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر زمانے میں مسلمانوں میں فقیر کم اور اغنیاء زیادہ ہوں گے۔ کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی وقت فقیر زیادہ ہوں اور اغنیاء کم مگر اُن کی دولت اتنی زیادہ ہو کہ اُس کی زکواۃ اور عُشر تمام فقراء کے لیے کافی ہو جائے۔

پس اس وقت مُسلمانوں میں افلاس زیادہ ہونے کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اغنیاء باقاعدہ پُوری زکوٰۃ اور عشر نہیں نکالتے اور یہ مرض اغنیاء میں آج سے نہیں بلکہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ اسی لیے صدیوں سے مسلمانوں میں افلاس بڑھ رہا ہے۔ دُوسرے یہ کہ ہندوؤں کے اختلاط سے مُسلمانوں کی ایک جماعت نے بھیک مانگنے کو عیب سمجھنے کے بجائے ہُنر سمجھ لیا اور اس کو مُستقل پیشہ بنا لیا ہے۔ اُن کو لاکھ کہا جائے کہ ہٹے کٹے تندرست آدمی کو بھیک مانگنا جائز نہیں۔ تم کو مزدوری کرنا چاہیئے یا دستکاری سیکھ کر پیٹ پالنا چاہیئے مگر اُن کی عقلیں مسخ ہو گئی ہیں وہ بھیک مانگنے ہی کو ہُنر سمجھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مُسلمان مالداروں کی خیرات کا زیادہ حصّہ انہی کے قبضہ میں جاتا ہے اور یہ لوگ ہزار ہا روپیہ جمع کرنے کے بعد بھی بھیک مانگنا نہیں چھوڑتے۔ چنانچہ جب وہ مرتے ہیں اُن کی جھونپڑیوں میں سے ہزار ہا روپیہ نکلتا ہے۔ پس ان کو غریب اور فقیر سمجھنا غلط ہے اور ان کو زکوٰۃ و صدقات دینا رقم برباد کرنا ہے۔

پس مُسلمانوں کو سب سے پہلے زکوٰۃ کا انتظام کرنا چاہیئے پھر ہر شہر اور ہر قصبہ کے امراء کو اپنی بستی کے فقراء کی تحقیق کرنا چاہیئے۔ تحقیق کے بعد زکوٰۃ دی جائے اور اُن سے کہہ دیا جائے کہ زکوٰۃ کی رقم کے بھروسہ ہی پر نہ رہو بلکہ جو کچھ اس وقت تم کو دیا جا رہا ہے اُس سے تجارت یا اور کوئی کاروبار شروع کرو۔ تاکہ تم اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ۔ پہلے زمانے کے فقراء ایسے ہی تھے وہ ایک دفعہ زکواۃ لے کر اُس سے کاروبار کرنے لگتے تھے۔ البتہ یتیم بچے اور بیوہ

عورتیں یا بوڑھے اور اپاہج مجبوراً زکوٰۃ کے بھروسہ پر رہتے تھے جن میں سے یتیم بچے تو تعلیم و تربیت سے فارغ ہو کر جب بالغ ہو جاتے اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاتے تھے اور بیوہ عورتیں دُوسری شادی کو عیب نہ جانتی تھیں وہ بھی کچھ دنوں کے بعد زکوٰۃ سے مستغنی ہو جاتی تھیں۔ اگر اب بھی اس کا رواج پُوری طرح ہو جائے تو بیوہ عورتیں بہت کم رہ جائیں۔ اور ظاہر ہے کہ اپاہج اور معذور کی تعداد زیادہ نہیں۔ اس طریقہ پر انتظام کے ساتھ عمل کیا جائے تو یقیناً مال دار اور زمین دار مسلمانوں کی زکوٰۃ و عشر مسلمانوں کا افلاس دُور کرنے کے لیے کافی ہو جائے۔

(۱۷۷) کسبِ معاش کی فضیلت حدیث سے کسبِ معاش کی فضیلت بھی معلوم ہو رہی ہے بشرطیکہ شریعت کے موافق ہو اور اُس سے دین میں مدد ملتی ہو لفظ یعمل بیدہ اس پر دال ہے جس سے ان تمام صنعتوں کا جواز مفہوم ہوتا ہے جو ہاتھ سے کی جاتی ہیں (بشرطیکہ شریعت کے خلاف نہ ہوں) حدیث میں یہ بھی بتلا دیا گیا کہ اپنی ضرورت کو صدقہ پر مقدم کرنا چاہیئے۔

چنانچہ ارشاد ہے یعمل بیدہٖ فینفع نفسہ و یتصدق (جس کے پاس صدقہ کرنے کے لیے کچھ نہ ہو) اپنے ہاتھ سے کچھ کام کرے پھر اپنے کو فائدہ پہنچائے اور صدقہ بھی کرے۔ تو حضورؐ نے دستکاری کے بعد اپنے کو فائدہ پہنچانا پہلے بیان کیا پھر صدقہ کو بیان کیا۔ اس میں تم غور کرو گے تو بڑا عجیب اشارہ پاؤ گے۔ کیونکہ اگر آپ صرف اتنا کہہ دیتے یعمل بیدہٖ و یتصدق کہ وہ اپنے ہاتھ سے کچھ کام کرے اور صدقہ کرے تو صحابہ کے سوال کا تو جواب ہو جاتا۔ کیونکہ وہ تو صدقہ ہی کے بارے میں سوال کر رہے تھے مگر کسی کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ بس میں تو صدقہ کرنے کے واسطے کام کروں گا اور خود اپنی ذات کے لیے اللہ تعالیٰ پر توکل کروں گا جو وہ دیں گے لے لوں گا۔ حضورؐ نے ینفع نفسہ بڑھا کر بتلا

دیا کہ اپنے کو نفع پہنچانا مقدم ہے کیونکہ سب سے بڑا صدقہ یہ ہے کہ انسان اپنا بوجھ دُوسروں پر نہ ڈالے امر اہم کو مقدم کرے۔ اس کے بعد صدقہ کرے۔ پھر یہ لفظ انسان کی تمام ضرورتوں کو عام ہے خواہ اس کی ذات سے متعلق ہوں یا اہل و عیال سے یا اپنے گھر کی حاجت سے جو عادۃً بشر کو لاحق ہوتی ہیں بشرطیکہ شریعت کے موافق ہوں کہ یہ قید تو تمام حالات میں لازم ہے۔ وفیہ دلیل علیٰ فضل التکسب الی قولہ فان ھذا اصل فی کل الامور۔

ف ۔ تم دیکھتے ہو کہ شریعت میں صدقہ کا کس طرح اہتمام ہے کہ جس کے پاس کچھ نہ ہو وہ بھی اپنے ہاتھ سے کسبِ معاش کرے اور اپنی حاجت کو پُورا کر کے کچھ صدقہ کرے اس کی وجہ ایک تو وہی ہے کہ شریعت مُسلمانوں کے افلاس کو دُور کرنا چاہتی ہے۔ شریعت اس کو گوارا نہیں کرتی کہ تندرست ہٹا کٹا آدمی ہو دُوسروں کے ہاتھ کو دیکھے بلکہ اُسے خود کسبِ معاش کر کے دُوسروں پر صدقہ کرنا چاہیئے۔ اگر ہر تندرست مسلمان اس پر عمل کرنے لگے اور کوئی بھی بیکار نہ رہے کسی نہ کسی کام میں لگ جائے خواہ مزدوری ہی کرنے لگے یا جنگل سے گھاس اور لکڑی کاٹ کر بیچے یا اور کوئی صنعت و حرفت اختیار کرے تو یقیناً مُسلمانوں میں بھیک مانگنے والا کوئی باقی نہ رہے۔

دوسری وجہ صدقہ کے اہتمام کی یہ ہے کہ اس سے بخل کا مادہ نکل جاتا اور سخاوت پیدا ہوتی ہے۔ جو شخص صدقہ کا اہتمام کرے گا اور روزانہ کچھ نہ کچھ خیرات کرنے کا التزام کرے گا تم دیکھو گے کہ کچھ عرصہ کے بعد اُس میں سخاوت کی صفت پیدا ہو جائے گی۔ جو اخلاقِ حمیدہ میں اعلیٰ درجہ کی صفت ہے۔ نیز صدقہ کی عادت سے دُنیا کی محبت بھی دل سے نکل جائے گی اسی لیے صوفیہ نے فرمایا ہے کہ سخاوت زہد کا دروازہ ہے بلکہ وہی عین زہد ہے۔ صدقہ کا اہتمام وہی کرتا ہے جس کے دل میں دُنیا کی محبت نہ ہو اور اگر کسی کے دل میں دُنیا کی محبت ہو بھی تو صدقہ کی عادت سے انشاء اللہ دل اس گندگی سے پاک

ہو جائے گا (حب الدنیا رأس کل خطیئة ، دُنیا کی محبت ہی تمام گناہوں کی جڑ ہے۔ جب یہ دل سے نکل جاتی ہے، پھر گناہوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا اور نیکیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

(۱۷۸) نفع متعدی نفع لازم سے افضل ہے حدیث کا مفہوم تمام انواع (صدقات) کے بتلانے کے بعد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً صدقہ کی ترغیب دی ہے کیونکہ اس کا نفع متعدی ہے جب اُس سے عاجز ہو تو اُس کے قریب یا اُس کے قائم مقام کی ترغیب دی کہ (ہاتھ سے) کام کرے پھر خود بھی نفع حاصل کرے صدقہ بھی کرے کیونکہ اس کا نفع بھی متعدی ہے جو یہ بھی نہ کر سکے تو اُس کے قائم مقام اس امر کی ترغیب دی کہ کسی حاجت مند پریشان کی مدد کرے (کہ اس کا نفع بھی متعدی ہے) اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ نیک کاموں میں ان جیسا (اُن کے برابر) کوئی کام نہیں۔ لیکن جو معروف یعنی جو بھلائی بھی ہو سکے کرے۔

معروف سے مراد وہ عمل ہے جو شرعاً پسندیدہ اور مستحب ہو اگرچہ اتنا ہی ہو کہ مُسلمانوں کے راستے میں سے تکلیف دینے والی چیز ہٹا دے یا چاشت کی دو رکعتیں پڑھ لیا کرے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے کو مستحب کام سے خالی نہ رکھے۔ کوئی مستحب کام (فرائض و واجبات سے زیادہ) کر لیا کرے اگرچہ تھوڑا ہی ہو (معمولی ہی درجہ کا ہو) کیونکہ اس میں بھی صدقہ یعنی ثواب ہے اور اگر تم کسی مستحب پر بھی قدرت نہیں رکھتے تو تمہارا شر سے رُک جانا یعنے بُرے کاموں کو جو شرعاً ممنوع ہیں چھوڑ دینا بھی صدقہ ہے اس پر بھی تم کو ثواب ملیگا۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن لوگوں کو تسلّی دی ہے جو (فرائض و واجبات سے زیادہ) مستحبات کے بجالانے سے عاجز ہوں، بشرطیکہ واقعی عاجز ہوں خواہ مخواہ) عاجز بنتے نہ ہوں کہ ان کو شر سے بچنے میں بھی ثواب

ملے گا۔ پس وہ بُرے کاموں سے بچتے رہیں۔ اور یہ تسلی ویسی ہی ہے جیسے ایک حدیث میں آیا ہے کہ فقراء صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ مالدار (صحابہ) صدقہ کی وجہ سے ہم پر سبقت لے گئے (نماز، روزہ وغیرہ تو وہ بھی کرتے ہیں ہم بھی کرتے ہیں مگر وہ صدقہ بھی کرتے ہیں اور ہم اس سے عاجز ہیں) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں تم کو ایسی بات بتلاتا ہوں جو صدقہ سے بھی (تمہارے واسطے) بہتر ہے۔ تم ہر نماز کے بعد ۳۳ بار سبحان اللہ اور ۳۳ بار اللہ اکبر اور ۳۳ بار الحمد للہ کہو اور لا الہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وہو علیٰ کل شیئٍ قدیر) کہہ کر سو کا عدد پُورا کر دیا کرو یہ (صدقہ سے بھی) بڑھ کر ہے۔ اغنیاء صحابہ کو یہ خبر پہنچی تو وہ بھی ہر نماز کے بعد یہ عمل کرنے لگے۔

فقراء پھر حضورؐ کے پاس واپس آئے اور کہا یا رسول اللہ! اغنیاء نے تو وہ عمل بھی شروع کر دیا (جو آپ نے خاص ہم کو بتلایا تھا) حضورؐ نے فرمایا کہ یہ اللہ کا فضل ہے وہ جس کو چاہے عطا کرے (یعنی اب تم کو یہ تمنا نہ کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ اُن کو فضیلت نہ دیں ولا تتمنوا ما فضل اللہ بہ بعضکم علیٰ بعض) اور یہاں سے معلوم ہُوا کہ شریعت ہم سے پُورے دین (پر عمل) کا مطالبہ کرتی ہے فرائض کا بھی نوافل کا بھی اور مستحبات کا بھی۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ اولاً فرض کو مقدم کیا جائے پھر مستحبات و نوافل میں جو اعلیٰ ہو اُس کو اختیار کیا جائے اور جو سب ہی کو بجا لائے (سبحان اللہ) اُس کے کیا کہنے ہیں اور جو مستحبات میں سے ادنیٰ کو بجالائے اعلیٰ کو چھوڑ دے اُس نے پسندیدہ طریقہ کو چھوڑ دیا لیکن پھر بھی وہ خیر سے محروم نہیں ہوگا اور جو شخص مستحبات میں سے کچھ بھی نہ بجالائے اُس نے اپنے کو بہت خسارہ میں رکھا تو اب وہ بُرے کاموں ہی سے بچتا رہے اس پر بھی اُس کو ثواب ملے گا۔ اگر یہ بھی نہ کیا تو اُس کے ہاتھ سے دین جاتا رہا اُس کے پاس دین کا کوئی نشان نہیں۔ نسأل اللہ العافیة بمنتہ۔ قولہ فمفھوم

الحدیث علی ھذہ التنویہات الیٰ قولہ نسأل اللہ العافیۃ ۔

ف ۔ صوفیہ اور فقہاء میں یہ قاعدہ مشہور ہے کہ نفع متعدی لازم سے افضل ہے اسی لیے اُن اعمال کو افضل کہا جاتا ہے جن کا نفع متعدی ہے ۔ مگر یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ قاعدہ مستحبات و نوافل میں ہے فرائض میں نہیں ورنہ لازم آئے گا کہ زکوٰۃ نماز سے افضل ہو حالانکہ بالاتفاق ایمان کے بعد تمام اعمال سے افضل نماز ہے حالانکہ اُس کا نفع لازم ہے اور زکواۃ کا نفع متعدی ہے ۔ مگر فرائض میں قاعدۂ مذکورہ جاری نہیں ۔ یہ قاعدہ مستحبات میں ہے کہ جس مستحب کا نفع متعدی ہو وہ اُس سے افضل ہے جس کا نفع لازم ہے اور مستحبات میں بھی یہ قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ اکثریہ ہے کہ بعض دفعہ شیخ مبصر طالبِ حق کے لیے اُن اعمال کو ترجیح دیتا ہے جن کا نفع لازم ہے ۔ اس کو وہی سمجھتا ہے جس کو امراض قلب پر پوری نظر ہے وہ جانتا ہے کہ جس شخص کی اصلاحِ نفس پوری طرح نہیں ہوئی اس کو نفع متعدی کا اہتمام مفید نہیں ہوتا بلکہ عجب و کبر کا سبب بن جاتا ہے اس لیے مبتدئ سلوک کو خدمتِ خلق کے خیال سے بھی روکا جاتا ہے ۔

جیسا بعض لوگ ذکر و شغل و اصلاحِ باطن میں اس قصد سے مشغول ہوتے ہیں کہ اپنی اصلاح و تکمیل کے بعد ہم دوسروں کی اصلاح کریں گے ۔ یہ خیال عجب و کبر سے پیدا ہوتا اور اُس کو بڑھاتا ہے ۔ مبتدی سلوک کو صرف اپنی اصلاح کا قصد کرنا چاہیئے یہ وسوسہ بھی نہ لانا چاہیئے کہ بعد میں دوسروں کی اصلاح کروں گا ۔ اسی طرح اس کو واعظ کہنے سے بھی منع کیا جاتا ہے کیونکہ لوگوں کی تعظیم و تکریم سے اُس کا دماغ خراب ہو جاتا ہے واعظ میں خلوص پیدا نہیں ہوتا ۔ وہ ایسی تقریر کرنے کی خواہش کرتا ہے جس سے لوگوں میں تعریف ہو نام مشہور ہو تو ایسا نفع متعدی کس کام کا جس میں اخلاص نہ ہو ۔ جملہ اعمال کی روح اخلاص ہے ۔ اگر اخلاص نہیں ہے تو عمل مقبول نہیں خواہ اُس کا نفع لازم ہو یا متعدی ۔

مَیں نے حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ سے سُنا کہ ایک دفعہ حضرت مولانا محمود الحسن صاحب صدر مدرس مدرسہ دیوبند کانپور میں خدام کے اصرار سے وعظ کے لیے کھڑے ہوئے ۔ اُس وقت اتفاق سے کسی مسئلہ منطق کی تقریر درمیان میں آگئی ۔ حضرت مولانا نے اس مسئلہ کی ایسی تشریح فرمائی کہ علماءِ منطق نے بھی نہ سُنی ہوگی ۔ اثناءِ تقریر میں ایک بہت بڑے معقولی عالم تشریف لے آئے ۔ حضرت مولانا کی نظر جو اُن پر پڑی فوراً تقریر بند کر کے بیٹھ گئے ۔ جب جلسہ منتشر ہوگیا تو ایک بزرگ نے عرض کیا کہ آپ نے فلاں صاحب کے آنے پر تقریر کیوں بند کر دی ؟ یہی تو موقع اس تقریر کا تھا تاکہ اُن کو بھی معلوم ہو جاتا کہ علماءِ دیوبند معقول و منطق میں بھی کسی سے کم نہیں ۔ فرمایا ہاں یہی خیال تو میرے دل میں بھی آگیا تھا کہ اب موقع ہے اسی لیے تقریر بند کر دی ۔

مطلب یہ تھا کہ جب وعظ میں اس خیال سے کوئی تقریر کی جائے کہ اب موقع ہے اب مخالفوں کو بھی ہمارا کمال معلوم ہوگا تو خلوص کہاں باقی رہا ۔ اس وقت تقریر بند کر دینا چاہیئے ۔ سبحان اللہ! یہ حضرات اطباءِ قلوب تھے نفس کے مکر و کید پر ہر وقت اُن کی نظر رہتی ہے ۔ اگر ہم جیسے ہوتے تو کسی نہ کسی تاویل سے خلوص کا دعوےٰ کر لیتے اور تقریر بند نہ کرتے ۔ مثلاً یہی تاویل کر لیتے کہ ہم اپنا کمال نہیں ظاہر کرتے بلکہ اپنے بزرگوں اور اُستادوں کا کمال ظاہر کرنا چاہتے ہیں مگر اللہ تعالےٰ کے سامنے یہ تاویلیں نہیں چل سکتیں ؎

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام ۔۔۔ در غلط اندازی تا ہر خاص و عام

با خدا تدبیر و حیلہ کے رواست

کار با او راست باید داشتن ۔۔۔ رایت اخلاص و صدق افراشتن

پس صدقہ کرنے والے کو بھی اخلاص کا اہتمام کرنا چاہیئے اسی لیے صدقۂ نافلہ کو چھُپا کر دینا افضل ہے کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا ہے ۔

(تنبیہ) یہاں ایک سوال ہے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کیوں فرمایا کہ کسی حاجت مند پریشان کی مدد کردے۔ حالانکہ ثواب تو ہر مسلمان کی مدد کرنے میں ملتا ہے، خواہ حاجت مند ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اللّٰہ فی عون العبد مادام العبد فی عون اخیہ۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد کرتے ہیں جب تک وہ اپنے بھائی (مسلمان) کی مدد میں لگا رہے۔ جواب یہ ہے کہ ثواب تو ہر مسلمان کی مدد میں ملتا ہے مگر جب صحابہ نے صدقہ کی انواع سے سوال کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ اُن کو ایسے اعمال بتلادیں جن کا ثواب صدقہ کے برابر ہو۔

سو ظاہر ہے کہ حاجت مند پریشان کی مدد میں ثواب زیادہ ہے اگر حاجت مند نہ ہو تو ثواب کم ہے اور حاجت مند ہو پریشان نہ ہو، جب بھی اس قدر ثواب نہ ہوگا جتنا حاجت مند پریشان کی مدد میں ہے۔ پس اس صفت کے زیادہ ہونے سے مدد کا ثواب اس قدر ہو گیا کہ صدقہ فوت ہونے کی تلافی ہو جائے گی۔ پھر یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ یہاں مدد سے مراد مالی امداد نہیں کیونکہ یہ عمل اُس شخص کے واسطے بتلایا گیا ہے جو صدقہ مالیہ سے بالکل عاجز ہے۔ مدد سے یہاں مراد یہ ہے کہ پریشان آدمی کو پریشانی سے نکلنے کا راستہ بتلا دیا جائے اگرچہ اپنے پاس سے کچھ نہ دو۔ مثلاً اُس سے یوں کہدو کہ میں تم کو ایک صُورت بتلاتا ہوں جس سے یہ پریشانی دُور ہو جائے گی۔ اتنا کہنے سے ہی پریشان آدمی کو اس درجہ خوشی ہوگی کہ صدقہ لینے سے نہ ہوتی۔ مثلاً ایک آدمی راستہ بھُول گیا ہے تم اُس سے کہو کہ آؤ میں تم کو اُس جگہ پہنچا دوں گا جہاں تم جانا چاہتے ہو۔ یقیناً گم کردہ راہ کو تمہاری اس بات سے بے حد خوشی ہوگی یا کسی پر مقدمہ قائم ہو گیا ہے تم اس سے کہو کہ میں تم کو فلاں رئیس کے پاس پہنچائے دیتا ہوں وہ تمہاری سفارش حاکم سے کردے گا۔ خود سوچ لو کہ اتنا کہنے سے پریشان آدمی کو کس قدر تسلی ہوگی یا کسی کا کوئی عزیز قریب مرگیا ہو اور وہ اُس کے غم میں پریشان ہو تم اُس کی تسلی و تعزیت کے لیے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگو اور اُس کا غم غلط کردو تو اُس کو کس قدر راحت ہوگی۔ پس جو شخص کسی مسلمان کی مالی امداد نہ کر سکے وہ ان طریقوں سے کسی پریشان آدمی کی پریشانی کو دُور کرنے کا اہتمام کرے تو اُس کو بھی صدقہ کا ثواب ملے گا۔

ہمارے بزرگوں میں حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی رئیس الاتقیا تھے۔ ایک دفعہ آپ پیادہ سفر کر رہے تھے اور عادت اکثر پیادہ سفر کرنے کی تھی۔ راستہ میں ایک بُوڑھے کو دیکھا سر پر لکڑیاں لادے ہوئے جا رہا ہے، اور بوجھ کی وجہ سے سانس پھول رہی ہے۔ آپ آگے بڑھے اور اُس سے کہا بھائی تم تھک گئے ہو۔ لاؤ کچھ دُور تک میں یہ بوجھ لے لوں۔ اُس نے مقدس صُورت دیکھ کر کہا کہ تم بھی تو بُوڑھے ہو مُجھ سے کچھ زیادہ مضبوط نہیں معلوم ہوتے فرمایا ہاں ٹھیک ہے مگر میں خالی ہاتھ سفر کر رہا ہوں اس لیے تم سے زیادہ تھکا ہُوا نہیں۔ اُس نے کہا مگر تمہاری صُورت شریفانہ ہے تم نے بوجھ اُٹھانے کا کام کب کیا ہوگا؟ فرمایا نہیں بھائی کام تو سب ہی کو کرنا پڑ جاتا ہے۔ غرض بہت اصرار کے ساتھ اس سے لکڑیوں کا بوجھ لے کر اس کے گاؤں تک پہنچایا۔ اُس کا گاؤں ایک دو میل کے فاصلہ پر تھا۔ راستہ میں باتیں ہونے لگیں تو وہ بوڑھا پوچھتا ہے کہ میاں تم مولوی مظفر حسین صاحب کو بھی جانتے ہو جو کاندھلہ میں رہتے ہیں۔ فرمایا ہاں جانتا ہوں۔ کہا مجھے اُن سے ملنے کا بہت ہی شوق ہے۔ نہ معلوم وہ آج کل کاندھلہ ہیں یا کہیں باہر ہیں۔ جب اُس کا گاؤں آگیا اور اُس نے آپ کے سر پر سے بوجھ اُتار لیا اُس وقت فرمایا کہ بھائی مظفر حسین تو میرا ہی نام ہے کاندھلہ رہتا ہوں اور وہیں جا رہا ہوں لوگ مولوی مظفر حسین بھی کہہ دیتے ہیں۔ یہ سُن کر بُوڑھا پیروں میں گر پڑا کہ حضرت یہ آپ نے کیا کیا؟ فرمایا کیا حرج ہے، مسلمان مسلمان کے کام آ ہی جاتا ہے۔ یہ بھی حاجت مند پریشان کی مدد کی ایک صُورت ہے اور تم سوچو گے تو

اور بہت سی صُورتیں سمجھ میں آجائیں گی ۔

اللہ تعالےٰ مُسلمانوں کو اس کی توفیق عطا فرمائیں کہ اپنے حاجت مند پریشان بھائیوں کی پریشانی دُور کرنے کی تدبیریں سوچا کریں اور ان کی مدد کیا کریں ۔ اگر سب مُسلمان بھائیوں میں یہی ایک وصف پیدا ہو جائے تو اُن کے دن پھر جائیں اور یہ صُورتِ حال بدل جائے جو اُس وقت اُن پر وبال کی طرح مسلط ہے جس کا سبب بجز اس کے کچھ نہیں کہ ہر شخص کو اپنی فکر ہے دُوسروں کی فکر نہیں ۔ ہر شخص اپنی غرض کا بندہ ہے ۔ اپنی ذاتی منفعت کو قوم کی منفعت پر مقدم کرتا ہے ۔ جب تک کسی قوم میں یہ مرض موجود ہے وہ کبھی دُنیا میں عزت و راحت حاصل نہیں کر سکتی ۔

(۱۷۹) دُوسروں کو پریشان کرنا گُناہ اور خود کو پریشان کرنا ثواب ہے

اس جگہ ایک بات پر تنبیہ (ضروری) ہے وہ یہ کہ شریعت کی حکمت میں غور کرو کہ دُوسروں کو راحت پہنچانا اور اُن کا دل خُوش کرنا تو ثواب ہے جبکہ اللہ تعالےٰ کے واسطے ایسا کیا جائے اور دُوسروں کو ضرر پہنچانا اور پریشان کرنا گناہ ہے مگر خود اپنے نفس کو پریشان کرنا اس کو مجاہدہ (اور مشقت میں ڈالنا ثواب ہے جب کہ اللہ تعالےٰ کے واسطے کیا جائے ۔ چنانچہ خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے (بطور وصیت کے فرمایا تھا وذعزع بالخوف قلبك فان ذلك مما یرضی ربك ۔ اپنے دل کو خوف سے جھڑ جھڑاتے رہو کہ یہ حق تعالیٰ کو پسند ہے ۔ غور کرو اس میں کوئی حکمت معلوم ہوتی ہے یا نہیں ؟ ہم پہلے کئی بار کہہ چکے ہیں کہ حکیم کوئی کام بدون حکمت کے نہیں کرتا (تو اس میں ضرور کوئی حکمت ہے) چنانچہ اس کی حکمت ظاہر بھی ہے اور مخفی بھی ۔ وہ یہ کہ (واللہ اعلم) اگر تم اپنے آپ کو خوش کرو گے اگرچہ یہ دعوےٰ بھی کرو کہ اللہ تعالےٰ کے واسطے ایسا کر رہے ہو جب بھی نفس کے دسیسہ (اور مخفی کید) سے بہت کم سالم رہو گے کیونکہ اس

میں نفس کو حظ حاصل ہوتا ہے (اور جس عمل میں حظ نفس شامل ہو اس کا اللہ تعالیٰ کے واسطے ہونا بہت دشوار ہے ۔ اس لیے اپنے نفس کو خوش کرنے میں ثواب نہیں بلکہ اس کو مجاہدہ و مشقت میں ڈالنا ثواب قرار دیا گیا) اور یہ سدّ ذریعہ کی جنس سے ہے جو کہ شریعت کا قاعدہ کلیہ ہے (کہ جو چیز کسی وقت شر کا ذریعہ بننے لگے اُس کو شروع ہی سے روک دیا جاتا ہے یہ نہیں کہ ذریعہ بننے کے وقت منع کیا جائے اور پہلے جائز رکھا جائے) اس کی ایسی مثال ہے کہ حق تعالےٰ نے مکّہ کو خشک رکھا کہ وہاں کھیتی نہیں ہوتی اور وہاں تک پہنچنا بھی مشقت سے خالی نہیں تاکہ وہاں جانا اور قیام کرنا خالص اللہ تعالےٰ کے واسطے ہو کیونکہ اُس میں (بظاہر) کوئی ایسی چیز نہیں جو نفس (کی لذّت اور حظ) کے مناسب ہو اور اگر برعکس معاملہ ہوتا کہ مکّہ سرسبزی اور شادابی اور (کثرت) فواکہ میں دمشق جیسا ہوتا تو وہاں جانا اور قیام کرنا خالص عبادت کے لیے نہ ہوتا ۔ کیونکہ اس کی سرسبزی میں حظ نفس اور تفریح بھی شامل ہو جاتی (اسی طرح یہاں سمجھو کہ اپنے نفس کو خُوش کرنے میں چونکہ حظ نفس کی بھی آمیزش ہے اس لیے اُس میں ثواب نہیں بلکہ دُوسروں کو خوش کرنے میں ثواب ہے) ۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ غیروں کو خوش کرنا اگر خالص اللہ تعالےٰ کے واسطے ہو تو اُس میں نفس کو کچھ نہ کچھ تعب ضرور ہوتا ہے ۔ کم از کم یہی بات ہے کہ ہر شخص کا دل ہر قسم کی بھلائی کو اپنے واسطے جمع کرنا چاہتا ہے اب اگر دُوسرے کے لیے ایثار کرے گا (اور اس کو کچھ بھلائی دینا چاہے گا) تو دل پر تعب ہو گا اور یہ (دل کا تعب ظاہر کے تعب سے زیادہ گراں ہے ۔ تو (اس صورت میں) عبادت خالص اللہ تعالےٰ کے واسطے ہو گی اور عبادت کی جڑ اخلاص ہی تو ہے ۔ حق تعالےٰ فرماتے ہیں مخلصین له الدین کہ اللہ کے لیے اخلاص کے ساتھ عبادت کا امر کیا گیا ہے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاص کے اسباب بھی بتلا دیئے تاکہ اس کی برکت سے بندہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے

مدد پہنچے۔ اسی لیے یمن بن ازق رحمۃ اللہ علیہ نے جو دونوں جماعتوں کے بڑے ہیں (علماء کے بھی صوفیہ کے بھی) فرمایا ہے کہ مَیں نے عبادت کے معاملہ میں نظر کی تو غربت (یعنی گھر چھوڑنے) سے زیادہ کسی چیز کو اُس میں معین نہیں پایا۔ کیونکہ وطن اور اہل وعیال اور ہمسایوں کے پاس رہنے میں نفس کو بہت سے موانع (اور حظوظ نفسانیہ) پیش آتے ہیں (جو خالص اللہ تعالےٰ کی طرف متوجّہ ہونے سے روکتے ہیں) ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ اگر وطن سے دُور رہنے میں میرے دین کی اصلاح ہو تو اللہ تعالےٰ وطن اور اہل وعیال (کے پاس رکھ کر) اپنے سے مجھے متوحش نہ کرے جبکہ میری ہمت (اور توجّہ) اللہ تعالےٰ سے وابستہ ہے اور میرا ارادہ اپنے دین کی درستی کا ہے۔ قولہ ھذا تنبیہ وھو المنظر الی حکمۃ الشرع الیٰ قولہ وعزمی فی اصلاح دینی۔

ف ۔ یہاں ایک اشکال ہے وہ یہ کہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں قل بفضل اللہ وبرحمتہٖ فبذلک فلیفرحوا ھو خیر مما یجمعون ۔ آپ اُن سے کہہ دیجئے کہ (جب قرآن ایسی چیز ہے پس ان) لوگوں کو اللہ تعالےٰ کے اس انعام اور رحمت پر خوش ہونا چاہیئے (اور اس کو دولتِ عظیمہ سمجھ کر لینا چاہیئے) وہ اس دُنیا سے بدرجہا بہتر ہے جس کو جمع کر رہے ہیں "۔ اس آیت میں نعمتِ قرآن سے خوش ہونے کا امر ہے اور جس بات کا امر ہو اُس کے بجالانے میں ثواب یقینی ہے۔ تو اپنے نفس کو خوش کرنے میں بھی ثواب ہُوا۔ نیز ایک حدیث میں ہے اذا سرتک حسنتک وساءتک سیئتک فانت مؤمن۔ جب تم کو اپنے نیک عمل سے خوشی ہو اور بُرے کام سے رنج ہو تو تم مومن ہو۔ اس میں نیک عمل سے خوش ہونے کو ایمان کی علامت بتلایا گیا ہے اور ایمان کی علامت کا مطلوب ہونا اور عمل مطلوب پر ثواب کا ہونا ظاہر ہے۔

جواب یہ ہے کہ آیت میں تو قرآن سے اور اسلام سے خوش ہونے کا امر ہے اور یہ ایسی نعمت ہے جو تمام مسلمانوں کے لیے عام ہے جس سے ہر

مُسلمان کو خوش ہونا چاہیئے اور بحمد اللہ ہر مسلمان کو اس کی خوشی ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ کی آخری کتاب کا وارث اور اُس کے آخری پیغمبر کا اُمتی ہے۔ مگر یہ خوشی وہ نہیں جس سے یہاں بحث ہو رہی ہے۔ یہاں ایسی چیز پر خوشی مراد ہے جو اسی کے ساتھ مخصوص ہو جیسے اپنا علم وعمل وعبادت وغیرہ۔

اور حدیث میں مسّرت سے مراد طبعی مسرت ہے جو بے اختیار نیک عمل سے ہُوا کرتی ہے۔ جیسے گنُاہ سے ایک قسم کی پریشانی اور وحشت ورنج بھی ہر مسلمان کو بے اختیار ہوتا ہے۔ غرض حدیث میں مسرت اختیاری مراد نہیں اور شارح کا مطلب یہ ہے کہ اپنی کسی خاص حالت سے اپنے نفس کو قصداً خوش کرنے میں ثواب نہیں۔ اس پر کچھ اشکال وارد نہیں ہوتا۔ مگر یہ ضرور کہا جائے گا کہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ اکثر یہ ہے کیونکہ بعض دفعہ اپنی کسی خاص حالت سے بھی اپنے نفس کو خوش کرنے میں ثواب ہوتا ہے۔ مثلاً کسی پر بحالتِ قبض حزن وغم یا خوف کا اس قدر غلبہ ہو جائے کہ یاس کے قریب حالت پہنچ جائے۔ اُس وقت اللہ تعالےٰ کی وہ نعمتیں جو خاص اپنے اُوپر ہیں سوچ کر دل کو خوش کرنا اور یاس کو دُور کر کے رجا کی کیفیت پیدا کرنا ثواب ہے۔ کیونکہ خدا کی رحمت سے یاس اور نا امیدی کفر ہے اور رجاء ایمان ہے تو جو خوشی کفر سے بچا کر ایمان کی طرف لائے یقیناً اس میں ثواب ہے۔

اسی طرح اللہ تعالےٰ کی محبّت دل میں غالب کرنے کے لیے اللہ تعالےٰ کی اُن نعمتوں کو جو اپنے ساتھ مخصوص ہیں سوچنا اور اُن سے خوش ہونا ثواب ہے۔ کیونکہ یہ خوشی غلبۂ محبتِ الٰہی کا ذریعہ بن رہی ہے جو کہ شرعاً مطلوب ہے یہی وہ احوال ہیں جن کے لیے شیخ محقق سے رجوع کرنے کی ضرورت ہے، وہی سمجھ سکتا ہے کہ کس کے لیے اپنے دل کو خوش کرنا ثواب ہے اور کس کے لیے اپنے نفس سے مجاہدہ کرنا ثواب ہے۔

ف ۔ اُوپر کہا گیا ہے کہ مکہ میں کوئی ایسی چیز نہیں جو نفس (کی لذت

اور حَظ) کے مناسب ہو۔ مَیں نے یہاں "بظاہر" کی قید اس لیے بڑھا دی ہے کہ باطن میں جمالِ کعبۂ معظمہ اس قدر کشش اور دلربائی رکھتا ہے کہ جب مومن کی اُس پر پہلی بار نظر پڑتی ہے تو سفر کا تمام تکان جاتا رہتا ہے۔ اور اُن تمام مشقتوں کو بھُول جاتا ہے جو وہاں پہنچنے تک پیش آئی تھیں۔ کچھ نہ پوچھئے کہ پہلی نظر سے دل میں کس قدر ٹھنڈک اور انشراح کی کیفیت پَیدا ہوتی ہے جس کے سامنے دُنیا بھر کی لذتیں ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔ بلاتشبیہ کعبۂ معظمہ دُنیا میں جنّت ہے جس طرح جنت میں قدم رکھتے ہی انسان اُن تمام مشقتوں کو بھول جائے گا جو جنت تک پہنچنے میں برداشت کی تھیں اور بے ساختہ کہے گا:

الحمد للہ الذی اذھب عنا الحزن ان ربنا لغفور شکور۔ یہی حال کعبۂ معظمہ کو پہلی بار دیکھ کر ہوتا ہے اور اس کا احساس جس طرح مومن کے دل کو ہوتا ہے کفار کے دلوں کو بھی ہوتا ہے بشرطیکہ دل میں کچھ احساس نیک و بد کا باقی ہو۔ غلبۂ مادیت سے بالکل نہ مسخ ہوگیا ہو۔

کعبۂ معظمہ میں علاوہ انوار باطنیہ کے ظاہری اعجاز بھی ایسا ہے جس سے مومن کا ایمان کامل ہوتا اور کافر کو ایمان کی طرف ہدایت ہوسکتی ہے اگر وہ انصاف سے کام لے۔ ایک یہ کہ کعبۂ معظمہ کی حُرمت کی وجہ سے چاروں طرف کچھ دُور تک مخصوص قطعہ کو زمینِ حرم قرار دیا گیا ہے جس میں شکار کرنا بھی ممنوع اور درختوں کا کاٹنا ناجائز ہے۔ تم دیکھو گے کہ اس زمینِ حرم میں بھیڑیا اور بکری ساتھ ساتھ چلتے ہیں نہ بکری بھیڑیئے سے ڈرتی ہے نہ بھیڑیا اُس پر حملہ کرتا ہے۔ زمینِ حرم سے باہر نکلتے ہی پھر بکری بھیڑیئے کا شکار ہے۔

نیز تم دیکھو گے کہ ہزاروں پرند کعبہ کا چکر کاٹ کر نکلتے ہیں اُس کے اُوپر سے کوئی نہیں جاتا۔ دوسرے تم منیٰ میں دیکھو گے کہ تین پتھروں پر تین دن تک کنکریاں ماری جاتی ہیں اور یہ سلسلہ ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے

چلا آرہا ہے۔ ممکن ہے اُس وقت حجاج کی شمار کم رہی ہو مگر سیّدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج وداع کے بعد سے تو آج تک حجاج کی شمار ہر سال لاکھ دو لاکھ سے کم نہیں ہوتی۔ اب سوچو کہ جن مقامات پر ہزاروں برس سے اسقدر بے شمار کنکریاں پڑتی چلی آتی ہیں وہاں تو ان کنکریوں سے پہاڑ بن جاتا۔ مگر مشاہدہ ہے کہ شام تک کنکریوں کا جس قدر انبارِ عظیم نظر آتا ہے صبح کو اُس کا نشان بھی باقی نہیں رہتا۔ تھوڑی سی محدودے چند کنکریاں پڑی رہ جاتی ہیں باقی سب غائب ہو جاتی ہیں شاید تم کہو کہ حکومت نے اُن کے اٹھوانے کا انتظام کیا ہوگا۔ ہرگز نہیں! کسی کا دل چاہے تو رات دن پہرہ دے کر دیکھ لے اُس کو خود معلوم ہو جائے گا کہ حکومت کی طرف سے اُن کے اٹھوانے کا کوئی بندوبست نہیں۔ پھر یہ کنکریاں کہاں چلی جاتی ہیں؟

حدیث میں آتا ہے کہ جو قبول ہو جاتی ہیں اُن کو فرشتے اُٹھا لیتے اور جنت میں پہنچا دیتے ہیں اور[ع] جو قبول نہیں ہوتیں وہ یہیں رہ جاتی ہیں۔ یہ زندہ معجزہ ہے جو زمانۂ رسالت سے اب تک باقی ہے اور جب تک خانہ کعبہ کا حج ہوتا رہے گا باقی رہے گا۔

ف۔ اُوپر امام یمن بن رزق رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد مذکور ہُوا ہے کہ اصلاح حال اور عبادت کے معاملہ میں غربت یعنی گھر چھوڑنے سے زیادہ اُنھوں نے کسی چیز کو معاون نہیں پایا۔ یہی وہ چیز ہے جس پر اس زمانے میں

ع اور یہاں سے معلوم ہُوا کہ بحمد اللہ حجاج میں ہر زمانے میں مقبول زیادہ ہوتے ہیں اور مردود بہت کم۔ پس وہ جو بمبئی سے ہر سال کسی شیخ احمد خادم روضۂ نبوی کے نام سے ایک اشتہار شائع ہوتا ہے وہ بالکل غلط اور سراسر جھوٹ ہے۔ مدینہ میں کوئی بھی شیخ احمد خادم روضۂ نبوی نہیں ہے۔ نہ معلوم یہ کس ملحد کی حرکت ہے جو ہر سال جھوٹا اشتہار شائع کرتا رہتا ہے۔ مسلمانوں کو اُس پر ہرگز توجہ نہ کرنا چاہیئے اور جس کو بھی وہ اشتہار ملے فوراً جلا دینا چاہیئے۔ ۱۲۔ ظ

ہمارے محترم بزرگ اور مخلص دوست مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت زور دیا کرتے تھے، وہ فرماتے تھے کہ اپنے گھر پر رہ کر پوری اصلاح نہیں ہوتی۔ لوگوں کو دین کے واسطے گھر چھوڑنے کی عادت کرنا چاہیئے کیونکہ گھر پر کچھ ایسے مشاغل مکان اور دُکان اور تعلقات کے لگے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے پُوری طرح انسان کا دل دین کے واسطے فارغ نہیں ہوتا باہر وہ مشاغل اور موانع نہیں ہوتے تو جتنا وقت دین کے واسطے باہر نکل کر دیا جائے گا اُس میں دل کی توجّہ کامل ہوگی اور قلب دین کے واسطے فارغ ہوگا۔ اسی لیے مولانا اس کی بہت تاکید کرتے تھے کہ گھر سے نکلو اور ایک چلّہ یا دو چلّہ یا جتنا وقت بھی سہولت سے دیا جاسکے گھر سے باہر نکل کر دین کے واسطے دو اور اس تمام وقت کو اس طرح تقسیم کرو کہ کوئی لمحہ بھی بے کار ضائع نہ ہو۔ کچھ دیر تعلیم دین حاصل کرو۔ کچھ دیر ذکر اللہ میں مشغول رہو۔ کچھ وقت تبلیغ میں صرف کرو کہ ناواقف مسلمانوں کو کلمۂ اسلام اور اس کے معنی بتلاؤ۔ بے نمازیوں کو نرمی اور شفقت سے نمازی بنانے کی کوشش کرو۔ کچھ دیر تلاوتِ قرآن اور نوافل میں مشغول رہو۔ غرض یہ سارا زمانہ غربت کا ایسے گزارو کہ چند دنوں کے لیے حضراتِ صحابہ کا نمونہ بن جاؤ۔ یہ واقعہ ہے کہ مولانا کے طریقۂ تبلیغ سے فریضۂ تبلیغ بھی ادا ہوتا ہے اور خود اپنے نفس کی بھی اصلاح ہوتی ہے بشرطیکہ اُن اصولوں پر پُوری طرح عمل کیا جائے جو مولانا نے بتلائے ہیں۔ ولمثل ھذا فلیعمل العاملون۔

(۱۸۰) ترکِ عمل پر بھی ثواب ہے جب ترک کرنا واجب یا مستحب ہو

اس حدیث سے بعض اصولیین کا رد ہوگیا جو یہ کہتے ہیں کہ ترکِ عمل پر ثواب نہیں ہوتا (صرف عمل پر ثواب ہوتا ہے یعنی بُرے کام کے چھوڑنے پر ثواب نہیں) کیونکہ وہ عمل نہیں (بلکہ عدم عمل ہے) یہ لوگ راستہ سے چُوک گئے اور گمراہی میں بہت دُور پہنچ گئے۔ وہ محض اپنی عقل سے ثواب (کا قاعدہ) مقرّر کرنا چاہتے ہیں۔ کتاب اور سُنّت کو نہیں دیکھتے۔ چنانچہ کتاب اللہ میں ارشاد ہے [illegible] ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف (ان کافروں سے کہہ دو کہ) اگر وہ (کفر سے) باز آجائیں گے تو اُن کے پچھلے گناہ معاف کردیئے جائیں گے اور باز رہنا [illegible] نیک عمل ہی تو ہے اس میں کچھ شک نہیں (مگر اس میں ایک اشکال ہے [illegible] ضمن فوائد مذکور ہوگا) اور حدیث (ایک دو نہیں اور بھی بہت ہیں منجلہ اُن کے) ایک تو یہی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف ارشاد ہے ولیمسک عن الشر فانھا له صدقة اور شر سے بچتا رہے کہ یہ بھی اُس کے لیے صدقہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام نیک اعمال کو فلیعمل بالمعروف میں جمع فرمادیا ہے (کہ نیک اعمال کرتا رہے) اور جملہ اقسامِ شر کو اسی لفظ میں جمع فرمادیا ہے ولیمسک عن الشر۔

مطلب یہ ہے کہ جو شخص نیک اعمال میں سے کوئی سا عمل کرے یا بُرے اعمال میں سے کسی عمل کو ترک کردے، ہر صُورت میں اُس کے لیے صدقہ (کا ثواب) ہے۔ یہاں تمہارے دل میں یہ کھٹک نہ ہونی چاہیئے کہ صدقہ (کا ثواب) مجموعہ پر ہوگا یعنی نیک عمل کرنے کے ساتھ بُرے عمل کے چھوڑنے پر ثواب ہوگا تنہا بُرے عمل کے چھوڑنے پر نہ ہوگا۔ کیونکہ الفاظِ حدیث اس مفہوم کو ادا نہیں کرتے اور یہ تو معتزلہ کا مذہب ہے اُن کا قول ہے کہ نیکی اُس وقت تک مقبول نہیں ہوتی جب تک بُرے عمل کو نہ چھوڑا جائے۔ جمہورِ اُمّت (کا قول) اس کے خلاف ہے کیونکہ حق تعالےٰ فرماتے ہیں:

فمن یعمل مثقال ذرة خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرة شرا یرہ۔

جو ذرہ برابر نیکی کرے گا اُس کو بھی دیکھ لے گا (یعنی اُس کی جزا پائے گا) اور جو ذرہ برابر بدی کرے گا اُس کو بھی دیکھ لے گا (اب اگر نیک عمل کی جزا بُرے اعمال کے چھوڑنے پر موقوف ہے تو لازم آئے گا کہ ذرہ برابر نیکی کچھ

کام نہ آئے گی۔ حالانکہ یہ نص کے خلاف ہے) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث میں فرماتے ہیں اتق محارم اللہ تکن اعبد الناس۔ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچتا رہ تو سب سے بڑا عابد بن جائے گا (اس میں بھی عملِ خیر کی شرط نہیں صرف عمل شر سے بچنے پر بشارت دی گئی ہے) اور آیات و احادیث اس باب میں بہت ہیں تو سبحان اللہ! یہ لوگ سمجھ بوجھ سے کس قدر محروم ہو گئے۔ قولہ وفیہ ردعلی بعض الاصولیین الی قولہ فسبحان من حرمھم طریق الرشاد ؎

ف۔ میں نے اس مسئلہ کو مسائلِ تصوف میں اس لیے داخل کر دیا کہ صوفیہ نے اس سے اپنی کتابوں میں بحث کی ہے۔ اگرچہ یہ مقاصد میں سے نہیں۔ مگر مسئلہ مشکل ہے جس میں علماءِ امت نے بحث کی ہے اور ممکن ہے آج کل بھی اصولِ فقہ پڑھنے پڑھانے والے اس کو مشکل سمجھ رہے ہوں اس لیے جی چاہا کہ اپنی بساط کے موافق اس کو حل کر دوں کیا عجب ہے کسی کو فائدہ پہنچ جائے۔ اب سنئے۔

حضرت شارح نے اس حدیث سے اُن اصولیین کا رد کیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ترک فعل پر ثواب نہیں ہوتا۔ میں نہیں معلوم کر سکا کہ یہ اصولیین کون ہیں؟ کیونکہ اصولِ حنفیہ میں یہ قول کسی کی طرف منسوب نہیں کیا گیا بلکہ ہماری کتب اصول میں ثواب و عقاب سے اس مسئلہ میں بحث ہی نہیں کی گئی۔ اصل بحث صرف یہ ہے کہ انسان اوامر شرعیہ میں تو بالاتفاق فعل کا مکلف ہے۔ یعنی جس بات کا شریعت میں امر ہے انسان اُس کے کرنے کا مکلف ہے لیکن جن اشیاء سے منع کیا گیا ہے جن کو نواہی کہتے ہیں وہاں فعل کا مکلف ہے یا عدم فعل کا؟ اصولیین کہتے ہیں کہ وہاں بھی فعل کا یعنی نفس کو گناہ سے روکنے کا مکلف ہے اور یہ فعل ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ منہیات میں فعل کا مکلف نہیں بلکہ عدم فعل کا مکلف ہے کہ وہ کام وجود میں نہ آئے خواہ نفس کو روکنے کی وجہ سے وجود میں نہ آئے یا اس لیے کہ اُس کا ارادہ عدم کے ساتھ متعلق ہو۔ اصولیین فرماتے ہیں کہ ارادہ اور مشیت کا تعلق عدم سے نہیں ہو سکتا۔ پس اگرچہ شریعت کا مقصود تو یہی ہے کہ فعل ممنوع وجود میں نہ آئے مگر خود عدم کوئی شے نہیں جس سے مشیت کا تعلق ہو سکے۔ اس لیے ضرور ہے کہ منہیات میں انسان کو کف النفس کا یعنی نفس کو روکنے کا مکلف کہا جائے تاکہ اس سے مشیت متعلق ہو سکے اور اسی طرح قدرت کے تحت میں آ سکے۔ نفسِ عدم سے تو نہ مشیت متعلق ہو سکتی ہے نہ وہ قدرت کے تحت میں آ سکتا ہے اس کا مکلف کیونکر کہا جائے گا؟ معتزلہ کسی دلیل سے یہ تو ثابت نہیں کر سکے کہ عدم فعل قدرت کے تحت میں آ سکتا ہے۔ انھوں نے اصولیین پر یہ اعتراض کر دیا کہ تمہارے قول پر لازم آتا ہے کہ اگر کسی شخص کو فعلِ حرام کی طرف میلان ہی نہ ہو۔ جیسا حضرت صدیق رضؓ سے منقول ہے کہ میرے دل نے شراب کو کبھی نہیں چاہا نہ اسلام میں نہ جاہلیت میں۔ تو ان کو کچھ فضیلت حاصل نہ ہو کیونکہ کف النفس نہیں پایا گیا۔ نفس کو روکنا تو اُسی وقت ہو سکتا ہے جب خواہش ہو۔ اصولیین نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہاں گو کف النفس نہیں پایا گیا مگر اُس سے اعلیٰ درجہ عصمت کا موجود ہے جو کف النفس سے بھی افضل ہے۔

ایک اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ اگر کسی شخص نے حرام کا ارتکاب اس لیے نہیں کیا کہ اُس کو حرام کا خیال ہی نہیں آیا تو چاہیئے کہ وہ گنہگار ہو کیونکہ اُس نے نفس کو روکا نہیں۔ جواب یہ ہے کہ جب تک اُس کو حرام کا خیال نہ آئے وہ کف النفس کا مکلف ہی نہیں تو گناہگار کیوں ہو۔ جب خیال آوے اُس وقت نفس کو روکنے کا مکلف ہے۔ ایک اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ اگر کسی شخص کو زنا کی طرف میلان ہوا اور اُس نے نفس کو میلان سے نہ روکا مگر زنا کیا بھی نہیں تو اس کو گناہگار ہونا چاہیئے۔ حالانکہ حدیث صحیح سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکی کے ارادہ پر تو ثواب لکھا جاتا ہے عمل ہو یا نہ ہو مگر سیئہ کے ارادہ پر گناہ نہیں لکھا جاتا

جب تک عمل نہ ہو۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ قاعدہ سے اُس کو گناہ گار ہونا چاہیئے۔ مگر حدیث کی وجہ سے ہم اُس کو گناہ گار نہیں کہتے۔ یہ اللہ تعالےٰ کی رحمت ہے۔

دُوسرا جواب یہ ہے کہ حدیث میں ارادہ سے مُراد قصد جازم نہیں ہے بلکہ حدیث النفس ہے کہ دل میں خیال آیا مگر اس کو پختہ نہیں ہونے دیا۔ خیال ہی کے درجہ میں رکھا تو یہ معاف ہے۔ کیونکہ اُس کا روکنا دشوار ہے الا لمن عصمہ اللہ اور اگر قصد جازم ہوگیا تو اب اگر گناہ کا صدور اس لیے نہیں ہُوا کہ اُس نے خدا کے خوف سے نفس کو روک دیا تو یہاں کف النفس موجود ہے۔ وہ ثواب کا مستحق ہوگا اور اگر اس لیے صدور نہ ہُوا کہ کوئی مانع حسی پیش آگیا۔ مثلاً عورت راضی نہ ہوئی یا تنہائی کا موقعہ نہ ملا یا اور کوئی سبب پیش آگیا اس صورت میں یہ گناہ گار ہے کیونکہ اس نے نفس کو گناہ سے نہیں روکا۔ اس تفصیل سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ اصولیین نے ثواب و عقاب سے بحث نہیں کی وہ صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جس طرح اوامر میں انسان فعل کا مکلف ہے اسی طرح نواہی میں بھی فعل کا یعنی کف النفس اور ترک کا مکلف ہے۔ عدم فعل کا مکلف نہیں۔ ثواب و عقاب سے معتزلہ نے اپنے اعتراضات میں بحث کی ہے اور اس کا جواب اصولیین نے دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ ترک بالقصد پر ثواب کے قائل ہیں۔ ترک بلاقصد پر ثواب کے قائل نہیں۔ اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ بعض اولیاء کاملین گناہوں کو بالقصد نہیں چھوڑتے۔ بلکہ اس لیے چھوڑتے ہیں کہ ان کو معاصی سے نفرت ہے اُن کو گناہوں کا خیال ہی نہیں آتا تو اصولیین کے قول پر لازم آتا ہے کہ ان حضرات کاملین سے وہ لوگ افضل ہوں جن کو گناہوں کی طرف میلان ہوتا ہے پھر نفس کو روکتے ہیں۔ اور غالباً یہی اشکال حضرت شارح کو پیش آیا ہے اُس کا جواب اصولیین نے یہ دیا ہے کہ ان کاملین کو کف النفس سے بڑھ کر دوسری فضیلت عصمت کی

حاصل ہے۔ اس لیے ناقصین اُن سے افضل نہیں ہوسکتے اور اگر کسی دلیل سے یہ ثابت ہو جائے کہ ترک بلاقصد پر مطلقاً ثواب ملتا ہے تو اصولیین اُس کے قائل ہو جائیں گے مگر ابھی تک کسی نص سے اس کا ثبوت نہیں ملا اور حضرت شارح نے جس قدر دلائل بیان کیئے ہیں اُن میں کسی دلیل سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ترک بلاقصد پر ثواب ملتا ہے۔ چنانچہ ان ینتھوا یغفرلھم ماقد سلف۔ میں کفار کو خطاب ہُوا ہے کہ اگر وہ کفر سے باز آجائیں گے اُن کے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

یہاں یقیناً کفر سے باز آنے کا مطلب قبولِ اسلام ہے اور وہ اُسی وقت معتبر ہے جب بالقصد ہو، بلاقصد ہرگز معتبر نہیں اور اگر کوئی کافر صرف کفر سے باز آجائے اسلام قبول نہ کرے اُس کے لیے ہرگز وعدۂ مغفرت نہیں اور یہ صورت محض فرضی ہے کیونکہ بدون قبولِ اسلام کے کفر سے باز آنے کا تحقق ہی نہیں ہوسکتا۔ بہرحال یہاں ترکِ کفر بالقصد اور قبولِ اسلام بالاختیار مُراد ہے۔ بلاقصد ترکِ کفر اور بالاضطرار قبولِ اسلام پر مغفرت مرتب نہیں ہوتی اور جس حدیث کی ہم شرح کر رہے ہیں اُس میں بھی "ولیمسک عن الشر" سے قصد و اختیار کے ساتھ گناہوں کا چھوڑنا مراد ہے، بلاقصد چھوڑنا مراد نہیں کیونکہ لفظ "امساک" متعدی ہے جس کے وہی معنی ہیں جو کف النفس کے معنی ہیں اور اُس پر اصولیین ثواب کے قائل ہیں۔ اسی طرح اتق محارم اللہ میں بھی اتقا متعدی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے ارادہ و اختیار سے محارم اللہ کو چھوڑ دے۔ اس کا حاصل بھی وہی کف النفس ہے۔ البتہ ایک حدیث بظاہر اہل اصول کے خلاف ہے: وھو قولہ صلی اللہ علیہ وسلم ان فی بضع احدکم بصدقۃ قالوا یا رسول اللہ ھل فی بضع احدنا صدقۃ قال نعم ارأیتم لوجعلھا فی حرام کان علیہ وزر قالوا نعم قال فکذلک او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کہ تمہاری شرمگاہ میں بھی صدقہ ہے (جبکہ بیوی یا شرعی باندی سے مشغول ہو) صحابہ نے اس پر تعجب کیا کہ یا رسول اللہ! کیا شرمگاہ میں بھی صدقہ ہے؟ فرمایا بتلاؤ اگر وہ حرام جگہ میں اُس کو استعمال کرتا تو اُس پر گناہ نہ ہوتا؟ عرض کیا ہاں گناہ ہوتا۔ فرمایا تو ایسے ہی (جب حلال جگہ استعمال کیا ثواب بھی ہو گا) اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیوی کے پاس جانے میں اس لیے ثواب ملا کہ حرام جگہ سے باز رہا تو حرام سے بچنے میں مطلقاً ثواب ہُوا خواہ اس قصد سے بیوی کے پاس گیا ہو یا نہ گیا ہو۔

جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے تو صرف اتنا ہی معلوم ہُوا کہ بیوی کے پاس جانے میں ثواب ہے اور حرام جگہ جانے میں گناہ ہے۔ پھر اُس کی وجہ بتلادی گئی کہ بیوی کے پاس جانے میں ثواب اس لیے ہے کہ وہ زنا سے بچنے کا سبب ہے اور جو عمل کسی حرام سے بچنے کا ذریعہ ہو اس میں ثواب ہونا ظاہر ہے کیونکہ یہ تو عمل پر ثواب ہے نہ کہ محض ترکِ عمل بلا قصد پر۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ بیوی کا دیانۃً حق ہے کہ مرد گاہے گاہے اُس سے ہم بستری کرے تاکہ اُس کی عفت و عصمت محفوظ رہے۔ اسی طرح خود اپنے کو حرام سے بچانے کے لیے بھی قضاءِ شہوت ضروری ہے، تو چونکہ بیوی کے پاس جانے میں اُس کی اور اپنی عفت کی حفاظت بھی ہے اور بیوی کے حق کی ادائیگی بھی ہے۔ اس لیے ثواب ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ثواب عمل پر ہے محض ترکِ حرام بلا قصد پر نہیں اور یہی حکم باندی کے پاس جانے کا ہے جبکہ شرعی باندی ہو کیونکہ اُس کی عفت کی حفاظت بھی مولیٰ پر واجب ہے۔

یہ تو اصولیینِ حنفیہ کا مذہب ہے اصولیین مالکیہ کا مذہب مجھے معلوم نہیں کہ وہ مطلقاً ترکِ عمل پر ثواب کا انکار کرتے ہیں یا ترکِ بلا قصد پر۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعضے مطلقاً ترک پر ثواب کے مُنکر ہیں جیسا حضرت شارح کے بیان سے واضح ہوتا ہے اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے۔ کیونکہ گناہ کو بالقصد ترک

کرنا اور اُس سے بچنا عین تقویٰ ہے جس پر ثواب کا وعدہ ہے واما من خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوىٰ فان الجنة هى الماوىٰ ۞ جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس کو خواہش (نفسانی) سے روکتا رہا تو اُس کا ٹھکانا جنت ہے۔ اس میں ترک ہویٰ پر وعدۂ ثواب کی تصریح ہے اور یہ حدیث جس کی شرح کی جارہی ہے صراحۃً اس پر دلالت کر رہی ہے کہ بُرے کاموں سے رُکنا صدقہ ہے۔ اس سے پہلے ایک حدیث گزر چکی ہے جس میں سات شخصوں کے لیے قیامت میں سایۂ عرش کی بشارت ہے جن میں ایک وہ شخص بھی ہے جس کو کسی خوبصورت معزز عورت نے اپنی طرف بُلایا اور وہ یہ کہہ کر رُک گیا کہ مَیں اللہ تعالےٰ سے ڈرتا ہوں۔ یہاں بھی ترک پر ثواب کا وعدہ ہے۔

اسی طرح حدیثِ غار میں بھی یہی مضمون ہے جو پہلے گزر چکی۔ پس یہ کہنا کہ ترک پر مطلقاً ثواب نہیں سراسر نصوص کے خلاف ہے۔ البتہ ترک بلا قصد پر ثواب کی تصریح کسی روایت میں نظر سے نہیں گزری۔ اگر کوئی صحیح روایت اس مضمون میں صریح ہو تو وہ اصولیین کے قول سے مقدم اور راجح ہو گی کیونکہ اس باب میں قیاس کوئی چیز نہیں اس کا مدار محض نصوص پر ہے اور اللہ تعالےٰ کے رحم و کرم سے کچھ بعید نہیں کہ وہ سب مسلمانوں کی حسنات کو سئیات پر غالب کر دیں۔ فانه بر رؤف رحیم۔

اُوپر معاصی سے غفلت کے متعلق ایک سوال و جواب مذکور ہُوا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص معاصی سے غافل ہو اُس کو گناہ نہیں کیونکہ غفلت کی حالت میں وہ کفّ النفس کا مکلف نہیں۔ اس پر سوال یہ ہے کہ اُس کو ثواب ملتا ہے یا نہیں۔ اصولیین کے جواب میں ثواب سے کچھ تعرض نہیں کیا گیا۔ میرے نزدیک اس میں تفصیل کی ضرورت ہے وہ یہ کہ دیکھنا چاہیئے کہ معاصی سے غفلت کا منشاء کیا ہے؟ اگر منشاء طاعات و حسنات میں انہماک ہے تو اس غفلت پر ثواب ملے گا۔ کیونکہ اس غفلت کو اللہ تعالےٰ نے مدح و

ثناء کے موقع پر بیان فرمایا ہے ان الذین یرمون المحصنٰت الغافلات المؤمنات لعنوا فی الدنیا والاخرۃ ۔ (جو لوگ پاکدامن غافل بے خبر مومن عورتوں کو تہمت لگاتے ہیں اُن پر دُنیا و آخرت میں لعنت ہے) یہاں غافلات کا یہی مطلب ہے کہ وہ بُرے کاموں کو جانتی ہی نہیں ہیں۔ بس اپنے دینی مشاغل اور گھر کے کام کاج میں لگی رہتی ہیں اور اگر غفلت کا منشاء دُنیا میں انہماک ہے کہ اس کو اپنی تجارت یا ملازمت کے کاموں سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی جو گناہوں کی طرف التفات ہو، تو اگر تجارت یا ملازمت وغیرہ موافق شریعت ہو اور فرائض و واجبات میں اُس کی وجہ سے کوتاہی نہ ہوتی ہو تو اُس میں بھی ایسا انہماک جو معاصی سے روک دے محمود ہے۔ کیونکہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے۔ ان اللہ یبغض الرجل البطال ۔ اللہ تعالیٰ بے کار آدمی سے نفرت کرتے ہیں (کیونکہ بے کاری ہی میں گناہوں کی فرصت ملتی ہے) جب بے کاری ناپسند ہے تو کام میں لگے رہنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور جو چیز ان کو پسند ہو اُس پر ثواب ضرور ہے مگر گو اس قدر نہ ہو جس قدر اطاعات و حسنات میں مشغول رہنے سے ملتا اور اگر مُسلمان کسب معاش میں بھی اپنی نیت درست کرے کہ اہل و عیال کا حق ادا کرنے اور فقراء کی امداد کرنے اور دین کی خدمت کرنے کے واسطے دُنیا کمائے تو وہ بھی پھر حسنات[ع] میں داخل ہو جائے گی۔ مگر یہ نیت صرف لفظوں سے نہیں ہوتی بلکہ سچے

ع ایک حدیث میں ہے ان من الذنوب ذنوبا لا یکفرھا الصلوۃ ولا الصوم ولا الحج ویکفرھا الھم فی طلب المعیشۃ الطبرانی وابونعیم صاحب الحلیۃ واللفظ المصنف فی بھجۃ النفوس لا یکفرھا الا الکد علی العیال ، ص ۱۹۲ ج ۲۔ گناہوں میں سے بعض گناہ وہ ہیں جن کا کفارہ نہ نماز سے ہوتا ہے نہ روزہ سے نہ حج سے اُن کا کفارہ طلب معاش میں فکر سے ہوتا ہے۔ ایک لفظ میں یہ ہے کہ اُن کا کفارہ عیال کے لیے مشقت کرنے سے ہوتا ہے ۔ ۱۲ ظ

ارادہ سے ہوتی ہے اور اگر یہ غفلت کسی مکروہ میں انہماک سے ہے جیسے شطرنج یا کھیل کود میں ایسا انہماک رہتا ہے جس کی وجہ سے اور معاصی کا خیال ہی نہیں آتا تو اگر یہ انہماک فرائض و واجبات میں بھی مخل انداز ہوتا ہے تو اس غفلت میں گناہ ہے اور اگر فرائض و واجبات میں مخل نہیں ہوتا تو اس غفلت میں نہ ثواب ہے نہ گناہ ۔ ہاں یہ شخص اُن لوگوں سے اچھا ہے جو معاصی میں منہمک رہتے ہیں۔ اور اگر کسی ایک گناہ میں ایسا منہمک ہے جس کی وجہ سے دُوسرے گناہوں کی طرف التفات نہیں ہوتا تو یہ غفلت بھی گناہ ہے کیونکہ اس کا منشاء انہماک فی المعصیۃ ہے ۔ واللہ تعالیٰ اعلم ۔

اے اللہ ! ہمیں ایسا بنا دے جیسا آپ چاہتے ہیں ۔ اے اللہ ! ہمیں اپنے دین کی خدمت کی توفیق دے ۔ اے اللہ ! ہمارے ذریعہ سے اپنے دین کو عزت اور غلبہ دے ۔ اللھم اجعلنا کما تحب وترضی واجعل آخرتنا خیرا من الاولیٰ ۔ آمین !



باب ۵۷

حدیث

اخذ المال بسخاوۃ النفس

حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپ نے مجھے دیا، پھر سوال کیا تو آپ نے پھر بھی مجھے دیا۔ پھر مانگا تو پھر بھی دیا۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا اے حکیم! یہ مال (دیکھنے میں) خوشنما (اور دل کو) مرغوب ہے تو جو اس کو نفس کی استغناء کے ساتھ لے اُس کے لیے تو مال میں برکت عطا کی جاتی ہے اور جو نفس کی طمع و حرص کے ساتھ لے اُس میں برکت نہیں دی جاتی اُس کا حال ایسا ہوتا ہے جیسے بعض آدمی کھاتا ہے اور اُس کا پیٹ نہیں بھرتا اور (یاد رکھو) اُونچا ہاتھ جھکے ہوئے ہاتھ سے اچھا ہوتا ہے۔

شرح حدیث کا ظاہری مطلب تو یہ ہُوا کہ استغناءِ نفس کے ساتھ جو مال ملے اُس میں برکت ہوتی ہے اور حرص و طمع سے جو کچھ لیا جاتا ہے اُس میں برکت نہیں ہوتی۔ حدیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت کا ثبوت ہو رہا ہے کہ مانگنے والے نے بار بار مانگا اور ہر دفعہ آپ دیتے رہے۔ بار بار مانگنے سے پریشان نہیں ہوئے۔

(۱۸۱) مال جمع کرنے کے ساتھ بھی زہد ہو سکتا ہے

حدیث سے ثابت ہُوا کہ مال حاصل کرنے (اور جمع کرنے) کے ساتھ بھی زہد ہو سکتا ہے اور زہد کے ساتھ

مال حاصل کرنے پر چند فائدے مرتب ہوتے ہیں۔ ایک تو زہد کا ثواب، دُوسرے دل کا چین، تیسرے رزق میں برکت۔ زہد پر تو حدیث کا یہ لفظ دلالت کر رہا ہے فمن اخذہ بسخاوۃ نفس۔ جس نے اس مال کو سخاوت نفس کے ساتھ لیا (جس کا ترجمہ ہم نے استغناء سے کیا ہے) اور (ظاہر ہے کہ) سخاوت نفس ہی تو زہد (کی حقیقت) ہے (اس سے ثابت ہوا کہ زہد مال کے ساتھ بھی جمع ہو سکتا ہے) رہا دل کا چین تو اسکی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے الزھد فی الدنیا یریح القلب والبدن دُنیا سے بے رغبت ہونا دل کو بھی راحت دیتا ہے اور بدن کو بھی۔ اور انسان کے لیے یہی سب سے بڑی راحت ہے (اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے کہ دل کو بھی چین ہو اور بدن کو بھی) اور برکت رزق پر حدیث کا یہ جملہ دلالت کر رہا ہے بورک لہ فیہ کہ اس کے مال میں برکت عطا کی جاتی ہے اور (اس مجموعہ) پر یہ علمی مسئلہ مرتب ہُوا کہ زہد میں دُنیا و آخرت دونوں کی بھلائیاں جمع ہو جاتی ہیں۔ دُنیا کی بھلائی تو یہ کہ اُسکے مال میں برکت ہوتی ہے جس سے حریص آدمی محروم ہے وہ دُنیا جمع کرنے میں رہتا ہے مگر برکت نہیں پاتا۔ دُوسرے زاہد کو دل اور بدن دونوں کے چین حاصل ہوتی ہے جس سے اہلِ دُنیا یکسر محروم ہیں حالانکہ دُنیا میں راحت کی حقیقت یہی ہے (کہ دل اور بدن کو چین ہو) اور آخرت کی بھلائی یہ ہے کہ زہد کا ثواب ملیگا اور اس سے حساب کم ہو گا۔ کیونکہ زہد کی وجہ سے وہ مال کے حقوق واجبہ (زکوٰۃ و نفقاتِ لازمہ) کو ادا کرتا رہے گا اور جس مال میں شبہ ہو گا اُس سے الگ رہیگا اور یہی پوری سعادت ہے (کہ قیامت میں ثواب کا مستحق ہو اور بازپرس سے بچا رہے)۔ اور طالب دُنیا کو دُنیا میں بھی خسارہ ہے اور آخرت میں بھی۔ دُنیا کا خسارہ تو یہ کہ دل اور بدن دونوں بے چین رہتے ہیں چنانچہ حدیث میں ہے والحرص فیھا تعب للقلب والبدن۔ دُنیا کی حرص دل کو بھی تعب میں ڈالتی ہے اور بدن کو بھی اور یہ انتہا درجہ کی مصیبت اور مشقت ہے۔ زیادہ سامانِ دُنیا جمع کرنے سے جو اُمید قائم کی تھی وہ پُوری نہیں ہوتی کیونکہ اُس کی برکت جاتی رہتی ہے جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے معلوم ہو چکا کہ جو شخص دُنیا کو اشراف نفس (یعنی حرص) سے لے گا اس میں برکت نہیں دی جاتی اور اس سے بڑھ کر محرومی کیا ہو گی کہ انسان سرتاپا پریشانی و مشقت ہی میں رہے پھر بھی جو اُمید قائم کی تھی وہ

پوری نہ ہوئی۔ تم اس کا مشاہدہ حسّی طور پر یوں کر سکتے ہو کہ اہل دُنیا کی جاں (دسترخوان پر) دیکھنے میں کھانا بہت ہوتا ہے اور کھاتے وقت (تھوڑے میں پیٹ نہیں بھرتا بلکہ) بہت زیادہ کھانے سے پیٹ بھرتا ہے اور جتنا کھایا جاتا ہے اُس کی نسبت سے (بدن اور دماغ و قلب میں) طاقت کم آتی ہے اور اصل میں تو زاہدین کا کھانا دیکھنے میں کم ہوتا ہے مگر اُس سے بڑی جماعت کا پیٹ بھر جاتا ہے اور جتنا کھاتے ہیں اُس کی نسبت سے اُن میں قوت اور طاقت بہت زیادہ پیدا ہوتی ہے۔ پھر اہل دُنیا کو اس پریشانی اور مشقت کے ساتھ دوسری مصیبت یہ پیش آتی ہے کہ اُن میں باہم حسد اور کینہ اور غیبت اور بخل بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر یا تو وہ بخل کی وجہ سے دُوسروں کے حقوق ادا نہیں کرتے یا کم ادا کرتے ہیں یا اپنے حقوق پُوری طرح وصول کرنا چاہتے ہیں (کہ پائی پائی کا حساب کرتے ہیں) ان تمام مصائب اور مُشکلات کے علاوہ آخرت کا خسارہ جُدا رہا، جس میں عذاب بھی ہے اور ذلت بھی۔ اللہ تعالٰے اپنے فضل سے ہمیں اُس سے بچائے (آمین) قولہ فیہ دلیل قد یقع الذھد مع الاخذ الی قولہ اعاذنا اللہ منہا بمنہ۔

ف ۔ بعض لوگوں کے نزدیک زہد کے معنی یہ ہیں کہ مال و دولت سے بالکل کنارہ کش ہو جائے۔ مال کو ہاتھ بھی نہ لگائے۔ کسی کا ہدیہ بھی قبول نہ کرے نہ تجارت و ملازمت اور صنعت و حرفت میں مشغول ہو یہ غلط ہے۔ زہد کی حقیقت یہ ہے کہ دُنیا کو دل سے چھوڑ دے اور اُس کی پرواہ نہ کرے کہ کس نے اس کو لیا۔ زہد آرزو کم کرنے کا نام ہے۔ زاہد وہ ہے جس نے اُن تمام چیزوں کو چھوڑ دیا جو اللہ تعالٰے سے غافل کرتی ہیں۔ تم دیکھوگے کہ بعضے ظاہر میں مفلس و فقیر ہیں مگر پھر بھی خدا سے غافل ہیں اور بعضے ظاہر میں مالدار ہیں مگر اُن کا باطن دوامِ حضور مع اللہ تعالٰے سے مالا مال ہے۔

حدیث میں اس حقیقت کو ان الفاظ سے بتلا دیا گیا ہے کہ جو اس مال کو اشرافِ نفس یعنی حرص و طمع سے لیتا ہے وہ زاہد نہیں اور جو سخاوت نفس یعنی استغناء سے

لیتا ہے وہ زاہد ہے۔ گو اُس کی پاس بہت کچھ ہو مگر دل اُس کی محبت سے خالی ہو اور مال سے دین کے کاموں میں مدد لیتا اور اہلِ حقوق کے حقوق ادا کرتا ہو۔

تصوف اور زہد کی حقیقت غیر اللہ سے مُنہ پھیر لینا اور اللہ تعالٰے پر بھروسہ رکھنا اور ہر حالت کی باگ تفویض و رضا کے ہاتھ میں دے دینا اور دروازۂ کرم کے کُھلنے کا منتظر رہنا اللہ تعالٰے کے فضل پر اعتماد کرنا، ہر وقت اللہ تعالٰے سے ڈرتا رہنا اور تمام حالات میں اللہ تعالٰے سے نیک گمان رکھنا ہے۔ خُوب سمجھ لو۔

آج کل کے مشائخ میں زاہد کی پہچان یہ ہے کہ جو ہر ہدیہ قبول نہ کرتا ہو بلکہ بعض کو قبول کرتا ہو بعض کو رد کر دیتا ہو۔ جو شخص کسی کا ہدیہ رد نہ کرتا ہو سب کو ہی قبول کر لیتا ہو وہ زاہد نہیں۔

ف ۔ ہم نے اہل اللہ کے کھانے میں کھلی آنکھوں برکت کا مشاہدہ کیا ہے۔ یہ حضرات بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ عین وقت پر زیادہ مہمان آگئے تو گھر میں جو کھانا موجود تھا وہی اُن کے سامنے لاکر رکھ دیا اور سب کے سب اُس سے سیر ہو گئے۔ حالانکہ جب کھانا سامنے آیا تھا تو خیال ہوتا تھا کہ اتنے بڑے مجمع کو یہ تھوڑا سا کھانا کیونکر کافی ہوگا۔ مگر بسم اللہ کرکے کھانا شروع کیا تو کافی سے بھی زیادہ ہو گیا۔ اہل اللہ کے یہاں کا کھانا اہلِ دُنیا کے کھانوں سے لذیذ بھی زیادہ ہوتا ہے اور اُس سے قلب و دماغ اور جسم کو وہ طاقت حاصل ہوتی ہے جو مالداروں کے مرغن قیمتی کھانوں سے نہیں ہوتی۔

(۱۸۲) زہد سلوک باطن کا پہلا دروازہ ہے

حدیث میں فضیلت صُوفیہ کی بھی دلیل ہے جن کے طریق کی بُنیاد ہی زہد پر ہے کیونکہ وہ سلوک کا پہلا دروازہ ہے اسی لیے یمن بن رزق رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اگر تمہارے دل میں فقر اور غنا کا اندیشہ (یا فکر) ہو اور منصب و ریاست کی طلب ہو تو تمہارا قدم دین کے راستہ میں نہیں جم سکتا۔ یہ تو دائمی فقر (اور محرومی) کی کُنجی ہے۔ قولہ وفیہ دلیل لفضل اھل الصوفۃ

الیٰ قولہ فذالک مفتاح فقراللابد۔

ف ۔ اس کا حاصل وہی ہے جو اُوپر کہا گیا ہے کہ زاہد وہ ہے جس کا دل محبّت منصب دنیوی اور طلب ریاست سے پاک ہو۔ اگر بلا طلب اور بدون محبّت کے کوئی منصب مل جاوے اور خلافِ شریعت نہ ہو اُس کا قبول کر لینا خلافِ زہد نہیں۔ حضرات خلفاء راشدین سے زیادہ زاہد کون ہوگا مگر سب کے سب صاحب منصب خلافت تھے۔ اسی طرح بہت سے اولیاء کرام صنعت وحرفت والے تھے۔ کسبِ حلال کے لیے اپنے ہاتھ سے کام کرتے تھے۔ بعض اولیاء کرام صاحبِ خانقاہ تھے مگر اُن کے یہاں کثرت سے ہدایا اور نذرانے آتے تھے جن کی وجہ سے اُن کا دربار شاہانہ معلوم ہوتا تھا مگر اُن کے قلوب محبّتِ دُنیا سے پاک تھے جس پر اُن کے احوال و واقعات شاہد تھے۔

(۱۸۳) مثال بیان کرنا جائز ہے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ جس بات کو مخاطب نہ سمجھ سکے اُس کے سمجھانے کے لیے ایسی مثال کرنا جائز ہے جس سے وہ اچھی طرح بات سمجھ جائے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ یہ اعمال بیان فرمائی ہے کہ جو شخص حرص کے ساتھ مال جمع کرتا ہے اُس کے مال میں برکت نہیں ہوتی اور اُس کا حال ایسا ہوتا ہے کہ جیسے بعض آدمی کھاتا ہے مگر اُس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ کیونکہ عام طور سے اکثر آدمی خصوصاً اس زمانہ کے لوگ برکت کی حقیقت نہیں جانتے۔

برکت کی حقیقت

اُن کے نزدیک برکت یہ ہے کہ (دیکھنے میں) کوئی شے زیادہ ہو جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی مثال بیان فرما کر جس کو سب جانتے ہیں بتلا دیا کہ برکت ایک خاص چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے پیدا ہوتی ہے وہ نہیں جو عام طور سے لوگ سمجھتے ہیں۔

اب تم اس مثال میں غور کرو کہ کھانے سے ہر شخص کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ پیٹ بھر جائے تاکہ بھوک کی تکلیف جاتی رہے مگر پیٹ بھر جانا تمہارے اختیار میں نہیں۔ یہ نعمت اللہ تعالیٰ کے حکم سے پیدا ہوتی ہے اور اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ تم کو

نظر بھی نہیں آتی۔ چنانچہ بعض دفعہ آدمی بہت کھانے کے بعد بھی بھوکا رہتا ہے۔ اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ اسی طرح استسقاء کی بیماری میں بہت پانی پینے سے بھی پیاس بھی بجھتی۔ اسی طرح برکت بھی خُدا کے حکم سے پیدا ہوتی ہے وہ کوئی محسوس چیز نہیں) اب اگر کوئی آدمی بہت کھانے کے بعد بھی بھوکا رہے تو اُس کا کھانا خسارہ ہی خسارہ ہے۔ کیونکہ جس فائدہ کے لیے اُس نے کھایا تھا کہ پیٹ بھر جائے اور بھوک جاتی رہے وہ حاصل نہ ہُوا۔

اسی طرح مال کی ذات میں کچھ فائدہ نہیں بلکہ مقصود وہ منافع ہیں جو مال کے ذریعہ سے حاصل کئے جاتے ہیں (یعنی راحتِ قلب و بدن وغیرہ) تو اگر مال زیادہ ہو اور یہ فوائد مقصودہ حاصل نہ ہوئے تو ایسے مال کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ تم اس حالت کا مشاہدہ اہلِ دُنیا اور اہلِ دین میں اس طرح کرو گے کہ اہلِ دنیا اپنی ضرورتوں کو (تھوڑے مال سے پوری نہیں کر سکتے بلکہ) بہت زیادہ مال سے پوری کرتے ہیں۔ اسی لیے اُن کو مال بڑھانے کے سوا (اور کوئی صورت نظر نہیں آتی تو رات دن اُس کے سوا) اور کچھ دھندا نہیں ہوتا اُن کی نظر سے وہ چیز غائب رہتی ہے جو اس کے علاوہ ہے (یعنی اُن کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ ضرورتیں تھوڑے مال سے بھی پُوری ہو سکتی ہیں جبکہ اُس میں برکت شامل ہو جائے) اور دین داروں کو دیکھو گے کہ وہ ان ہی ضرورتوں کو جنہیں اہلِ دُنیا بہت زیادہ مال سے پُوری کرتے ہیں بہت تھوڑے مال سے پُوری کر لیتے ہیں اور بعض دفعہ ان سے بھی اچھی طرح پُوری کرتے ہیں اور یہ (فرضی قصّہ نہیں بلکہ) بکثرت مشاہدہ میں آ رہا ہے بشرطیکہ کوئی غور اور تامل سے کام لے۔ قولہ وفیہ دلیل علی جواز ضرب المثل الی قولہ ھذا موجود کثیر لمن تاملہ ونظرہ۔

ف ۔ ہم نے اہلِ اللہ میں اس کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کیا ہے اور اہلِ دُنیا کو یہ کہتے سُنا ہے کہ ہماری آمدنی تو تنخواہ کی بھی ہے اور زمین کی بھی اور فلاں کی تنخواہ ہی تنخواہ ہے زمینداری کچھ نہیں اور تنخواہ بھی ہم سے بہت کم ہے پھر بھی

اُس کے گھر کا انتظام ہم سے اچھا اُس کے بچوں اور گھر والوں کا لباس ہمارے بچوں سے اچھا یا ہمارے برابر ہے۔ پھر ہم اتنی دولت کے ساتھ بھی وہ کام نہ کر سکے جو اُس نے تھوڑی سی آمدنی میں کر لیے ہیں۔

یہ برکت نہیں تو اور کیا ہے؟ برکت کوئی ایسی چیز نہیں جو حسی طور پر آنکھوں سے نظر آجائے بلکہ وہ خدا کی دی ہوئی مخفی نعمت ہے جیسے کھانا کھانے اور پانی پینے کے بعد سیری اور سیرابی مخفی چیز ہے۔ جس کو وہی جانتا ہے جس کا پیٹ بھرا ہوا اور پیاس بجھی ہے، دُوسرے محسوس نہیں کرتے۔ اسی طرح بے برکتی بھی غیر محسوس شئے ہے جس کا مشاہدہ آنکھوں سے نہیں ہوتا بلکہ اہلِ دین و اہلِ دُنیا کی حالت کا موازنہ کرنے سے ہوتا ہے۔

ف ۔ شارح فرماتے ہیں کہ یہاں جو مثال کے ذریعے برکت کا خدا کی طرف سے ہونا بتلایا گیا ہے یہ صحابہ کے سمجھانے کے لیے نہیں کیونکہ ہم کو یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ صحابہ برکت کی حقیقت سے واقف تھے اُن کو اس کا مشاہدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات میں اور خود اپنے واقعات میں بار ہا ہو چکا تھا (وہ ایک دفعہ نہیں بلکہ متعدد بار دیکھ چکے تھے کہ ایک دو آدمی کا کھانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعا سے پورے لشکر کو کافی ہو گیا اور سب کے سیر ہونے کے بعد بچ بھی رہا۔ بعض دفعہ کھانا کھاتے ہوئے صحابہ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کھانا نیچے سے خود بخود زیادہ ہوتا چلا آرہا ہے۔ کھانے والوں کے لقموں سے کم نہیں ہوا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا) پس یہ مثال دوسروں کو سمجھانے کے لیے بیان کی گئی ہے جو صحابہ کے بعد آنے والے تھے۔

اس تشریح اور بیان کے بعد اب ذرا اس پر بھی تو غور کرو کہ آج کل عام طور سے اُن لوگوں کی حالت کیا ہے جو اہلِ علم کہلاتے ہیں دُوسروں کا تو ذکر ہی کیا؟ افسوس طریقے ہی بدل گئے اور بہت سے امور میں حق مشکوک ہو گیا یا اس کا انکار کیا جانے لگا (چنانچہ تم اہلِ علم میں سے بعض کو برکت کی حقیقت سے ناواقف یا منکر پاؤ گے) جس کا سبب وہ بُری عادتیں ہیں جو کثرت سے اُن ہی لوگوں میں

پائی جاتی ہیں جنہوں نے لوگوں کو اس دھوکہ میں ڈال رکھا ہے کہ وہ علماء اور صلحاء ہیں۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ سے فرمایا تھا کیف بک یا حذیفة اذا ترکت بدعة قالوا ترکت سنة۔ اے حذیفہ! اُس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب تم کسی بدعت کو چھوڑو گے تو لوگ کہیں گے کہ اس نے سُنّت کو چھوڑ دیا۔ حضرت حذیفہ نے عرض کیا یا رسول اللہ: تو آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ اگر میں اُس زمانہ تک زندہ رہوں قال اقرضهم من عرضك ليوم فقرك فرمایا اُن کو اپنی آبرو پر حملہ کرنے دو اُس دن کے (ثواب کے) لیے جب تم دُنیا میں نہ ہو گے، مطلب یہ ہے کہ تم حق اور سُنّت پر عمل کرتے رہو اور اُن کو جو وہ چاہیں بکنے دو۔ کیونکہ تم کو تو اس صورت میں ثواب ہی ثواب ہے جب وہ ناحق تمہاری آبرو پر حملہ کریں۔ (هذا ترجمة ما ذكره الشارح في شرحه ادخلته في الفوائد لعدم تعلقه بالمسائل بل بالمواعظ فافهم)۔

تنبیہ :۔ یہ تو شارح نے اپنے زمانے کا حال لکھا ہے اب ذرا ہمیں اپنے زمانے کا حال بھی دیکھنا چاہیئے۔ کیا یہ وہی زمانہ نہیں جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی؟ کیا آج اگر کوئی رواجی مولود نہ پڑھے بلکہ سنت کے موافق ذکرِ رسول کرے اُس کو بُرا بھلا نہیں کہا جاتا؟ کیا اگر کوئی میلاد میں قیام نہ کرے اُس کو وہابی کہہ کر بدنام نہیں کیا جاتا؟ اور اگر کوئی عالم صوفی قوم کے ہدایہ اور نذرانوں پر رہ کر مُسلمانوں پر اپنا بار نہ ڈالنا چاہے بلکہ ملازمت یا صنعت و حرفت و تجارت سے کسبِ حلال کرنا چاہے اُس کو حبِ دُنیا سے بدنام نہیں کیا جاتا؟ حالانکہ جوازِ ترکِ اسباب کے لیے شرط ہے کہ انسان مجرد ہو، صاحبِ عیال نہ ہو اور ملازمتوں میں بہتر وہ ہے جس میں تعلیمِ دین پر اُجرت نہ ہو۔

(۱۸۳) بلند ہاتھ پست ہاتھ سے اچھا ہے اور اُسکی تحقیق حدیث سے معلوم ہُوا کہ

بلند ہاتھ پست ہاتھ سے بہتر ہے۔ اُس کی شرح میں علماء اور صُوفیہ کے درمیان اختلاف ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ بلند ہاتھ دینے والا ہے اور پست ہاتھ لینے والا۔ صوفیہ برعکس کہتے ہیں کہ بلند ہاتھ لینے والا ہے اور پست ہاتھ دینے والا۔ کیونکہ لینے والا تم کو تھوڑی سی چیز کے عوض بہت سا ثواب دیتا ہے (یعنی ثواب کا ذریعہ بنتا ہے) کہ ایک کے بدلے دس اور (بعض دفعہ) سات سو تک (ثواب دلواتا ہے) اور دینے والا ثواب (ہی کے لیے دیتا ہے تو وہ اس) کا منتظر اور محتاج ہے۔ اور میرا خیال یہ ہے کہ دونوں قولوں کو اس طرح جمع کیا جا سکتا ہے کہ دینے والے کی دو حالتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ تم سے اپنے عطیہ کے قبول کرنے کی درخواست کرتا ہو۔ دُوسرے یہ کہ (وہ تم سے درخواست نہیں کرتا بلکہ م) تم اُس سے سوال کر رہے ہو۔ اس صُورت میں تو دینے والے کا ہاتھ بلند ہے اور (لینے والے کا پست ہے کیونکہ) تم کو سوال کی ذلّت پہنچ چکی۔ اور (آثار میں) آیا ہے کہ ذلّت ہر سوال میں ہے چاہے راستہ ہی کا سوال ہو اور جو اس کا انکار کرے وہ بداہت کا انکار کرتا ہے اور اگر وہ تم سے اپنی عطا کے قبول کرنے کی درخواست کر رہا ہے تو اُس نے تمہارے سامنے اپنی عزت و جاہ کو گرا دیا کہ وہ تم سے ایسی درخواست کر رہا ہے جس میں تم مختار ہو اور وہ محتاج ہے یا تو اس لیے کہ وہ اپنے ذمّہ سے واجب شرعی ادا کرنا چاہتا ہے یا اس لیے کہ وہ اس ہدیہ کے ذریعے دُنیا یا آخرت کی بھلائی کا اُمیدوار ہے۔

اس صُورت میں وہ اپنے ہدیہ سے تم پر احسان کا قصد نہیں کرتا بلکہ اپنی بھلائی کا قصد کر رہا ہے تو تمہارا اُس کو قبول کر لینا احسان ہے اور دینے والا سائل و محتاج ہے اُس کا ہاتھ پست ہے، لینے والے کا ہاتھ بلند ہے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی ہماری دعوت کرتا ہے تو (پہلے) اُس کا احسان ہے پھر اگر ہم دعوت قبول کر لیں تو اب ہمارا (اُس پر) احسان ہے اور جس حدیث کی ہم شرح کر رہے ہیں اُس کا واقعہ بھی اسی کی تاکید کرتا ہے (کہ دینے والے کا ہاتھ بلند ہے) کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد

(الید العلیا خیر من الید السفلیٰ) سائل ہی کے متعلق فرمایا ہے جبکہ اُس نے بار بار سوال کیا (تو معلوم ہُوا کہ) پست ہاتھ سائل ہی کا ہے۔ قولہ الید العلیا خیر من السفلیٰ ھنا خلاف بین العلماء و اھل الصوفۃ الیٰ قولہ لما کرر سوالہ مرارا“

ف۔ بعض احادیث میں تصریح ہے والید العلیا المنفقۃ والسفلی السائلۃ رواہ مسلم اونچا ہاتھ خرچ کرنے والا ہے اور نیچا ہاتھ مانگنے والا ہے۔ اس لیے دینے والے کے ہاتھ کو نیچا کہنا بظاہر صحیح نہیں البتہ بعض روایات میں بجائے المنفقۃ کے المتعففۃ بھی وارد ہے (رواہ ابوداؤد) جس کا مطلب یہ ہے کہ اُونچا ہاتھ سوال سے بچنے والا ہے اور نیچا ہاتھ سوال کرنے والا ہے۔ اس روایت پر لینے والے کے ہاتھ کو بھی اُونچا کہہ سکتے ہیں جبکہ وہ سوال نہ کرے بلکہ دینے والا خود اُس سے قبول ہدیہ کی درخواست کرے اور ہر حال میں نیچا ہاتھ سوال کرنے والے کا ہے۔ پس شارح کی توجیہ پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا بلکہ وہ بھی بعض الفاظ حدیث سے مؤید ہے۔ واللہ تعالےٰ اعلم۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ ان سائلین کو حقیر نہ سمجھو۔ یہ تمہارے مُحسن ہیں کہ تمہارے اموال کا بوجھ اُٹھا کر آخرت میں پہنچاتے ہیں تو یہ تمہارے مزدور ہیں مگر دُنیا کے نہیں بلکہ حمال آخرت ہیں (قالہ سیدی حکیم الامۃ عنہ) حاجی صاحب کا یہ مطلب نہیں کہ سائلین کا ہاتھ اُونچا ہے جیسا بعض صوفیہ نے کہا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُن کو اپنا محسن سمجھ کر صدقہ دو گے تو ثواب کامل ہوگا حقیر سمجھ کر دو گے تو صدقہ کا ثواب کم ہو جائے گا۔ اگر سائل کے ہاتھ کو اُونچا کہا جائے گا تو حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ نعوذ باللہ جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا اُن کا ہاتھ اُونچا تھا اور اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہو سکتا۔ پس بعض صُوفیہ کا سائل کے ہاتھ کو اُونچا کہنا کہ اس لیے کہ وہ دینے والے کے لیے ثواب کا ذریعہ بنتا ہے ہرگز صحیح نہیں سائل کا ہاتھ اُونچا نہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی

وقت دینے والے کا ہاتھ نیچا ہو جائے جبکہ وہ کسی کو ہدیہ دینا چاہے اور وہ قبول نہ کرے پھر اس کے اصرار سے یا درخواست و التجا سے قبول کرے۔ واللہ اعلم۔

حضرت شارح فرماتے ہیں کہ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ ہاتھ دونوں ہی اچھے ہیں، دینے والا بھی اور لینے والا بھی البتہ دینے والا زیادہ اچھا ہے کیونکہ حضورؐ نے بلند ہاتھ کو خیرؔ فرمایا ہے جو اسم تفضیل کا صیغہ ہے (جس کے معنی ہیں بہت اچھا) اور اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ نفس حُسن میں دونوں شریک ہیں اور ایک میں خوبی زیادہ ہے جیسے ہم کہیں زید خیر من عمرو زید عمرو سے بہتر ہے تو اُس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ عمرو میں کچھ بھی خوبی نہیں بلکہ مراد یہ ہوتی ہے کہ زید کا درجہ اُس سے بڑھا ہُوا ہے۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ یہ دونوں ہاتھ اچھے ہیں کیونکہ ان سے نیکی کی گئی ہے (ایک نے احسان کیا دُوسرے نے احسان قبول کر کے اُس کو ثواب کا مستحق کیا) پھر ایک کو دُوسرے پر فضیلت دُوسری وجہ سے ہو گئی یا تو نفس فعل پر نظر کر کے یا مال پر یا نیت و قصد پر نظر کر کے یا ان سب کے مجموعہ سے۔ ان علتوں ہی کی وجہ سے (علماء و صوفیہ میں) خلاف واقع ہُوا۔ اھ مگر یہ استدلال اُس وقت صحیح ہو گا جبکہ لفظ خیرؔ کو اسم تفضیل مان لیا جائے ورنہ محاورات میں بکثرت اس کا استعمال معنیٰ تفضیل سے خالی ہو کر بھی آتا ہے۔

(۱۸۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اعلیٰ مقام کی ہدایت فرماتے ہیں !

حدیث سے معلوم ہُوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اعلیٰ مقام کی ہدایت فرماتے ہیں۔ کیونکہ آپؐ کا ارشاد (الید العلیا خیر من السفلی) کا مطلب یہ ہے کہ تم کو اُن لوگوں میں سے ہونا چاہیئے جن کا ہاتھ اُونچا ہے اُن میں سے نہ ہو جن کا ہاتھ نیچا ہے۔ مگر یہ (تعلیم) مقاماتِ دینیہ میں ہے دُنیا اور دُنیا کے سامان میں نہیں (کیونکہ) دُنیا میں تو بقدرِ ضرورت و کفایت پر بس کرنے کی تعلیم ہے فاتقوا اللہ واجملوا فی المطلب و توکلوا علیہ دُنیا میں سب سے اُونچا ہونے کی تعلیم نہیں)۔

قولہ فیہ دلیل علی ارشاد الشارع الی الاعلیٰ الی قولہ لا فی الدنیا وحطامہا۔

ف ۔ مَیں کہتا ہوں کہ اگر اس کو دُنیا اور دین دونوں کے لیے عام کہا جائے جب بھی کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ حدیث کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ دُنیا میں سب سے زیادہ مالدار ہونا چاہیئے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہاتھ اُونچا ہونا چاہیئے یعنی سوال سے بچنا اور دوسروں کو دینا چاہیئے اور یہ حالت یقیناً محمود و مطلوب ہے۔ دُنیا کے سامان میں بھی کسی کا محتاج اور دستِ نگر ہونا اچھا نہیں۔

ایک حدیث میں ہے المومن القوی خیر من المومن الضعیف و فی کل خیر۔ مسلمان صاحبِ قوت کمزور سے بہتر ہے اور یوں دونوں ہی اچھے ہیں۔ اس حدیث میں صوفیہ کی حجت ہے کیونکہ وہ بھی مقاماتِ عالیہ کی ہدایت فرماتے ہیں۔ ہر کام میں عزیمت اور فضیلت حاصل کرنے کا اہتمام کرتے ہیں حتی الامکان بلا ضرورت ادنیٰ حالت پر قناعت نہیں کرتے نماز کو بھی کامل کرنا چاہتے ہیں اور ذکر کو بھی اور خدمتِ خلق کو بھی وعلیٰ ھذا القیاس۔

(۱۸۵) اہلِ فضل و دینداروں سے سوال کرنا جائز ہے

حدیث سے معلوم ہوا کہ اہلِ فضل اور اہلِ معاملہ اور دینداروں سے سوال کرنا جائز ہے۔ اس میں کچھ ذلّت نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے صحابی کے سوال سے کچھ تعرض نہیں فرمایا بس اُن کو ایک قاعدہ کُلیہ بتا دیا (کہ استغنا کے ساتھ مال لینے کا یہ ثمرہ ہے اور حرص کے ساتھ لینے کا یہ نتیجہ ہے) اور اگر اُس کے سوال میں کوئی بات (کراہت یا حرمت کی) ہوتی تو آپ اُس کو کبھی نہ چُھپاتے بلکہ اُسے کچھ دیتے بھی نہیں جب تک سوال کی کراہیت (وغیرہ) نہ بتلا دیتے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم احکامِ شرعیہ کے بیان کرنے والے ہیں اور ضرورت کے وقت سے بیان کو مؤخر کرنا جائز نہیں۔ پس آپ کے ارشاد کی شوکت بتلا رہی ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے لینا اور (مانگنا) دوسرے سے لینے (اور مانگنے)

کے مثل نہیں الید العلیا خیر من السفلی ۔ بلند ہاتھ پست ہاتھ سے بہتر ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ مبارک تو تمام حالات میں بلند ہی ہے کیونکہ آپؐ کے دستِ مبارک جیسا کس کا ہاتھ ہے ۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے جس میں کچھ بھی خفا نہیں ۔ (پس حضورؐ سے مانگنے میں اصلاً ذلت نہیں بلکہ عین سعادت اور بہت بڑی عزت ہے ۔ اسی لیے آپؐ نے صحابی کو سوال سے منع نہیں فرمایا بلکہ حرصِ مال سے منع فرمایا ہے) اور بطور وراثت کے یہی حکم اُن حضرات کا ہے جو آپ کے بعد منصبِ خلافت پر سرفراز ہوئے ۔ اگرچہ وہ آپ کی مثل نہیں ۔ اسی طرح خلیفہ کا نائب اور اُس کا نائب، جب تک سلسلۂ خلافت باقی رہے ۔ بشرطیکہ وہ اہلِ فضل اور دیندار ہوں ۔ قولہ وفیہ دلیل علیٰ جواز سؤال اھل الفضل والدین واھل المعاملۃ الیٰ قولہ اذا کانوا من اھل الفضل والدین ۔

ف ۔ اہلِ معاملہ سے مُراد وہ حضرات ہیں جن کا معاملہ اللہ تعالیٰ سے درست ہے یعنی بزرگانِ دین کہ وہ بھی باطن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ہیں ۔ گو ظاہر میں صاحبِ سلطنت نہ ہوں اُن سے مانگنے میں بھی ذلت نہیں ۔ کیونکہ وہ کسی مسلمان کو ذلیل نہیں سمجھتے اور سوال سے منع کرنے کی علت یہی ہے کہ اُس سے انسان ذلیل ہوتا ہے ولاینبغی للمؤمن ان یذل نفسہ ۔ اور مسلمان کو یہ نہ چاہیئے کہ اپنے کو ذلیل کر دے ۔ تو جہاں سوال میں ذلت نہ ہو وہاں کراہت نہ ہوگی ۔

چنانچہ ایک حدیث میں ہے ان المسئلۃ کد یکد بھا الرجل وجھہ الا ان یسأل الرجل سلطانا او فی امر لابد منہ قال الترمذی ھذا حدیث حسن صحیح ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سوال کرنا ذلت ہے جس سے آدمی اپنے چہرے کو ذلیل کرتا ہے ۔ مگر یہ کہ بادشاہ سے سوال کرے (تو ذلت نہیں) یا ایسی حالت میں سوال کرے کہ بدوں سوال کے چارہ نہ ہو (تو معذور ہے) علماء نے لکھا ہے کہ چونکہ سُلطان کے قبضہ میں بیت المال ہے جس میں سب کا حق ہے تو اُس سے مانگنا اپنا حق مانگنا ہے اُس کی جیب سے تو کچھ خرچ نہیں ہوتا ۔ اور اپنا حق مانگنے میں کچھ ذلت نہیں ۔

(۱۸۶) غنا سے تحصیلِ علم میں مدد ملتی ہے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ تحصیلِ علم میں غنا سے بہت مدد ملتی ہے ۔ حکمت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ چنانچہ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی کو (مسئلہ مال کی) اُس وقت تعلیم دی جبکہ تین مرتبہ مال دے کر اُن کو غنی کر دیا ۔ قولہ وفیہ دلیل علیٰ ان من اقوی الاسباب فی حمل العلم بمقتضی الحکمۃ الجدۃ الیٰ قولہ حتیٰ اغناہ بتکرار العطاء ثلثا ۔

ف ۔ یہ استدلال قوی نہیں ۔ ہاں حدیث سے یہ ضرور معلوم ہُوا کہ سوال کرنے والے کو مال کے متعلق حکم شرعی سوال پُورا کرنے کے بعد بتلانا چاہیئے ۔ کیونکہ سوال پُورا کرنے سے پہلے اُس کا دل پریشان ہوتا ہے ۔ اس حالت میں وہ حکم شرعی کو پوری طرح نہیں سمجھے گا اور ممکن ہے وہ یہ خیال کرے کہ مجھے ٹالنے کے واسطے یہ مسئلہ بیان کیا گیا ہے تو عالم کو متہم سمجھے گا اور اس صورت میں سائل کو شرمندگی اور خجالت بھی زیادہ ہوگی ۔ اور اگر پہلے اُس کی حاجت پوری کر دی جائے تو اُس کا دل اس قسم کے خیالات سے خالی ہو جائے گا ۔ پھر اس کو تحصیلِ علم سے فائدہ ہوگا ۔ اور جس مسئلہ کو حضرت شارح نے اس حدیث سے استنباط کیا ہے وہ اپنی جگہ درست ہے کیونکہ تحصیلِ علم کے لیے جمعیت قلب اور اطمینان کی ضرورت ہے اور غنا سے ہی یہ بات حاصل ہوتی ہے ۔ فقر کی حالت میں انسان کو اپنے کھانے کپڑے کی فکر سے فرصت نہیں ہوتی وہ اطمینان سے کیونکر علم حاصل کرے گا ۔ پس طالب علم یا تو غنی ہونا چاہیئے اور اگر فقیر ہو تو اسے کھانے کپڑے کی فکر سے مطمئن کر دینا چاہیئے ۔

چنانچہ ہمارے امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس جب امام ابو یوسف پڑھنے کے لیے آئے تو امام ابو یوسف کے باپ نے اُن کو درس سے اُٹھانا

چاہا اور کہا میں اپنے بچے کو شغلِ معاش میں لگانا چاہتا ہوں کیونکہ میں فقیر آدمی ہوں۔ میری آمدنی پورے گھر کے خرچ کو کافی نہیں ہوتی۔ یہ لڑکا بھی کچھ کمانے لگے تو گھر کا خرچ پورا ہوگا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ اس حالت میں کہ ابھی یہ بچے ہیں اور کچھ علم بھی حاصل نہیں کیا، تم کو ان سے کتنی آمدنی کی امید ہے ؟ اس نے کچھ مقدار بتلائی۔ امام صاحب نے فرمایا تم اس کو ہمارے پاس پڑھنے دو اور جتنی رقم تم نے بتلائی ہے اس سے بھی زیادہ ہم تم کو ہر مہینہ دے دیا کریں گے۔ چنانچہ وہ راضی ہو گئے اور امام ابو یوسف اطمینان کے ساتھ تحصیلِ علم میں لگے رہے۔ پھر دُنیا جانتی ہے کہ وہ کس درجہ کے امام ہوئے۔ امام ابو حنیفہ نے اسی طرح بہت سے طلبہ کو اپنے پاس سے دے کر پڑھایا ہے۔ جو اُن کے بعد بڑے درجہ کے مفتی اور قاضی اور عالم ہوئے۔

اسی حکمت کی وجہ سے ہمارے اکابر نے مدارسِ دینیہ میں یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ غریب طلبہ کو مدرسہ سے کھانا کپڑا کتابیں مفت دی جائیں تاکہ وہ اطمینان سے علم کی تحصیل میں لگے رہیں اور اسی وجہ سے اہلِ طریق نے اپنی خانقاہوں میں غریب سالکین کے لیے امداد کا سلسلہ جاری کیا ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں اغنیاء کو تحصیل علم شرعی اور طلب طریقِ باطن کا شوق نہیں رہا۔ اب اہلِ دُنیا کی عقلمندی دیکھو کہ اس پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان طلباء اور سالکین کو کسبِ معاش میں مشغول ہونا چاہیئے۔ یہ لوگ قوم کے اُوپر بار ہیں۔ تو اُن کو سمجھ لینا چاہیئے کہ کسبِ معاش کی فکر میں مشغول ہو کر تحصیلِ علم اور طلبِ طریق پُوری طرح نہیں ہو سکتی اور جو لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ یہ طلباء اور سالکین قوم پر بار ہیں وہ اپنا ہاتھ روک لیں اور دیکھیں کہ خدا اُن کو رزق پہنچاتا ہے یا نہیں ؟ یاد رکھو ان مدارس کا مدار اللہ تعالےٰ کے بھروسہ پر ہے وہ خود ایسی جگہ سے اُن کو رزق پہنچاتا ہے جہاں گمان بھی نہیں ہوتا اور سمجھ لو کہ اگر یہ مدارس اور خانقاہیں ویران ہو گئیں تو ہندوستان سے اسلام اور

دین کا نام مٹ جائے گا۔ ہندوستان میں دین کا جو کچھ نام و نشان باقی ہے، اُن ہی کی برکت سے باقی ہے۔ ہاں یہ ضرور تحقیق کرنا چاہیئے کہ حقیقی مدارس اور خانقاہیں کون سی ہیں ؟ اور نام و نمود کی کون سی ہیں ؟ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا حماقت ہے۔

(۱۸۷) سوال تین بار تک جائز ہے

حدیث سے معلوم ہوا کہ تین بار تک سوال کرنا جائز ہے چوتھی بار ممنوع ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی دفعہ دُوسری دفعہ سوال کرنے پر دیتے رہے اور خاموش رہے اور تیسری بار سوال کرنے پر بھی دیا اور علمی مسئلہ بتلا کر اُس کے بعد سوال کرنے سے روک دیا کیونکہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم میں قوتِ ایمان کی وجہ سے اس قدر فہم اور ذکاوت تھی کہ اُن کو ادنیٰ اشارہ بھی روکنے کے واسطے کافی تھا (اس لیے گو حضورؐ نے آئندہ سوال کرنے سے صراحۃً منع نہیں فرمایا بلکہ سخاوتِ نفس کی تعلیم دی اور حرص مال سے روکا مگر اشارۃً آئندہ سوال کرنے ہی سے روک دیا گیا جس کو صحابی سمجھ گئے اور اُنہوں نے عرض کیا کہ اب میں آپ کے بعد کسی سے بھی سوال نہ کروں گا چنانچہ وہ مالِ غنیمت میں سے اپنا حق بھی کسی خلیفہ سے نہ لیتے تھے۔ حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اعلان کرنا پڑا کہ لوگو! گواہ رہو میں حکیم بن حزام کو اُس کا حق دینا چاہتا ہوں مگر وہ نہیں لیتے)۔

اور اس میں اُن صوفیہ کی بھی حُجت ہے جو زنبیل کے قائل ہیں کہ اگر کسی درویش متوکل کو دو تین دن تک فتوحات نہ ہوں اور ہلاکت کا اندیشہ ہونے لگے تو وہ زنبیل ہاتھ میں لے کر نکل سکتے ہے۔ وہ فرماتے ہیں زنبیل لے کر نکلنے کی شرط یہ ہے کہ کسی خاص شخص کا قصد کر کے نہ نکلے اور نہ کسی سے زور دے کر مانگے اور نہ قسم کھائے بلکہ صرف اللہ تعالےٰ سے سوال کرے۔ پھر اگر تقدیر اُسے کسی کے گھر پر یا کسی آدمی کے پاس پہنچا دے تو اُس سے آگے نہ بڑھے اور یہ بھی شرط ہے کہ بدون سخت ضرورت کے نہ نکلے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

لابأس ان یشکوا المؤمن حاجته لاخیه المؤمن۔ اس میں کچھ حرج نہیں کہ مُسلمان اپنی حاجت کو اپنے بھائی مُسلمان کے سامنے ظاہر کر دے (تو سخت مجبوری میں سوال کرنا جائز ہے) پھر جس شخص کے پاس تقدیر نے اُس کو پہنچا دیا اگر اُس نے دیدیا تو بہتر اور نہ دیا تو یہ بھی اچھا ہے اب وہ دُوسرے کے پاس جائے اور تیسرے کے پاس جائے۔ اگر تینوں نے کچھ نہ دیا تو آگے نہ بڑھے اور سمجھ جائے کہ اللہ تعالےٰ کا مقصود یہ ہے کہ صبر و تسلیم سے کام لے۔ اب اپنی جگہ واپس آجائے کسی اور سے سوال نہ کرے۔ یہاں تک کہ حق تعالےٰ اُس کے پاس فتوحات پہنچا دیں یا جو اُن کی مرضی ہو کریں۔

اب ذرا تم دیکھو تو کہ آج کل اہلِ علم اور اہلِ حال دونوں میں سے کوئی بھی اُس راستہ پر ہے جس کو اُس کے بزرگوں نے کتاب و سُنّت سے استنباط کیا ہے جیسا ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں اور اس حدیث (سے شرح) میں بھی کچھ حصّہ مذکور ہے، نہیں خدا قسم! (آج کل کوئی جماعت بھی اپنے بزرگوں کے راستہ پر نہیں) راستے بدل گئے اور (سیدھے راستہ پر) چلنے والے کم رہ گئے فانا للہ وانا الیہ راجعون، قوله وفیه دلیل علی جواز تکرار السؤال ثلاثا والرابعة ممنوعة الی قوله فانا للہ الخ۔

ف۔ حضرت شارح مجھے معاف فرمائیں۔ اس حدیث میں اہلِ زنبیل کے لیے کوئی حجت نہیں۔ اس میں اشارۃً یہ مسئلہ مذکور ہے کہ جس سے سوال کیا جائے تین دفعہ سے زیادہ نہ کیا جائے۔ مگر یہ اس میں کہاں ہے کہ زنبیل لے کر نکلنا جائز ہے اور جو زنبیل لے کر نکلے وہ تین آدمیوں سے آگے نہ بڑھے۔ اس کے لیے مستقل دلیل کی حاجت ہے اور میرا خیال ہے کہ اسلام میں زنبیل کی کوئی اصل نہیں۔ یہ صرف راہبوں اور جوگیوں کا طریقہ ہے۔ اسلام کا اصول پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ ہر مُسلمان پر صدقہ ہے اگر کوئی صدقہ نہ کر سکے تو اپنے ہاتھوں سے کام کرے جس سے اپنے کو بھی نفع پہنچائے اور دُوسروں پر بھی صدقہ کرے اسی

لیے ہمارے اکابر نے سالکین کو سوال سے مطلقاً منع فرمایا ہے۔ اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہوتا اُس کو مزدوری کر کے پیٹ پالنے کی تاکید کرتے تھے۔ چنانچہ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کے بعض خدام اسٹیشن پر مزدوری کرنے جاتے اور مزدوری کر کے اپنا کام چلاتے تھے، سوال ہرگز نہ کرتے تھے۔ اسی طرح جو شخص تارکِ اسباب ہو اگر کسی وقت اُس کو فتوحات حاصل نہ ہوں تو فتوحات بند ہونے سے اُس کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ کو اُس کا ترکِ اسباب پسند نہیں اُسے کسبِ معاش کا کوئی حیلہ کرنا چاہیئے۔ زنبیل لے کر سوال کے لیے ہرگز نہ نکلے اور مولانا روم نے شیخ شیرازیؒ کا جو واقعہ لکھا ہے وہ اُن کا خاص حال تھا جس میں وہ معذور تھے۔ اہلِ حال کے حال کو تسلیم کیا جائے گا مگر اُن کی اقتداء نہیں کی جائے گی جب تک کسی پر ویسا ہی حال غالب نہ ہو۔ واللہ تعالےٰ اعلم۔



حدیث

كراهية السوال

”عبداللہ بن عُمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ آدمی برابر لوگوں سے سوال کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ قیامت میں آئے گا اس حالت میں کہ اُس کے چہرہ میں گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہو گا“

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ زیادہ سوال کرنے والے کے چہرے پر قیامت کے دن گوشت نہ ہو گا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مراد ہر سوال نہیں کیونکہ علمی سوال تو مامور بہ ہے۔ حق تعالےٰ فرماتے ہیں۔ فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون۔ اگر تم کو (کوئی حکم) معلوم نہ ہو تو اہلِ ذکر سے سوال کرو (یعنی اُن سے حکم شرعی دریافت کرو) اسی طرح راستہ کا سوال بھی اس میں داخل نہیں۔ کیونکہ گم کردہ راہ کو راستہ بتلانا مامور بہ ہے (تو اُس کا دریافت کرنا بھی جائز ہے) اب صرف دُنیا کے سامان کا سوال باقی رہ گیا وُہی یہاں مُراد ہے (یعنی بھیک مانگنا کسی سے روپیہ پیسہ کا سوال کرنا) اور یہ بھی ہر حالت میں ممنوع نہیں کیونکہ ضرورت کے وقت سوال جائز ہے (بلکہ بعض کے نزدیک لازم ہے جبکہ بدون سوال کے جان بچانے کی کوئی صورت نہ ہو) کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں لا بأس للمؤمن ان یشکو حاجته لاخیه المؤمن۔ مسلمان کے لیے اس میں کوئی حرج نہیں کہ اپنی حاجت کو اپنے مُسلمان بھائی سے ظاہر کر دے۔ جس شخص کو سخت بھُوک (سے ہلاکت کا اندیشہ) ہو، اُس کے متعلق علماء میں اختلاف ہے کہ اُس

کے لیے صبر کرنا افضل ہے (کہ کسی سے سوال نہ کرے) یہاں تک کہ مر جائے، تو شہید ہو گا کیونکہ حق تعالےٰ فرماتے ہیں واصبر لحکم ربك فانك باعیننا۔ اپنے رب کے حکم کے لیے صبر کئے رہو، کیونکہ تم ہماری نگاہوں کے سامنے ہو (جس سے معلوم ہُوا کہ اللہ کی تقدیر کا منتظر رہنا چاہیئے کسی سے سوال نہ کرنا چاہیئے) یا اُس کو سوال کر کے جان بچانا افضل ہے ورنہ گناہ گار ہو گا۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ مُسلمان کے لیے اس میں کچھ حرج نہیں کہ اپنی حالت کو اپنے مُسلمان بھائی سے ظاہر کر دے۔ اگر ایسا نہ کیا یہاں تک کہ مر گیا تو اُس نے خودکشی کا سامان کیا تو ایک جماعت کے قول پر گنہ گار ہو گا (اور یہ اختلاف اس صُورت میں ہے جبکہ اُس کے پاس فاقہ دُور کرنے کی کوئی چیز نہ ہو اور اگر وہ صُورت ہو جس کو آج کل بھُوک ہڑتال کہا جاتا ہے کہ کھانے پینے کا سامان موجود ہے اور بطور سیاسی حربہ کے بھُوک ہڑتال کر رہا ہے۔ اس میں اگر مرے گا تو سب علماء کے نزدیک خودکشی کا گناہ ہو گا خُوب سمجھ لو)۔

پس حدیث میں دُنیا کا سوال مُراد ہے جبکہ بدون حاجت اور سخت ضرورت کا ہو اُسی پر وعید ہے (جبکہ مرنے سے پہلے توبہ نہ کی ہو) اور اگر توبہ کر لے تو اُمید ہے کہ اس عموم میں داخل نہ ہو گا (اور وعید سے بچ جائے گا) کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ التوبة تجب ما قبلها۔ توبہ اُن تمام گُناہوں کو ساقط کر دیتی ہے جو توبہ سے پہلے کئے تھے۔ ہاں یہ سوال باقی رہا کہ توبہ کے وقت جو مال اُس کے پاس سوال حرام سے جمع کیا ہُوا باقی ہے اُس کو کیا کرے؟ سو ظاہر ہے کہ مال حرام کو اپنے قبضہ میں رکھنا جائز نہیں۔ اب اگر اُن لوگوں کو پہچانتا ہے جن سے سوال کیا تھا تو اُن ہی کو (یا اُن کے ورثہ کو) واپس کر دے اور اگر انہیں نہیں پہچانتا تو اس مال کو صدقہ کر دے (اور صدقہ کا ثواب اُن کو پہنچا دے، تو یہ حقیقت میں اُن کی طرف سے صدقہ ہو گا اپنی طرف سے نہیں۔ پس اُس حدیث کے خلاف نہ ہو گا جس میں وارد ہے لا تقبل صدقة من غلول کہ حرام مال سے صدقہ

قبول نہیں کیونکہ وہ اُس صُورت میں ہے جبکہ حرام مال کو اپنی طرف سے صدقہ کرے اور راز اس میں یہ ہے کہ جب مال کا مالک معلوم نہ ہو نہ اُس کے ورثاء معلوم ہوں، تو یہ لاوارث کا مال ہے اور جس کا کوئی وارث نہ ہو اُس کے وارث فقراء ہیں تو فقراء کو پہنچا دینا اصل مالک کے وارثوں کو پہنچا دینا ہے کیونکہ فقراء کے ذریعے اُس کو ثواب مل جائے گا خُوب سمجھ لو) اور یہ حکم جیسا مردوں کے لیے ہے ویسا ہی عورتوں کے لیے ہے اگرچہ حدیث میں لایزال الرجل وارد ہے، جس سے بظاہر مردوں کے ساتھ حکم کا خاص ہونا مفہوم ہوتا ہے۔ مگر عمُوماً احکام شرعیہ میں مرد کا ذکر بوجہ فضیلت کے ہوتا ہے اور عورتیں تبعاً مُراد ہوتی ہیں۔ نیز یہ وعید اُس شخص کے لیے ہے جو سوال کی عادت کرے جیسا لایزال الرجل کے لفظ سے واضح ہے تو اگر کسی نے ایک دو بار سوال کیا ہو عادت نہ کی ہو تو وہ اس وعید میں داخل نہیں (گو بلا ضرورت سوال کرنے کا گناہ اُس کو بھی ہوگا۔ مگر قیامت میں بدنام نہ کیا جائے۔ پس توبہ اس کو بھی لازم ہے۔ ھذا حاصل ما ذکرہ الشارح فی شرحہ)۔

(۱۸۸) علمِ دین کی سب کو ضرورت ہے

حدیث سے معلوم ہوا کہ علم دین کی سب کو ضرورت ہے۔ کیونکہ سب سے کم درجے کے لوگ بھیک مانگنے والے جن کے پاس دُنیا کا کچھ ساز و سامان نہیں ہوتا اُن سے بھی سوال پر حساب کیا جائے گا کہ اُن کا سوال حکم شرعی کے موافق تھا یا خلاف تھا تو دُوسروں کا کیا حال ہوگا؟ (یہاں سے اُن لوگوں کو سبق لینا چاہیئے جو بدون علم شرعی کے شیخ یا مولانا بنے ہوئے ہیں) حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہل سے کوئی معذور نہ ہوگا (یعنی یہ عُذر نہیں سُنا جائے گا کہ ہم کو خبر نہ تھی ہم جاہل تھے) کیونکہ جب یہ مانگنے والے بھی باوجود اپنی مسکنت کے معذور نہ ہوئے، اُن سے بھی سوال کے متعلق باز پُرس ہوگی تو اور لوگ کیسے معذور ہو سکتے ہیں۔

علم تمام فضائل میں افضل ہے

اور یہاں سے معلوم ہوا کہ علم تمام فضیلت کی چیزوں سے افضل ہے جبکہ اُس پر عمل بھی کیا جائے کہ اسی سے معزز اور ذلیل میں امتیاز ہوتا ہے۔ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ (ضرورت کے وقت) غیر مسلم سے مانگنا بھی جائز ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ما یزال الرجل لیسأل الناس بعض آدمی لوگوں سے برابر مانگتا رہتا ہے اور یہ لفظ مُسلم اور غیر مسلم دونوں کو عام ہے۔ اسی لیے ایک بزرگ اپنے گھر سے بدون ضرورت (اور سخت حاجت) کے نہیں نکلتے تھے اور جب نکلتے تو غیر مسلم کے سوا کسی مُسلمان کے گھر پر نہ جاتے تھے۔ اُن سے کسی نے اُس کی وجہ پُوچھی تو فرمایا کہ میں بدون ضرورت و احتیاج کے گھر سے نہیں نکلتا۔ اب اگر مُسلمان کے دروازہ پر جاؤں تو اندیشہ ہے کہ وہ میرا سوال رد کر دے، تو اُس پر کوئی بلا نازل ہو جائے کیونکہ اُس پر شرعاً میری جان کا بچانا واجب ہے (اس واجب میں کوتاہی کرے گا تو بلا نازل ہونے کا اندیشہ ہے) تو میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کسی مُسلمان کو تکلیف پہنچے اور ذمی (غیر مسلم) میری جان بچانے کا مکلف نہیں۔ اگر وہ مجھ سے ہمدردی کرے گا اُمید ہے اُس کو بھلائی پہنچ جائے اور اگر میرا سوال رد کر دیگا تو اُسے میری وجہ سے کسی گزند پہنچنے کا اندیشہ نہ ہوگا (سبحان اللہ! ان بزرگ کی نیت کا کیا کہنا اللہ والے ایسے ہی ہوتے ہیں جو کسی کا بُرا نہیں چاہتے) مگر حدیث سے اس بات کا استنباط واضح نہیں کیونکہ حدیث میں سائل کی مذمت کی گئی ہے مدح نہیں کی گئی۔ تو یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ مذمت میں اس بات کو بھی دخل ہو کہ وہ سب ہی سے سوال کرتا رہا۔ نہ مسلم کو دیکھا نہ غیر مسلم کو۔

فقہاء حنفیہ نے کافر کی مزدوری اور ملازمت کرنے میں بھی یہ قید لگائی ہے کہ جائز کام میں ملازمت یا مزدوری ہو اور اُس سے مُسلمان کی ذلت نہ ہوتی ہو جب مزدوری اور ملازمت میں یہ شرط ہے تو غیر مسلم سے مانگنا کیونکر جائز ہوگا کہ سوال تو خود ہی ذلت ہے، البتہ اگر کوئی غیر مُسلم شریف اور سخی اور نیک دل ہو

ضرورت میں سوال کرنے والوں کو ذلیل نہ سمجھتا ہو بلکہ عزت کرتا ہو تو اُس سے سخت احتیاج کی حالت میں سوال کا مضائقہ نہیں اور ذمی غیر مسلم اکثر ایسے ہی ہوتے تھے کہ اللہ والوں کی عزت کرتے تھے باقی آج کل تو مُسلمان بھی سوال کرنے والوں کی عزت نہیں کرتے، خواہ کیسے ہی حاجت مند اور کیسے ہی اللہ والے ہوں۔ غیر مُسلم تو کیا کریں گے۔ پس ایک زمانے کو دُوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا)۔

سائل کو بلا وجہ جھُوٹا نہ سمجھنا چاہیئے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ سوال کرنے والوں کو سچا ہی سمجھنا چاہیئے۔

(بلا وجہ اُن کو جھوٹا نہ سمجھنا چاہیئے) کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے (اس حدیث میں سوال کرنے والے کی تو مذمت کی ہے مگر) دُوسروں کو سچے اور جھُوٹے (سائلوں) میں فرق کرنے کو نہیں فرمایا (پس اُن کو جائز ہے کہ ہر سوال کرنے والے کا سوال پُورا کردیں۔ مگر یہ کہ کسی کے متعلق تحقیق سے یہ بات ثابت ہوگئی ہو کہ اُس نے سوال کو پیشہ بنالیا ہے تو اُس کو دینا جائز نہیں ہے کما فی حاشیۃ الترمذی عن المدد وغیرہ۔

چنانچہ ایک بابرکت بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ ایک دن چلے جارہے تھے، ایک شخص کو دیکھا کہ بالکل ننگا ہے لوگوں سے اللہ کے واسطے کپڑا مانگ رہا ہے آپ نے اپنا ایک کپڑا اُتار کر اُس کو دے دیا۔ بعض لوگوں کو اس شخص کی عادت معلوم تھی کہ وہ حیلہ اور مکر کرتا ہے (کپڑا پاس ہوتا ہے پھر بھی ننگا ہوکر یہ کپڑا مانگتا ہے) اور اُس کو بیچ کر ناجائز کاموں میں صرف کرتا ہے۔ چنانچہ یہ بزرگ واپس ہُوئے تو کسی نے خبر دی کہ مَیں نے اس سائل کو فلاں جگہ دیکھا تو اُس کے بدن پر آپ کا دیا ہُوا کپڑا نہ تھا (وہ پھر ننگا پھرتا ہے) اور ممکن ہے اُس نے آپ کے کپڑے کو بیچ کر ناجائز کاموں میں اُس کی قیمت کو استعمال کیا ہو۔ بزرگ کو یہ سُن کر غصّہ آیا اور پھر فرمایا ذرا مجھے اُس تک پہنچادو تاکہ خود اس حالت کا مشاہدہ کروں جب اُس کے پاس پہنچے تو جیسا سُنا تھا ویسا ہی پایا (کہ واقعی وہ تو پھر ننگا پھر رہا ہے) پُوچھا ارے تُو نے وہ کپڑا کیا کیا جو مَیں نے دیا تھا وہ تو بہت قیمتی تھا (اُس کو بیچ کر تو ایک کی جگہ چار یا پانچ کپڑے بنا سکتا تھا مگر تُو پھر بھی ننگا ہے) اُس نے جواب دیا کہ اپنا کپڑا اُس سے مانگو جس کو تم نے دیا ہے اور مجھے اس کے ساتھ رہنے دو جس کی مَیں نافرمانی کر رہا ہوں۔ فرمایا بے شک تُو نے سچ کہا۔ پھر اُس کو اسی حال میں چھوڑ کر واپس آگئے (مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان بزرگ نے اس سائل کو پھر بھی کچھ دیا۔ ممکن ہے کہ تحقیقِ حال کے بعد پھر نہ دیا ہو اور اُس کے جواب کو اس لیے رد نہیں کیا کہ اُس نے معقول بات کہی تھی کہ جب تم ثواب کی نیت سے صدقہ کرچکے اور مجھے مستحق سمجھ کر دے چکے تو تمہارا ثواب کہیں نہیں گیا پھر اب تم کو مجھ سے بازپُرس کا حق نہیں۔ اگر مَیں نے اُس کو ناجائز کام میں صرف کیا اس کا مَیں ذمہ دار ہوں گا آپ ذمہ دار نہیں تو صدقہ ماضیہ کے متعلق یہ بات صحیح ہے جیسے پہلے ایک حدیث میں گزر چکا ہے کہ کسی نے زانیہ، چور اور غنی کو رات کے اندھیرے میں صدقہ دے دیا تھا تو وہ قبول ہوگیا۔ باقی آئندہ کے لیے ایسے شخص کو دینا جائز نہیں جو حیلہ و مکر سے سوال کرتا ہے اور سوال کرکے بدمعاشی کرتا ہے ۱۲۔

جب تم اپنے نیک کام میں سچے اور مخلص ہو تو جس کے ساتھ تمہارا معاملہ ہے اُس کے فضل میں رہو وہ بھی تم کو سچا قرار دے گا اور (مقرب) خاص بنائے گا۔

قولہ وفیہ دلیل علی ان جمیع الناس محتاجون الی العلم الی قولہ صدقا مخلصا۔

ف ۔ ظاہر ہے کہ یہاں علم سے مُراد علمِ دین اور علمِ احکام ہے۔ جب مُسلمانوں کے دن اچھے تھے اسی پر عزت و ذلت کا مدار کار تھا مگر آج اس علم کی وہ عزت باقی نہیں رہی جس میں کچھ تو عامۂ مُسلمین کی خطا ہے کہ اُنھوں نے دُنیا کو دین پر مقدم کردیا ہے اور کچھ علماء کی بھی خطا ہے کہ اُنھوں نے وعظ گوئی کو نذرانے

وصول کرنے کا ذریعہ بنالیا ہے۔ اگر علماء لوجہ اللہ محض تبلیغ کی نیت سے وعظ کہیں اور معاوضہ یا نذرانہ قبول نہ کریں بلکہ واپس کردیں تو اُن کی عزت بہت بڑھ جائے۔ صدق اور خلوص کی ہر عمل میں ضرورت ہے جبھی اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوتا ہے اور جو عمل بارگاہِ الٰہی میں قبول ہو جاتا ہے اُس کا ثمرہ آخرت میں تو یقینی ہے دُنیا میں بھی مل کر رہتا ہے۔

(۱۸۹) عمل کی جزاء سزا اُسکے مناسب ہوگی کہ آخرت میں امورِ معنویہ محسوس ہوں گے

اس میں کیا حکمت ہے کہ اس سائل کے چہرہ میں قیامت کے دن گوشت نہ ہوگا؟ سو بات یہ ہے کہ چہرہ کا حُسن گوشت ہی سے ہے اسی لیے موٹاپے سے چہرہ کا حُسن بڑھ جاتا ہے تو مطلب یہ ہے کہ اُس کے چہرے میں ذرّہ برابر حُسن نہ ہوگا۔ کیونکہ اُس نے دُنیا میں اپنے چہرہ کی آب و تاب کھو دی تھی یعنی حیاء کو اُتار کر رکھ دیا تھا جو بھیک مانگنے سے روکتی ہے جب اُس نے بلاضرورت حیاء کو اُتار دیا تو آخرت میں اُس کا حُسنِ ظاہری زائل کر دیا جائے گا کیونکہ آخرت میں وہ چیزیں محسوس و مشاہد ہوں گی جو یہاں معنوی (اور باطنی) ہیں کیونکہ حکمت اس کو مقتضی ہے کہ دُنیا میں جو گُناہ کسی نے کیا ہوگا آخرت میں اُس کا ایک نشان ہوگا جس سے سب لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ اس شخص نے یہ گُناہ کیا ہے تاکہ عذاب کے ساتھ ذلّت بھی جمع ہو جائے کہ تمام عالم میں اس کی شہرت ہو جائے۔ چنانچہ جھُوٹی گواہی دینے والے کے بارے میں وارد ہُوا ہے کہ وہ قیامت میں اس حال سے اُٹھے گا کہ اُس کی زبان سے آگ نکلتی ہوگی۔ اور سُود خوار ہاتھ پیر مارتا ہوگا۔ جیسے مست اُونٹ مستی میں ہاتھ پیر مارتا ہے اور یتیموں کا مال کھانے والا قبر سے اس طرح اُٹھے گا کہ آگ کے شُعلے اُس کی ناک سے سانس کے ساتھ نکلتے ہوں گے اسی طرح اور بہت گُناہ ہیں جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ (اُن کے لیے قیامت میں خاص علامتیں ہوں گی)

اور اس خبر کا فائدہ یہ ہے کہ لوگ اس بڑی رُسوائی اور ذلّت کے عذاب سے بچیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے فضل و احسان کے صدقہ ان سب سے پناہ دیں۔ کسی نے کہا ہے اپنا انجام اچھا بنا اگر تجھے کچھ عقل ہے اور اُس دن کی رُسوائی سے بچ جو بہت ہی سخت ہیبت ناک ہے۔ جس کا طریقہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و تقویٰ ہے جو ہمیشہ تجھ پر انعام کرتا اور تیرے عمل کی قدر دانی کرتا ہے۔

قولہ ما الحکمۃ فی کونہ یأتی یوم القیامۃ و لامضغۃ لحم فی وجہہ الی

قولہ بتقویٰ مولیٰ لم یزل علیک منعما شکورا۔

ف۔ صوفیہ کا کشف ہے کہ دُنیا میں جو امور معانی و اغراض کی قسم سے ہیں۔ آخرت میں جواہر محسوس ہوں گے۔ اسی مضمون کو کسی نے ان الفاظ سے تعبیر کر دیا ہے کہ انسان کی جنت اور دوزخ دُنیا میں بھی اُس کے ساتھ ساتھ ہے یعنی اعمالِ صالحہ جنت ہیں کہ یہی اعمال آخرت میں اُس کو عجیب خُوب صُورت اشکال میں نظر آئیں گے جن سے راحت پہنچے گی اور اعمال سیئہ دوزخ ہیں کہ یہی آخرت میں خوف ناک صُورتوں میں اُس کے سامنے آئیں گے اور ستائیں گے۔

اس سے بعض عقلمندوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ صُوفیہ بھی فلاسفہ کی طرح جنت و دوزخ کو خیالی چیز سمجھتے ہیں موجود اور مشاہد نہیں مانتے۔ صُوفیہ کے کلام کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ صوفیہ کے نزدیک جنت و نار اس دُنیا سے الگ موجود اور مستقل مخلوق ہیں۔ چنانچہ بعض نے اپنے کشف سے جنت دوزخ کی پیمائش تک بیان کر دی ہے۔ اُن کا مطلب یہ ہے کہ جنّت اور دوزخ کی نعمتیں اور نقمتیں انسان کے اعمال سے ملتی جلتی ہیں جن کو دیکھ کر وہ خود سمجھ لے گا کہ یہ نعمت فلاں عمل کا صلہ ہے اور یہ نقمت فلاں عمل کی سزا ہے جس کا حاصل وہی ہے جو حضرت شارح نے بیان فرمایا ہے کہ جو امور دُنیا میں معنوی تھے وہ آخرت میں محسوس و مشاہد ہو جائیں گے۔ اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ جنّت دوزخ محض خیالی نہیں بلکہ اس کا تو یہ مطلب ہے کہ جو چیزیں دُنیا میں خیالی سمجھی جاتی ہیں، وہ

آخرت میں خیالی نہ رہیں گی بلکہ محسوس و مشاہد بن جائیں گے۔

بعض لوگوں نے شیخ ابن عربیؒ کے کلام سے یہ سمجھا ہے کہ دوزخ کچھ مدت کے بعد فنا ہو جائے گی اور کفار و مشرکین کا عذاب ختم ہو جائے گا۔ سو جان لینا چاہیئے کہ شیخ کے کلام میں یہ مضمون ملاحدہ نے ملحق کر دیا ہے، شیخ کا یہ مذہب ہرگز نہیں وہ نصوص قطعیہ کے خلاف کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔ علامہ شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے الیواقیت والجواہر میں تصریح کر دی ہے کہ شیخ کی فصوص کا جو صحیح نسخہ ہمارے پاس ہے اُس میں کوئی بات بھی خلافِ شریعت نہیں ہے۔ ہاں بعض نسخوں میں کچھ باتیں خلافِ شرع ملتی ہیں سو تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ اُن میں ملاحدہ اور یہود نے الحاق کیا ہے۔ خوب سمجھ لو۔



باب ۶۶

حدیث

اقران الحج والعمرۃ

حضرت عُمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وادی عقیق میں سنا فرماتے تھے کہ آج رات میرے پاس میرے رب کی طرف سے ایک قاصد آیا (جس نے یہ پیام پہنچایا کہ) اس مبارک میدان میں نماز پڑھیئے اور کہیئے کہ عمرہ بھی حج کے اندر ہے۔

شرح حضرت شارح کو اس حدیث پر ایک اشکال واقع ہوا ہے جس کا جواب بھی اپنے مذہب کے موافق دیا ہے۔ اشکال یہ ہے کہ عمرۃ فی حجۃ (عمرہ بھی حج کے اندر ہے) سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ عمرہ کو احرامِ حج کے بعد ملایا گیا حالانکہ قواعد شرع سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ عمرہ کو احرامِ حج کے بعد نہیں کیا جاتا بلکہ حج کو احرام عمرہ کے بعد کیا جاتا ہے مگر حنفیہ کے مذہب پر یہ اشکال وارد نہیں ہوتا کیونکہ اُن کے نزدیک افعالِ حج شروع کرنے سے پہلے عمرہ کا احرام اور اعمالِ عمرہ شروع کرنے سے پہلے حج کا احرام ایک دوسرے کے ساتھ ملایا جا سکتا ہے اور اگر افعال شروع کر دیئے گئے تو حج پر عمرہ کا اضافہ نہیں کیا جا سکتا، عمرہ پر حج کا اضافہ ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اب تک اعمالِ حج یا عمرہ شروع نہیں کیئے تھے۔ کیونکہ ابھی تک آپ مکہ معظمہ نہیں پہنچے تھے اور اعمالِ حج و عمرہ مکہ پہنچ کر ہی شروع ہوتے ہیں۔ یہ واقعہ

وادی العقیق کا ہے یعنی ذوالحلیفہ کا جو مدینہ سے چھ میل ہے اور مدینہ والوں کی میقات ہے۔ اسی جگہ سے وہ احرام باندھتے ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ ابھی تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام نہیں باندھا تھا نہ حج کا نہ عمرہ کا کہ رات کو اللہ تعالےٰ کی طرف سے فرشتہ نے یہ پیام پہنچایا کہ اُس وادی مبارک میں نماز پڑھیئے اور نماز کے بعد عمرہ و حج دونوں کا احرام ساتھ ساتھ باندھئے جس کو قران کہا جاتا ہے اور یہ حدیث حنفیہ کے اس دعوےٰ کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے، مفرد یا متمتع نہ تھے۔ اس کے بعد شارح نے ملاحدہ کے ایک اعتراض کا جواب دیا ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی حج کیا ہے۔ اور اُس کی کیفیت میں اس قدر اختلاف روایت ہے کوئی کہتا ہے آپ قارن تھے کوئی کہتا ہے مفرد تھے کوئی کہتا ہے متمتع تھے۔ اس اختلاف کو دیکھتے ہُوئے صحابہ کی نقل پر وثوق نہیں رہتا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فعل کو پُوری طرح ضبط نہیں کر سکے۔

جواب کا حاصل یہ ہے کہ جھُوٹ کا احتمال خبر میں ہو سکتا ہے استدلال اور نظر میں نہیں ہو سکتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (عام طور پر بطریق اعلان) یہ نہیں فرمایا تھا کہ مَیں نے قران کیا ہے یا تمتع۔ اگر ایسا ہوتا اور پھر بھی صحابہ نقل میں اختلاف کرتے تو اشکال ہو سکتا تھا اور جب ایسا نہیں بلکہ ہر شخص نے آپ کے افعال سے ارادہ و نیّت پر استدلال کیا ہے، استدلال میں اختلاف ہو سکتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ عام کے ساتھ اپنے قارن ہونے کو اس لیے ظاہر نہیں فرمایا کہ پھر سب ہی قارن بننے کی کوشش کرتے اور سب کے لیے قران مناسب نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں احرام طویل ہوتا ہے طویل مُدت تک محظوراتِ احرام سے بچنا ہر اک کو آسان نہیں۔ پھر قارن پر قُربانی بھی واجب ہے جس کی سب کو استطاعت نہیں۔

دُوسرا جواب یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو قران کا حکم دیا کسی

کو تمتع کا، کسی کو افراد کا تاکہ سب صُورتوں کا جواز معلوم ہو جائے۔ ناقلین نے اس امر کو آپ کا فعل قرار دیا اور محاورات میں ایسا ہوتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے رجم النبی صلی اللہ علیہ وسلم ماعزا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماعز کو رجم کیا حالانکہ آپ نے خود رجم نہیں کیا صرف حکم دیا تھا۔ اسی طرح بولا جاتا ہے بنی الامیر المدینۃ امیر نے فلاں شہر بنایا۔ حالانکہ وہ خود نہیں بناتا صرف حکم دیتا ہے۔ غرض حکم کو فعل کہہ دینا محاورات میں شائع ہے۔

تیسرے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قران کی نیت کی تھی اور قارن پر یہ واجب نہیں کہ تلبیہ میں ہر دفعہ حج و عمرہ دونوں کا نام لیا کرے بلکہ ایک دفعہ دونوں کو جمع کر کے پھر ایک کے ذکر پر بھی کفایت کر سکتا ہے۔ تو آپ نے کبھی تو لبیک بعمرۃ وحجۃ کہا جس نے اُس کو سُنا اُس نے کہا حضور قارن تھے کبھی فرمایا لبیک بحجۃ جس نے یہ سُنا وہ سمجھا کہ آپ مفرد ہیں۔ اُس نے افراد کی روایت کی۔ کبھی فرمایا لبیک بعمرۃ جس نے یہ سُنا وہ سمجھا کہ آپ متمتع ہیں۔ اور اس سے تو حضراتِ صحابہ کے اہتمام نقل کی دلیل نکلتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے جو کچھ نکلا جس نے بھی اُس کو سُنا محفوظ رکھا اور جیسا سُنا تھا ویسا ہی بیان کر دیا۔ اب یہ مجتہد اور محقق کا فرض ہے کہ تمام روایات کو جمع کر کے راجح اور مرجوح کو معلوم کرے چنانچہ بحمد اللہ محققین نے ثابت کر دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قارن تھے۔ کیونکہ بیس سے اُوپر صحیح اور صریح حدیثیں اس پر دال ہیں اور دس وجوہ سے ان روایات کو دوسری روایات پر ترجیح ہے جس کو تفصیل کا شوق ہو زاد المعاد ابن القیم ص۱۹۳ ج ا کا مطالعہ کرے۔ یا اعلاء السنن ص۱۴۰ ج ۱۰ سے مراجعت کرے۔

(لطیفہ) حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ نے بوادر النوادر میں تحریر فرمایا ہے کہ ایک عالم سے جو کہ فارسی میں احقر کے اُستاد ہیں ایک عیسائی نے اعتراض کیا کہ اہلِ اسلام میں دینی تحقیق کی کمی کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ اُن کے

اکثر مسائل مختلف فیہ ہیں۔ اگر کافی تحقیق ہوتی تو سب میں متفقہ فیصلہ ہو جاتا۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ یہی دلیل ہے اُن کی غایت تحقیق کی کہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا جزو بھی بے تحقیق کئے نہیں چھوڑا اور تحقیق کے لوازم عادیہ سے ہے اہلِ تحقیق میں اختلاف ہو جانا بخصوص جبکہ محل تحقیق معانی ہوں جبکہ ماریات مشاہدہ میں اختلاف ہو جاتا ہے۔

ماشاء اللہ نہایت لطیف جواب ہے۔ ص ۸۰۲

مَیں کہتا ہوں کہ حضرات صحابہ کے اہتمام نقل کی دلیل حج ہی کے واقعہ میں یہ ہے کہ اُنھوں نے اس بات کو بھی نہیں چھوڑا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لبیک کس وقت کہا تھا۔ چنانچہ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اُنھوں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے عرض کیا مجھے تعجب ہوتا ہے کہ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تلبیہ میں بھی اختلاف ہے کہ آپؐ نے کس وقت لبیک کہا۔ فرمایا بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی تو حج کیا تھا اس لیے اُن میں اختلاف ہو گیا۔ مَیں سب سے زیادہ اس کو جانتا ہوں (کیونکہ مَیں آپ کے قریب تھا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کے ارادے سے تشریف لے چلے جب آپؐ نے مسجد ذی الحلیفہ میں دو رکعتیں پڑھیں اُسی جگہ احرام باندھا اور دو رکعتیں پڑھنے کے بعد لبیک کہا۔

کچھ لوگوں نے سُنا اور اُس کو محفوظ کر لیا (اُن کی روایت یہی ہے کہ آپ نے دو رکعت پڑھنے کے بعد لبیک کہا) پھر آپؐ ناقہ پر سوار ہوئے جب ناقہ آپ کو لے کر کھڑی ہو گئی اُس وقت بھی لبیک کہا۔ بعض لوگوں نے اُسی وقت آپ کا تلبیہ سُنا کیونکہ مجمع بہت زیادہ تھا سب آپ کے پاس نہیں رہ سکتے تھے۔ یکے بعد دیگرے آپ کے پاس سے گزرتے تھے۔ ان لوگوں نے بھی کہا کہ حضورؐ نے اُس وقت لبیک کہا جب ناقہ کھڑی ہو گئی۔ پھر آپ آگے بڑھے جب بیداء کی بلندی پر چڑھے اُس وقت بھی لبیک کہا۔ بعض لوگوں نے اس وقت آپ کا تلبیہ سُنا پہلے نہیں سُنا تھا۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیداء کی

بلندی پر چڑھتے ہوئے تلبیہ کہا اور خُدا کی قسم! حضورؐ نے اپنی نماز (احرام) ہی کی جگہ (پہلے) لبیک کہا اور ناقہ کے کھڑے ہونے کے وقت بھی (دوبارہ) لبیک کہا اور بلندئ بیداء پر بھی لبیک کہا (کیونکہ احرام کے بعد تو ہر اختلافِ حال میں لبیک کہنا مستحب ہے) سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے ابن عباسؓ کی روایت کو لیا وہ اسی جگہ لبیک کہتے ہیں جہاں (احرام) کی دو رکعتیں پڑھتے ہیں۔ اس حدیث کو حاکم نے روایت کیا اور شرط مسلم پر صحیح کہا ہے۔ ذہبی نے اُس کی تائید کی ہے اور یہ روایت سُنن ابی داؤد میں بھی ہے اور اب فقہاء کا عمل اب اسی پر ہے۔

اسی طرح آپ کے حج کی ہر ہر بات کو صحابہ نے محفوظ کر کے روایت کیا ہے مثلاً مدینہ سے کس دن خروج ہُوا؟ کس وقت کُوچ ہُوا، ظہر کہاں پڑھی عصر کہاں پڑھی؟ راستہ میں کس مقام پر نزول ہُوا، کتنی جگہ پڑاؤ ہُوا۔ ہر منزل پر آپ کس جگہ پر کھڑے ہوئے کہاں پیشاب کیا؟ کہاں اُونٹنی کو چکر دیا؟ کس جگہ غسل کیا کس جگہ دُعا کی؟ مکہ میں کس راستے سے داخل ہُوئے؟ کس دن اور کس وقت داخل ہوئے مکہ میں داخل ہو کر کس دروازے سے بیت اللہ میں آئے آتے ہی پہلے کیا کام کیا؟ مکہ میں کتنے دن ٹھہرے؟ کس تاریخ کو منیٰ کی طرف چلے؟ منیٰ میں کتنی نمازیں پڑھیں؟ وہاں سے عرفات کی طرف کب چلے؟ عرفات کس وقت پہنچے: وہاں کیا خُطبہ دیا؟ وہاں سے کب لوٹے؟ اور کس راستہ سے واپس ہُوئے راستہ میں کہاں وضو کیا؟ کہاں پیشاب کیا؟ مزدلفہ کب اور کس وقت پہنچے؟ مزدلفہ میں کتنا قیام ہُوا وہاں سے کس وقت کُوچ ہُوا؟ منیٰ کب پہنچے؟ وہاں آتے ہی پہلے کیا کام کیا۔ کس ترتیب سے کیا؟ لوگوں نے اس تمام سفر میں آپؐ سے کیا کیا مسائل دریافت کئے؟ حضورؐ نے اُن کا کیا جواب دیا؟ منیٰ میں کتنے خطبے دیئے؟ اُن میں کیا فرمایا؟ طوافِ زیارت کب کیا؟ رمی جمار کس طرح کیا؟ منیٰ سے واپس ہو کر کہاں نزول ہُوا؟ وہاں سے مدینہ کو کس وقت اور کس دن واپسی ہوئی۔ پھر واپسی کے حالات سے بھی اس تفصیل سے بیان کئے

تلاش ہوتی ہے۔ پھر طالب صادق محروم نہیں ہوتا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے آخری سچے رسول سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں پہنچ جاتا اور قرآن وحدیث سے اپنی طلب کی پیاس بجھاتا ہے۔ غرض ان تمام مخلوقات سے ہمیں کو فائدہ پہنچ رہا ہے اور ہمارے ہی اوپر رحمت ہو رہی ہے۔

قولہ وفیہ دلیل علی۔ ان اللہ عز وجل یفضل ما یشاء من خلقہ الی قولہ فکان الفائدۃ لنا ورحمۃ بنا۔

ف ۔ شریعت نے تو کسی زمان یا مکان کی فضیلت اس لیے بتلائی تھی کہ ہم اُس میں عبادت کر کے ثواب زیادہ حاصل کریں۔ لیکن اب اس فضیلت کو لہو ولعب کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے یا آمدنی وصول کرنے کا وسیلہ۔ چنانچہ شب قدر کی فضیلت کا یہ حشر ہو رہا ہے کہ اُس رات تراویح میں قرآن ختم کیا جاتا ہے تو مسجدیں میں فضول چراغاں کی جاتی ہے مٹھائی کا انتظام ہوتا ہے اور مسجد میں وہ شور وغل برپا ہوتا ہے کہ نہ مسجد کا ادب ملحوظ رکھا جاتا ہے نہ نماز پڑھنے والوں کی نماز کا خیال کیا جاتا ہے۔ عید وبقر عید کا دن خوشی کا ہے تاکہ سب مسلمان جمع ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔ ذکر اللہ زیادہ کریں، اللہ کا بول بالا کریں۔ اُس کو بھی تماشا بنا لیا گیا۔ بہت آدمیوں کی عید تو کپڑوں کی عید ہوتی ہے۔ نماز کا اہتمام برائے نام ہوتا ہے اور عید کی نماز کے بعد تم نوجوانوں کو ہوٹلوں اور سینما گھروں میں رنگ رلیاں مناتے پاؤ گے استغفر اللہ! عاشورہ محرم میں روزہ کی فضیلت ہے اُس میں وہ خرافات ہوتی ہیں کہ ہندوؤں کی رام لیلا کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

ربیع الاول میں ولادت نبویہ کی وجہ سے فضیلت اس لیے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام زیادہ پڑھا جائے۔ آپ کی اتباع کا زیادہ اہتمام کیا جائے مگر لوگوں نے اس کو بھی ایک تہوار بنا لیا جس میں سوائے محفل میلاد کے اور کچھ نہیں ہوتا اور محفل میلاد بھی اپنی طرف سے ایک خاص صورت اختراع کر کے منعقد کی جاتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا ذکر آتے ہی قیام

ئے۔ کوئی ہے جو اس اہتمام کی مثال پیش کر سکے۔

فضیلتِ انسانی حدیث سے انسان کی فضیلت بھی تمام مخلوقات پر مفہوم ہو رہی ہے کیونکہ کسی مکان یا زمان کی فضیلت ہی انسان کے فائدہ کے لیے ہے کہ وہ اُن میں عبادت کا مامور ہے اور اُس کا ثواب بڑھتا ہے۔ چنانچہ اس کی تصدیق حق تعالیٰ شانہٗ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے وسخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض جمیعا منہ ان فی ذلک لآیات لقوم یتفکرون ؕ اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے واسطے اپنی طرف سے (اپنے حکم سے) ان تمام چیزوں کو مسخر کر دیا (یعنی تمہارے کام میں لگا دیا) ہے جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں (کیونکہ اگر انسان نہ ہو تو ان کا کوئی نقصان نہیں اور یہ نہ ہوں تو انسان پریشان ہو جائے۔ اس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ تمام مخلوقات انسان کے واسطے ہیں۔ انسان اُن کے واسطے نہیں۔ تو کیا انسان اشرف المخلوقات ہو کر بیکار محض ہے اس سے متعلق کوئی کام نہیں؟) یقیناً اس میں دلائل ہیں اُن لوگوں کے لیے جو سوچتے ہیں (وہ غور وفکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ان چیزوں کو ہمارے کام میں لگانا ہمارے بس کی بات تو نہیں کیونکہ چاند، سورج، ستارے، پہاڑ بادل، ہوا اور دریا ہمارے بنائے ہوئے نہیں نہ اُن کے نظام پر ہم کو قدرت۔ اسی طرح زمین سے جو ہمارے واسطے غلہ پھل ترکاری اور اقسام وانواع کی نعمتیں پیدا ہو رہی ہیں، جانوروں سے دودھ وغیرہ مل رہا ہے ہم نے اُس میں کچھ نہیں کیا؟ پھر کس نے ان چیزوں کو ہمارے واسطے بنایا اور سب کو ہمارے کام میں لگا دیا؟ اسی نقطہ سے اپنے مالک کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔ پھر اُس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا جذبہ دل میں پیدا ہوتا اور اُس کے راضی کرنے کا طریقہ معلوم کرنے کی فکر ہوتی ہے اور انسان سمجھ جاتا ہے کہ جس نے میرے واسطے یہ تمام سامان کیا ہے اُس نے ضرور میرے فرائض بھی کچھ رکھے ہیں اور ایسا مہربان مالک مجھے اندھیرے اور گمراہی میں نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کے بعد اُس کو رسولوں اور راہنماؤں کی

کیا جاتا ہے اور قیام میں گلے ملا کر درود شریف پڑھا جاتا ہے۔ پھر حاضرین کو مٹھائی تقسیم کی جاتی ہے اور میلاد خوان کو نذرانہ دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی اس طریقہ کو بدعت کہے تو اُس کو وہابی کہہ کر بدنام کیا جاتا ہے کیونکہ میلاد خوانوں کے نذرانے موقوف ہوتے ہیں مگر یہ صُورت اُسی وقت تک اچھی ہے جب تک میلاد خوانوں کو نذرانے مل رہے ہیں اور اگر عامہ مسلمین اُن سے برابر میلاد پڑھوائیں اور نذرانہ بند کر دیں تو میں سچ کہتا ہوں کہ وہ خود بھی اس کو بدعت کہنے لگیں گے۔ مُسلمانوں کو سمجھ لینا چاہئیے کہ اللہ تعالےٰ نے جس زمان یا مکان کو فضیلت دی ہے اُس میں عبادت مطلوب ہے۔ لہو ولعب اور جشن آرائی مطلوب نہیں۔ اب وہ خُود فیصلہ کر لیں کہ ان کا عمل مقصود شریعت کے موافق ہے یا خلاف۔ واللہ المستعان۔

واقعہ یہ ہے کہ ان ایامِ فضیلت کے آنے سے پہلے جو حالت ہماری ہوتی ہے وہی ان ایام میں بھی باقی رہتی ہے اور ان کے بعد بھی۔ نہ ان ایام میں عبادت کا اہتمام ہوتا ہے نہ ان کے بعد پھر محض ہنگامہ آرائی سے کیا فائدہ؟ جتنی رقم ان ہنگامہ آرائیوں میں ہر سال صَرف ہوتی ہے اگر اُس کو کسی تعمیری کام میں صرف کیا جاتا تو مُسلمانوں کی حالت سنبھل جاتی اور ان ایام میں اپنی حالت درست کرنے کا اہتمام کیا جاتا تو نصرتِ خداوندی شامل حال ہوتی مگر لوگ صرف ہنگامہ آرائی کو مقصود سمجھ بیٹھے ہیں عمل کا اہتمام بالکل نہیں۔



باب ۴۵

حدیث

الانابۃ عن الحج

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حج وداع میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے باپ پر اللہ تعالےٰ کا فریضۂ حج عائد ہو گیا ہے۔ مگر وہ بہت بُوڑھا ہے۔ سواری پر جم (کر بیٹھ) نہیں سکتا تو میں کیا اُس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ فرمایا ہاں! (کر سکتی ہو)۔"

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ حج میں نیابت ہو سکتی ہے۔ اب گفتگو یہ ہے کہ کیا حج فرض اور نفل دونوں میں نیابت ہو سکتی ہے؟ جیسا امام شافعیؒ سے منقول ہے یا صرف نفل میں ہو سکتی ہے فرض میں نہیں۔ سو اس عورت نے اپنے باپ کی جو حالت بیان کی ہے کہ وہ سواری پر نہیں جم سکتا اس کا مقتضا یہ ہے کہ اُس پر حج فرض نہ تھا کیونکہ حق تعالےٰ فرماتے ہیں کہ من استطاع الیہ سبیلا کہ (حج اُس پر فرض ہے) جو راستہ طے کرنے کی طاقت رکھتا ہو اور اس شخص کو طاقت نہ تھی تو اُس پر فرض عائد نہ تھا مگر سوال کرنے والے کے سوال میں تصریح ہے کہ فریضۂ حج اُس کے باپ پر عائد ہو گیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار نہیں فرمایا۔ اس سے زیادہ صریح عبداللہ بن زبیر کی حدیث ہے کہ ایک شخص قبیلۂ خثعم کا حضورؐ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ میرے باپ نے اسلام قبول کر

لیا ہے۔ وہ بہت بوڑھا ہے سواری پر نہیں جم سکتا ہے اور حج اُس پر فرض ہے تو کیا میں اُس کی طرف سے حج کر سکتا ہوں ؟

فرمایا کیا تم اُس کے سب سے بڑے بیٹے ہو ؟ کہا ہاں ! فرمایا بتلاؤ اگر تمہارے باپ پر (کسی کا) دین ہوتا اور تم اُس کو ادا کر دیتے تو کیا اُس کی طرف سے ادا ہو جاتا ؟ کہا ہاں ! فرمایا تو بس تم اُس کی طرف سے حج کرو۔ رواہ احمد والنسائی و قال الحافظ اسنادہ صالح صہ ج ۱۰ - اعلاء -

اس میں سوال کرنے والے نے اپنے باپ کی حالت بیان کر کے صاف کہا کہ اُس پر حج فرض ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کا رد نہیں کیا بلکہ اداء دین کی مثال دے کر اُس کو حکم دیا کہ اپنے باپ کی طرف سے حج کرے۔ اسی لیے امام ابو یوسف اور امام محمد کا قول یہ ہے کہ صحت بدن و امن طریق شرط وجوب ادا ہے۔ شرط نفس وجوب نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے من استطاع الیہ سبیلا کی تفسیر میں صرف زاد و راحلہ کا ذکر فرمایا ہے۔ صحت بدن و امن طریق وغیرہ کا ذکر نہیں فرمایا تو جس میں زاد و راحلہ کی قدرت موجود ہے اُس پر حج فرض ہوگا۔ اب اگر مرض اور ضعف وغیرہ بھی نہیں تو خود حج کرنا فرض ہے اور اگر کوئی مرض یا راستہ کی بدامنی یا بڑھاپا مانع ہو گیا تو خود حج کرنا فرض نہیں بلکہ حج بدل کرا دینا یا وصیت کر جانا فرض ہے یہی قول صحیح ہے اگرچہ مذہب میں اور بھی روایات ہیں۔ بہر حال یہ حدیث حج فرض میں جواز نیابت پر دال ہے اور نفل اُس کے تابع ہے ۱۲-)

یہاں دُوسری گفتگو یہ ہے کہ (حج کی طرح) اور طاعاتِ بدنیہ میں بھی نیابت جائز ہے یا نہیں) جیسے نماز، روزہ) تو جمہور کے نزدیک جائز نہیں اور جن آئمہ نے حج میں نیابت جائز کی ہے صرف اسی حدیث کی وجہ سے جائز کی ہے اور تم دیکھ رہے ہو کہ ان میں بھی اختلاف ہے کہ یہ حدیث حج فرض کے متعلق ہے یا نفل کے۔ دوسرے حج میں انفاق مال کی جہت غالب ہے طاعتِ بدنیہ

اُس کے تابع ہے اور عباداتِ مالیہ میں نیابت جائز ہے اور فرض مالی میں بلا اختلاف جائز ہے۔ باقی عباداتِ بدنیہ (محضہ) میں نیابت جائز نہیں۔ صرف بعض لوگوں نے شذوذ کے طور پر خلاف کیا ہے (یعنی وہ عامۂ فقہاء سے الگ ہو کر ایسا کہتے ہیں) کہ اگر کوئی مر جائے اور اُس کے ذمے فرض روزہ ہو تو ولی اُس کی طرف سے روزہ رکھ دے۔ جمہور علماء کہتے ہیں کہ اس کی طرف سے ولی روزہ نہیں رکھ سکتا (بلکہ فدیہ ادا کر سکتا ہے)۔

ایک حدیث میں (یہ لفظ) وارد ہُوا ہے یصوم عنہ ولیہ کہ ولی اُس کی طرف سے روزہ رکھ دے۔ بعض علماء نے اس پر عمل کیا مگر جمہور کے نزدیک اس پر عملدرآمد صحیح (طور سے ثابت) نہیں ہُوا۔ (جمہور کہتے ہیں کہ جن صحابہ نے یہ حدیث روایت کی ہے اُن کا فتوے خود اُس کے خلاف ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ اور عبد اللہ بن عباس اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے: لایصلین احد عن احد و لایصومن احد عن احد ولکن ان کنت فاعلا تصدقت عنه او اهديت۔ کوئی کسی کی طرف سے نہ نماز پڑھے نہ روزہ رکھے لیکن اگر تمہیں کچھ کرنا ہے تو اُس کی طرف سے صدقہ کر دو یا ہدی کر دو یعنی قربانی کر کے غرباء کو بانٹ دو"

پس یا تو یہ کہنا چاہیئے کہ پہلی حدیث منسوخ ہے وہ حکم ابتدائی اسلام میں ہو گا یا یہ کہا جائے کہ پہلی حدیث اُس صورت میں ہے جب میت نے وصیت نہ کی ہو یا وصیت کی ہو مگر کچھ مال نہیں چھوڑا تو وارث پر فدیہ واجب نہ ہوگا۔ ہاں اگر وہ چاہے اپنے پاس سے فدیہ ادا کر دے یا نماز پڑھ کر روزہ رکھ کر میت کو اُس کا ثواب پہنچا دے اور دُوسری حدیث اِس صورت میں ہے جب میت نے وصیت کی ہو اور مال بھی چھوڑا ہو۔ اس وقت وارث کا نماز روزہ کفایت نہ کریگا بلکہ فدیہ ادا کرنا واجب ہوگا۔ ھذا ھو تفصیل ما ذکرہ الشارح فی المقام والبسط فی الاعلاء واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۱۹۱) کسی کی طرف سے دُوسرا استفتاء کر سکتا ہے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ مسئلہ شرعی معلوم کرنے میں نیابت جائز ہے (کہ کسی کی طرف سے دُوسرا استفتاء کر لے) چنانچہ اس عورت نے اپنے باپ کے متعلق استفتاء کیا (اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم شرعی بتلا دیا۔ یہ نہیں فرمایا کہ اپنے باپ سے کہو وہ خود آکر سوال کرے) نیز یہ بھی معلوم ہُوا کہ عورت بھی دُوسرے کی طرف سے حکمِ شرعی دریافت کر سکتی ہے اور یہ بھی معلوم ہُوا کہ عورت سے بات چیت کرنا اور اجنبی مردوں کا اُس کی آواز سُننا جائز ہے اگرچہ اُس کی آواز بھی عورت ہے (یعنی چھپانے کی چیز ہے) جس کا سُننا اجنبی کو جائز نہیں مگر ضرورت میں جائز ہے (اور یہ موقعہ ضرورت کا تھا کہ حکم شرعی معلوم کرنا تھا) چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس نے مسئلہ دریافت کیا اور حضورؐ نے اُس کی بات کو سُنا (اگر یہ جائز نہ ہوتا تو حضورؐ اُس کو بات کرنے سے منع کر دیتے اور فرماتے کہ کسی محرم کے ذریعے سے سوال کرو) اور اس سے معلوم ہُوا کہ متقی حکام اور فقہاء کے ساتھ (اُن کے دربار وغیرہ میں) بیٹھنا جائز ہے اگرچہ اُن کے پاس مرد اور عورتیں سب ہی آتے ہوں۔

کیونکہ جس وقت اس عورت نے سوال کیا تھا اُس وقت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور دُوسری احادیث میں بھی یہی منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی تنہا نہیں بیٹھتے تھے بلکہ صحابہ کی ایک جماعت آپؐ کی مجلس میں حاضر رہتی تھی۔ اسی طرح احکام (شرعیہ) کا تقرر ہُوا ہے کہ آپؐ نے جس کو بھی جو کچھ بتلایا اور جس کے بھی سوال کا جواب دیا صحابہ کی ایک جماعت اُس کو سُنتی اور محفوظ کرتی تھی۔ پھر انہوں نے بعد والوں کو احکام پہنچائے جو کُتب حدیث میں جمع کر دیئے گئے) اگر یہ صُورت دوسروں کے لیے جائز نہ ہوتے، صرف آپؐ کی ذات سے خاص ہوتی کہ وہاں تقریرِ احکام کے لیے اُس کی ضرورت تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس کو ضرور ظاہر فرما دیتے

دیتے) مگر ایسا نہیں ہُوا بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین کا عمل بھی اسی پر رہا کہ اُن کی مجلس میں بھی ایک خاص جماعت اہل شوریٰ کی رہتی تھی جو حضرات خلفاء کے احکامات کو سُنتے اور محفوظ کرتے اور ضرورت کے موقعہ پر مشورہ بھی دیتے تھے۔

قوله فيه دليل على جواز النيابة فى العلم الى قوله لكان يذكر ذلك ويبينه "

ف ۔ صوفیاء کے نزدیک بھی ایک شخص دُوسرے کے متعلق سوال کر سکتا ہے بشرطیکہ اُس کی مخفی حالت کے متعلق سوال نہ ہو۔ مثلاً یہ سوال کر سکتا ہے کہ فلاں شخص بیمار ہے وہ بیماری میں اپنے معمولات پُورے نہیں کر سکتا تو کیا کرے؟ لیکن یہ سوال نہیں کر سکتا کہ فلاں شخص میں بد نگاہی کا مرض ہے اُس کو کیا کرنا چاہیئے یہ سوال مریض کو خود کرنا چاہیئے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔

ف ۔ ضرورت کے موقعہ پر عورت کو عالم کے پاس جانا اور حُکم شرعی دریافت کرنا جائز بلکہ بعض دفعہ واجب ہے جب کہ اس کے سوا کوئی صُورت نہ ہو مگر عالم کو تنہائی میں عورتوں سے بات نہ کرنا چاہیئے یا تو اپنے گھر والوں کے سامنے بات چیت کرے یا مجمع عام میں۔ اگر عالم کے گھر پر سوال کرنے کا موقعہ مل جائے تو عورت کو عالم کے سامنے نہ آنا چاہیئے بلکہ پردے کے پیچھے سے بات کرے اور اگر عالم کے گھر والوں میں سے کوئی اس قابل ہو کہ سوال سمجھ کر صحیح طور سے عالم کے سامنے بیان کر سکے تو اجنبی عورت کو خود بات نہ کرنا چاہیئے بلکہ بواسطہ سوال کرنا چاہیئے اور اگر اُس کے گھر والوں میں کوئی سوال کو صحیح طور سے ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو یہ خود پردے کے پیچھے سے بات کرے اور مجمع عام میں سے سوال کی ضرورت ہو تو عورت کو مُنہ کھول کر نہ آنا چاہیئے، بلکہ بُرقعہ پوش ہو کر آنا چاہیئے۔

اور اس عورت نے جس کا واقعہ حدیث میں مذکور ہے مُنہ کھول کر اس

لیے بات کی کہ وہ احرام کی حالت میں تھی اور حالتِ احرام میں عورت کو مُنہ کھولنا جائز بلکہ ضروری ہے۔

اور اللہ تعالےٰ کی قدرت ہے کہ زمانۂ حج میں جو کہ ایک ہفتہ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ عورتوں کے مُنہ کھولنے سے اب تک کوئی فتنہ پیدا نہیں ہُوا۔ مگر پھر بھی زمانۂ فساد پر نظر کر کے آج کل فقہاء نے حالتِ احرام میں بھی عورتوں کو مُنہ چھپانے کی تاکید کی ہے۔ مگر کپڑا مُنہ سے علیٰحدہ رہنا چاہیئے۔ جس کے لیے اس قسم کے کپڑے، پنکھے ایجاد ہو گئے ہیں جن کو سر پر رکھنے سے نقاب چہرہ سے الگ رہتا ہے۔



باب ۶۹

حدیث

مایلبس المحرم فی الحج

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! محرم کون کون سے کپڑے پہن سکتا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (محرم) قمیص نہ پہنے نہ عمامہ باندھے، نہ پائجامہ پہنے نہ برنس (لمبی ٹوپی کا نام ہے جو زمانۂ قدیم میں مستعمل تھی جو پورے سر کو گردن سمیت محیط تھی) اور نہ موزے پہنے مگر یہ کہ کسی کے پاس نعل نہ ہو (وہ جُوتہ جس میں ایڑی نہیں ہوتی) تو وہ موزے پہن سکتا ہے، بشرطیکہ اُن کو ٹخنے سے نیچے (کر کے) کاٹ دے اور کوئی ایسا کپڑا نہ پہنو جس کو زعفران یا ورس لگی ہو (یہ بھی ایک گھاس ہے خوشبودار جس سے کپڑے رنگے جاتے ہیں۔

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ حالتِ احرام میں ان کپڑوں کا پہننا اور ایسے موزے پہننا جس سے ٹخنے ڈھک جائیں اور زعفران و ورس سے رنگے ہوئے کپڑے پہننا ممنوع ہے اور ظاہر یہ ہے کہ ممانعت ان ہی چیزوں میں منحصر نہیں بلکہ بعض کو بیان فرما کر تنبیہ کی گئی ہے جو اُن کے مثل ہوں جس کی تفصیل کتبِ فقہ میں مذکور ہے۔

(۱۹۲) گفتگو ایسی ہونی چاہیئے کہ مخاطب سمجھ جائے یہاں سے معلوم ہُوا کہ سائل سے اس

طرح کلام کرنا چاہیئے جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ سمجھ گیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اعرابی سے اسی طرح کلام فرمایا جو حدیث میں مذکور ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نہ معلوم ہوتا کہ وہ اس جواب سے پوری بات سمجھ جائے گا تو آپ اتنی سی بات پر اکتفا نہ کرتے جو حدیث میں مذکور ہے بلکہ مبالغہ کے ساتھ تشریح فرماتے۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حدیث نبوی اور قرآن شریف میں زبانِ عربی کے قاعدے کے موافق ہی غور کرنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں۔ اسی لیے حق تعالیٰ فرماتے ہیں فانما یسرناہ بلسانک لعلھم یتفکرون (ہم نے قرآن کو آپ کی زبان (عربی) میں آسان کر دیا ہے تاکہ وہ سمجھ جائیں (یعنی بقاعدہ زبان عربی جس مطلب کو کلام مقتضی ہے اس کو سمجھ جائیں تاکہ اُن سے جس بات کا ارادہ کیا گیا ہے اُس کو سمجھ کر نصیحت حاصل کریں اور اُس پر عمل کریں"

قولہ ان المتکلم یخاطب السائل بحسب مایعلم انہ یفھم عنہ الیٰ

قولہ فیتذکرون عند ذلک۔

ف ۔ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کو اس کا بہت اہتمام تھا کہ بات صاف ہو اور پوری ہو ادھوری نہ ہو تاکہ مخاطب اچھی طرح مطلب سمجھ جائے۔ جن لوگوں نے حضرت کے مکاتیب و رسائل کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا جواب مختصر بھی کافی ہوتا تھا۔ صوفیاء اور علماء کو اس کا اہتمام کرنا چاہیئے۔

ف ۔ جو لوگ قرآن و حدیث میں بدون ذوقِ عربیت کے غور کرنا چاہتے ہیں، اُن کی غلطی بھی واضح ہو گئی۔ آج کل بعض جہلا صوفیاء قرآن سے اپنے طریقہ کو قواعد عربیت کے خلاف ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ محض ترجمہ دیکھ کر مجتہد بن جانا چاہتے ہیں۔ بعضے تھوڑی سی صرف و نحو پڑھ کر قرآن و حدیث سے مسائل کا استنباط کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سب قرآن و حدیث میں تحریف کرنا چاہتے ہیں۔ جس کو عربی زبان سے ذوق نہ ہو اُس کو علماء محققین سے رجوع کرنا لازم ہے۔ فاسئلوا

اھل الذکر ان کنتم لاتعلمون۔

(۱۹۳) مسائل جزئیہ کی تحقیق بھی جائز ہے

حدیث سے معلوم ہوا کہ مسائل جزئیہ کی تحقیق کرنا جائز ہے

کیونکہ اس شخص نے جزئیات ہی سے سوال کیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو جواب دیا جس سے اس قسم کے سوال کا جواز معلوم ہو گیا۔

نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ (احکام) دین کا پوچھنا ضرورت سے پہلے بھی جائز ہے کیونکہ اُس شخص نے محرم کے لباس کو دریافت کیا حالانکہ وہ اس وقت محرم نہ تھا۔ اسی کے مناسب امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا واقعہ ہے کہ ایک رات وہ اپنے زمانہ کے ایک امام کے پاس رہے جن پر عبادت کا (زیادہ) غلبہ تھا۔ اگرچہ اُس زمانے کے سبھی ائمہ کا یہی حال تھا (مگر پھر بھی بعضوں پر کسی ایک شان کا غلبہ ہوتا تھا) تو وہ امام تو رات بھر نماز میں مشغول رہے اور امام شافعیؒ لیٹے رہے۔ صبح کو اُن عالم کی بیوی نے کہا یہی وہ امام شافعی ہیں جن کی آپ تعریف کیا کرتے تھے۔ آپ تو رات بھر نماز پڑھتے رہے اور وہ رات بھر بے حس و حرکت لیٹے رہے۔ اُن بزرگ نے اپنی بیوی کی بات کا تذکرہ امام شافعی سے کیا تو فرمایا کہ میں آج رات بھر استنباط مسائل میں مشغول رہا اور اسّی (۸۰) مسئلے دلیل و برہان کے ساتھ اپنے ذہن میں جمع کر لیے۔ اُن بزرگ نے اپنی بیوی سے کہا کہ جس کے لیٹے رہنے پر تُو نے اعتراض کیا تھا اُس نے اس رات میں اسّی مسائل استنباط کئے ہیں جن میں سے ایک مسئلہ بھی میری ساری عبادت سے افضل ہے (کیونکہ میری عبادت تو صرف میرے لیے ہے اور مسائل کا استنباط ساری اُمت کو نافع ہے جس سے قیامت تک وہ دین کا راستہ معلوم کرے گی)، ذرا تم ان حضرات کی بزرگی اور باہمی انصاف اور علم کے احترام کو تو دیکھو اللہ تعالیٰ ان سب پر رحم فرمائے (واقعی یہ حضرات امام تھے) اور یہی حق ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کے واسطے ہو (کہ ہر عالم دوسرے کا احترام کرے اور صرف اللہ تعالیٰ کے

واسطے احترام کرے)۔ قولہ وفیہ دلیل علی البحث فی جزئیات الدین الیٰ قولہ وھوالحق اذا کان للہ۔

ف ۔ اسی قسم کا واقعہ امام محمد بن الحسن رحمہ اللہ تعالےٰ کا امام شافعی کے ساتھ منقول ہے کہ امام شافعی اخیر شب میں تہجد کو اُٹھے اور امام محمد لیٹے رہے۔ صبح کو امام شافعی نے دریافت کیا کہ آپ نے رات تہجد کیوں نہیں پڑھا؟ فرمایا تم نماز میں قرآن پڑھ رہے تھے اور میں اُن آیات سے مسائل استنباط کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ دو سو سے زیادہ مسائل میں نے جمع کر لیے اس لیے تہجد کو نہ اُٹھا۔ یہ ہیں وہ حضرات جن کے متعلق حدیث میں وارد ہے نوم العالم عبادۃ عالم کا سونا اور لیٹنا بھی عبادت ہے۔

حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کی عادت تھی کہ سوتے ہوئے پنسل کاغذ اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔ اگر رات کو کوئی مسئلہ علم ظاہر یا علم باطن کا قلب پر وارد ہوتا تو فوراً بتی جلا کر اُس کو لکھ لیتے تھے۔ بعض دفعہ یہ بھی دیکھا گیا کہ دن میں ڈاک پوری نہ ہوئی تو رات کو تہجد کی نماز ہلکی ہلکی رکعتوں سے ادا کر لی اور ڈاک لکھنے بیٹھ گئے۔ کیونکہ اس میں طالبین کی اصلاح و تربیت ہوتی تھی جو تہجد سے اہم و اقدم ہے۔

ف ۔ حضرات فقہاء نے استنباط مسائل کے لیے تہجد کو ہمیشہ ناغہ نہیں کیا بلکہ ایسا اتفاق کبھی کبھی ہو جاتا تھا جبکہ قلب پر دفعۃً مسائل کا ورود ہونے لگتا اور تہجد میں مشغول ہونے سے اس سلسلہ کے منقطع ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ورنہ حضراتِ فقہاء کو علمِ ظاہر کے ساتھ عبادت کا بھی بہت زیادہ اہتمام تھا اس عمل ہی کی برکت سے علم ظاہر میں ترقی اور نُور پیدا ہوتا تھا اور اسی کی برکت سے بعض دفعہ اُن کے قلب پر دریائے علم موجزن ہوتا تھا تو اس وارد کا حق ادا کرنے کے لیے اُسی میں مشغول رہتے اور اس وقت تہجد کو ناغہ کر دیتے پھر بعد طلوع آفتاب کے اُس کی قضاء کر لیتے تھے اور ظاہر ہے کہ وارد کا غلبہ

ہمیشہ نہیں ہوا کرتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ایک ذاکر شاغل صوفی حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ کے مہمان ہوئے۔ عشاء کے بعد مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ نے صوفی صاحب سے فرمایا اگر تہجد پڑھنا چاہتے ہو تو اپنا پلنگ مولوی ظفر احمد کے پاس بچھاؤ وہ رات کو اُٹھے گا تم بھی اُٹھ جاؤ گے اور اگر سونا چاہتے ہو تو اپنا پلنگ میرے ساتھ بچھا لو۔ صوفی نے کہا میں تو آپ ہی کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔ فرمایا بہت اچھا۔ چنانچہ اُس رات دونوں حضرات صبح تک سوتے ہی رہے۔ صبح کی نماز کے بعد وہ صُوفی کہنے لگے مولانا ایسی نیند تو روز سُلا دیا کرو۔ واللہ! رات بھر اللہ تعالےٰ کا ایسا حضور رہا کہ مجھے نماز میں بھی اب تک ایسا حضور حاصل نہیں ہوا۔ مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور فرمایا بھائی ہمارے پاس تو بس یہی ہے۔ اللہ اللہ! ایسے حضرات کی نیند پر ناقصوں کے ہزار تہجد قربان ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

(۱۹۴) اسرارِ حج کا بیان

حاجی (حالتِ احرام میں) جن باتوں کا مکلف کیا گیا ہے کہ سلا ہوا کپڑا نہ پہنے خوشبو نہ لگائے۔ زینت نہ کرے اس کی کوئی حکمت ہے یا محض تعبد ہے جس کی علت عقل میں نہیں آسکتی؟ اگر محض تعبد ہے تو گفتگو کی ضرورت نہیں اور اگر کہا جائے کہ قواعد شرعیہ حکمت پر مبنی ہیں تو اس کی حکمت میں غور کیا جائے گا۔ چنانچہ کتاب اللہ نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس میں ایک ہی نشانی نہیں بلکہ بہت سی نشانیاں ہیں چنانچہ حکمِ حج سے پہلے ارشاد ہے فیہ آیات بینات بیت اللہ میں بہت سی نشانیاں ہیں اور یہ لفظ عام ہے جو معنوی حکمتوں اور حسی نشانیوں سب کو شامل ہے یا حسی نشانیوں کیساتھ ہے جیسا بعض علماء نے فرمایا ہے (کہ بیت اللہ میں ایک نشانی قدرت یہ[ع]

ع اور ایک بڑا نشانِ قدرت تو یہ ہے کہ بیت اللہ ہزارہا برس گزر جانے پر بھی محفوظ ہے جبکہ بڑے بڑے سلاطین کے محلات کا نام و نشان تک باقی نہیں رکعبہ معظمہ سے قدیم تر عمارت آج دُنیا کے پردہ پر کسی جگہ موجود نہیں ۱۲۔ ظ

ہے کہ) وہاں (پہنچ کر) کوئی مخدوم نہیں دیکھا جاتا (بلکہ سب ہی ایک شان میں نظر آتے ہیں نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز) اور (دوسرا نشانِ قدرت) رمی جمار میں (رہے) کہ ہر سال اُن پر کنکریاں ماری جاتی ہیں (اور یہ سلسلہ ہزاروں برس سے چلا آرہا ہے ہر سال لاکھوں آدمی تین روز تک مسلسل ہر جمرہ پر لاکھوں کنکریاں مارتے ہیں) مگر اُن کا کوئی نشان وہاں باقی نہیں رہتا (حالانکہ اُن کے اُٹھانے اور صاف کرنے کا کوئی انتظام نہیں ہے جس کا جی چاہے تحقیق کرے تو عقل کا مقتضا دیہ تھا کہ اسی مقام پر کنکریوں سے ایک پہاڑ بن جاتا مگر ایسا نہیں ہوا کیونکہ حدیث میں وارد ہے کہ جو کنکریاں قبول ہو جاتی ہیں اُن کو فرشتے اُٹھا لیتے ہیں) تو یہ (حسّی نشان قدرت) بھی اُن آیاتِ کثیرہ کا ایک حصہ ہے (جن پر فیہ آیات بینات میں اشارہ کیا گیا ہے اور تیسرا حسی نشانِ قدرت یہ ہے کہ زمینِ حرم کے اندر بھیڑیا اور بکری ساتھ ساتھ رہتے ہیں نہ بکری بھیڑیئے سے ڈرتی ہے نہ بھیڑیا اُس پر حملہ کرتا ہے اور جہاں زمینِ حرم سے باہر ہوئے پھر بکری بکری ہے اور بھیڑیا بھیڑیا)۔ تو اس میں سوچنے اور سمجھنے والوں کو تنبیہ ہے وہ غور کریں گے تو اُن کی سمجھ میں بہت سی نشانیاں قدرت کی آجائیں گی۔ ان آیات کے عموم سے ہر شخص اپنی سمجھ کے موافق حصہ لیتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اُس پر منکشف کردیں کیونکہ اس میں عجیب عجیب حکمتیں ہیں۔

چنانچہ (لباسِ احرام کے متعلق) اللہ تعالیٰ کی توفیق سے جو حکمت ہمیں معلوم ہوئی وہ دو باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ حجاج اپنے گناہوں کا بوجھ اتارنے (اور گناہوں سے معافی چاہنے کو) جاتے ہیں۔ اس حالت کے مناسب یہی صورت ہے کہ ذلت کی شکل بنا کر جائے۔ لذاتِ نفس سے علیحدہ ہو کر جائے کہ وہی گناہوں میں مبتلا کرتی ہیں کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ جب حق تعالیٰ شانہٗ نے ملائکہ سے فرمایا: انی جاعل فی الارض خلیفۃ کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں تو انہوں نے کہا اتجعل فیہا من یفسد فیہا و یسفک الدماء و نحن نسبح بحمدک و نقدس لک۔ کیا آپ زمین میں ایسے لوگوں کو خلیفہ کرنا چاہتے ہیں جو اُس میں

فساد کریں گے خون ریزی کریں گے اور ہم بحمد اللہ آپ کی تسبیح و تقدیس کرتے ہیں (ہم اس کے لیے حاضر ہیں ہمارے ہوتے ہوئے کسی اور کی کیا ضرورت ہے؟) قال انی اعلم ما لا تعلمون سے اللہ تعالیٰ کو غصہ آگیا[ع۱] (اور فرمایا بس میں جانتا ہوں جو کہ تم نہیں جانتے) تو فرشتوں نے سات دفعہ عرش کا طواف کیا اور توبہ و استغفار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اُن کی توبہ قبول کی پھر فرمایا زمین میں ایک گھر بناؤ جس کا گنہگار انسان طواف کرے تو میں اُن کی توبہ قبول کروں جیسا (عرش کے طواف سے) تمہاری توبہ قبول کی اور اُن کی بھی مغفرت کردوں جب تمہاری مغفرت کی۔ فرشتوں نے یہ گھر (کعبہ معظمہ) بنایا تو جو اس غرض سے آئے۔ حکمت کا

ع۱ یہ حدیث میری نظر سے نہیں گزری البتہ مُلا علی قاری نے معالم التنزیل سے نقل کیا ہے کہ امام علی بن الحسین (زین العابدین) رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرش کے نیچے ایک مکان بنایا جس کا نام البیت المعمور ہے اور فرشتوں کو اس کے طواف کا امر کیا۔ پھر جو فرشتے زمین پر رہتے ہیں اُن کو حکم دیا کہ ایسی تعمیر پر اسی کے برابر زمین میں ایک گھر بنائیں۔ انہوں نے بنایا۔ اور اس کے طواف کا زمین والوں کو حکم کیا گیا جیسا آسمان والے بیت المعمور کا طواف کرتے ہیں۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ فرشتوں نے آدم علیہ السلام کی پیدائش سے دو ہزار برس پہلے بیت اللہ کو بنایا تھا اور وہ اس کا حج کرتے تھے۔ جب آدم علیہ السلام نے حج کیا۔ فرشتوں نے کہا آپ کا حج قبول ہے ہم نے آپ سے دو ہزار برس پہلے اس کا حج کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

پس اگر یہ حدیث جو شارح نے بیان کی ہے صحیح نہیں تو کچھ اشکال نہیں اور اگر صحیح ہے تو اس سے عصمت ملائکہ کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ ملائکہ کا مقصود اعتراض نہ تھا بلکہ حکمت دریافت کرنا تھا کہ ہمارے ہوتے ہوئے ایسی مخلوق کو خلافت دینے میں کیا حکمت ہے؟ مگر عنوان خلافِ ادب تھا اس لیے حق تعالیٰ ناراض ہوئے پس ملائکہ کی بات گناہ کے درجہ میں نہ تھی صرف لغزش کے درجہ میں تھی جو عصمت کے منافی نہیں۔ ۱۲ ظ

مقتضاء یہ ہے کہ اُس کی حالت مقصود کے مناسب ہو۔ دیکھو عید (کی نماز) کے لیے نکلنا چونکہ طلبِ رحمت کا انعام) کے لیے ہے عبادت صوم پُورا کرنے کے بعد تو اُس میں خوشبُو لگانا اچھے کپڑے پہننا مطلوب ہے کیونکہ اس وقت کے مناسب یہی ہے۔ یہ حالت استقامت اور امتثال امر کی ہے (کہ امتثال امر کے بعد انعام حاصل کرنے کے لیے بارگاہِ عالی میں حاضر ہوئے ہیں تو اچھی شکل سے آنا چاہیئے) اور نمازِ استسقاء کے لیے نکلنا اُس معیبت کے دُور کرنے کے لیے ہے جو (قحط کی شکل میں) نازل ہوئی ہے تو اُس وقت تضرع و مسکنت (خشوع وخضوع) کے ساتھ نکلنا چاہیئے۔ (کپڑے بھی اچھے نہ ہوں بلکہ میلے کچیلے ہوں) کیونکہ اُس وقت گناہوں کا ارتکاب کرکے بارگاہ میں آئے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے جب بندے گُناہ کرتے ہیں حق تعالےٰ اُن سے بارش کو روک لیتے ہیں تو اُس حالت کے مناسب یہی صُورت ہے کہ مسکنت و ذلت کی شکل میں آئیں۔ دُعا میں مارے خوف کے ہاتھ بھی اس طرح اُٹھائیں کہ ہتھیلی زمین کی طرف ہو (جس سے اس طرف اشارہ ہوتا ہے) کہ ہماری حالت پلٹ دیجئے۔ اسی طرح حج میں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ، کیونکہ حج میں بہت بڑی طلب ہے۔

دُوسری بات یہ ہے کہ حج میں روزِ محشر کا نمونہ ہے کیونکہ وہاں بھی ایک ہی دن میں تمام رُوئے زمین کے آدمی جمع ہوں گے (حج میں بھی ایک تاریخ میں تمام اطراف کے آدمی جمع ہوتے ہیں اور جیسا قیامت میں مختلف مقامات پر ٹھہرنا ہوگا (کبھی میدان میں جمع ہوں گے، کبھی حساب کے لیے بلائیں جائیں گے، کبھی میزانِ عمل پر جائیں گے وغیرہ وغیرہ) اسی طرح یہاں بھی مختلف مقامات مقرر ہیں کبھی (میدانِ عرفات میں اجتماع عظیم ہے) رمی جمار ہو رہا ہے۔ کبھی منیٰ، مزدلفہ میں وقوف ہو رہا ہے (کبھی طوافِ زیارت کے لیے جا رہے ہیں وغیرہ وغیرہ) اور جیسا دُنیا سے آخرت کی طرف جاتے ہوئے اہل وعیال اور مال سب چھوٹ جاتے ہیں

اور بجز کفن اور ضروریاتِ دفن کے (دُنیا کی) اور کوئی چیز ساتھ نہیں جاتی۔ اسی طرح حاجی اپنے اہل وعیال اور وطن سے مفارقت کرتا ہے جس کو اللہ تعالےٰ نے موت کے ساتھ ملا کر بیان فرمایا ہے ولو انا کتبنا علیھم ان اقتلوا انفسکم او اخرجوا من دیارکم ما فعلوہ الا قلیل منھم (اور اگر ہم اُن کے اُوپر یہ فرض کر دیتے کہ اپنی جانیں دے دو یا گھروں سے نکل جاؤ تو بہت کم آدمی اس فرض کو پُورا کرتے) اور اُس کے ساتھ بھی بقدرِ ضرورت سفر کے مال ہوتا ہے۔ غالب عادت یہی ہے باقی سب چھوڑ جاتا ہے۔

نیز جیسا میت کو قیامت سے پہلے مختلف مقامات میں ٹھہرنا ہوتا ہے اور قسم قسم کے خطرات پیش آتے ہیں جن سے بعض لوگ خلاصی پا جاتے ہیں جن کو اللہ تعالےٰ خلاصی دینا چاہیں اور بعضے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح حج کے راستے میں بھی بہت مشقتیں پیش آتی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے لم تکونوا بالغیہ الا بشق الانفس (اور یہ جانور تمہارے بوجھ اُٹھا کر ایسے شہر میں پہنچاتے ہیں جہاں تم بدون جانوں کو مشقت میں ڈالے نہیں پہنچ سکتے تھے) اور بعض لوگ حج کے راستہ ہی میں ہلاک ہو جاتے ہیں جیسا وہاں بعض لوگ قیامت سے پہلے ہی ہلاکت میں پڑ جاتے ہیں) مگر دونوں ہلاکتوں میں ایک فرق ہے کہ یہاں تو صرف اتنی ہی ہلاکت ہے کہ جان بدن سے نکل جاتی ہے۔ جس میں بعض دفعہ سعادت (اور شہادت) بھی مل جاتی ہے اور وہاں کی ہلاکت خطرات کی کثرت سے ہوتی ہے جن سے خلاصی نہیں ہوتی تو وہ شقاوت اور ناکامی کی ہلاکت ہے (حج کے راستہ میں ہلاک ہونے والا اس سے محفوظ ہے کیونکہ اللہ تعالےٰ کا وعدہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالےٰ کے واسطے گھر سے نکل چکا پھر راستہ میں موت آ جائے تو اُس کا ثواب اللہ کے ذمے ثابت ہو گیا۔ وہ انشاءاللہ محروم نہیں) مگر قیامت سے پہلے اور میدانِ قیامت) میں تو لوگ ننگے کھڑے ہوں گے اور حج میں ننگے نہیں ہوتے۔ اگرچہ زمانۂ جاہلیت میں اسلام سے پہلے (اکثر) لوگ ننگے ہو کر وقوف

(عرفہ وغیرہ) کرتے تھے۔ مگر اب شریعت نے اُس کو روک دیا اور ستر ڈھانکنے کے لیے لباس کو ضروری قرار دیا (مگر سِلا ہُوا کپڑا اور زینت کا لباس ممنوع کر دیا گیا بس مُردہ کی طرح لُنگی اور چادر میں احرام ہونا چاہیئے اور اُس کو حج پُورا ہونے تک رکھنا چاہیئے) کیونکہ قیامت کا تو ہول اس قدر ہو گا کہ کسی کو کسی کے ستر پر نظر کرنے کی مہلت نہ ہو گی اور حج میں نظر سے مانع کوئی چیز نہیں ہے تو لباس کی ضرورت ہے اور قیامت میں کسی کے پاس خوشبو نہ ہو گی۔ ایسا ہی یہاں بھی (زینت اور خوشبو سے منع کر دیا گیا) نیز قیامت میں حکومت اور سلطنت صرف اللہ تعالےٰ کی ہو گی اور کسی کی نہ ہو گی سب کے دعوے ختم ہو جائیں گے۔ اسی طرح حج میں جس غرض سے جاتے ہیں یعنی گناہوں کی مغفرت اور معافی اس میں بھی کسی کا کچھ دخل نہیں سب کے سب گردن جُھکائے منتظر کھڑے ہوتے ہیں کہ دیکھئے اللہ تعالےٰ کیا فیصلہ فرماتے ہیں (مغفرت سے نوازتے اور حج کو قبول فرماتے ہیں یا اُلٹا مُنہ پر مارتے ہیں۔ پھر میدانِ عرفات میں بادشاہ اور رعایا امیر و غریب سب ایک لباس میں ہوتے اور سب کے سب اللہ تعالےٰ کے سامنے عاجزی اور انکساری اور زاری کے ساتھ ہاتھ اُٹھائے ہوتے ہیں اُس وقت کوئی خادم اور مخدوم نظر نہیں آتا، بلکہ صاف ان الحکم الا للہ کا نقشہ سامنے ہوتا ہے)۔

ایک بزرگ سے منقول ہے کہ اُنہوں نے ایک بار حج کیا۔ حج سے فارغ ہو کر سو گئے تو خواب میں دیکھا کہ آسمان سے دو فرشتے اُترے ہیں (اور آپس میں باتیں کر رہے ہیں) ایک نے دُوسرے سے پُوچھا اس سال ہمارے پروردگار کے گھر کا کتنے آدمیوں نے حج کیا؟ دُوسرے نے کہا چھ لاکھ نے۔ اُس نے پھر سوال کیا کہ اُن میں سے کتنوں کا حج قبول ہُوا؟ کہا صرف چھ کا! یہ بزرگ گھبرا کر جاگ اُٹھے اور بار بار کہتے تھے۔ کاش مجھے کوئی بتلا دے کہ میں بھی اُن چھ میں ہوں؟ دُوسرے دن پھر سوئے (مگر کچھ معلوم نہ ہُوا) تیسرے دن پھر سوئے تو اُن ہی دو فرشتوں کو دیکھا کہ پھر آسمان سے اُترے ہیں اور پہلے کی طرح سوال و جواب کر رہے ہیں۔ جب ایک نے یہ جواب دیا کہ اس سال صرف چھ آدمیوں کا حج قبول ہُوا ہے تو دُوسرے نے سوال کیا کہ ہمارے پروردگار نے باقیوں کے متعلق کیا فیصلہ کیا؟ پہلے نے جواب دیا کہ اللہ تعالےٰ نے ان چھ میں سے ہر ایک کی سفارش ایک ایک لاکھ کے لیے قبول فرمائی (اس طرح سب ہی کا حج قبول ہو گیا) اب یہ بزرگ فرحاں و شاداں بیدار ہُوئے۔

اسی طرح قیامت میں کوئی نجات پانے والا ہے، کوئی ہلاک ہونے والا، کوئی مقبول ہے، کوئی غیر مقبول ہے۔ کوئی سفارش کرنے والا ہے کسی کے لیے سفارش ہو رہی ہے۔ لیکن شفاعت اللہ تعالےٰ کی اجازت کے بعد ہو گی اور کوئی محض فضل سے ناجی ہو گا (بدون اجازت کے کوئی کسی کی سفارش نہیں کرے گا من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ) اور کسی پر فضل بھی ہو گا شفاعت بھی ہو گی۔

قولہ وھنا بحث وھو ھل ھذہ الصفات التی کلف بھا الحاج من ترک المخیط و ترک الطیب الی قولہ ولکن باذنہ وفضلہ وقد یکون للمجموع۔

ف ۔ اگرچہ اس میں کوئی مسئلہ تصوف کا نہیں مگر حج کی رُوح کا بیان ہے۔ اس لیے اس کا ترجمہ کر دیا گیا تاکہ حجاج عموماً اور صوفیاء خصوصاً حج میں اور نماز میں اس روح کو ملحوظ رکھیں۔ کیونکہ نماز میں بھی حج کی شان موجود ہے کہ بیت اللہ کی طرف متوجہ ہونے کا امر ہے تو استقبال قبلہ کے ساتھ موت اور قیامت کا منظر سامنے ہونا چاہیئے۔ پھر انشاء اللہ خشوع آسان ہو جائے گا اور اس شان سے حج کیا جائے گا تو انشاء اللہ قبول ہو گا۔

(۱۹۵) قُرب کا بڑا درجہ بڑے بڑے مُجاہدات و عبادات سے ہی حاصل ہوتا ہے

اس حکمت کے معلوم ہو جانے سے یہ مسئلہ مستنبط ہُوا کہ قرب کا بڑا درجہ بڑے بڑے مجاہدات اور عبادات ہی سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ یہ مقام (عرفات وغیرہ) ایسا مقام ہے جس میں بڑے بڑے جرائم کی مغفرت ہوتی ہے۔ جیسا حدیث میں وارد ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان یوم عرفہ سے زیادہ کسی دن زیادہ ذلیل اور حقیر نہیں دیکھا جاتا۔ کیونکہ وہ اس دن دیکھتا ہے کہ اللہ تعالےٰ بڑے بڑے گناہوں کو معاف فرما رہے ہیں تو اپنے سر پر مٹی ڈالتا جاتا اور کہتا جاتا ہے کہ جس قوم کو میں نے پچاس یا چالیس سال تک گناہوں میں مبتلا رکھا اُن کو ایک ساعت میں بخش دیا گیا۔ (او کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام) تو ایسے مقام تک پہنچنا آسان نہیں بلکہ بڑی مشقت سے پہنچنا ہوتا ہے۔ ہاں جس پر اللہ تعالےٰ اپنے فضل سے آسان کر دیں (اُس کے لیے حج آسان ہو جاتا ہے مگر ایسے تھوڑے ہی ہیں اسی طرح مقاماتِ عالیہ باطنہ کثرتِ مجاہدات و عبادات و ذکر ہی سے حاصل ہوتے ہیں آسانی سے حاصل نہیں ہوتے اِلّا ماشاء اللہ ؎

نازپروردہ تنعم نہ بردراہ بدوست
عاشقی شیوۂ رنداں بلاکش باشد!

اور اس میں اس پر بھی تنبیہ ہے کہ حج میں اس موقف (یعنی میدانِ حشر) کو یاد کرے جس کا یہ نمونہ ہے تاکہ مولےٰ کریم کی طرف سچے دل سے التجا کی توفیق ہو اور اللہ تعالےٰ کی طرف زیادہ توجہ اور رغبت اور اپنی احتیاج کا اظہار ہو کہ اُسی سے تمام خیر کی اُمید کی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں امن یجیب المضطر اذا دعاہ (کیا وہ جو مضطر کی دُعا قبول کرتا ہے جب وہ اُسے پکارتا ہے کیا اس کے ساتھ بھی دوسروں کو شریک کرتے ہیں) ہرگز نہیں بلکہ اکثر لوگ نادان ہیں جو ایسے خدا کے ساتھ بھی دُوسروں کو شریک کرتے ہیں) اور اللہ تعالےٰ سبحانہٗ وعدہ کے خلاف نہیں کرتے (وہ مضطر و محتاج کی دُعا ضرور قبول کرتے ہیں) اللہ تعالےٰ ہم کو بھی اُن میں سے کرے جن پر محض اپنے فضل سے احسان فرمایا اور اُن کو کوئی مشقت اُٹھانا نہیں پڑی۔ اللہ کے سوا کوئی پروردگار نہیں۔ قولہ ویتسم علیہ من معرفۃ الحکمۃ الی قولہ لادب سواہ۔

ف۔ عام قاعدہ تو یہی ہے کہ مقاماتِ عالیہ بڑے بڑے مجاہدات اور کثرتِ

عبادات سے حاصل ہوتے ہیں۔ مگر یہ اُس وقت تھا جب مُسلمانوں میں طلبِ دین غالب اور طلبِ دُنیا مغلوب تھی۔ اب معاملہ برعکس ہے۔ اُس زمانے میں جو لوگ دین کی طلب میں مشغول ہوتے ہیں اُن کو تھوڑے سے مجاہدہ ہی سے مقاماتِ عالیہ حاصل ہو جاتے ہیں۔ یہی مطلب اُس حدیث کا ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا تھا کہ تم ایسے زمانے میں ہو کہ اگر اوامر کا دسواں حصّہ چھوڑ دو تو ہلاک ہو جاؤ۔ پھر ایک زمانہ آئے گا کہ اگر مسلمان اوامر کا دسواں حصّہ بجا لائیں تو کامیاب ہو جائیں گے۔

حدیث میں اوامر سے فرائض و واجبات مُراد نہیں کہ ان میں سے تو کسی کا ترک بھی کسی وقت جائز نہیں بلکہ وہ مجاہدات و عبادات مُراد ہیں جو شریعت نے فرائض و واجبات کی تکمیل کے لیے بتلائے ہیں جن سے خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ان مجاہدات و عبادات کا دسواں حصّہ بھی آج کل نجات اور کامیابی کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ آج کل طالبانِ خُدا کم ہیں اور آسامیاں (یعنی مقامات) وہی ہیں جو پہلے تھیں جن کا پُر کرنا ضروری ہے تو آج کل جس میں طلب کے ساتھ اخلاص ہوتا ہے اُس کو بہت جلد کسی نہ کسی آسامی پر فائز کر دیتے ہیں۔ تو اس زمانے میں کام تھوڑا کرنا ہوتا ہے اور مرتبہ بڑا مل جاتا ہے۔ دنیا ابدالؔ اقطاب و اوتاد و نقباء و اصحاب ولایت سے کسی وقت خالی نہیں ہو سکتی ورنہ قیامت آجائے مگر پہلے یہ مقامات بہت زیادہ کام کرنے پر عطا ہوتے تھے۔ آج کل تھوڑی سی محنت میں حاصل ہو جاتے ہیں بشرطیکہ طلب صحیح اور اخلاص کامل ہو۔ اس لیے آج کل سالکین کو صوفیاء متقدمین کی کتابوں کا مطالعہ زیادہ مفید نہیں کہ اُن کی تشدید کو دیکھ کر بہت لوگ یہ سمجھ جاتے ہیں کہ درجۂ ولایت حاصل کرنا بہت دشوار بلکہ ناممکن ہے کیونکہ احیاء العلوم وغیرہ میں ہر بات کو بڑی سختی اور باریکی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس کا تحمل آج کل کی طبائع سے

نہیں ہوسکتا۔ اس زمانہ میں طالبانِ سلوک کو حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کی تصانیف کا مطالعہ ہی نافع ہوسکتا ہے۔ حضرت نے اس زمانے کی طبائع کے موافق دستور العمل تجویز کئے اور امراضِ قلب کے معالجات بیان فرمائے ہیں جن پر عمل دشوار نہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ جس سلوک کو لوگوں نے بہت دشوار سمجھ رکھا تھا حضرتؒ نے اُس کو پھول کی طرح ہلکا کر دیا ہے اور جس چیز کو معمّہ سمجھا جا رہا تھا اُس کو ایسا صاف اور بے غبار کر دیا ہے کہ ہر شخص حقیقت تک بآسانی پہنچ سکتا ہے۔ جس تصوّف کو خلافِ قرآن وحدیث کہا جا رہا تھا حضرت نے اُس کی اصلی حقیقت کو کتاب وسُنت سے ثابت کرکے دکھا دیا ہے۔ ملاحظہ ہو مسائل السلوک اور التکشف والتعرف وغیرہ۔

ف۔ حج میں تو جو باطنی حکمتیں ہیں وہ آپ نے سمجھ لیں اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ بیت اللہ میں اب بھی وہ نشان ہائے قدرت موجود ہیں جن میں انصاف کے ساتھ غور کرنے سے کافر بھی ایمان لے آئے۔ اور مومن غور کرے تو اُس کا ایمان کامل ہوجائے اسی لیے حج کو مکمل ایمان کہا گیا ہے۔

حج کی ظاہری حکمتیں اب ہم بعض ظاہری حکمتیں بھی بیان کرنا چاہتے ہیں جو حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ میں مذکور ہیں۔ وہ یہ کہ ہر قوم اور ہر سلطنت میں ایک دن اجتماع اور دربارِ عام کا ہوتا ہے جس میں دور اور نزدیک والے سب ہی جمع ہوتے ہیں تاکہ حکومت کے احکام پر مطلع ہوں۔ ایک دُوسرے سے مِل کر تبادلۂ خیالات کریں اور شعائرِ سلطنت کی تعظیم بجالائیں۔ اسی طرح حج ملّتِ اسلامیہ کا دربار ہے جس میں اطرافِ عالم سے مسلمان جمع ہوتے ہیں اُن کی شوکت اور اجتماعی شان ظاہر ہوتی ہے۔ شعائر اللہ کی تعظیم ہوتی ہے۔ ایک دُوسرے کو پہچانتا ہے اور یہ دیکھ کر کہ اسلامی برادری بہت دُور تک پھیل چُکی ہے خوش ہوتا ہے آپس میں اتحاد و اتفاق بڑھتا ہے۔ کلمۂ اسلام بلند ہوتا اور اللہ کا بول بالا ہوتا ہے اور اگر دُنیا میں خلافتِ اسلامیہ کا وجود ہو تو خلیفہ کو تمام اطراف کے مُسلمانوں کی حالت معلوم ہوسکتی ہے۔ چنانچہ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ ہر سال حج کرتے تھے

اور اپنے عمال (گورنروں) کو بھی ہر سال حج کرنے کی تاکید فرماتے تھے۔ کیونکہ جب گورنر حج کو جائیگا اُس کے ساتھ اُس کے مُلک اور صُوبہ کے بھی بہت آدمی ہوں گے اس طرح خلیفہ کو ہر مُلک اور ہر صُوبہ کے آدمیوں سے اپنے عمال و ولاۃ (گورنروں، حاکموں) کے عدل وانصاف یا بے راہروی کی اطلاع آسانی سے ہوجاتی تھی۔ پھر ان اعمال وولات کے اجتماع سے مُلکی مسائل اور سیاسی مصالح پر بھی مشورہ کا موقع ملتا تھا اور سال آئندہ کے متعلق ایک خاص طریقہ اور لائحہ عمل طے ہوجاتا تھا۔ مَیں نے بچپن میں ایک اخبار میں کسی امریکن ڈاکٹر کا مضمون پڑھا تھا جس میں لکھا تھا کہ یورپ اور امریکہ چار باتوں کے لیے مدت سے کوشش کر رہے ہیں مگر باوجود ہر قسم کے ذرائع ووسائل مہیا ہونے کے اُن کو اب تک کامیابی نہیں ہوسکی اور حیرت ہے کہ پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) پہلے ہی قدم میں تھوڑی سی مُدت میں ان چاروں میں ہی کامیاب ہوگئے۔

ایک یہ کہ ہم ایک مشترک بین الاقوامی زبان کی تجویز میں ہیں مگر ہنوز روزِ اوّل ہے۔ پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عربی کو تمام مُسلمانوں کی مشترک بین الاقوامی زبان بنادیا۔ تم کسی مُلک میں چلے جاؤ ہر جگہ مُسلمان عربی میں اذان دیتے، عربی میں نماز پڑھتے عربی میں خطبہ دیتے ہیں۔ ہر مُلک اور ہر قوم کو اپنی الگ الگ زبان کے ساتھ عربی زبان سے بھی لگاؤ ضرور ہے (اُن کا سلام بھی عربی میں ہے اور خطبہ نکاح بھی عربی میں قرآن بھی عربی میں ہے۔ دوسری قوموں کے پاس تورات وانجیل کے تراجم ہی رہ گئے ہیں اصل کتاب مفقود ہے وغیرہ وغیرہ)۔

دوسرے ہم ایک بین الاقوامی کانفرنس کی تجویز میں ہیں مگر ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔ پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس میں بھی کامیابی حاصل کرلی ہے کہ ہر سال تمام ممالکِ اسلامیہ کے مُسلمان مکّہ میں حج کے لیے جمع ہوتے ہیں جو بہت بڑی بین الاقوامی کانفرنس ہے۔

تیسرے ہم ایک بین الاقوامی سرمایہ جمع کرنا چاہتے ہیں جس میں ناکام ہیں مگر

پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) اس میں بھی کامیاب تھے۔ "بیت المال" تمام مسلمانوں کا بین الاقوامی مشترک خزانہ تھا جس میں تمام دُنیا کے مسلمانوں کا حق تھا اور جب تک خلافتِ اسلامیہ قائم رہی بیت المال بھی قائم رہا جس سے سب مسلمان فائدہ حاصل کرتے تھے۔

چوتھے ہم کوشش کر رہے ہیں کہ بین الاقوامی وحدت حاصل کریں اور یہ رنگ ونسل اور جغرافیہ کی بناء پر اقوام کی تقسیم باطل ہو جائے مگر ابھی تک ناکام ہیں پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پہلے ہی قدم میں اس کو کامیابی کے ساتھ حاصل کر لیا اور فرما دیا انما المؤمنون اخوۃ۔ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ ہم کو بلال حبشی بھی اُسی مقام پر نظر آتے ہیں جہاں ابو بکرؓ و عمرؓ نظر آتے ہیں، ہر ایک دُوسرے کا احترام و عزت کرتا ہے (فاروقِ اعظمؓ حضرت بلالؓ کو دیکھ کر کھڑے ہو جاتے اور فرماتے تھے سیدنا بلال، یہ ہمارے سردار بلال ہیں)۔

مگر مُسلمانوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ سب حکمتیں حکمت کے درجہ میں ہیں اصل علت نہیں۔ فرض حج کی علت محض اللہ تعالےٰ کا حُکم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اگر یہ حکمتیں نہ بھی ہوتیں جب بھی حج فرض تھا مگر اللہ و رسول کے احکام کی یہ خاص شان ہے کہ اُن میں علاوہ تکمیلِ عبدیت اور اطاعت کے انسان کی دنیوی مصالح بھی بہت ہوتی ہیں۔ جو شخص دین کو مضبوطی کے ساتھ تھام لیتا ہے دُنیا خود بخود غلام بن کر آ جاتی ہے۔

باب ہشتم
۸۰

حدیث

جواز الشرب من السقایۃ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سقایہ (زمزم) پر تشریف لائے (یہ ایک حوض تھا جس میں لوگوں کے پینے کے واسطے زمزم کا پانی بھرا جاتا تھا) اور پینے کے لیے پانی مانگا۔ حضرت عباسؓ نے کہا اے فضل اپنی ماں کے پاس جاؤ اُن کے پاس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پانی لے آؤ (مطلب یہ تھا کہ ٹھنڈا پانی گھر سے لاؤ کیونکہ عرب میں دیر تک برتن میں رکھا ہُوا پانی ٹھنڈا اور عُمدہ ہو جاتا ہے)۔ حضورؐ نے فرمایا مُجھے (اسی میں سے) پلا دو۔ کہا یا رسول اللہ! اس میں تو لوگ ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔ فرمایا پلاؤ بھی۔ غرض اُس میں سے آپؐ نے پانی پیا پھر (چاہ) زمزم پر تشریف لائے جہاں لوگ پانی بھر رہے اور کام کر رہے تھے۔ فرمایا کام کئے جاؤ۔ تم اچھا کام کر رہے ہو۔ پھر فرمایا اگر یہ (اندیشہ) نہ ہوتا کہ لوگ (ہجوم کر کے) تم پر غالب آ جائیں گے تو میں (سواری سے) اُتر کر رسّی یہاں رکھتا۔ گردن پر اشارہ فرمایا (اور خود پانی کھینچتا)۔

شرح حدیث کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ جس پانی میں لوگ ہاتھ ڈالتے ہوں وہ پاک ہے اگرچہ یہ احتمال بھی ہے کہ کسی کا ہاتھ پاک ہو کسی کا پاک نہ ہو۔ مگر آپ نے سقایہ سے پانی پی کر بتلا دیا کہ ایسے احتمالات (بلا دلیل) پر عمل نہ

کیا جائے گا۔ جب تک یہ امر محقق نہ ہو جائے کہ کسی نے ناپاک ہاتھ ڈالا ہے کیونکہ پانی اپنی ذات سے پاک ہے۔ بلادلیل اُس کو ناپاک نہ کہا جائے گا۔ اسی لیے فقہاء نے اُن حوضوں اور مشکوں کے پانی سے وضو کو جائز کہا ہے جو راستوں پر بنے ہوئے یا رکھے ہوتے ہیں جن سے جانور پانی پیتے ہیں اور جانوروں کی ناک کا غبار وغیرہ بھی اُن میں مل جاتا ہے اور لوگوں کے ہاتھوں اور پیروں کا میل بھی جس میں ناپاکی کا احتمال ہو سکتا ہے مگر محض احتمال اور شک سے پانی کو ناپاک نہ کہا جائے گا۔ حضرت شارحؒ نے اس حدیث سے ماءِ مستعمل کی طہارت پر بھی استدلال کیا ہے مگر استدلال ناقص ہے کیونکہ ماءِ مستعمل وہ ہے جس میں ازالۂ حدث کی نیت سے یا وضو اور غسل کی نیت سے ہاتھ ڈالا جائے اور یہاں ایسا نہ تھا۔ سقایہ میں عرف پینے کے واسطے ہاتھ ڈالتے تھے تو اس سے حنفیہ کے نزدیک پانی مستعمل نہیں ہوتا ہے۔

(۱۹۶) پینے کے لیے پانی مانگنا خلافِ زہد نہیں

حدیث سے معلوم ہوا کہ پینے کے لیے پانی مانگنا حضر اور سفر دونوں میں جائز ہے۔ پانی کا مانگنا اور چیزوں کے مانگنے کے برابر نہیں کہ (اُن کا سوال ممنوع ہے خاص مشروط ہی سے جائز ہے، پینے کے لیے پانی مانگنا ہر حال میں جائز ہے) بعض فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے (مگر یہ قید ضروری ہے کہ دُوسرے کے پاس حاجت سے زیادہ پانی ہو اور اس نے داموں سے نہ خریدا ہو ورنہ بدون سخت مجبوری کے پانی کا سوال بھی نہ کیا جائے)۔

نیز معلوم ہوا کہ سبیل عام کا پانی جس کو صدقہ نہ کہا گیا ہو غنی اور فقیر سب کے لیے حلال ہے یہ (وہ) صدقہ نہیں (جو غنی پر حرام ہوتا ہے) اس میں کسی پر خاص طور سے احسان نہیں ہوتا (بلکہ وقف عام ہے سب کو اُس سے پینے کا حق ہے) دیکھو سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سقایہ سے پانی پیا جس میں کچھ لوگ پانی بھر رہے اور کام کر رہے تھے مگر وہ اپنے عمل کو اللہ تعالےٰ کے واسطے کر چکے اور پانی کو اپنی

مِلک سے نکال چکے تھے۔ اگر یہ بھی صدقہ کی طرح ہوتا تو آپ ہرگز نہ پیتے۔ کیونکہ صدقہ آپ پر حرام تھا اور اگر اس میں کچھ کراہت ہوتی جب بھی آپ نہ پیتے۔ مگر آپ سقایہ پر تشریف لے گئے اور اُس میں سے پانی طلب کیا۔

قولہ فیہ دلیل علی طلب شرب الماء الی قولہ فاستسقی۔

ف۔ اس میں کوئی مسئلہ تصوف کا نہیں مگر بعضے خشک زاہد وہمی ہو جاتے ہیں۔ اُن کے وہم کا اس میں علاج ہے۔ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے ایک خادم خانقاہ کے کنوئیں سے وضو نہیں کرتے کہ یہاں اکثر لوگ ننگے پاؤں باہر سے آتے ہیں اس لیے کنوئیں کے آس پاس کی زمین ناپاک ہے اور کبھی وہاں ڈول رکھا جاتا ہے اور بدوں پاک کئے کنوئیں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس لیے کنواں ناپاک ہے۔ حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا کہ میاں پھر تم میرے پیچھے نماز کیسے پڑھتے ہو جب کہ مَیں اسی کنوئیں سے وضو کرتا ہوں۔ کہا نماز تو آپ کے پیچھے جائز ہے۔ اسی طرح بعض لوگ وقفِ عام کی چیز کے استعمال میں وہم کرتے ہیں مگر فقہاء نے تصریح کی ہے کہ سقایہ اور حوض اور کنواں اور سرائے و مقبرہ وغیرہ جو مسافروں اور ہر وارد و صادر کے لیے بنائی جاتی ہے اُس میں فقیر و غنی سب برابر ہیں۔ اُس کو صدقہ خاصہ پر قیاس نہ کیا جائے اور اس کی دلیل یہی حدیث ہے جو یہاں مذکور ہے۔

(۱۹۷) مردوں کے سامنے عورتوں کا نام لینا جائز ہے

حدیث سے معلوم ہوا کہ بزرگوں اور مردوں کے مجمع کے سامنے عورتوں کا تذکرہ جائز ہے۔ اس میں کچھ کراہت نہیں۔ دیکھو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ہمراہیوں کے سامنے کہا کہ اے افضل! اپنی ماں کے پاس جاؤ اور حضورؐ نے اس پر عتاب نہیں کیا بلکہ کچھ بھی نہیں فرمایا۔ آج کل بعض لوگوں کی عادت ہے کہ اگر عورتوں کا تذکرہ اُن کی زبان پر آجاتا ہے تو اس کے بعد حاشاک (توبہ توبہ) بھی

کہتے ہیں اور اس کو تہذیب سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بدعت ہے۔

قولہ وفیہ دلیل علیٰ جواز ذکر النساء بمحضر اھل الفضل الیٰ قولہ بل ھو من البدع۔

ف ۔ آج کل عام لوگوں کی تو یہ حالت ہے کہ پیروں کے سامنے اپنی عورتوں کو لے جاتے ہیں اور پیر صاحب سب کے سامنے عورتوں سے بات چیت کرتے ہیں یہ تو نہایت قبیح بدعت ہے جس کے مفاسد ظاہر ہیں اور زاہدانِ خشک کی یہ حالت ہے کہ وہ عورتوں کا ذکر بھی زبان پر لانا گوارا نہیں کرتے۔ حضرت حکیم الامتؒ بعض دفعہ اپنے گھر والوں کی کوئی بات مجلس میں کرتے تو بعض لوگ اعتراض کرتے تھے کہ یہ وقار کے خلاف ہے۔ انہوں نے تکبّر کا نام وقار رکھ لیا ہے۔ اور یہاں سے ناظرین کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ پہلے زمانے کے مسلمانوں کو پردہ کا کس قدر اہتمام تھا کہ عورتوں کا ذکر بھی مردوں کے سامنے تہذیب کے خلاف سمجھتے تھے۔ آج کل ذکر سے تو کیا عار ہوتا ہے عورتوں کو مردوں کے سامنے لانے اور جلسوں اور جلوسوں میں لے جانے سے بھی عار نہیں۔ کیسا انقلاب ہُوا ہے؟ خُدا خیر کرے نہ معلوم اس کا انجام کیا ہونے والا ہے؟

(۱۹۸) ٹھنڈا پانی پینا بھی خلافِ زہد نہیں

حدیث سے معلوم ہُوا کہ پانی کو ٹھنڈا کرنا اور ٹھنڈا پانی پینا، جائز ہے۔ حضرت عباسؓ نے اس لیے تو فرمایا تھا کہ اپنی ماں کے پاس جاؤ اور حضورؐ کے لیے پانی لاؤ۔ کیونکہ حجاز میں تھوڑی دیر کا رکھا ہُوا پانی ٹھنڈا اور لذیذ ہو جاتا ہے۔ اگر یہ جائز نہ ہوتا تو حضرت عباس ایسا نہ کہتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم بھی یہ بات سُن کر سکوت نہ فرماتے اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ اگر کسی کو اپنی ضرورت خاص طریقے سے پُوری کرنا ہو تو اُس کو وجہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عباس کی بات قبول کرنے سے کوئی مانع اس کے سوا نہ تھا کہ آپ ایک قاعدہ شرعیہ بتلانا چاہتے تھے کہ جس پانی میں لوگوں کے ہاتھ

پڑتے ہوں (اور ناپاکی کا یقین نہ ہو) وہ پاک ہے (محض وہم سے اُس کو ناپاک نہیں کہا جائے گا۔ مگر آپؐ نے اس وجہ کو بیان نہیں فرمایا صرف اتنا ہی فرمایا کہ اس میں سے پلا دو)۔

دوسرے آپؐ تکلف سے بھی بچنا چاہتے تھے جو آپؐ کا خاص طریقہ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جب کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو دو باتوں میں سے ایک کا اختیار دیا گیا تو آپ ہمیشہ سہل و آسان کو اختیار فرماتے تھے جبکہ اُس میں گناہ نہ ہو اور اس میں حضراتِ صوفیہ کی دلیل ہے کہ وہ بھی ترک تکلّف کی تعلیم دیتے ہیں۔

قولہ وفیہ دلیل علیٰ جواز تبرید الماء الیٰ قولہ یقولون بترک التکلف۔

ف ۔ بعض زاہدوں کا خیال ہے کہ پانی ٹھنڈا پینا زہد کے خلاف ہے گرم پینا چاہیئے۔ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ سید الزاہدین صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹھنڈا پانی مرغوب تھا۔ اس واقعہ میں ایک خاص وجہ سے آپؐ نے سقایہ کا پانی پیا ہے جو اُوپر تفصیل سے بیان ہو چکی۔ ہمارے حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا حکیم الامتؒ سے فرمایا تھا کہ میاں اشرف علی پانی جب پیؤ ٹھنڈا پیؤ۔ ہر بُن مو سے الحمد للہ نکلے گا اور گرم پانی پی کر زبان تو الحمد للہ کہے گی مگر دل نہ کہے گا۔ واقعی سچ فرمایا دُوسرے گرم پانی معدہ کے لیے مضر بھی ہے۔ اسی طرح پانی بہت ٹھنڈا بھی زیادہ برف سے نہ کرنا چاہیئے کہ وہ بھی اعصاب کے لیے مضر ہے۔ اعتدال ہر چیز میں افضل ہے۔

ف ۔ حضرت عائشہ کی حدیث پر ایک اشکال مشہور ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو باتوں میں اللہ تعالےٰ کی طرف سے اختیار دیا جاتا تھا تو اس میں کسی شق کے گناہ ہونے کا احتمال کیسے ہو سکتا ہے؟ پھر حضرت عائشہؓ نے یہ کیوں فرمایا مالم یکن اثما۔ جبکہ اُس میں گناہ نہ ہو۔ اس کا مشہور جواب یہ ہے کہ یہاں استثنا منقطع ہے متصل نہیں۔ علماء کے لیے یہ جواب کافی ہے اور عوام کو غور کرنے کی ضرورت نہیں۔ دُوسرا جواب حضرت حکیم الامتؒ نے دیا تھا جو

جو بہت لطیف ہے۔ مگر اس وقت باوجود تلاش کے نہیں ملا اور میں اُس کو حضرتؒ ہی کے الفاظ میں لکھنا چاہتا تھا اگر کسی کو مل جائے یہاں نقل کر دے۔

(۱۹۹) جس کام میں دو پہلو ہوں اس میں دین کے پہلو کو مقدم کیا جائے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ جب کسی کام میں ایک پہلو حظِ نفس کا ہو اور دُوسرا پہلو مصلحتِ دین کا ہو اگرچہ دینی مصلحت درجۂ استحباب ہی میں ہو تو دین کا پہلو مقدم کیا جائے گا۔ کیونکہ (واقعۂ حدیث میں) ٹھنڈا پانی پینے میں تو نفس کی راحت تھی اور سقایہ سے پینے میں دینی فوائد تھے جن کا اُوپر ذکر آچکا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے پہلو کو حظِ نفس کے پہلو پر ترجیح دی۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قاعدہ کی تصریح بھی فرما دی ہے۔

فقال انتم فی زمان یقدمون اعمالهم علی اهوائهم و یأتی زمان یبدؤن باهوائهم علی اعمالهم۔ آپؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ تم ایسے زمانے میں ہو جس میں مسلمان (دینی) اعمال کو اپنی خواہش (اور حظِ نفس) پر مقدم کرتے ہیں اور ایک زمانہ آئے گا جس میں مُسلمان اپنی خواہش (اور نفسانی لذات) کو اعمال (دین) پر مقدم کریں گے۔ قوله فیه دلیل علی انه اذا اجتمع حظ النفس وامر ما فی الدین الی قوله یبدؤن باهوائهم علی اعمالهم۔

ف ۔ وہ زمانہ بھی غنیمت تھا جس میں مُسلمان اعمالِ دین بجا تو لاتے تھے گو لذاتِ نفس کے بعد ہی سہی۔ اب تو وہ زمانہ ہے جس میں لذات اور حظوظِ نفس کے لیے احکامِ شرعیہ کو چھوڑ دیا جاتا ہے فالی اللہ المشتکی۔ اس حدیث میں صوفیاء کی دلیل ہے کیونکہ اُن کے طریق کی بنا اسی پر ہے کہ ہر کام میں دین کے پہلو کو حظِ نفس کے پہلو پر مقدم کیا جائے۔

(۲۰۰) گھر میں تصرّف کی مالک عورت ہے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ گھر میں تصرّف کی مالک عورت

ہی ہے۔ کیونکہ حضرت عباسؓ نے اپنے بیٹے سے فرمایا تھا کہ اپنی ماں کے پاس جاؤ اور اُس کے پاس سے حضورؐ کے واسطے پانی لاؤ) اگر گھر میں حکومت اور تصرف کا اختیار عورت کے ہاتھ میں نہ ہوتا تو یوں فرماتے کہ جاؤ خود گھر سے پانی لے آؤ یا کسی دُوسرے کو تصرف کا اختیار ہوتا تو اُس کا نام لیتے اور یہ شُبہ نہیں کیا جا سکتا کہ فضل بن عباس نابالغ ہوں گے۔ اس لیے ایسا کہا گیا کیونکہ اُن کا اس وقت بالغ عاقل ہونا تاریخ سے ثابت ہے۔ وہ حضرت عباس کی اولاد میں سے سب سے بڑے تھے اُن ہی کے نام پر حضرت عباس کی کنیت ابوالفضل تھی) اور اس سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ بیوی کو بھی نیک کام میں شریک کرنا مستحب ہے۔ کیونکہ جب حضرت عباس کی بیوی کو یہ خبر ہوتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے مجُھ سے پانی مانگا گیا ہے تو وہ برتن کی صفائی اور پانی کی عمدگی اور ستھرائی کا اہتمام کرتیں جس سے اُن کو خوشی بھی ہوتی اور ثواب بھی ملتا۔

قوله وفیه دلیل علی ان المرأة هی المتصرفة فیما فی البیت الی قوله فیکون لها فی ذلك اجر وسرور۔

ف ۔ یہ مسئلہ دُوسری حدیث سے بھی ثابت ہے جس میں والمرأة داعیة فی بیت زوجها ۔ وارد ہے کہ عورت اپنے شوہر کے گھر میں نگران اور حاکم ہے۔ اس سے اُن لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو صوفیاء اور علماء پر اعتراض کرتے ہیں کہ ان کے گھر میں بیویوں کی حکومت ہے وہی ہر تصرف کی مالک ہیں۔ اُن کو سمجھ لینا چاہیئے کہ شریعت کی تعلیم یہی ہے کہ گھر میں تصرّف کا اختیار بیوی کے ہاتھ میں اور باہر کا اختیار مرد کے ہاتھ میں ہو۔ نظام اسی طرح قائم ہو سکتا ہے دو عملی میں ہمیشہ گڑبڑ ہوتی ہے۔ اگر گھر کے سامان وغیرہ کا اختیار ایک کے ہاتھ میں نہ ہُوا متعدد ہاتھوں میں ہُوا تو کوئی بھی اپنے کو ذمّے دار نہ سمجھے گا اور جب کوئی ذمّے دار نہ ہُوا تو گھر کی بربادی لازم ہے اور ظاہر ہے کہ مرد سے گھر کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ اُس کو تو خبر بھی نہیں ہوتی کہ کون سی چیز کہاں ہے اور کتنی مقدار میں ہے؟ اس لیے

بیوی ہی کے ہاتھ میں اس کا انتظام ہونا چاہیئے کہ وہی حفاظت پُوری طرح کر سکتی ہے۔ پس گھر والوں میں جو شخص بھی کوئی چیز لے اُس سے پُوچھ کر اُس کو اطلاع کر کے لے تاکہ نظام درست رہے۔ مگر یہ جبھی ہے کہ بیوی میں انتظام اور حفاظت کا سلیقہ بھی ہو۔ بدسلیقہ کے ہاتھ میں تصرف و اختیار دینا مناسب نہیں پھر مرد اپنے ہی ہاتھ میں اختیار رکھے یا اولاد میں سے جس کو ہوشیار دیکھے اُس کو اختیار سونپ دے فالصّٰلحٰت قانتٰت حٰفظٰت للغیب بما حفظ اللہ میں بھی اس طرف اشارہ ہے کہ عورتیں ہی مرد کے گھر کی محافظ ہیں بشرطیکہ اُن میں صلاحیت ہو۔

ف ۔ حدیث سے معلوم ہُوا کہ حضرت عباس کی بیوی ام الفضل رضی اللہ عنہما گھر کے اندر تھیں مجمع میں نہ تھیں جس سے پردے کا ثبوت ہوتا ہے اور یہاں سے اُن لوگوں کے اعتراض کا بھی جواب ہوگیا جو پردہ کو عورتوں کی تذلیل و توہین سمجھتے ہیں اُن کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام میں عورتوں کی عزت اس قدر ہے کہ گھر میں حکومت و اختیار اُن ہی کا ہے اور کسی کا نہیں اور اُن کو پردہ میں اس لیے رکھا جاتا ہے کہ قیمتی شئے کو چُھپایا ہی جاتا ہے۔ دیکھو ہر شخص اپنی دولت کو چُھپا کر تجوری میں اور تالوں میں رکھتا ہے تاکہ چور کا ہاتھ وہاں تک نہ پہنچے اور یقیناً عورت کی قدر و منزلت مال سے زیادہ ہے تو اُن کی حفاظت مال سے بھی زیادہ ہونا چاہیئے تاکہ بوالہوسوں کی نگاہ اُن تک نہ پہنچ سکے۔ جو لوگ اپنی عورتوں کو بے پردہ باہر پھراتے ہیں معلوم ہوتا ہے اُن کے دل میں مال کے برابر بھی اُن کی وقعت نہیں۔ یا اُن کے نزدیک دُنیا میں مال کے چور تو ہیں عورتوں کے ڈاکو نہیں مگر یہ بالکل مشاہدہ کے خلاف ہے عورتوں کے ڈاکو مال کے چوروں سے زیادہ موجود ہیں۔ جس پر وہ واقعات شاہد ہیں جو رات دن اخباروں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

(۲۰۱) سوال و جواب مختصر ہونا چاہیئے حدیث سے معلوم ہُوا کہ سوال و جواب میں اختصار ہی بہتر ہے بشرطیکہ مقصود واضح ہو جائے کیونکہ جب حضورؐ سے یہ کہا گیا کہ لوگ اس پانی

میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔ آپؐ نے اتنا ہی فرمایا اسقنی مجھے اسی میں سے پانی دو۔ زیادہ کچھ نہیں فرمایا۔ سائل کا مطلب یہ تھا کہ اس میں گندگی کا احتمال ہے۔ مگر اُس نے بھی اس احتمال کو صاف صاف نہیں کہا۔ حضورؐ نے بھی صاف نہیں فرمایا کہ محض احتمال سے کچھ نہیں ہوتا کیونکہ مقصود دونوں جگہ واضح تھا)۔

قولہ وفیہ دلیل علی ان الاختصار فی الجواب والسوال ھو الاولیٰ الیٰ قولہ ولم یزد علی ذلک شئیا۔

ف ۔ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے جوابات خطوط میں مختصر ہوتے تھے مگر کافی شافی ہوتے تھے۔ یہ حدیث اُن کے اس طرز کی دلیل ہے مگر ایسا اختصار نہ ہو کہ مقصود ہی واضح نہ ہو کہ وہ بلاغت کے خلاف ہے۔

(۲۰۲) کھانا کھا کر اس جگہ سے ہٹ جانا چاہیئے حدیث سے معلوم ہُوا کہ کھانے پینے سے فراغت کے بعد اس جگہ سے ہٹ جانا ہی سُنت ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پانی پی کر اُس جگہ سے چل کر چاہ زمزم پر تشریف لے گئے۔ دوسرے (اس میں یہی حکمت تھی کہ) ایک نیکی کے بعد دُوسری نیکی کرنا بھی اسلامی طریقہ ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ نے جس جگہ پانی پیا وہاں چند احکام بیان فرمائے۔ پھر دُوسری جگہ تشریف لے جا کر دُوسری نیکی کی۔ حالانکہ دونوں مکان بظاہر برابر تھے۔ وہاں بھی لوگ پانی ہی پلا رہے تھے مگر آپ کا جانا ان لوگوں کو خوش کرنے کے لیے تھا (جو زمزم پر کام کر رہے تھے) اگر آپ اُن کے پاس نہ جاتے اُن کے دل شکستہ ہوتے کہ ہم اپنے کام کی وجہ سے حضورؐ کے دیدار اور شرف ہم کلامی سے محروم رہے) نیز (یہ بھی ہوتا کہ) لوگ سقایہ کو زمزم سے افضل قرار دیتے اور کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سقایہ پر تشریف لے گئے تھے زمزم پر نہیں گئے تھے تو آپؐ کا ان لوگوں کے پاس جانا دُوسری نیکی تھی (جس میں چند در چند مصالح دینیہ تھیں) پھر آپؐ کے اس ارشاد سے کہ "کام کرتے رہو تم اچھا کام کر رہے ہو"

یہ مسئلہ معلوم ہُوا کہ جو لوگ (اچھا) کام رہے رہوں اُن کو اس عمل پر رغبت دلانا چاہیئے (اُن کا حوصلہ بڑھانا چاہیئے) تاکہ وہ نشاط کے ساتھ کام کریں۔ چنانچہ حق تعالےٰ فرماتے ہیں وتعاونوا علی البر والتقوی۔ نیکی اور تقویٰ میں ایک دُوسرے کی مدد کرو (اور مدد میں یہ بھی داخل ہے کہ اُس کام کی فضیلت بیان کی جائے جو دُوسرا کر رہا ہے) مگر کام کرنے والے کی مدح کرنا اس کے خلاف ہے (وہ مناسب نہیں) کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (کے سامنے کسی نے ایک شخص کی مدح اُس کے مُنہ پر کی تھی تو آپ) نے فرمایا قطعتم ظھر الرجل تم نے تو اُس کی کمر توڑ دی کیونکہ ذات کی مدح کرنے سے بعض دفعہ دُوسرے میں عجب پیدا ہو جاتا ہے اور وہ سم قاتل ہے۔ کام کی تعریف میں یہ مفسدہ نہیں بلکہ اس سے تو دُوسرے کو عمل کی رغبت بڑھتی ہے۔ مثلاً تم کسی کو روزہ رکھتے دیکھو تو اُس کے سامنے روزے کے فضائل بیان کر دو یا جہاد کرتے دیکھو تو جہاد کے فضائل بیان کر دو۔ جو (قرآن و حدیث میں) وارد ہوئے ہیں اس سے اُس کو اپنے کام میں تقویت حاصل ہو گی اور حضورؐ کا ان لوگوں کے کام کو عمل صالح فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ تم کو اس پر ثواب ملے گا کیونکہ کسی عمل کا صالح ہونا یہی ہے کہ اُس پر ثواب مرتب ہو۔

قولہ وفیہ دلیل علی ان من السنۃ الانصراف عند الفراغ من الشرب والاکل الخ **قولہ** فائدتھا ما یترتب علیھا من الثواب۔

ف ۔ کھانے پینے کے بعد اس جگہ سے ہٹ جانا اس لیے سُنت ہے تاکہ دُوسروں کو معلوم ہو جائے کہ بس کھا پی چکے وہیں جم کر بیٹھنے سے شُبہ ہو گا کہ شاید ابھی نیت نہیں بھری کچھ کسر باقی ہے اور اگر اپنا گھر نہیں، دُوسرے کا گھر ہے تو وہاں جم کر بیٹھا رہنے سے اُس کے کاموں کا حرج ہو گا۔ ممکن ہے اب اُس کے گھر والے اسی جگہ کھانے کا ارادہ رکھتے ہوں تمہارے بیٹھے رہنے سے اُن کو تکلیف ہو گی۔ البتہ اگر اپنا گھر ہے اور وہ جگہ تمہارے بیٹھنے کے واسطے مخصوص ہے وہاں سے پانی پی کر ہٹ کر ضروری نہیں۔ کیونکہ وہاں سے ہٹ کر پھر اُسی جگہ آؤ گے جب کہ وہ جگہ

بیٹھنے ہی کے واسطے مخصوص ہے۔ قرآن میں واذا طعمتم فانتشروا (جب کھانا کھا چکو تو چل دو) دُوسرے کے گھر کے متعلق ہے۔ البتہ اگر گھر والا کھانے کے بعد بھی روکنا چاہے تو پھر وہاں بیٹھنے کا مضائقہ نہیں کیونکہ اب اُس کے حرج اور تکلیف کا اندیشہ نہیں رہا اور حدیث میں پانی پی کر ہٹ جانا اسی جگہ کے متعلق ہے جہاں اور لوگ بھی پانی پینے آتے ہیں۔ ایسی جگہ یہی چاہیئے کہ جو پی چکے وہ دُوسروں کے لیے جگہ خالی کر دے۔ یہ آدابِ معاشرت ہیں جو مُسلمانوں کے گھر کی دولت ہے۔ مگر افسوس اب مُسلمان اس سے بالکل بے خبر ہیں کہ اُن کی شریعت نے معاشرت کے متعلق کیسے عجیب و غریب اصول بتلائے ہیں۔

ف ۔ ایک نیکی کے بعد دُوسری نیکی کرنا یہ بھی اسلامی اصول ہے تاکہ انسان برابر ترقی میں رہے۔ صُوفیاء کو اس کا خاص اہتمام ہے۔ آج کل کے صُوفیاء کو بھی اس سے سبق لینا چاہیئے۔

ف ۔ کسی کی تعریف سامنے کرنا منع ہے جبکہ اُس میں عجب پیدا ہونے کا خطرہ ہو۔ پیچھے تعریف کرنا منع نہیں کہ اس سے محبت و اتفاق بڑھتا ہے۔

(۲۰۳) اگر کسی مُستحب پر مفسدہ مرتب ہونے کا اندیشہ ہو اُسے ترک کر دیا جائے

جو کام فرض نہ ہو بلکہ مُستحب ہو اور اُس کے کرنے پر کسی مفسدہ کے مرتب ہونے کا اندیشہ ہو یا یہ معلوم ہو کہ لوگ مجھے یہ کام نہ کرنے دیں گے تو اس کا چھوڑ دینا جائز ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فرمایا ہے کہ اگر لوگوں کے ہجوم کا اندیشہ نہ ہوتا تو مَیں اپنی گردن پر رسّی رکھ کر زمزم کا پانی کھینچتا (اور لوگوں کو پلاتا) یعنی آپ نے ایسا اس لیے نہیں کیا کہ لوگ آپ کو ایسا نہ کرنے دیں گے۔ رسّی کھینچنے کے لیے سب ٹوٹ پڑیں گے۔ پھر ممکن ہے ہجوم سے کسی کے چوٹ لگ جاتی۔ **قولہ وفیہ جواز ترک العمل** مالم یکن فرضا الخ **قولہ** فیہ اذی۔

ف ۔ صوفیاء محققین کا اس پر پورا عمل ہے کہ تم دیکھو گے انہوں نے سماع مباح کو اس لیے ترک کر دیا کہ اُس میں مفاسد کا خطرہ ہے۔ چنانچہ بزرگوں کے سماع مباح کے واقعات سُن کر لوگوں نے مزامیر و معازف کے ساتھ سماع شروع کر دیا۔ اور صوفیاء چشتیہ کو بدنام کرنے لگے کہ اُن کا سماع ایسا ہی تھا حالانکہ وہ اُس کی حرمت کی تصریح کر رہے ہیں اور سماع مباح کے لیے سخت شرطیں بیان کرتے ہیں جن کی رعایت آج کل کہاں ہے؟ اسی طرح محققین صوفیاء نے اپنے بزرگوں کا عُرس بھی موقوف کر دیا کہ لوگوں نے اُس کو آمدنی کا ذریعہ بنا لیا ہے اسی طرح توجہ کا حلقہ بھی موقوف کر دیا کہ آج کل اس میں منافع سے زیادہ مفاسد ہیں۔

(۲۰۴) اہلِ برکت سے برکت حاصل کرنا چاہیئے یہاں سے معلوم ہُوا کہ اہلِ برکت سے برکت حاصل کرنا مطلوب ہے۔ کیونکہ لوگ رسول اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتی کو اسی لیے تو پکڑتے کہ اُن کو آپؐ کے ساتھ لگنے سے برکت حاصل کرنے کا شوق تھا قاعدہ ہے کہ جب کریم اپنے محبوب کا عمل قبول کرتا ہے اُس کے ساتھ شریک ہونے والوں کو بھی محروم نہیں کرتا اور کیسے محروم کر دیں وہ تو خود فرماتے ہیں ھم القوم لا یشقیٰ جلیسھم۔ یہ وہ ہیں جن کے پاس بیٹھنے والا محروم نہیں رہتا۔ جب پاس بیٹھنے کا یہ ثمرہ ہے تو کسی عمل میں اُن کے ساتھ شریک ہونا کیا کچھ ہو گا؟ (اور حدیث میں اس شوق و رغبت پر انکار نہیں کیا گیا صرف یہ بتلایا گیا ہے کہ لوگوں کے اس شوق کی وجہ سے حضورؐ اپنا شوق پُورا نہ کر سکیں گے اور ہجوم سے کسی کی تکلیف کا بھی خطرہ تھا) اور یہاں سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بزرگوں سے اس اُمید پر ہر حالت میں ملنے ملانے کا اہتمام کرنا چاہیئے کہ اُن سے فضل سے کچھ حصّہ مل جائے کیونکہ اللہ تعالےٰ نے تو اُن کو رحمت ہی رحمت بنایا ہے ہم کو چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ کی اس رحمت کو غنیمت سمجھیں (اور اہلِ فضل سے فیض حاصل کرنے میں کوتاہی نہ کریں مگر اس کا لحاظ رکھا جائے کہ کسی کو یا اُن کو ہجوم سے ایذا نہ پہنچے ورنہ وہ خود اس

کا اہتمام کریں گے کہ ہجوم نہ ہونے پائے۔ جیسا واقعۂ حدیث میں حضورؐ نے ہجوم سے بچنے کے لیے اُس عمل کو چھوڑ دیا جس کا ارادہ کیا تھا) اسی لیے صُوفیاء کا درجہ دُوسروں سے بڑھا ہُوا ہے کیونکہ وہ ایک دُوسرے سے اچھا گمان رکھتے ہیں (ہر ایک دُوسرے سے فیض حاصل کرنے کا طالب ہوتا ہے) میں اُندلس کی ایک بستی میں جس کا نام بلفیق ہے جو بابرکت بزرگ شیخ ابو اسحٰقؒ کا وطن ہے اللہ تعالےٰ اُن سے امثال سے نفع پہنچائے گیا تو وہاں یہ دستور دیکھا کہ جب کسی کے متعلق کسی سے دریافت کیا جاتا کہ فلاں صاحب کہاں ہیں تو ہر شخص اس طرح جواب دیتا کہ سیدی فلاں نفع اللہ بہٖ فی المواضع الفلانی۔ وہ ہمارے سردار اللہ اُن سے نفع پہنچائے فلانی جگہ پر ہیں۔ یہ تو غائبانہ تعظیم کا حال تھا (کہ کسی کا نام بھی بدوں سیدی اور نفع اللہ بہٖ کے نہ لیتے تھے) مگر سامنے بجز سلام شرعی کے کچھ نہ تھا اور اگر اُس کو پُکارتے تو نام لے کر پُکارتے اور (سیدی وغیرہ) کچھ نہ بڑھاتے۔ میں نے مُدت تک اپنے قیام کے زمانہ میں سب کا یہی برتاؤ دیکھا۔ اور اس میں ذرا بھی تغیر نہ پایا۔

قولہ وفیہ دلیل علیٰ طلب التبرک بالمبارکین الی قولہ لم یتغیر واعنہ۔

ف ۔ شاید کسی کو اس جگہ یہ خیال ہو کہ یہ لوگ بڑے بدتمیز تھے کہ اپنے بزرگوں کو نام لے کر پُکارتے تھے تو اُن کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اہلِ عرب اس کو بدتمیزی شمار نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے بادشاہوں کو بھی نام لے کر پُکارتے تھے۔ مکّہ میں شریف حسین مرحوم کے زمانے تک یہ دیکھا گیا کہ اہلِ عرب اُن کو یا شریف حسین کہہ کر پُکارتے تھے۔ اب دُوسری قوموں کی دیکھا دیکھی اُن میں بھی تکلف آگیا اور جلالۃ الملک کہہ کر بادشاہ سے بات کرتے ہیں مگر پھر بھی عجم کی برابر تکلف نہیں آیا۔ اصل تہذیب یہی ہے کہ پیچھے تعظیم کی جائے۔ دُوسرے کے سامنے اپنے بزرگوں کو تعظیمی الفاظ سے یاد کریں۔ سامنے تعظیمی الفاظ سے خطاب کرنے میں ایک قسم کی اجنبیت ظاہر ہوتی ہے۔ اس لیے قدیم اہلِ عرب اپنے بڑوں کے سامنے بے تکلف بات کرتے زیادہ تعظیمی الفاظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ پیچھے کسی کے سامنے نام لیتے تو بہت تعظیم سے لیتے تھے۔

آج کل معاملہ برعکس ہے کہ سامنے تو بہت تعظیم ہے اور پیچھے اعتراض ہے۔ البتہ اہلِ محبت سامنے اور پیچھے یکساں رہتے ہیں مگر آج کل اہلِ محبت کہاں ؟ قلیل ما ہم ! آج کل تو اکثر اہلِ غرض ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔

ف - ہمارے اکابر بھی یہی طرز تھا کہ جس مستحب کام سے لوگوں کا ہجوم زیادہ ہوتا اُس کو چھوڑ دیتے تھے۔ کیونکہ ہجوم میں پریشانی بہت ہے۔ آنے والوں کو بھی اور خود کو بھی۔ اسی لیے حضرت حکیم الامتؒ بعد وعظ کے مصافحہ سے گھبراتے تھے کہ اس میں ہجوم بہت ہوتا تھا۔ پھر اس مستحب کے اہتمام میں کسی کی تکلیف کا خیال ہوتا ہے نہ راحت کا۔ بعض لوگوں کے چوٹ لگ جاتی ہے۔ اسی طرح حضرت نے تراویح میں قرآن سُنانا بھی اسی لیے چھوڑ دیا تھا کہ حضرت کا قرآن سُننے کو لوگ دُور دُور سے آتے تو خانقاہ میں ہجوم بہت ہو جاتا تھا آخر عمر میں ختمِ قرآن گھر پر کرتے تھے۔

(۲۰۵) اشارہ کنایہ سے بات کرنا خلافِ تہذیب نہیں

حدیث سے معلوم ہوا کہ اشارہ سے بات کرنا بھی جائز ہے اور یہ عیب میں داخل نہیں۔ نہ بزرگی کے خلاف ہے نہ اُس سے بزرگوں کے درجہ میں کوئی نقصان یا خلل واقع ہوتا ہے نہ اس میں کوئی اعتراض کی بات ہے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی گردن مبارک پر اشارہ فرمایا اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اعتبار معانی کا ہے۔ الفاظ کا نہیں اور اس میں اہلِ اشارات کی دلیل ہے یعنی حضرات صُوفیاء کی کہ وہ بھی اپنے کلام میں اشارات استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اشارات ہی سے خفی اور نازک بات کو سمجھنا چاہیئے (جس سے مخالف تو مطلب سمجھ جاتا ہے اور نااہل کو کچھ پتہ نہیں چلتا۔ نااہل کو ان باتوں سے دُور ہی رکھنا چاہیئے)۔ وفیہ دلیل علی الکلام بالاشارۃ نحو الٰی قولہ وان الا بلاغ فیہا فیما خفی ودق۔

ف - حدیث میں تو اشارہ محسوس پر ہے مگر اس سے مضامینِ دقیقہ پر اشارہ بھی جائز ہو گیا کیونکہ اصل علت میں اشتراک ہے اور صوفیاء کے اشارات کی دلیل

خود فقہاء کے کلام میں موجود ہے۔ اُنھوں نے دلالت کلام کی چار قسمیں بتلائی ہیں۔ عبارۃ النص۔ اشارۃ النص۔ اقتضاء النص اور دلالۃ النص۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ صوفیاء اپنے کلام میں اشارات بھی استعمال کرتے ہیں تو اب ہر کس و ناکس کو اُن کی کتابوں کا دیکھنا جائز نہیں۔ صرف اسی کو اُن کا مطالعہ جائز ہے جو اُن کی اصطلاحات و اشارات کو بخوبی سمجھتا ہے۔ شیخ ابن عربیؒ نے تصریح کی ہے کہ نااہل کو ہماری کتابوں کا مطالعہ حرام ہے۔

(۲۰۶) تحقیق اخفاء و اظہارِ عمل مستحب

یہاں ایک سوال ہے کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمزم (سے پانی بھرنے) والوں کو تو فرمایا کام کئے جاؤ تم اچھا کام کر رہے ہو اور نماز کے بارے میں فرمایا ہے کہ گھر میں نماز پڑھنا (مسجد میں نماز پڑھنے سے) افضل ہے بجز فرض کے (کہ اُس کا مسجد میں جماعت سے ادا کرنا افضل بلکہ ضروری ہے۔ سوال کا حاصل یہ ہے کہ زمزم کا پانی بھرنا بھی تو عمل مستحب ہے اس سے اخفاءُ کا حکم کیوں نہ دیا گیا) جواب یہ ہے کہ جن مستحبات و نوافل کو اظہار و اخفاء دونوں ہی طرح کیا جا سکے وہاں تو اخفاء افضل ہے اور جن مستحبات کی صُورت و وضع ایسی ہے کہ اخفاء کے ساتھ اُن کو ادا نہیں کر سکتے جیسے لوگوں کو پانی پلانا اور علمِ دین کا درس دینا اور جہاد کرنا (جبکہ فرضِ عین نہ ہُوا ہو) وغیرہ وغیرہ۔ وہاں فضیلت کا مدار نیت کی درستی پر ہے (اخفاء پر نہیں کیونکہ وہ کام اخفاء کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (دوسری حدیث میں) فرماتے ہیں اوقع اللہ اجرہ علی قدر نیتہ۔ اللہ تعالےٰ اُس کو اس کی نیت کے موافق ثواب دیتے ہیں (نیت میں جس قدر خلوص ہو گا اُسی قدر ثواب ہو گا) اہلِ سلوک کو اسی بات کی وجہ سے دُوسروں پر فضیلت حاصل ہے کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے اعمال میں ترقی کے پہلو پر نظر رکھتے ہیں خواہ نیّت سے ترقی ہو یا بات سے ہو یا عمل سے ہو یا زمانہ کی برکت سے ہو یا جگہ (کی فضیلت) سے ہو یا

مجموعہ سے ہو۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کفٰی بالعبادۃ شغلا (انسان کے لیے) عبادت کا شغل کافی ہے (اس شغل کے ساتھ دوسرے اشغال جمع نہیں ہو سکتے) کیونکہ اس کی وہی حالت ہوتی ہے جو دُنیا میں تاجر کی ہوتی ہے۔ جس طرح اس کو ہر وقت مال کے بڑھانے کی دُھن ہوتی ہے اسی سوچ اور فکر میں رہتا ہے کہ کس طرح مال کو بڑھایا جائے۔ اسی طرح اہلِ معاملات کی حالت اپنے مولیٰ کے ساتھ ہے۔ اُن کو بھی رضاءِ حق کے سوا کوئی شغل نہیں نہ اُس کے بغیر اُن کو چین آتا ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ فرماتے ہیں۔ جس آنکھ نے آپ کو نہیں دیکھا اُس نے کسی دل خوش کرنے والی چیز کو نہیں دیکھا اور جس آنکھ نے آپ کو دیکھ لیا وہ کسی ناگوار چیز کو نہ دیکھے گی۔ آپ کی تجلی جلال (کا مُشاہدہ) اُس کی کسر کو پُورا کر دیتا ہے (یعنی کسی ناگوار چیز کے دیکھنے سے اگر طبعی ناگواری ہوتی بھی ہے تو اس میں تجلی جلال بھی تو ہوتی ہے اور آپ کی ہر تجلی محبوب ہے خواہ بصورتِ جمال ہو یا بصورتِ جلال ہو ؏

اُن کو آتا ہے پیار پر غُصّہ ہم کو غصّہ پہ پیار آتا ہے

جیسے آسمان کی بارش زمین کی خُشکی کو دُور کرتی ہے (تو اُس کی گرج اور کڑک سب ہی گوارا ہوتی ہے اسی طرح تجلی جلال سے زمین قلب کو جو زندگی اور شادابی نصیب ہوتی ہے وہ ظاہری ناگواری کو گوارا بنا دیتی ہے) قسم ہے آپ کے علم کی حرمت کی جس کے سامنے میرا ضعف ظاہر ہے کہ آپ کا لطف ہی میری بدحالی کی شکستگی کو جوڑنے والا ہے۔ قولہ وھمنا بعث وھو لم قال کلاھل نعزم اعملوا الیٰ قولہ جبر لرھب جالھا۔

ف ۔ یہ شُبہ نہ کیا جائے کہ صُوفیاءِ چشتیہ ذکر جہر کی تعلیم دیتے ہیں۔ بعض دفعہ تسبیح ہاتھ میں رکھنے کی کہتے ہیں حالانکہ ذکر تو آہستہ بھی ہو سکتا ہے بدون تسبیح کے بھی ہو سکتا ہے تو یہاں اظہار سے اخفاء افضل ہونا چاہیئے۔ جواب یہ ہے کہ اگر ذکر سے ثواب ہی مقصود ہو تو یقیناً ذکر خفی ذکر جہر سے افضل ہے بجز اُن مواقع

کے جہاں شریعت نے جہر مشروع کیا ہے، لیکن چشتیہ ذکر جہر محض ثواب کے لیے نہیں بتلاتے بلکہ ذکر کو قلب میں پیوستہ کرنے کے لیے بتلاتے ہیں اور تجربہ ہے کہ یہ مقصود بدون جہر کے جلدی حاصل نہیں ہوتا جیسے ایک شخص قرآن حفظ کرنے کے واسطے سبق یاد کر رہا ہو تو اُس کا مقصود محض ثواب نہیں بلکہ ثواب کے ساتھ حفظ کرنا بھی مقصود ہے تو وہ اخفاء کے ساتھ سبق یاد نہ کرے گا بلکہ جہر سے کرے گا۔ کیونکہ آہستہ پڑھنے سے یاد نہیں ہوتا یا بہت دیر میں ہوتا ہے۔ پس نفس جہر میں خود کوئی ثواب نہیں جبکہ شرعاً جہر کا امر نہیں بلکہ وہ ذکر کو دل میں پیوستہ کرنے کا ذریعہ ہے۔ اور ذکر کا دل میں جمانا مطلوب و محمود ہے تاکہ کسی وقت اللہ تعالےٰ کے ساتھ غفلت نہ ہو اور قاعدہ ہے کہ مطلوب کا مقدمہ بھی مطلوب ہوتا ہے اس طرح بالواسطہ جہر بھی محمود اور موجبِ ثواب ہو گیا۔ جیسا حفظ کرنے والے کا جہر محمود اور موجبِ ثواب ہے اسی طرح تسبیح ہاتھ میں رکھنا خود کوئی ثواب کا کام نہیں بلکہ وہ دل کے لیے مذکر ہے۔ تسبیح ہاتھ میں رہنے سے قلب ذکر یا مذکور کی طرف متوجہ رہتا ہے اور توجہ الی اللہ مطلوب ہے تو اُس کا مقدمہ اور ذریعہ بھی بواسطہ مطلوب ہو جائے گا۔ خوب سمجھ لو۔

ف ۔ درس و تدریس اور وعظ و تقریر اور تحریر وغیرہ میں نیّت درست کرنا ضروری ہے تاکہ ثواب سے محروم نہ ہو۔ درس و تدریس اور وعظ وغیرہ میں تبلیغِ احکام کی نیّت کی جائے۔ اگر ان کاموں کے لیے ملازمت کی جائے تو محض تنخواہ کی نیّت نہ کی جائے کہ وہ تو ہر حال میں ملے گی۔ نیت یہ کی جائے کہ میں دین کی اشاعت اور تبلیغ کے واسطے یہ کام کر رہا ہوں اور تنخواہ اس واسطے لیتا ہوں تاکہ دل جمعی اور بے فکری سے اس فرض کو ادا کر سکوں۔

❖

باب ہشت دیک [۸۱]

حدیث

تقدیم صلوٰۃ الفجر بالمزدلفۃ یوم النحر

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی نماز بے وقت پڑھتے نہیں دیکھا سوا دو نمازوں کے۔ آپ نے (مزدلفہ میں) مغرب و عشاء کو جمع کیا اور فجر کی نماز بھی وقت سے پہلے پڑھی اور یہ حج کے موقعہ پر ہُوا۔

شرح ظاہر حدیث سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں نمازیں اپنے وقت پر نہیں ہوئیں مگر واقع میں ایسا نہیں کیونکہ مغرب کی نماز تو عشاء کے وقت میں پڑھی گئی تھی لیکن فجر اپنے وقت پر ادا کی گئی مگر چونکہ اُس دن حضورؐ نے نماز فجر صُبح ہوتے ہی پڑھی تھی جو آپ کی عادتِ معروفہ کے خلاف تھا تو صحابی نے اُس کو بے وقت کہہ دیا مطلب یہ تھا کہ جس وقت کی عادت تھی اس سے پہلے نماز پڑھی (جس سے حنفیہ نے استدلال کیا ہے کہ حضورؐ کی عادت نمازِ فجر میں اسفار کی تھی اور وہ جو بعض احادیث میں آیا ہے کہ آپ فجر کی نماز غلس میں پڑھتے تھے اس کا مطلب یہ ہے کہ زیادہ اسفار نہ کرتے تھے بلکہ ایسے وقت نماز پڑھتے تھے کہ مسجد کے اندرونی حصہ میں تاریکی اور بیرونی حصہ میں روشنی ہوتی تھی)۔

(۲۰۷) مسائل دینی کا تذکرہ و تکرار بھی دین ہے اگرچہ مسئلہ مشہور ہی **کیوں نہ ہو**

یہاں سے معلوم ہُوا کہ دین کے احکام کا تذکرہ اور اُن میں گفتگو کرنا بھی دین ہے۔ اگرچہ حکم ظاہر ہو سب کو معلوم ہو۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نماز کی کیفیت مشہور تھی آج تک بھی اسی کے موافق عمل ہو رہا ہے مگر پھر بھی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کا تذکرہ کیا۔ میں بعض بزرگوں سے ملا ہوں جو علم و عمل میں اعلےٰ درجہ پر فائز تھے۔ جب کبھی وہ کسی مجلس میں جمع ہوتے تو اُن کی بات چیت مسائل دین ہی میں ہوتی تھی وہ بھی مُشکل مسائل میں نہیں نہ باطنی حالات میں گفتگو ہوتی تھی) اس کے سوا اور کوئی بات نہ کرتے تھے۔ اسی طرح صحابہ اور سلف صالحین سے منقول ہے کہ وہ جب آپس میں ملتے تو کہتے آؤ کچھ دیر ایمان کی باتیں کریں یعنی مسائل دین میں گفتگو کریں۔ کیونکہ دُنیا کی ہر چیز کی حالت یہ ہے کہ اُس میں جب زیادہ گفتگو ہوتی ہے تو بعض وقت دل اُکتا جاتا اور پریشان اور تنگ ہو جاتا ہے۔ مگر ایمان اور اُس کے فروع اور اہلِ ایمان کے حالات میں گفتگو سے اہلِ تحقیق کے نزدیک ایمان بڑھتا ہے (اس لیے وہ کسی وقت بھی اس سے دل تنگ نہیں ہوئے) جیسے علم کو جتنا بھی خرچ کرو بڑھتا ہی ہے علم کے سوا دُوسری چیزوں کو خرچ کرو تو وہ گھٹتی ہے۔

پس تم ایسا راس المال (اور سرمایہ) لے لو جو خرچ کرنے سے بڑھتا ہے ترقی کرتا ہے اور دُوسروں کو بھی اُس سے فائدہ اور غناء حاصل ہوتی رہے اور تمہارا سرمایہ ذرا بھی کم نہ ہو۔ اسی لیے بعض حکماء نے فرمایا ہے کہ علم ربانی عطیہ ہے۔ علماء تم کو ایک چیز پوری کی پوری دے دیتے ہیں اور اُن کے خزانے میں اس سے کچھ کمی نہیں آتی۔ کیونکہ جب کوئی تم کو علم دیتا ہے تمہارے پاس اُس کے علوم و معارف سب ہی آجاتے ہیں۔ مگر اُس کے پاس جو علم تھا اُس میں کمی نہیں آتی بلکہ اُس میں ایک نئی قسم کی ترقی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ علمی تذکرہ سے خود عالم کو بھی پہلے سے زیادہ تنبہ ہو جاتا ہے اور ثواب زیادہ علاوہ الگ رہا جو سب چیزوں سے بڑھ کر ہے۔

قولہ وفیہ دلیل علی ان من الدین ذکر الحکم فی الدین الی قولہ الذی ھو خیر من الکل۔

ف ۔ صوفیاء اور علماء کو چاہیئے کہ اپنی مجلسوں کو علمی و اصلاحی تذکرہ سے خالی نہ رکھیں سلف کا طریقہ یہی تھا ۔ آج کل بعض علماء کی حالت یہ ہے کہ اُن کی مجلس میں بجز اِدھر اُدھر کے قصوں یا سیاسی جھگڑوں کے اور کچھ نہیں ہوتا یہ حالت تنزلِ دین کی علامت ہے عارف کا تو یہ حال ہونا چاہیئے ؎

ماقصۂ سکندر ودارا نہ خواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

ہم نے اپنے اکابر کی مجلسوں میں بجز علمی و اصلاحی گفتگو کے فضول قصے نہیں دیکھے الا نادرا والنادر کالمعدوم ۔

(۲۰۸) روایت ہی سے قطع حجت اور تسلی کامل ہوتی ہے

یہاں سے یہ علمی مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ احکام دین کا روایت کرنا خصم کی حجت کو زیادہ قطع کرنے والا ہے ۔ اگرچہ اُس پر عملدر آمد ہو رہا ہو اور سب کو اس کا علم ہو کیونکہ روایت ہی سے تو یہ معلوم ہو گا کہ اللہ تعالےٰ کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی اسی طرح تھا جس طرح عمل ہو رہا ہے ۔ پھر ایک دُوسرے سے نقل در نقل ہوتا رہے گا (تو ساری اُمت کو قیامت تک یہ علم ہوتا رہے گا) اگر امام عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس حدیث کو بیان نہ فرماتے اگرچہ عمل اُس کے موافق ہو رہا ہے تو ہم کو کس طرح یقین ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت یہی ہے کوئی مخالف اگر اس کا انکار کرتا تو ہم اُس کو کیا جواب دیتے یا خود ہمارا دل حقیقتِ حال پر مطلع ہونا چاہتا تو کیونکر تسلی ہوتی ؟ کسی نے خُوب کہا ہے کہ دین میں کوشش کرتے رہو اور اُس کو بدون کسی اصل کے نہ لو اور وہ کتاب اللہ ہے اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ایک ثقہ دُوسرے ثقہ سے روایت کرتا ہے اور اجماع اور قیاس بشرطیکہ تم شرطِ قیاس سے متصف ہو اور (ان کے سوا) پانچواں کوئی طریق معتدل نہیں ۔ قولہ وفیہ من الفقہ ان دوایتہ الی قولہ لیس طریقہ بالعدل ۔

ف ۔ یہاں سے صوفیاء زمانہ کو سبق لینا چاہیئے جو علم کتاب وسُنّت واجماع و قیاس حاصل نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ یہ تو علم شریعت ہے اور ہمارا علم طریقت سینہ بہ سینہ ہے ۔ ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ سینہ بہ سینہ بجز نسبت باطنہ کے کچھ نہیں اور نسبت باطنہ بدون علم وعمل کے حاصل نہیں ہوتی اور علمِ احکام سینہ بہ سینہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ پڑھنے پڑھانے سے حاصل ہوتا ہے ۔ بزرگوں کا ارشاد ہے ۔ ما اتخذ اللہ من ولی جاھل ۔ اللہ تعالےٰ کسی جاہل کو ولی نہیں بناتے اور جن صوفیاء کو اَن پڑھ کہا جاتا ہے وہ جاہل نہ تھے بقدرِ ضرورت علمِ دین اُن کو حاصل تھا خواہ کتابوں سے یا صُحبتِ علماء سے ۔ اس کے بعد ہی اُن کا عمل کامل ہوا اور عمل کامل سے نسبتِ باطنہ اُن کے قلب پر فائض ہوئی ۔ پس جو عمل کسی آیت یا حدیث یا اجماع یا قیاس سے ثابت نہ ہو اس کو رد کیا جائے گا احکامِ الٰہیہ سینہ بہ سینہ حاصل نہیں ہو سکتے اور یہاں سے اُن علماء کی غلطی بھی واضح ہو گئی جو بدون شرط قیاس کے اپنے کو مجتہد سمجھ بیٹھتے ہیں ۔ قیاس کے لیے علاوہ دیگر شرائط کے ایک بڑی شرط کمال ذوقِ عربیت ہے کیونکہ قرآن کریم عربی فصیح معجز میں نازل ہُوا ہے ۔ جس کو سب سے زیادہ سمجھنے والے وہی تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے قریب تھے کہ اس وقت تک ذوقِ عربیت پُوری طرح محفوظ تھا ۔ تفسیر سلف کو چھوڑ کر آج کل جو نئی نئی تفسیریں قرآن کی کی جاتی ہیں یقیناً تحریف میں داخل ہیں ۔

ایک مفسر کا رد جس نے واقعۂ معراج میں تحریف کی ہے

چنانچہ اس زمانہ کے ایک مفسر نے سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصےٰ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ معراج جسمانی نہ تھی نہ محض خواب تھا بلکہ ایک درمیانی کیفیت تھی جو نبوت کے ساتھ مختص ہے جس کی حقیقت ہم بیان نہیں کر سکتے ۔ مگر اُس کو یہ عقل نہ آئی کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعۂ معراج کو مکہ والوں کے سامنے بیان کیا اور ان آیات کو پڑھا اُس وقت

اہلِ مکہ نے اُس سے کیا سمجھا تھا ؟ یقیناً سب نے قرآن کی آیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے معراج جسمانی ہی سمجھا تھا اسی لیے تو استہزاء کیا۔ اور مضحکہ اُڑایا اور بیت المقدس کا نقشہ دریافت کیا اور اُن قافلوں کا حال پُوچھا جو مکہ سے شام کی طرف گئے تھے اور جس وقت حضرت ابوسفیانؓ سے ہرقل نے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے ؟ اُنہوں نے جواب دیا ھو صائب الرائے فینا غیر انا انکرنا منہ شئیا کہ وہ بڑے صائب الرائے ہیں لیکن اُن کی ایک بات ہم کو اوپری معلوم ہوئی پُوچھا وہ کیا ؟ کہا وہ کہتے ہیں کہ میں ایک رات مکہ سے بیت المقدس گیا وہاں سے آسمانوں پر گیا پھر صبح سے پہلے گھر واپس آگیا۔ یہ بات ہماری عقل میں نہیں آئی اس پر بیت المقدس کے پادری نے کہا وہ سچ کہتے ہیں مجھے وہ رات معلوم ہے جس میں وہ بیت المقدس تشریف لائے تھے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سیرۃ حلبیہ وغیرہ۔ غرض تواتر سے یہ بات ثابت ہے کہ تمام مشرکین نے جو قرآن کے اوّل مخالف تھے قرآن سے اور رسول اللہ کے بیان سے معراج جسمانی ہی سمجھا اسی وجہ سے انکار کیا اسی لیے نشانات دریافت کئے۔ اگر معراجِ جسمانی کا دعویٰ نہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہی فرما دیتے جو آج چودھویں صدی کا نیا مفسّر کہتا ہے کہ معراجِ جسمانی کا مجھے دعویٰ نہیں بلکہ یہ ایک خاص کیفیت ہے جو نبی کے ساتھ مختص ہے تم اس کو نہیں سمجھ سکتے ؟ آپ کو بیت المقدس کا نقشہ بتلانے اور قافلوں کی حالت بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟ دُنیا جانتی ہے کہ حضرت صدیق اکبر کو لقب صدیق اُسی دن دیا گیا جب اُنہوں نے معراج کی تصدیق کی جبکہ بہت سے ضعفاء اس بات کو سُن کر مرتد ہو گئے تھے۔ اگر اس نئے مفسر کی تفسیر کو صحیح مان لیا جائے تو اُس کی تصدیق میں کچھ بھی کمال نہ تھا نہ ضعفاء کو ارتداد کی نوبت آنے کی کوئی وجہ تھی۔ نہ مشرکین کو استہزا اور مضحکہ کا کوئی موقعہ تھا۔ مگر خدا ناس کرے اس مرعوبیت کا کہ آج کل دُوسروں کے اعتراض سے خوفزدہ ہو کر مُسلمانوں کے نئے مفسر قرآن ہی کو بدلنے لگے اور اُس میں ایسی تحریفیں کرنے لگے جو قواعدِ عربیت کے خلاف اور اہلِ عرب کی فہم سے بہت دُور ہیں۔

باب ہشت و دوم
۸۲

حدیث

الصدقۃ بجلال البُدون وجلودہا

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اُن اونٹوں کی جھولوں اور کھالوں کو صدقہ کر دوں جو (حج کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے) قربانی میں نحر کئے گئے تھے۔

شرح ظاہر حدیث تو یہ ہے کہ قُربانی کے اُونٹوں کی جھولوں اور کھالوں کے صدقہ کا حُکم کیا گیا۔ اس پر چند سوالات ہیں ایک یہ کہ یہ امر وجوب کے لیے تھا یا استحباب کے لیے ؟ دُوسرے حضرت علیؓ کے اس بات کے بیان کرنے میں کیا فائدہ ہے ؟ تیسرے اس میں کیا حکمت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو اس حکم کے لیے مخصوص کیا ؟

پہلے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ امر استحباب کے لیے ہے وجوب کے لیے نہیں۔ کیونکہ خود قربانی کے گوشت کا صدقہ کرنا واجب نہیں جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے تو جھول اور کھال اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی۔ دُوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس بات کو اس لیے بیان کیا کہ یہ مسئلہ معلوم ہو جائے کہ صدقہ کرنے میں کسی کو نائب بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ حضراتِ صحابہ رضی کو اس سے خاص فرحت اور فخر ہوتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن

کو کسی بات کے ساتھ خاص طور سے خطاب فرمائیں۔ دیکھو حضرت علی کو اپنے سب ناموں میں زیادہ محبوب ابوتراب تھا کیونکہ یہ کنیت حضورؐ نے دی تھی۔ نیز حکم کی پختگی بھی مقصود ہے کہ یہ مسئلہ کسی کے واسطہ سے نہیں بلکہ میں نے بلاواسطہ حضورؐ سے سُنا ہے اور بذاتِ خود اُس کو معلوم کیا ہے۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو اس حکم کے ساتھ اس لیے مخصوص فرمایا کہ اُن کو علم زیادہ تھا اگرچہ حضرات خلفاء سبھی علماء تھے۔ لیکن حضرت علی کو وجوہ خیر میں سے اس خیر میں فضیلت حاصل تھی چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے انا مدینۃ العلم وعلی بابہا میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہیں۔ نیز یہ بھی وجہ تھی کہ حضرت علیؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قربانی کے اُونٹوں کے نحر کرنے میں نائب کیا تھا۔ (کیونکہ آپ نے سو اُونٹوں میں ترسیٹھ تو خود اپنے ہاتھ سے نحر کئے تھے بقیہ کو حضرت علیؓ کے سپرد کیا تھا کہ وہ نحر کریں تو کھالوں اور جھولوں کے صدقہ میں بھی اُن ہی کو نائب کر دیا گیا۔ ھذہ خلاصۃ ماذکرہ الشارح فی شرحہ)

(۲۰۹) اگر کسی کو کسی دینی کام میں نائب کیا جائے تو عالم اور قرابت دار کو مقدم کیا جائے

اس سے معلوم ہُوا کہ قربانی اور صدقہ وغیرہ میں (اگر کسی کو نائب کرنے کی ضرورت پڑے تو) مستحب یہ ہے کہ کسی عالم کو نائب کیا جائے کہ یہ بھی قربت کو کامل کرنے والا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہُوا کہ جو نیک کام واجب نہ ہوں اُن میں مستحب یہ ہے کہ (ضرورت نیابت کے موقعہ پر) اپنے عزیز قریب کو حکم دیا جائے۔ چنانچہ حضورؐ نے حضرت علی کو نحر ہدی اور صدقہ جلال وجلود کا حکم دیا کیونکہ وہ حضورؐ کے چچازاد بھائی اور داماد تھے۔ اس نیابت سے اُن کو خوش کرنا مقصود تھا اگر حضورؐ کسی دُوسرے کو اس صدقہ کا حکم دیتے تو احتمال تھا کہ اُن کی خاطر میں تغیّر پیدا

ہو جاتا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اپنی طرف سے صدقہ وغیرہ میں نائب کر دیا تاکہ اُن کا دل خوش ہو جائے اور شکستہ نہ ہو۔ قولہ ویترتب علیہ من الفقہ ان المندوب فی النیابۃ الی قولہ ادخال سرور وجبر قلب۔

ف ۔ یہ نیابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی معاملہ میں تھی اور ذاتی معاملات ہی میں اہلِ قرابت کو مقدم کرنا مستحب ہے جبکہ اُن کو علم بھی زیادہ ہو پس اس سے مسئلہ خلافت میں تقدیم پر استدلال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ حضورؐ کا ذاتی معاملہ نہیں بلکہ عام مسلمانوں سے متعلق ہے اُس میں اسی کو تقدم ہوگا جسے عام مُسلمان مقدم کریں اور یہ بدیہی مسئلہ ہے جس میں زیادہ بحث کی اصلا ضرورت نہیں۔ ایک مقام پر ہم بیان کر چکے ہیں کہ حضرات خلفاء راشدین کی خلافت جس ترتیب سے واقع ہوئی ہے وہی عین حکمت اور ضرورت کے موافق تھی۔

(۲۱۰) حُسنِ معاشرت یہ ہے کہ جس نے کام شروع کیا ہو اُسی سے ختم بھی کرایا جائے

ایک وجہ حضرت علیؓ کو اس حکم کے ساتھ مخصوص کرنے کی یہ بھی تھی کہ حُسن صحبت (اور حُسنِ معاشرت) کا مقتضا یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کام کو شروع کرے اُس کی تکمیل بھی اُسی کے ہاتھوں سے کرائی جائے۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو یمن کی طرف بھیجا تھا کہ وہاں سے قربانی کے اُونٹ لائیں (چنانچہ وہ اپنے ساتھ لے کر آئے اور حج کے موقعہ پر مکہ پہنچے) تو حسن صحبت کے قاعدہ سے اُن ہی کو آپ نے بقیہ قربانی میں نائب کیا اور اُن ہی کو کھالوں اور جھولوں کے تصدق میں نائب کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حُسن صحبت کی رعایت کرنے والا کون ہے؟

وفیہ وجہ من حسن الصحبۃ الی قولہ ومن احسن صحبۃ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ف ۔ جب اس قصہ میں وجوہ نیابت متعدد ہو سکتے ہیں تو کسی ایک وجہ پر یقین

نہیں کیا جاسکتا۔ پس اس سے مسئلہ خلافت میں تقدیم پر استدلال نہیں ہوسکتا اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال۔

ف۔ حُسنِ صحبت و ادبِ معاشرت بھی دین کا بڑا اہم شعبہ ہے جس کی طرف سے آج کل بہت غفلت ہے اور تعجب تو یہ ہے کہ اس کے آداب کو قرآن و حدیث سے علماءُ بھی کم سمجھتے ہیں۔ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے تجدیدی کارناموں میں یہ بھی بڑا کارنامہ ہے کہ آپ نے دین کے اس باب کو زندہ کیا اور اس کی تعلیم و تلقین میں بڑا اہتمام فرمایا۔

(۲۱۱) فتوحاتِ الٰہیہ کو بیان کرنا چاہیئے

حدیث سے معلوم ہُوا کہ جب حق تعالےٰ کسی بندے پر امورِ خیر کو مفتوح فرمادیں تو اُس کو بیان کرنا چاہیئے بشرطیکہ اُس میں اپنے کسب و اختیار کو دخل نہ ہو (محض وہب و فضل ہو) کیونکہ جن امور میں کسب و اختیار کو دخل ہے اُن کو بیان کرنا تو اپنا تزکیہ (اور اپنے منہ سے اپنی تعریف ہے اور (اس سے) حق تعالےٰ نے (منع فرمایا ہے چنانچہ ارشاد) فرمایا ہے فلا تزکوا انفسکم (اپنی تعریف خود نہ کرو) اور جو امور محض وہب و فضل سے حق تعالےٰ عطا فرمائیں اُن کا بیان کرنا شکر میں داخل ہے بشرطیکہ نیت طلب جاہ سے سالم ہو چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں التحدث بالنعم شکر نعمتوں کا بیان کرنا بھی شکر ہے اور حق تعالےٰ فرماتے ہیں لئن شکرتم لازیدنکم اگر تم شکر کروگے تو مَیں تم (پر اپنی نعمتوں) کو بڑھاتا رہوں گا۔

دیکھو حضرت علیؓ نے (اس حدیث میں) یہ بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے صدقہ کا امر فرمایا (جس میں اس نعمت کا ذکر ہے کہ حضورؐ نے محض وہب و فضل سے اُن کو اس حکم کے ساتھ مخصوص فرمایا) پھر ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا کہ (اس کے بعد) جو کچھ مَیں نے کیا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر سے کیا جس میں دعوے اور تزکیہ سے برأت کا اظہار ہے۔ جیسے کوئی کسی کو صدقہ کرتے ہوئے دیکھے اور وہ

کہہ دے کہ یہ صدقہ واجبہ ہے (نافلہ نہیں) اُس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس میں میری تعریف کی کوئی بات نہیں، کیونکہ حضرات صحابہ اور پہلے زمانے کے مُسلمانوں کے نزدیک واجبات کا ادا کرنا تعریف کا سبب نہ تھا کیونکہ واجب کا ادا کرنا تو لازم ہے اور واجبات کے ادا کرنے میں سب ہی لوگ برابر تھے (اُس زمانہ میں فرائض و واجبات کو کوئی نہیں چھوڑتا تھا تو اس میں تعریف یا کمال کچھ نہ تھا) اسی لیے بعض عابدین نے فرمایا ہے کہ خُدا تارکینِ صلوٰۃ کو جزائے خیر نہ دے۔ اُنہوں نے (خود تو نماز چھوڑ دی اور) ہم کو نماز پڑھتے دیکھا تو کہنے لگے یہ بڑے عابد ہیں (یعنی اُن کے ترکِ صلوٰۃ نے ہم کو عابدین میں داخل کر دیا اگر وہ بھی نماز پڑھا کرتے تو ہمارا کچھ بھی کمال نہ تھا) اور صحابہ رضی اللہ عنہم جو اُن باتوں کا تذکرہ (کبھی کبھی) کر دیتے ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالےٰ نے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو مخصوص فرمایا ہے اس کا منشاء محض اپنی خوشی کا اظہار اور نعمت کا شکر تھا وہ دعوئ عمل سے بری تھے۔

آج کل کے آدمیوں کی طرح نہ تھے جو واجبات کو بھی پُوری طرح ادا نہیں کرتے اور چاہتے یہ ہیں کہ اُن کو اہلِ برکت میں شمار کیا جائے (لوگ اُن کو بزرگ اور شیخ سمجھیں) ایسے ہی لوگوں کے متعلق حق تعالےٰ نے فرمایا ہے ویحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا (اور وہ چاہتے ہیں کہ اُن کی تعریف کی جائے ایسے کاموں میں جو اُنہوں نے نہیں کئے) اس میں صوفیاء کی دلیل ہے جو فرماتے ہیں کہ اہلِ طریق کو چاہیئے کہ حق تعالےٰ نے اُن پر جن نعمتوں کو مفتوح کیا ہے اپنے دوستوں کے سامنے بیان کر دیا کریں بشرطیکہ مجلس میں کوئی اجنبی نہ ہو کیونکہ اس سے اہلِ طریق کا ایمان قوی ہوتا ہے اور ایمان کی زیادتی سے اللہ تعالےٰ کا قرب بڑھتا ہے نیز اس سے اُن کو نفس کے مقابلہ میں مدد ملتی ہے۔ خصوصاً اس زمانہ میں جبکہ اس طریق میں صدق (و خلوص) سے کام کرنے والے کم ہو گئے۔ یہاں تک کہ بعض لوگ تو یہی سمجھ بیٹھے کہ یہ (طریق تصوف) ایسی چیز ہے جس کا بستر لپیٹ دیا گیا ہے (اب دُنیا میں نہ کہیں طریق کا وجود ہے نہ اہلِ طریق کا) تو یہ خیال اُن کو ترقی سے ہمت پست

کرنے کا سبب ہو جاتا ہے (اب اگر مشائخ طریق حق تعالے کی اُن نعمتوں کو بیان کرتے رہیں گے جو اللہ تعالے نے اُن پر مفتوح کی ہیں تو اس سے سُننے والوں کی ہمت بلند ہو گی وہ سمجھیں گے کہ اب بھی وہ حالات و مقامات حاصل ہو سکتے ہیں جو پہلے زمانے میں حاصل ہوتے تھے)۔ مجھ سے ایک شخص نے جس کو طریق سے وابستگی تھی پھر عمل میں سُست پڑ گیا۔ پھر اپنے زمانے میں ایک بزرگ کو دیکھا جس کے اندر اندر حالاتِ صُوفیاء کا کچھ حصّہ موجود تھا تو دوبارہ مجاہدہ اور خدمت میں مشغول ہو گیا اور تھوڑے ہی دنوں میں کشود کار سے سرفراز ہو گیا۔ بیان کیا کہ واللہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری سُستی اور کاہلی کا سبب صرف یہ ہُوا کہ میں نے اپنے اندر کوئی بات نہ دیکھی اور نہ کسی ایسے شخص سے مُلاقات ہوئی جس میں وہ باتیں موجود ہوں جو صوفیاء کی کتابوں میں لکھی ہیں۔ میں نے کہا کہ اب اس طریق کا بستر لپیٹ دیا گیا ہے تو میں نے کیوں خواہ مخواہ سر مارا۔ پھر جب میں نے فلاں شخص میں کچھ وہ باتیں دیکھیں جو قوم کی کتابوں میں لکھی ہیں تو مجھے یقین ہو گیا کہ طریق تو باقی ہے لیکن سالک کم ہو گئے ہیں۔ اب میں پھر خدمت اور مجاہدہ میں لگ گیا جس کے بعد میری یہ حالت ہو گئی جو آپ دیکھ رہے ہیں (کہ بحمد اللہ فتوحاتِ الٰہیہ سے کامیاب ہو گیا ہوں)۔ تو فتوحاتِ الٰہیہ کے بیان کرنے میں یہ فائدہ ہے (کہ جو لوگ طریق کو دشوار اور معدوم سمجھ بیٹھے ہیں اُن کی ہمتیں بلند ہو جائیں) اسی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جب تو اپنے حال میں سچّا ہو تو تیرا بولنا اور دیکھنا رہنا دیکھنے والوں کے حق میں فلاح ہی فلاح ہے۔ قولہ وفیہ دلیل علی التحدث بما فتح اللہ بہ علی العبد الی قولہ لمن رآہ فلاح۔

ف۔ کتب صوفیاء میں بزرگوں کی کرامات و تصرفات اور کشفیات و حالات و کیفیات کا ذکر ہوتا ہے تو اُن کو دیکھ کر بعض لوگ اُن کی تحصیل کے طالب ہو جاتے ہیں اور جب حاصل نہیں ہوتیں تو مایوس اور بد دل ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ امور اختیار سے باہر ہیں اور امور غیر اختیاریہ کے درپئے ہونا پریشانی میں پڑنا ہے اور بعض

کتابوں میں مقامات و اخلاق حمیدہ کی تعریف ایسی تدقیق اور کاوش سے کی گئی ہے جسے دیکھ کر بہت لوگ یہ سمجھ جاتے ہیں کہ ان مقامات و اخلاق کا حاصل ہو جانا آج کل محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ حالانکہ فی نفسہٖ اُن کی تحصیل دشوار نہیں۔ دشواری محض مصنفین کے بیان میں ہے کیونکہ اخلاقِ حمیدہ کی تحصیل اور اخلاقِ رذیلہ کی اصلاح شرعاً مامور بہ ہے اور شریعت نے وسعت و طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں کیا۔ لایکلف اللہ نفساً الا وسعہا وما جعل علیکم فی الدین من حرج اس پر صراحۃً دال ہے۔

پس تصوف کا حاصل یہ ہے کہ امورِ اختیاریہ میں کوتاہی نہ کرے اور غیر اختیاریہ کے درپئے نہ ہو۔ پھر اُس میں کچھ بھی دشواری نہیں۔ البتہ امورِ اختیاریہ میں خلوص و صدق حاصل کرنے اور شائبہ نفس سے بچنے کے لیے کسی شیخ سے رجوع کی ضرورت ہے جس کی صحبت اور تعلیم کی برکت سے قلب میں خلوص اور صدق جلد پیدا ہو جاتا اور نفس کے مکائد پر نظر ہو جاتی ہے۔ یہ بات خود کتابیں دیکھ کر جلدی حاصل نہیں ہو سکتی اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کوئی مریض اپنے مرض کا علاج کتابیں دیکھ کر کرے تو دیر میں شفاء ہو گی اور ممکن ہے شفاء نہ ہو بلکہ بڑھ جائے اور کسی طبیب حاذق کے حوالہ اپنے کو کردے تو جلد شفا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح امراض قلب سے شفا طبیب روحانی کے ذریعے جلدی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بعد نسبت باطنہ کے حصول کا درجہ ہے وہ تو کتابوں سے حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ دولت مشائخ طریق کی صحبت ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ خوب سمجھ لو اور بحمد اللہ ہر زمانہ میں ایسے مشائخ موجود رہتے ہیں جن کے وسیلہ سے یہ دولت طالبین کو حاصل ہوتی رہتی ہے۔ طلب اور تحقیق شرط ہے بدون تحقیق کے ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دینا چاہیئے ؎

اے بسا ابلیس آدم روے ہست
پس بہر دستے نہ باید داد دست

❖

حدیث

لبس المحرم المخیط

بخاری رحمہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں کہ عطاء رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر کوئی (محرم حالتِ احرام میں) بھول کر یا جہالت سے خوشبو لگا لے یا (سِلا ہوا) کپڑا پہن لے تو اس پر کفارہ نہیں۔

شرح یہ عطاء کا مذہب ہے، متفق علیہ نہیں۔ نسیان میں تو امام شافعی بھی اُن کے موافق ہیں اور امام مالک کے نزدیک نسیان میں بھی کفارہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح نماز میں سہو سے سجدہ سہو لازم ہے اور اس سے نقصان کا جبر ہو جاتا ہے اسی طرح احرام میں سہو و نسیان معاف نہیں بلکہ جبر نقصان کے لیے کفارہ لازم ہے اور یہاں سہو و عمد دونوں میں کفارہ ہے۔ نماز میں صرف سہو سے سجدۂ سہو لازم ہوتا ہے عمد میں نہیں۔ باقی جہل کی صُورت میں جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی عالم نے عطاء کی موافقت نہیں کی بلکہ نص قرآنی فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون (اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پُوچھو) اُن کا رد کر رہی ہے۔ قرآن نے کسی کو جہل کی وجہ سے معذور نہیں قرار دیا اور اگر جہل عُذر ہو جائے تو اس کا درجہ علم سے بڑھ جائے گا جس کا کوئی بھی قائل نہیں۔ (ہذا ما قالہ الشارح فی شرحہ اس مسئلہ میں امام مالک کی دلیل ایک حدیث ہے کہ ایک شخص حالتِ احرام میں خوشبُو لگائے عبا پہنے ہوئے حضورؐ کے سامنے آیا تو آپ نے اُس کو خوشبو کے دھونے اور عبا کے اُتارنے کا حکم دیا اور کفارہ کا حکم نہیں دیا۔ کیونکہ اُس کو یہ مسئلہ معلوم نہ تھا کہ احرام کی حالت میں خوشبو لگانا اور عبا پہننا منع ہے۔ جمہور کی طرف سے جواب کُتب فقہ میں مذکور ہے وہاں دیکھ لیا جائے)۔

(۲۱۲) نا اہل کو محض کتاب دیکھ کر فتویٰ دینا یا باطنی اصلاح کرنا جائز نہیں

یہاں سے معلوم ہُوا کہ کتابوں میں کوئی روایت دیکھ کر فتویٰ دینا ہر شخص کو جائز نہیں یہ کام انہی لوگوں کا ہے جو اس کے اہل ہیں اور فیصل شُدہ بات کے جاننے والے اور مدلول کلام کے سمجھنے والے ہیں۔ اسی مسئلہ کو دیکھو اگر کوئی ناواقف آدمی عطاء کا یہ قول دیکھے وہ تو اسی پر عمل کرنے لگے گا اور سمجھے گا کہ سب علماء کا یہی قول ہے (کیونکہ یہاں کسی کا خلاف مذکور نہیں۔) اب وہ اپنے امام پر جھوٹ بات لگانے کا مجرم ہوگا اور دُوسروں کو بھی دھوکہ میں ڈالے گا۔ چنانچہ ایک عالم کے متعلق جو مذہب مالک پر فتویٰ دیتے تھے ایک جماعت نے مجُھ سے بیان کیا کہ وہ عطاء کے قول پر فتویٰ دیتے (اور اسی کو مالک کا مذہب سمجھتے) ہیں حالانکہ مالک کا مذہب ہم اُوپر بتلا چکے ہیں (کہ وہ کسی جزو میں بھی عطاء کے موافق نہیں نہ نسیان میں نہ جہل میں)۔ ہم اللہ تعالےٰ سے دُعا کرتے ہیں کہ ہم کو معرفتِ علم کا صحیح راستہ دکھلائیں اور اُس پر اپنی رضا کے لیے عمل کی توفیق دیں۔ قولہ ویترتب علیہ من الفقہ انہ لا یجوز الحکم بمجرد النقل الی قولہ لا درب سواہ۔

ف ۔ ہر چند کہ یہ مسئلہ تصوف کے مسائل سے نہیں مگر اس کی ضرورت علماء اور صوفیاء دونوں کو ہے آجکل یہ مرض عام ہے کہ کتابیں اور ترجمے دیکھ کر حکم شرعی یا باطنی بیان کرنے لگتے ہیں۔ اور بعض تو مجتہدین بن جاتے ہیں۔ حالانکہ کتابیں اور ترجمے دیکھنے سے علم حاصل نہیں ہوتا بلکہ پڑھنے پڑھانے اور علماء کے پاس مدت سے رہنے سے حاصل ہوتا ہے ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را
عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

❖

حدیث

بناء مسجد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے اور مسجد بنانے کا حکم دیا تو بنو نجار سے فرمایا اے بنی نجار! مجھ سے (اس زمین کی) قیمت کا معاملہ کر لو۔ اُنہوں نے کہا ہم اس کی قیمت اللہ تعالےٰ کے سوا کسی سے نہیں لینا چاہتے تو آپؐ نے مشرکین کی قبروں کے کھود ڈالنے کا حکم دیا اور خراب زمین کو برابر کر دیا گیا اور کھجوروں کو کاٹ دیا گیا۔ پھر اُن کو مسجد کے قبلہ (کی دیوار) میں اُوپر تلے رکھ دیا گیا۔

شرح حدیث کا ظاہر تو یہ ہے کہ مسجد مدینہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بنائی گئی ہے جبکہ آپؐ نے (مکہ سے) مدینہ کو ہجرت فرمائی۔ اس میں چند وجوہ سے کلام (کی ضرورت) ہے۔

(۲۱۳) ہدیہ قبول کرنے میں خلوص پر نظر کرنا ضروری ہے یہاں سے معلوم ہُوا کہ کسی چیز کے متعلق اُس کے مالک سے یہ درخواست کرنا کہ اس کو ہمارے ہاتھ بیچ دو جائز ہے۔ اگرچہ اُس نے پہلے سے بیچنے کا خیال ظاہر نہ کیا ہو۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا اے بنو نجار مجھ سے اس زمین کی قیمت لے لو۔ حالانکہ اُن لوگوں نے اس زمین کو بیچنے کے لیے پیش نہیں کیا تھا۔ نیز یہ بھی معلوم ہُوا کہ جو شخص

کسی صنعت یا پیشہ سے مشہور ہو چکا ہو یا اُس کا خاندان مشہور ہو چکا ہو اُس کو اس پیشہ کی طرف نسبت کرنا جائز ہے (بشرطیکہ اُس کو ناگوار نہ ہو) اور یہ اُن القاب میں داخل نہیں جن سے منع کیا گیا ہے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا یا بنی النجار (اے بڑھئی کی اولاد) یہ صنعت اُن کے آبا و اجداد میں کسی نے اختیار کی تھی اُس سے خاندان مشہور ہو گیا۔ آپؐ نے اُسی مشہور نسبت سے اُن کو خطاب فرمایا (کیونکہ یہ نسبت اُن کو ناگوار نہ تھی)۔

نیز یہاں سے معلوم ہُوا کہ اگر کسی چیز کو خریدنے کا ارادہ کیا گیا ہو پھر مالک اُس کو ہدیہ کر دے تو اُس کا قبول کرنا جائز ہے۔ بشرطیکہ مالک پر دباؤ ڈالنے کا قصد نہ کیا گیا ہو۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کا ہدیہ قبول کر لیا حالانکہ پہلے آپؐ نے خریدنے کا قصد کیا تھا اور اس بات کی دلیل کہ مالک پر دباؤ ڈالنے کا قصد نہ ہو۔ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے جو اوّلاً یہ فرمایا تھا کہ مجھ سے اس زمین کی قیمت لے لو سچ مچ دل سے فرمایا تھا کیونکہ نبی حق کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ نہ حیلہ بہانہ کرتے ہیں نہ ایسی بات مجازًا کہہ سکتے ہیں (اُن کی مراد وہی ہوتی ہے جو الفاظ کا حقیقی مدلول ہے) جس کے دل میں اُس کے خلاف کا وسوسہ بھی ہو وہ نبی کی تنقیص کرتا ہے جو ہرگز جائز نہیں اور اگر زبان سے صاف طور پر اس کو ظاہر کر دے گا قتل کیا جائے گا۔

ہاں یہاں پر ایک مسئلہ قابلِ غور ہے وہ یہ کہ ہدیہ کرنے والے کے خلوص کی تصدیق محض دعوے سے نہ کی جائے گی جب تک خلوص پر قرینہ قائم نہ ہو جو اُس کو واضح کر دے جیسا ان صحابہ کا قول ہے لانطلب ثمنہ الا الی اللہ ہم اس کی قیمت بس اللہ ہی سے طلب کرتے ہیں۔ اور اُن کے اس قول سے یہ لازم نہیں آیا کہ وہ (ہدیہ نہیں کر رہے تھے بلکہ) صدقہ کر رہے تھے۔ کیونکہ صدقہ کرنے والے کی طرح ہدیہ کرنے والا بھی تو ثواب کا مستحق ہوتا ہے جبکہ اللہ کو راضی کرنے کے لیے ہدیہ کرے۔ صدقہ اور ہدیہ میں صرف اتنا فرق ہے کہ صدقہ تو صرف اللہ تعالےٰ

کے لیے ہوتا ہے بشرطیکہ ریا کو دخل نہ ہو اور ہدیہ کی بہت صورتیں ہیں جن کو کتب فقہ میں بیان کیا گیا ہے جن میں سے ایک قسم یہ بھی ہے کہ اللہ تعالےٰ کے لیے ہو اسمیں ہدیہ والے کو بھی صدقہ والے کی طرح ثواب ملتا ہے اگرچہ ہدیہ کرنے والے نے ان حضرات صحابہ کی طرح صاف صاف نہ کہا ہو کہ میں اللہ تعالےٰ کے واسطے ہدیہ کرتا ہوں بلکہ اور کوئی قرینہ اُس کے قائم مقام ہو۔

بعض صوفیاء سے منقول ہے کہ جب اُن کے پاس کوئی ہدیہ آتا اور اُن کو کسی قرینہ سے معلوم نہ ہوتا کہ یہ کس قسم کا ہدیہ ہے تو وہ ہدیہ کرنے والے سے فرماتے ہیں تم کو اللہ تعالےٰ کا واسطہ دیتا ہوں کہ سچ بتلاؤ تمہارے نزدیک میرا اس ہدیہ کو قبول کر لینا اچھا ہے یا رد کر دینا اچھا ہے ؟ وہ قسم کھا کر جو صورت بیان کر دیتا اُس کے موافق عمل کرتے تھے اور اُن کے اس فعل کا منشا دعوے سے بچنا تھا اگرچہ وہ بڑے صاحب کشف بزرگ ہوتے تھے، لیکن محض اپنے کشف کی بنا پر کسی کا ہدیہ رد نہ کرتے تھے تاکہ دعوے کی صورت نہ ہو جائے بلکہ ہدیہ دینے والے کی قسم پر عمل کرتے تھے۔

قولہ منہا جواز طلب الاشیاء للبیع الی قولہ وان کان علی مادوی عنہ من اھل الکشف والاطلاع ۔

ف ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ کو بہت بے تکلف کر دیا تھا جیسا واقعاتِ صحابہ سے واضح اور روشن ہے۔ اس لیے آپؐ کسی چیز کو خریدنا چاہتے اور صحابہ اس کو ہدیہ کر دیتے تو اس میں خلاف خلوص کا شُبہ نہ ہوتا تھا۔ مگر آجکل مشائخ نے اپنے مریدوں کو بے تکلف نہیں بنایا وہ اگر کسی مرید سے یہ کہیں گے کہ اپنی فلاں چیز ہمارے ہاتھ بیع کر دو اور وہ کہہ دے کہ نہیں حضور میں اس کو ہدیہ کرتا ہوں تو وہ محض شرما شرمی ایسا کہتا ہے دل سے نہیں کہتا۔ الا ماشاءاللہ پس اُن کو اس حدیث پر عمل اُس وقت جائز ہے جبکہ مریدوں کو اپنے سے ویسا ہی بے تکلف بنا دیں جیسا حضورؐ نے صحابہ کو بنا دیا تھا۔

ف ۔ ہدیہ میں خلوص اور محبت کی تحقیق ضروری ہے۔ ہر ہدیہ کو بلا تحقیق قبول نہ کرنا چاہیئے۔ ورنہ لوگ حریص اور دُنیا دار مشہور کر دیں گے جس سے فیضِ عام میں کمی ہو جائے گی اور اپنا نفس بھی حریص ہو جائے گا۔ اگر کوئی اور صورت تحقیق کی نہ ہو تو اپنے قلب سے رجوع کرنا چاہیئے۔ جس ہدیہ کو دل قبول کرے لے لیا جائے ورنہ رد کر دیا جائے۔

تحقیق خلوص کی ایک صورت وہ بھی ہے جو یہاں ایک بزرگ سے منقول ہے مگر یہ اُس زمانے میں مفید تھی جب ہدیہ کرنے والے سچے ہوتے تھے وہ قسم دینے کے بعد جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ صاف کہہ دیتے تھے کہ حضرت واقعی میرے ہدیہ کا قبول کرنا آپ کے حق میں اچھا نہیں۔ آجکل ایسے سچے مرید کہاں ؟

(۲۱۴) سعید ازلی کو فتنہ مضر نہیں

یہاں اس پر بھی اشارہ ہے کہ جو شخص ازل میں سعید ہو چکا ہے اُس کو ان فتنوں سے کچھ ضرر نہیں ہوتا جو اُس پر گزرتے رہتے ہیں۔ دیکھو اس قطعۂ زمین کے لیے (جس میں مسجد نبویؐ بنائی گئی) یہ سعادت عظمیٰ مقدر ہو چکی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد بنائی جائے گی اسی میں آپؐ کا نزول ہو گا اسی میں آپؐ کی قبر شریف ہو گی تو اس کو مشرکین کے قبضہ میں رہنے اور اُن کی خلافِ شرع حرکات کا مورد بننے اور اُن کی قبرگاہ ہونے سے کچھ ضرر نہیں پہنچا (اسی لیے کہا گیا ہے) جب انجام اچھا ہو جائے تو ہر بُرائی جاتی رہتی ہے اور اگر انجام بُرا ہو تو ہر اچھی حالت بدل جاتی ہے۔ قولہ وھذا اشارۃ الی قولہ فکل یحول ۔

ف ۔ یہی وہ منزل ہے جس سے ہر عارف لرزاں ترساں ہے سب کو عاقبت حسنیٰ کی طلب ہے اور اس سے پہلے وہ اپنی کسی حالت سے مطمئن نہیں ہوتے اللہ تعالےٰ ہمیں اور تمہیں حسن ختام اور عاقبت حسنیٰ سے سرفراز فرمائیں۔ آمین !

(۲۱۵) ہر کام اپنی وسعت کے موافق کرنا چاہیئے

یہاں سے معلوم ہوا کہ عمل کی خوبی یہ ہے کہ

انسان اپنے ہر کام میں وسعت کے موافق عمل کرے اگر غنی ہو تو غنا کے موافق عمل کرے۔ تنگدست ہو تو تنگدستی کے موافق عمل کرے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات مہاجرین اپنے وطن اور مال کو چھوڑ کر مدینہ پہنچے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد بنانے کی ضرورت ہُوئی تو آپؐ نے اُس وقت کی حالت کے موافق کام کیا کہ مسجد کو کچی اینٹوں سے بنایا۔ چھت میں کھجور کی شاخیں لگائیں اور کھجور کی کڑیوں سے ستون قائم کئے اُن ہی کو دیوار میں اُوپر تلے لگوایا جیسا قصعت النخل قبلة المسجد سے ظاہر ہو رہا ہے۔ پکی اینٹوں یا چُونہ وغیرہ سے نہیں بنایا نہ کسی قسم کا تکلف کیا جو آپ پر یا دُوسروں پر گرانی کا سبب ہوتا۔ سُنّت کا مقتضاء یہی ہے اور کتاب اللہ بھی اسی کی تائید کرتی ہے لینفق ذو سعة من سعته ہر شخص کو اپنی وسعت کے موافق خرچ کرنا چاہیئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے "خرچ میں آسان روش اختیار کرنا زیادہ کمانے سے بہتر ہے۔" قولہ دلیل علی ان من حسن التصرف الی قولہ من الزیادة فی الکسب۔

ف۔ حضرات صوفیاء کا یہ خاص مذاق ہے کہ ہر حالت میں ہمت اور وسعت کے موافق کام کرتے ہیں اُس سے زیادہ کا تکلف نہیں کرتے۔ دُنیا و آخرت دونوں کی راحت اسی میں ہے۔ مال زیادہ ہو اور خرچ بے تُکا ہو تو راحت نہیں مل سکتی۔ اگر خرچ اندازہ سے ہو اور آمدنی قلیل ہو تو راحت ہی راحت ہے۔ اہل اللہ کی حالت کا مشاہدہ اس کی دلیل ہے کہ اُن کے برابر دُنیا کی راحت بھی کسی کو نہیں۔

(۲۱۶) انسان کو دین کا اہتمام زیادہ ہونا چاہیئے

یہاں سے معلوم ہُوا کہ انسان کو زیادہ اہتمام اپنے دین کا ہونا چاہیئے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچ کر سب سے پہلے جس چیز پر نظر کی وہ مسجد تھی (کہ اپنے مکانات بنانے سے پہلے آپؐ کو مسجد بنانے کا فکر ہُوا) جو آخرت کا کام تھا (اور دینی ضرورت تھی)۔

یہاں سے اُن فقراء کے قول کی دلیل بھی معلوم ہو گئی جو فرماتے ہیں کہ جب درویش

زہد اختیار کرے اور اپنی تمام مملوکات کو خیرات کرنے کا ارادہ کرے تو جو چیزیں دین کے لیے ضروری ہیں وہ اس سے مستثنیٰ ہوں گی اُن کو ملک سے نکالنا جائز نہ ہو گا۔ بلکہ قدر ضرورت کا رکھنا واجب ہے جیسے وضو کا برتن اور بدن چھپانے کے لیے کپڑا اور جانماز وغیرہ۔ کیونکہ جن چیزوں کے نکال دینے سے دین کا کوئی کام دشوار ہو جائے اُن کو مِلک سے نکالنا جائز نہیں۔ دین تمام چیزوں میں اہم اور اقدم ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے تم دین کی فکر رکھو اور اُس کے سوا کسی چیز کی پرواہ نہ کرو کیونکہ انسان کی عزّت دین ہی سے ہے اور کسی چیز سے نہیں۔

قولہ وفیہ دلیل علی ان اھم ما علی المرأ النظر فی امر دینہ الی قولہ لا بما سواہ۔

ف۔ شاید کسی کو شُبہ ہو کہ آج کل تو دین سے عزّت نہیں بلکہ دُنیا میں مال سے عزّت ہے جواب یہ ہے کہ اب بھی دین ہی سے عزّت ہے بشرطیکہ دین ہو محض دین کی صُورت نہ ہو۔ دین اخلاص کا نام ہے اہلِ اخلاص کی اب بھی عزّت ہے اور ہر زمانہ میں رہے گی اور جن اہلِ دین کو تم ذلیل دیکھتے ہو اُن میں دین کی صُورت ہی صورت ہے۔ اور وہ بھی ناقص۔ اگر اُن میں حقیقی دین ہوتا ہرگز ذلیل نہ ہوتے۔ وللہ العزة ولرسولہ وللمؤمنین ولکن المنافقین لا یعلمون۔



حدیث

خروج الدجال وفتنہ

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دجال مدینہ کے ایک سنگستان میں (مدینہ سے باہر) پڑاؤ کرے گا۔ اُس وقت اُس کے پاس ایک شخص جو سب آدمیوں سے اچھا ہوگا یا فرمایا اچھے لوگوں میں سے ہو جائے گا اور (اس کے مُنہ پر) کہے گا میں گواہی دیتا ہوں کہ تُو وہی دجال ہے جس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دی تھی۔ دجال (لوگوں سے) کہے گا بتلاؤ اگر میں اس کو مار ڈالوں اور پھر زندہ کر دوں کیا اس کے بعد بھی تم میرے معاملے میں شک کرو گے۔ سب کہیں گے نہیں چنانچہ وہ اس کو قتل کر دے گا۔ پھر زندہ بھی کر دے گا۔ تو وہ شخص زندہ ہو کر کہے گا بخدا آج سے پہلے مجھے تیرے معاملے میں اس قدر بصیرت نہ تھی جتنی اب ہے (میں پہلے سے زیادہ وثوق کے ساتھ آج پھر کہتا ہوں کہ تو کذاب ہے) دجال کہے گا اچھا میں اس کو پھر قتل کرتا ہوں مگر اب اُس کو اس شخص (کے قتل) پر دسترس نہ ہو گی۔

شرح حدیث کا ظاہری مفہوم دو باتیں ہیں ایک یہ کہ دجال کو جو خرق عادات عطا کئے گئے ہیں وہ خود اُس کے دعوے کی تکذیب کرتے ہیں۔ کیونکہ اُس کے خرق عادات اُس کے دعوے کو پُورا کرنے سے قاصر ہوں گے (چنانچہ وہ اس شخص کے دوبارہ قتل کرنے کا دعوے کرے گا مگر اُس پر دسترس نہ ہو گی اپنا سا

مُنہ لے کر رہ جائے گا) دوسرے اس شخص کی قوتِ ایمان معلوم ہو گئی جو دجال کے پاس جائے گا (اور اُس کے منہ پر تکذیب کرے گا) دجال کا اتنا بڑا فتنہ اُسے کچھ ضرر نہ دے سکے گا۔ اس حدیث کے معانی پر چند وجوہ سے کلام ہے۔

(۲۱۷) خرق عادت کی تقسیم اور معجزہ وکرامت اور شعبدہ وسحر میں فرق

حضرات علماء نے فرمایا ہے کہ خرق عادت کی چار قسمیں ہیں: ایک قسم وہ ہے جو دعوئے نبوّت کی سچائی پر دلالت کرے۔ اس کا تو بستر لپیٹ دیا گیا (اب ایسی خرق عادت ظاہر نہیں ہو سکتی جو صدق نبوت پر دلالت کرے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں) مگر ہم اس کو محض معرفت کی غرض سے بیان کرتے ہیں کیونکہ اس کا علم بھی دین ہے۔ ایک قسم وہ ہے جو ولایت پر اور اُس کے تحقق پر دلالت کرے۔ ایک وہ قسم ہے جو محض مجاہدات و ریاضات کا ثمرہ ہے اگرچہ مجاہدہ کرنے والا فاسق اور کافر ہی ہو۔ اس قسم سے بہت لوگ بوجہ جہالت کے فتنہ میں پڑ جاتے ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس کو سیمیا کہتے ہیں جس کی حقیقت یہ ہے کہ بعض ارواح کو بُلایا جاتا ہے اور بعض ستاروں کو مسخر کیا جاتا ہے۔ اس سے بہت لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں (وہ ایسے لوگوں کو بزرگ سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ اِس کو بزرگی سے دُور کا بھی واسطہ نہیں)۔

ان میں سے ہر قسم کی ایک علامت ہے جس سے پہچاننے والا پہچان لیتا ہے۔ مگر وہی پہچانتا ہے جس کے دل میں نورِ ایمان ہے اور ان اقسام کو جانتا ہے۔ چنانچہ پہلی قسم کی جو نبوت پر دلالت کرنے والی ہے علامت یہ ہے کہ اُس کے ساتھ تعدی بھی ہوتی ہے یعنی خرق عادت ظاہر کرنے والا یہ دعوی کرتا ہے کہ میں نبی ہوں اور میری نبوت کی دلیل یہ ہے کہ میں ایسا ایسا کر سکتا ہوں (جو دُوسرا کوئی نہیں کر سکتا اگر کسی کو نبوت میں شک ہو تو میرا مقابلہ کر کے دکھلائے) اس کے بعد جیسا اُس نے دعوے کیا تھا اُس کے مطابق ظہور ہو جائے (اور کوئی اُس کا مقابلہ نہ کر سکے) مگر

اب کسی کو اس قسم کا دعوے کرنے کی گنجائش نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما چکے ہیں لا نبی بعدی (کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں) اور یہ حدیث تواتر سے ثابت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا نبی ہونا دلائل عقل ونقل سے ثابت ہو چکا ہے تو حضورؐ کے بعد جو کوئی بھی دعوئے نبوت کرے یقیناً جھوٹا ہے اور اس دعوے کے بعد اُس کے ہاتھ سے کوئی خرق عادت ظاہر نہیں ہو سکتی بلکہ جن چیزوں کو وہ خرق عادت قرار دے گا اُنہی سے اُن کا جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے گا (جیسا پنجاب میں ایک مدعی نبوت اسی قریب زمانہ میں ہُوا تھا اور اُس نے اپنی پیشین گوئیاں سچا ہونے کو معجزہ قرار دیا تھا مگر دُنیا جانتی ہے کہ اس کی صدہا پیشین گوئیاں غلط ہُوئیں اور جن لوگوں نے اُس کے مقابلے میں پیشین گوئیاں کیں اُن کی اکثر باتیں صحیح ہوئیں)۔

دوسری قسم جو صدق ولایت پر دلالت کرتی ہے وہ ولی کے ہاتھوں بدون تعدی اور دعوئی کے ظاہر ہوتی ہے اُس کی شرط یہ ہے کہ اس شخص کی حالت سُنت کے موافق ہو اتباع سنت کا اہتمام کرتا ہو کیونکہ حق تعالےٰ کسی بدعتی کو ولی نہیں بناتے چنانچہ ارشاد ہے قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تعالےٰ تم سے محبت کریں گے اور اگر ولی کسی وقت بوجہ ضرورت کے کرامت کا دعوے کرے عجب و پندار شامل نہ ہو تو اللہ تعالےٰ اُس کے دعوئی کو پُورا کر دیتے ہیں کیونکہ ولی کی کرامت تصدیق نبوت کی برکت ہے۔ جو کرامت بھی کسی ولی سے ظاہر ہوتی ہے وہ اُس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے کیونکہ یہ خیر اُس کو صدق اتباع سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ اس کی مثال میں ایک واقعہ کا ذکر مناسب ہے کہ ایک بزرگ (حج کے ارادہ سے) سمندر (میں جہاز) پر سوار ہوئے اُن کے ساتھ اور بھی حاجی سوار ہو گئے اُس جہاز میں بادشاہ کا گیہوں بھرا ہُوا تھا اچانک سمندر میں طوفان آگیا جہاز والوں نے باہم مشورہ کیا کہ غلّہ تو شہادت کے ذریعہ ناپ تول کر بھرا گیا ہے اور یہ حاجی اپنے اختیار سے سوار ہو گئے ہیں ہمارے اُوپر ان کی ذمہ داری نہیں تو (جہاز کو ہلکا کرنے

کے لیے) ان حاجیوں کو سمندر میں پھینک دینا چاہیئے۔ گیہوں کو بچا لینا چاہیئے کہ اُس کا ہم سے مطالبہ ہوگا۔ یہ بات ان بزرگ کے کان میں پہنچی۔ جب آپ نے دیکھا کہ ان لوگوں نے یہ ارادہ پختہ کر لیا ہے تو جہاز والوں سے فرمایا کہ تم (جہاز کو ہلکا کرنے کے لیے) گیہوں پھینک دو۔ اُس (کے پُورا کرنے) کا میں ذمہ دار ہوں چنانچہ اُنہوں نے جتنی مقدار کم کرنا چاہی سمندر میں پھینک دی جس کو اللہ ہی جانتا ہے۔ پھر سمندر کو سکون ہو گیا اور منزل مقصود پر سلامتی سے پہنچ گئے تو اب ان بزرگ سے گیہوں کا مطالبہ کیا فرمایا وہ شہادت نکالو جس میں گیہوں کی مقدار لکھی ہوتی ہے اس کے بعد بقیہ گیہوں کو پیمانہ سے ناپو جتنا کم ہو گا اُس کا میں ضامن ہوں چنانچہ پیمانہ سے غلہ ناپا گیا تو اُس مقدار سے بھی زائد تھا جو شہادت میں لکھی ہوئی تھی اور بزرگ کو چھوڑ دیا گیا۔

اُس وقت اُنھوں نے اپنے دوستوں سے فرمایا کہ واللہ میں نے یہ کرامت محض ضرورت کی وجہ سے ظاہر کی ہے کہ مُسلمانوں کی جان کا بچانا لازم تھا (تو ایسی صُورت میں ولی کو کرامت کا دعویٰ جائز ہے) اور اگر کوئی [illegible] بلا ضرورت کے کرامت کا دعوے کرے وہ اہلِ طریق کے نزدیک اولیاء میں سے نہیں بلکہ اُن لوگوں میں سے ہے جن کے متعلق ارشاد ہے سنستدرجھم من حیث لا یعلمون۔ ہم اُن کو اس طرح آہستہ آہستہ پکڑتے ہیں کہ اُن کو معلوم بھی نہیں ہوتا (کہ یہ کرامت ہمارے واسطے لطف نہیں بلکہ قہر ہے اسی کا نام استدراج ہے) اللہ تعالےٰ کے یہاں اُن کا حصّہ یہی ہے (کہ چند کرامات کا اُن سے ظہور ہو گیا) حضرات صوفیاء نے تصریح کی ہے کہ جو شخص اس لیے عبادت کرے کہ اُس سے کرامات ظاہر ہوں یا اُس کی دُعا قبول ہونے لگے یا دُنیا میں اس کا درجہ بلند ہو جائے بزرگ مشہور ہو جائے تو یہ اُن لوگوں میں سے ہے جو اللہ تعالےٰ کی عبادت ایک کنارہ پر کھڑے ہو کر کرتے ہیں (اُن کو دربار تک رسائی نہیں ہوتی)۔

اور تیسری قسم جو مجاہدات کی وجہ سے ہو کیونکہ مجاہدات وریاضات سے بھی

خوارق عادات کا ظہور ہونے لگتا ہے۔ مگر وہ نافذ نہیں ہوتیں (یعنی اُن کی تاثیر کرامت
ولی کی طرح کامل نہیں ہوتی اُن سے اس شخص کی وہ عظمت وصولت ظاہر نہیں ہوتی
جو کرامت ولی میں ہوتی ہے) اور نہ اُن کا کشف نگاہ کی مسافت سے آگے بڑھتا
ہے یہ قسم کافر و مومن دونوں میں پائی جاتی ہے کیونکہ یہ تو محض مجاہدہ کا اثر ہے۔
نفس مجاہدہ و ریاضت سے بھی باطن منور ہو جاتا اور قلب صاف شفاف آئینہ کی
طرح ہو جاتا ہے جس میں ہر چیز منقش ہو جاتی ہے جو اُس کے سامنے آجائے اور
جو سامنے نہ آئے وہ منقش نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ایک بڑے بزرگ کا واقعہ ہے کہ
وہ سفر میں ایک گرجا پر گزرے جہاں بہت سے راہب رہتے تھے۔ انہوں نے
اُن کے مجاہدات کو دیکھا تو دل میں خیال آیا کہ یہ لوگ خوب مجاہدہ کرتے ہیں یہ خیال
آنا تھا کہ راہبوں نے فوراً خادم سے کہا کہ آپ کی خاطر کرو اچھی طرح میزبانی کرو اور
عبادت خانہ میں جہاں بُت رکھے ہوئے ہیں ٹھہراؤ۔

اُس نے ان بزرگ کو بُت خانہ میں پہنچایا تو دل میں ان لوگوں کی حماقت اور
نادانی کا خیال آیا کہ سارے مجاہدے ان بتوں کی پرستش کے واسطے کر رہے ہیں۔
یہ خیال آنا تھا کہ دفعتہً سب راہب چلائے اس کو نکال دو باہر کر دو یہاں مت
ٹھہراؤ۔ بزرگ کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ لوگ اتنی جلدی دل کے خطرہ پر مطلع ہو گئے
مگر ان لوگوں کا مکاشفہ نگاہ کی مسافت سے آگے نہیں بڑھتا اور اگر ایمان و اتباع
سنت کے ساتھ مجاہدہ کیا جائے تو عرش اور عرش کے نیچے تک کا کشف ہونے
لگتا ہے (بشرطیکہ کشف سے مناسبت ہو کیونکہ بعض طبائع کو کشف سے مناسبت نہیں
ہوتی تو اُن کو اصلاً کشف نہیں ہوتا خواہ کتنے ہی مجاہدے کریں۔ جیسے بعض لوگوں کو
خواب سے مناسبت نہیں ہوتی تو ہزار تدبیروں سے بھی خواب نہیں آتا خوب سمجھ
لو) متبع سُنت مجاہدہ کرے تو ساری دُنیا اُس کے نزدیک ایک قدم کے برابر
ہو جاتی ہے جس میں وہ جس طرح چاہے تصرّف کر سکتا ہے جتنا بھی حق تعالےٰ
اُس پر دروازہ کھول دیں۔

چوتھی قسم جس کو سیمیا کہتے ہیں جس میں ارواح کو حاضر کیا جاتا یا بعض ستاروں کو
مسخر کیا جاتا ہے اُس کی بھی چند علامتیں ہیں۔ جو لوگ ستاروں کو مسخر کرتے ہیں اُن میں
ہر ستارہ کی پرستش کرنے والے کی ایک علامت ہے جس سے اس کو پہچان سکتے ہیں۔
مثلاً جو شخص ستارۂ زحل کی پرستش کرتا ہے اُس کا لباس خراب خستہ گندہ ہوتا ہے۔
اُس کی زندگی اور نشست و برخاست بھی گندی ہوتی ہے ناواقف آدمی اُس کی یہ حالت
دیکھ کر سمجھتا ہے کہ بڑے زاہد متقی ہیں عیش و آرام سے نفور ہیں حالانکہ اس میں زہد و
ورع کا کچھ دخل نہیں۔ یہ حالت صرف اُس ستارہ کی وجہ سے ہے جس کی وہ پرستش
کر رہا ہے اور جب تک اُس کے معبود کا دورہ رہے گا جو اُن کے خیال میں چھتیس سال
ہے اُس وقت تک اسی حالت پر رہے گا۔ اس میں کمی نہیں کر سکتا۔ اگر ایک ساعت
بھی اُس میں کمی کرے گا سارا کیا کرایا عمل برباد ہو جائے گا۔ اسی طرح ہر ستارہ کی
پرستش کا ایک نشان ہے مگر ستارہ زحل کا عابد اُن کے نزدیک سب سے زیادہ منحوس
حالت میں رہتا ہے۔ اور جو شخص ارواح کو حاضر کرتا ہے اُس کا حال اس کے
برعکس ہوتا ہے اُس کا لباس بھی عمدہ صاف سُتھرا ہوتا ہے اور ہر حالت میں انشراح و
انبساط سے رہتا ہے۔ اس کی نشست و برخاست بھی عمدہ طور سے ہوتی ہے۔
مگر ہر حالت میں ان سب کا مقصود حظ نفس اور طلب جاہ اور مخالفت سنت اور
بدعات کا ایجاد ہے جن کے ذریعے عوام کو اپنی طرف مائل کرتے اور اس کو طریق
حکمت و معرفت اور ریاضت و مجاہدہ بتلاتے ہیں حالانکہ یہ سب اس کے برعکس
طریق ضلالت و جہالت میں داخل ہیں۔ خدا ہم کو اس سے بچائے۔

الغرض جس خرق عادت کے ساتھ اتباع شریعت کی حکومت نہ ہو وہ ہر جہت
سے نافذ نہیں ہوتی (صرف ایک جہت سے نافذ ہوتی ہے) اور جب اُس کے
مقابلہ میں صاحبِ حقیقت آجاتا ہے تو اُس کے سامنے اُس کی کچھ نہیں چلتی۔ اُس
کا عمل دشوار ہو جاتا یا بہت کم چلتا ہے جیسی صاحبِ حقیقت کی ایمانی قوت ہو گی
اسی قدر [illegible] جائے گا۔ اسی لیے یہ لوگ عموماً جاہلوں سے

زیادہ ملتے ملاتے (اور اُن ہی کو اپنے جال میں پھانستے ہیں) اہلِ علم واہلِ صلاح سے دُور رہتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے سامنے اُن کا علم نہیں چلتا) اور جس شخص کو اتباعِ سنت کے ساتھ خرقِ عادت عطا ہوتا ہے وہ شاہانہ حالت میں رہتا ہے۔ کسی حیلہ اور مکر سے یا کسی مادی اور غیر مادی طاقت سے اُس کو مغلوب نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی حالت روزانہ ترقی پذیر ہوتی ہے گھٹتی نہیں۔ تمام آدمی اور سارا عالم وجود اُس کے نزدیک ایک حد پر ہیں (وہ سب کو لاشئ اور ناقابلِ اعتبار سمجھتا ہے کسی سے اللہ تعالےٰ کے سوا نہیں ڈرتا) جس طرح چاہتا ہے جس چیز میں چاہتا ہے تصرف کرتا ہے مگر دعوےٰ نہیں کرتا۔ اگر کبھی دعوےٰ کرتا ہے تو اپنی طاقت وقوت سے بیزاری ظاہر کر کے اللہ کی طاقت وقوت پر بھروسہ کر کے دعویٰ کرتا ہے۔ اس کو سب سے زیادہ اپنے اُوپر اندیشہ ہوتا ہے (کہ مبادا دربارِ حق سے مردود نہ ہو جاؤں) ہاں جب اُس کے پاس اللہ تعالےٰ کی طرف سے بشارتیں آتی ہیں (اس وقت خوش ہوتا ہے) اس کی علامت یہ ہے کہ سب سے زیادہ متواضع ہوتا ہے اور سب سے زیادہ لوگوں کا عُذر قبول کرتا ہے مگر جبکہ دین کا معاملہ ہو تو اُس وقت تواضع سے کام نہیں لیتا بلکہ سیاست سے کام لیتا ہے۔ مگر دل میں اپنے کو دُوسروں سے کمتر ہی سمجھتا ہے۔ گو ظاہر میں حکومت وسیاست کرتا نظر آئے) وہ سب سے زیادہ مخلوقِ خدا پر شفقت کرنے والا ہوتا ہے اپنے کو کمتر جانتا ہے۔ اُس کے پاس جو خیر بھی ہے (خواہ کرامات ہوں یا کمالات) سب کو اللہ تعالےٰ کی عطا اور احسان سمجھتا ہے اپنا کوئی استحقاق نہیں سمجھتا۔

لوگوں کو اتباعِ سُنت کی ترغیب دیتا ہے (اور خود بھی سنتوں کا اہتمام کرتا ہے) خاموش زیادہ رہتا ہے ضرورت کے وقت بولتا ہے۔ بہت ہوشیار ہوتا ہے لوگوں سے طمع نہیں رکھتا۔ آخرت کا خیال ہر وقت دل کے سامنے رہتا ہے۔ کسی پر اپنا کوئی حق نہیں سمجھتا۔ دُوسروں کے حقوق اپنے ذمے بہت سمجھتا ہے سامنے بھی اور پیچھے بھی بشرطیکہ اخوتِ ایمان موجود ہو (یعنی ایمان کی وجہ سے وہ ہر مُسلمان کا اپنے ذمہ حق سمجھتا ہے) مدح وثناء سے بھاگتا ہے (نفرت کرتا ہے) تنہائی اور خلوت سے

مانوس ہوتا ہے۔ احسان کرتا رہتا ہے ایذا رسانی کم کرتا ہے بلکہ نہیں کرتا۔ ہر چیز اُس سے محبت کرتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ زمین بھی جس پر چلتا ہے اور آسمان بھی جو اُس پر سایہ کرتا ہے۔ اسی طرح زمین وآسمان کی مخلوقات بھی۔ آسمان والے اُس کو زمین والوں سے زیادہ پہچانتے ہیں۔ وہاں یہاں سے زیادہ مشہور ہوتا ہے۔ خبیث مال نہیں کھاتا۔ نہ بُری باتیں سُنتا ہے۔ اُس کو گنہگار کی معصیت سے ایسی تکلیف ہوتی ہے جیسے خود اُس نے گناہ کیا ہے۔ نیک آدمیوں کی طاعات سے ایسی خوشی ہوتی ہے جیسے اسی کو اس کا ثواب ملے گا۔ ظاہری صُورت میں آدمی ہوتا ہے مگر باطن میں فرشتہ نورانی مقدس ہوتا ہے۔

اس کے اوصاف کہاں تک بیان کئے جائیں اس کے لیے تو دفتر بھی کافی نہیں۔ اللہ تعالےٰ ہم کو بھی اپنے فضل وکرم سے وہ نعمتیں عطا فرمائیں جو اپنی رحمت سے اُن کو عطا فرمائی ہیں اور اُن کے طفیل میں ہم پر بھی رحم فرمائیں۔ وصلی اللہ علی محمد نبیہ وعبدہٖ۔

غرض چُونکہ اکثر لوگ اہلِ طریق سے ناواقف ہیں۔ جہل غالب ہو رہا ہے اس لیے جس سے بھی کوئی خرقِ عادت دیکھتے ہیں خواہ کسی قسم کی ہو اُس کو بزرگ کہنے لگتے ہیں یا ان مفسدوں کے فساد کی باتیں سُنتا ہے تو اہلِ حقیقت پر بھی طعن کرنے لگتا (اور اُن کی کرامات کو بھی شعبدہ اور فریب کہنے لگتا) ہے اس طرح ان کی برکت سے محروم ہو جاتا ہے کیونکہ وہ دو حال سے خالی نہیں اگر یہ احتیاط سے کام لے گا تو اُن کی حالت کو محتمل سمجھے گا۔ (کہ نہ معلوم یہ کرامت ہے یا شعبدہ) یا ان کو اہلِ فساد میں داخل کرے گا۔ اس صُورت میں حرمان کے ساتھ خسارہ بھی ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اپنے دوستوں کے لیے بہت غیرت آتی ہے (وہ اُن کے بُرا بھلا کہنے والوں کو سخت سزا دیتے ہیں) چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے من اھان لی ولیا فقد بادزنی بالمحاربۃ۔ جس نے میرے ولی کی اہانت کی اُس نے مجھے اعلانِ جنگ دیا ہے۔ قولہ فاما خرق العادۃ فقد تکلم العلماء علیہ وھو علی اربعۃ اقسام الیٰ قولہ فقد بادزنی بالمحاربۃ۔

ف ۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ نفس مجاہدہ سے بھی باطن منور ہو جاتا ہے اور قلب بمثل صاف شفاف آئینہ کے ہو جاتا ہے۔ یہاں حضرت شارح نے لفظ باطن اور قلب کو لغوی معنی میں استعمال کیا ہے۔ ورنہ قلب اصطلاحی کو بدون ایمان کے نورانیت نصیب نہیں ہوتی۔ نفس مجاہدہ سے صرف لطیفۂ نفس کی صفائی ہو جاتی ہے جو مادی ہے اور قلب و روح اور سر وخفی و اخفیٰ جو غیر مادی جواہر ہیں بدون ایمان کے منور نہیں ہو سکتے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات میں اس کی تصریح فرمائی ہے۔ یہ لطائف غیر مادیہ بدون معرفت حق کے منور نہیں ہوتے اور معرفتِ حق بدون اسلام کے نہیں ہو سکتی خوب سمجھ لو۔

ف ۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ اہلِ حقیقت کے سامنے اہلِ باطل کی کچھ نہیں چلتی ہم نے اپنے اکابر میں اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ ایک دفعہ مسلمانوں اور آریوں میں مناظرہ تھا ہندوؤں کی طرف سے ایک جوگی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جس وقت مسلمانوں کی طرف سے مناظرہ کے لیے کوئی عالم کھڑا ہوتا وہ جوگی سر جھکا لیتا اور مسلمان عالم کی تقریر کمزور ہو جاتی اس کیفیت کو ایک صاحبِ دل نے بھانپ لیا اور سیدی حضرت مولوی خلیل احمد صاحب قدس اللہ سرہ کو اطلاع دی۔ اب حضرت نے بھی اپنا سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ وہ جوگی کرسی چھوڑ کر بھاگا پھر جلسہ میں آخر تک نہ آیا۔ اور علماءِ اسلام کی تقریریں زور دار ہونے لگیں۔ کفار کے مناظر مغلوب ہو گئے اور مسلمان مظفر و منصور واپس آئے۔

اسی طرح ایک جوگی نے ریل میں حضرت مولانا موصوف کے ایک مرید پر تصرف کیا جس سے اُن کے دل میں وساوس شیطانی آنے لگے اور وہ اس قدر پریشان ہوئے کہ چلتی ریل سے کودنے کا قصد کیا۔ دفعتہً حضرت مولانا کی صورت سامنے نظر آئی کہ فرما رہے ہیں کہو حسبنا اللہ و نعم الوکیل۔ یہ کہنا تھا کہ تمام وساوس کافور ہو گئے اور جوگی کا تصرف باطل ہو گیا وہ خود کہنے لگا کہ تمہارا پیر بڑا کامل ہے اب تو اُنہوں نے جوگی کو بہت برا بھلا کہا اور وہ نادم ہو کر خاموش ہو گیا۔

اسی طرح حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائپوری اور حضرت مولانا حکیم الامۃ تھانویؒ کے سامنے بھی جوگیوں اور شعبدہ بازوں کی کچھ نہیں چلتی تھی اور مجبور ہو کر اُنہیں ماننا پڑتا تھا کہ یہ لوگ اہلِ حق ہیں اُن کی باتوں میں نورانیت ہے۔ مجھ سے خود بعض ہندوؤں نے ان حضرات کے کمال کا تذکرہ کیا اور اسلام قبول کیا۔ بحمد اللہ ان حضرات کے خدام میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جن کے سامنے اہلِ باطل کے تصرفات نہیں چل سکتے اور ان کو مغلوب ہو کر اہلِ حق کے کمال کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کیونکہ مجاہدہ و ریاضت کا اتنا اثر ضرور ہوتا ہے کہ وہ انصاف سے کام لیتے ہیں جھوٹ نہیں بولتے۔

ف ۔ متبع سنت صاحبِ کرامت کی جو علامات یہاں بیان کی گئی ہیں الحمد للہ ہم نے اپنے اکابر میں اُن کا ظہور بدرجۂ اتم پایا ہے۔ دُنیا اُن کے اتباعِ سُنت و زہد و ورع اور تقویٰ اور خشیت و شفقت علی الخلق سے واقف ہے۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے دیکھنے والے ہزاروں لاکھوں موجود ہیں وہ اس کی شہادت دیں گے۔ اس زمانے میں ان اوصافِ کمال کی جامع ہستی حضرت ہی کی ذات تھی نور اللہ مرقدہ۔

(۲۱۸) جس کا ایمان قوی ہوتا ہے وہ بدعات کا تحمل نہیں کر سکتا

یہاں سے معلوم ہوا کہ جس شخص کا ایمان قوی ہوتا ہے وہ بدعات کا تحمل نہیں کر سکتا۔ نہ اُن پر سکوت کر سکتا ہے۔ دیکھو یہ شخص جس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہترین ہونے کی شہادت دی ہے حالانکہ جانتا تھا کہ دجال مدینہ کے اندر نہیں آ سکتا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ تنہا اُس کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا۔ پھر بھی قوتِ ایمان نے اُس کو دجال کے پاس جانے اور اُس کی جماعت میں موجودگی میں اُس کو جھوٹا کہنے پر مجبور کیا۔ اگرچہ وہ یہ بھی نہ جانتا تھا کہ ایسا کرنے کے بعد بچ کر آئے گا یا نہیں؟ قوتِ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے حکم پر قائم رہے اگرچہ تنہا ہی رہ گیا ہو۔ جیسا ابوبکر صدیق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کیا۔ جبکہ بعض لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور (صحابہ کی (عام) لائے یہ ہوئی کہ

اس وقت ان لوگوں سے چشم پوشی کی جائے (سختی نہ کی جائے کیونکہ روم و فارس کا خطرہ سر پر موجود تھا) مگر صدیق اکبرؓ نے اپنے خطبہ میں فرمایا کہ میں ان سے ضرور مقابلہ کروں گا اگرچہ میرے ساتھ ہُوا ہی ہوا اور کچھ نہ ہو (یہ لفظ دبور کا ترجمہ ہے اور بعض نے اس کو تشدید سے پڑھا ہے جس کے معنی زنبور یعنی بھڑ کے ہیں) حضرت صدیقؓ نے یہ بات پوری بھی نہ کی تھی کہ تمام مسجد ہُوا سے (یا بھڑوں سے) بھر گئی۔ یہاں تک کہ سب لوگ مسجد سے باہر نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب میں نے حضرت صدیقؓ سے یہ بات سُنی تو سمجھ گیا کہ اُن کی رائے حق ہے اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی اُس رائے پر شرح صدر عطا فرمایا جس پر حضرت صدیق کو شرح صدر ہو چکا تھا اور یہاں سے معلوم ہُوا کہ نصرت الٰہی قوتِ ایمان کے موافق ہوتی ہے (جس قدر ایمان قوی ہو گا اسی قدر نصرت قوی ہو گی)۔ قو لہ وفیہ دلیل علیٰ ان من قوی ایمانہ الی قولہ الا بقدر قوۃ الایمان۔

ف ۔ جب کسی بدعت اور منکر پر نکیر کرنے والا کوئی نہ ہو تو قوتِ ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اس وقت یہ نہ دیکھے کہ میں تنہا ہوں، تنہا کیونکر انکار کروں میرے انکار سے کیا فائدہ ہو گا؟ اس وقت بدعت اور منکر پر ضرور انکار کیا جائے تاکہ حق ظاہر ہو جائے گو ہلاکت کا اندیشہ بھی ہو کیونکہ اگر کسی نے بھی انکار نہ کیا تو عام مُسلمان گمراہ ہو جائیں گے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس وقت مسئلہ خلق قرآن کا فتنہ مامون کے زمانے میں پھیلا اور بعض علماء گول مول بات کہہ کر چھُوٹ گئے، بعضوں نے تقیہ کے طور پر مامون کی موافقت میں جواب دید یا تو مجھے بھی خیال ہُوا کہ گول مول بات کہہ کر چھُوٹ جاؤں کہ دفعتہً مجھے معلوم ہُوا کہ لاکھوں مسلمان دربار سے باہر دوات قلم لیے کھڑے ہیں کہ احمد بن حنبل جو کچھ کہیں گے اُسی پر اعتقاد رکھیں گے تو میں نے عزم کر لیا کہ حق کو صاف صاف کہوں گا تاکہ اُمت گمراہی میں مُبتلا نہ ہو چاہے میرا کچھ ہی حشر ہو۔ غرض جب بدعت اور منکر پر صاف صاف نکیر کرنے والا کوئی نہ ہو اُس وقت صاحبِ حق کو اپنی جان کی پرواہ نہ کرنا چاہیئے۔ حق

کو صاف صاف کہنا چاہیئے۔ خُوب سمجھ لو۔

ف ۔ یہاں سے یہ ثابت ہُوا کہ اہلِ بدعت قوتِ ایمان سے محروم ہیں۔ گو اہلِ بدعت میں بعض اہلِ نسبت بھی ہیں۔ مگر اُن کی نسبت میں وہ نور نہیں ہوتا جو متبع سُنت صاحبِ نسبت میں ہوتا ہے۔

(۲۱۹) مُسلمان کی بھلائی قوتِ ایمان کے موافق ہے

یہاں سے معلوم ہُوا کہ مُسلمان کی بہتری (اور اچھائی) قوتِ ایمان کے موافق ہے (جتنا ایمان قوی ہو گا اُسی قدر بہتری ہو گی) جب ایمان قوی ہوتا ہے تو یقین کے ساتھ جان لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو لکھ دیا ہے وہی پیش آئے گا۔ چاہے بیٹھا رہے یا حرکت کرے پس مناسب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس بات کا حکم دیا یا ترغیب دی ہے اُس کو پُورا کیا جائے چنانچہ ارشاد ہے قل لن یصیبنا الا ما کتب اللّٰہ لنا ھو مولانا وعلی اللّٰہ فلیتوکل المؤمنون۔ فرما دیجئے کہ ہم کو اس کے سوا کچھ پیش نہ آئے گا جو اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے وہی ہمارا مددگار ہے اور اللہ ہی پر ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہیئے۔ چنانچہ یہ شخص (جس کا حدیث میں ذکر ہے) تنہا جا کر دجال کی تکذیب کرے گا کہ میں گواہی دیتا ہوں تو وہی دجال ہے (جس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دی ہے) یعنی تو خُدا نہیں جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے بلکہ تو جھُوٹا کذاب ہے اور یہ بہت بڑا مجاہدہ ہے کہ حق بات کہہ دی اور اُس کی پرواہ نہ کی کہ انجام کیا ہو گا؟

آجکل بعض لوگ جو علماء اور دیندار کہلاتے ہیں حق بات کہنا اس خیال سے چھوڑ دیتے ہیں کہ اُس سے دُنیوی ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی حالت کا مشاہدہ کر کے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بدترین لوگ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بھی ہم کو خبر دیدی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا جس میں صُبح کو آدمی مومن ہو گا شام کو کافر ہو جائے گا، شام کو مومن ہو گا صُبح کو کافر ہو جائے گا۔ اپنے دین کو دُنیا کے سامان کے بدلے بیچ دے گا۔ یہ ضرور

نہیں کہ اس سے بالکل ہی کافر ہو جائے بلکہ بعض تو بوجہ مداہنت کے فاسق ہو جائیں گے اور فسق کو بھی کبھی زجراً کفر کہہ دیا جاتا ہے اور بعضے دُنیا کی طمع میں اسلام سے مرتد ہی ہو جائیں گے اعاذنا اللہ من ذلک کلہ) اور یہاں جس شخص کا ذکر ہے وہ اس حدیث کا مصداق ہے لا تزال طائفة من امتی علی الحق ظاهرة الی قیام الساعة لا یضرهم من خالفهم - میری اُمت میں کچھ لوگ حق پر غلبہ کے ساتھ جمے رہیں گے۔ قیامت آنے تک اُن کو کسی مخالف کی مخالفت ضرر نہ دے گی۔

اور یہاں سے معلوم ہوا کہ ایمان مدینہ والوں میں قوی رہے گا اگرچہ بعض میں کچھ گڑبڑ بھی ہو کیونکہ دجال کے مُنہ پر حق بات کہنے والا مدینہ ہی کا آدمی ہوگا۔ اگر اور کسی جگہ بھی دُوسرا ایسا ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی بھی خبر سُنا دیتے۔ قوله وفيه دليل على ان الخيرية هی بقدر الایمان الی قوله لاخبر به صلی اللہ علیہ وسلم۔

ف ۔ بہت سے علماء کا قول یہ ہے کہ دجال کے مُنہ پر حق بات کہنے والے یہ بزرگ حضرت خضر علیہ السلام ہوں گے۔ کیونکہ بعض روایت میں یہ لفظ بھی آیا ہے فیخرج الیه رجل ممن قد رأنی کہ دجال کے پاس ایک شخص میرے دیکھنے والوں میں سے جائے گا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھنے والوں میں سے بجز خضر علیہ السلام کے اور کوئی زندہ نہیں وہی اس وقت تک زندہ رہیں گے واللہ تعالیٰ اعلم۔

خضر علیہ السلام کا نام بلیان بن ملکان ہے کنیت ابو العباس ہے لقب خضر ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ جو اُن کا اور اُن کے باپ کا نام اور اُن کی کنیت اور لقب معلوم کرے اس کا خاتمہ اچھا ہوتا ہے۔ حدیث میں اُن لوگوں کے لیے تسلی ہے جو اللہ تعالےٰ کی توفیق سے حق پر قائم ہیں۔ اگرچہ سارا زمانہ اُن کا مخالف ہو اُن کے لیے نصرت الٰہی کی بشارت ہے۔ کیونکہ جس چیز کی وجہ سے اس بزرگ کی نصرت کی گئی وہ علت یہاں بھی موجود ہے یعنی قوتِ ایمان اور اللہ کی رضا کیلئے حق کو ظاہر کرنا۔

(۲۲۰) ایمانی طاقت ضرورت کے موقعہ پر صرف قدرت پر

بھروسہ کرتی ہے حکمت پر نظر نہیں کرتی

اور یہاں سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے وقت قوتِ ایمان تنہا قدرتِ الٰہیہ پر بھروسہ کرتی ہے۔ قانون حکمت کو کام میں نہیں لاتی گو دل میں قانونِ حکمت اور اثر قدرت دونوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ اس شخص نے قانونِ حکمت سے عدول کیا کہ ایسے کام کے لیے نکل کھڑا ہوا جو اُس کی طاقت سے باہر تھا اور شریعت جو کہ قانونِ حکمت ہے اس سے منع کرتی ہے چنانچہ ارشاد ہے ولا تلقوا بایدیکم الی التهلكة ط اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اور قدرت الٰہیہ کا مقتضیٰ یہ ہے وما هم بضارین به من احد الا باذن الله اور وہ (ساحر کافر) خود کسی کو کچھ ضرر نہیں دے سکتے۔ مگر اللہ کے حکم سے نیز اُس کا مقتضیٰ یہ بھی ہے قل لن یصیبنا الا ما كتب الله لنا۔ کہہ دیجئے ہم کو وہی پیش آئے گا جو اللہ نے ہمارے واسطے مقدر کر دیا ہے۔ چنانچہ سب سے بڑی مصیبت قتل ہے جب اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو مارنا چاہا تو قتل سے اُس کو کچھ ضرر نہ ہوا اور جب دوبارہ اُس کے قتل کا ارادہ کیا گیا تو اللہ تعالےٰ نے محض اپنی قدرتِ کاملہ ظاہر کرنے کے لیے دجال کو اس کے قتل سے روک دیا تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالےٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

رہا یہ کہ پھر پہلی مرتبہ اُس کو قتل پر قدرت کیوں دی گئی تو اس میں بھی اللہ تعالےٰ نے اپنی قدرتِ عظیمہ کو ثابت کیا ہے کیونکہ اگر پہلی بار ہی قتل سے روک دیا جاتا تو کوئی کہہ سکتا تھا کہ دجال نے اُس کو دیکھا نہ تھا یا دیکھا تھا پھر اُس کی نگاہ سے غائب ہو گیا۔ اور کرامت اولیاء میں شمار کر لیا جاتا (کہ یہ ولی اپنی کرامت سے غائب ہو گیا۔ اگر غائب نہ ہوتا دجال ضرور مار ڈالتا) مگر جس صورت سے اللہ تعالےٰ نے کرامت ظاہر کی وہ بہت ہی عجیب و غریب ہے (کہ دجال کو ایک بار اُس کے قتل پر قدرت دے دی اور دوبارہ قدرت نہ دی کہ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا)۔

قوله وفيه دليل على ان قوة الایمان عند الضرورة تعول على القدرة

بمجردھا الیٰ قولہ وما اظھر اللہ عزوجل لہ من الکرامۃ ادفع اعظم ۔

ف ۔ مَیں اُوپر بتلاچکا ہوں کہ جب بدعت ومُنکر پر نکیر کرنے والا کوئی نہ ہو اُس وقت اپنے کو خطرہ میں ڈال کر بدعت پر انکار کرنا جائز بلکہ بعض صُورتوں میں واجب ہے جبکہ سکوت سے اُمّت کے گمراہ ہونے کا اندیشہ ہو۔ پس یہ صُورت اگرچہ ایک قانونِ حکمت کے خلاف تھی مگر دُوسرے قانونِ حکمت کے موافق تھی۔ حدیث میں ہے اعظم الجھاد کلمۃ حق عند سلطان جائر ۔ بڑا جہاد حق بات کہہ دینا ہے ظالم بادشاہ کے سامنے ۔ اس کو بڑا جہاد اسی واسطے کہا گیا ہے کہ اس میں جان کا خطرہ غالب ہے چنانچہ بہ کثرت علماء حق ایسے گزرے ہیں جنہوں نے سلاطین کے سامنے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا اور جان دے دی کیونکہ اس میں اُمّت کو بدعت اور منکر سے بچانے کا فائدہ تھا گو مخاطب کو نفع نہ پہنچا ہو۔ جان کو ہلاکت میں ڈالنا وہاں منع ہے جہاں کوئی نفع مرتب نہ ہو نہ مقابل کو کوئی ضرر پہنچے تو بے فائدہ جان کیوں دی ۔

(۲۲۱) ایمان کے ساتھ فتنہ مُضر نہیں ہوتا

یہاں سے معلوم ہُوا کہ ایمان کے ساتھ فتنہ کچھ ضرر نہیں دیتا بلکہ فتنہ سے ایمان اور زیادہ مضبوط ہوجاتا ہے۔ دیکھو اس شخص کو سخت ابتلاءٗ پیش آیا کہ قتل کیا گیا پھر زندہ کیا گیا مگر اس سے اُس کی قوتِ ایمان (کم نہ ہُوئی بلکہ) زیادہ ہی ہوئی کیونکہ پہلے تو اُس کو (دجال کے جھُوٹا ہونے کا علم الیقین تھا اب عین الیقین ہوگیا اور عین الیقین علم الیقین سے اعلیٰ ہے ۔ جیسا حضرت ابراہیمؑ سے جب کہا گیا اولم تؤمن (کیا تم کو اس کا یقین نہیں کہ اللہ تعالےٰ مُردوں کو زندہ کریں گے) تو عرض کیا بلیٰ ولکن لیطمئن قلبی کہ یقین کیوں نہ ہوتا لیکن مَیں اطمینانِ قلب چاہتا ہوں (یعنی علم الیقین سے ترقی کر کے عین الیقین چاہتا ہوں اور وہ مشاہدہ ہی سے ہوگا) اسی لیے وہ درجۂ خلت کے مستحق ہُوئے اس میں ایک دُوسری حدیث کی بھی تائید ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دل پر فتنے یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں جس پر وہ پیوست ہوگئے اُس میں سیاہ داغ

پیدا کر دیتے ہیں اور جس دل میں پیوست نہ ہُوئے اُس میں سفید (چمکتا ہوا) نشان پیدا کر دیتے ہیں جو ہمیشہ بڑھتا رہتا ہے ۔ یہاں تک کہ دل صاف (آئینہ کی طرح) ہو جاتا ہے پھر اُس کو کوئی فتنہ اس کے بعد ضرر نہیں دیتا ۔ چنانچہ یہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی تصدیق کرتا ہُوا اللہ ورسول کے راستہ میں مجاہد بن کر نکلا تو اُس کو قتل سے بھی کچھ ضرر نہ پہنچا بلکہ ایمان میں ترقی ہی ہُوئی اور دجال کی حالت سے واضح ہوجائے گا کہ اُس کے خوارق عادات خود اُس کی تکذیب کریں گے کیونکہ وہ اپنے آدمیوں سے کہے گا بتلاؤ اگر مَیں اس کو قتل کر کے پھر زندہ کر دوں کیا پھر بھی میرے متعلق شک کرو گے ؟ (اُس کا یہ سوال ہی بتلاتا ہے کہ وہ دعوےٰ خُدائی میں جھُوٹا ہوگا) اگر اُس کا دعوےٰ خدائی سچا ہوتا تو لوگوں کے دلوں کو اپنی تصدیق پر خود مائل کر دیتا کیونکہ قلوب تو اللہ تعالےٰ کے قبضہ میں ہیں (وہ جس طرح چاہیں اُن کو پھیر سکتے ہیں) پس دجال کا لوگوں سے اپنی تصدیق طلب کرنا خود اُس کی کمزوری پر دلالت کرتا ہے اور خدا تعالےٰ کے حق میں کمزوری محال ہے) پھر بڑی کمزوری یہ ہوگی کہ وہ دوبارہ اس شخص کے قتل کا دعوےٰ کرے گا مگر قادر نہ ہوگا اپنا سا منہ لے کر رہ جائے گا) ۔ قولہ وفیہ دلیل علیٰ ان الفتنۃ لا تضر مع الایمان الیٰ قولہ وھذا فی حق الربوبیۃ محال ۔

ف ۔ حضرت شارح نے یہ جو فرمایا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے علم الیقین سے عین الیقین کی طرف ترقی کے لیے احیاءِ موتیٰ کی کیفیت دیکھنا چاہی اس میں کلام ہے کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ بدون مشاہدۂ حسّی کے عین الیقین حاصل نہیں ہو سکتا اور مشاہدہ سے پہلے ابراہیمؑ کو عین الیقین کا درجہ حاصل نہ تھا ۔ اگر حضرت شارح کی مراد عین الیقین سے اصطلاحی معنی نہیں بلکہ لغوی معنوی مراد ہیں تو یہ مقدمہ مسلّم ہے مگر اُس کو علم الیقین کے مقابلہ میں لانا درست نہیں کہ اس سے معنی اصطلاحی کا شُبہ ہوتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت سیدنا ابراہیمؑ علم الیقین وعین الیقین دونوں سے کامیاب تھے ۔ جب اولیاء کاملین کو یہ دونوں درجے حاصل ہوتے ہیں تو انبیاء کا کسی

ایک سے خالی ہونا کیونکر ممکن ہے اُن کو وحی اور نبوت کے ساتھ ہی عین الیقین بمعنی اصطلاحی حاصل ہوجاتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بدون مشاہدۂ کیفیت کے دل کو ایک کیفیت پر قرار نہیں ہوتا بلکہ ذہن نقشے بناتا رہتا ہے جیسے ہم کو یقین کامل ہے کہ دُنیا میں خانہ کعبہ موجود ہے مگر جب تک مشاہدہ نہ کر لیا جائے ذہن کو ایک صُورت پر قرار نہیں ہوتا بلکہ مختلف صُورتیں ذہن میں آتی رہتی ہیں کہ کعبہ ایسا ہے یا ایسا ہے، دیکھنے کے بعد ایک صورت پر قرار ہوجاتا ہے کہ بس ایسا ہے اس کا نام اطمینان ہے اور لغۃً اس کو عین الیقین کہہ سکتے ہیں اصطلاحًا نہیں۔ اسی کو حضرت ابراہیمؑ نے طلب کیا تھا اور یہ مقاصد میں سے نہیں بدون اس کے بھی ایمان اور یقین کامل حاصل ہو سکتا ہے۔ جیسے ہم کو بدون دیکھے خانہ کعبہ کے وجود کا پُورا یقین ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اطمینان کی طلب اس لیے کی کہ اُن سے احیاء موتیٰ میں نمرود نے مناظرہ کیا تھا اُن کو خیال ہُوا کہ شاید پھر کوئی اس باب میں مناظرہ کرنے لگے تو میں اُس کی کیفیت کا مشاہدہ کر لوں تاکہ مشاہدہ کے بعد قوت کے ساتھ گفتگو کر سکوں کیونکہ قاعدہ ہے کہ صاحب مشاہدہ کے کلام میں وہ قوت اور شوکت ہوتی ہے جو غیر صاحب مشاہدہ کے کلام میں نہیں ہوتی جس نے حج کر لیا ہے۔ وہ جس قوت اور شوکت کے ساتھ مسائل حج میں گفتگو کر سکتا ہے حج نہ کرنے والا نہیں کر سکتا جیسا کہ ظاہر ہے۔

پس ہر شخص کو دُنیا میں طلب اطمینان کی اجازت نہیں نہ ضرورت فالایمان بین الخوف والرجاء اطمینان تو آخرت ہی میں حاصل ہوگا ہاں طلب یقین لازم ہے۔ اور اُس کا ہر درجہ دُنیا میں حاصل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اولیا کاملین اُس سے کامیاب ہیں کہ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے لوانکشف الغطاء ما ازددت یقینًا اگر پردہ اُٹھ جائے جب بھی میرے یقین میں زیادتی نہ ہوگی گو اطمینانی کیفیت ضرور پیدا ہوگی لیس الخبر کالمعاینۃ۔ سننے اور دیکھنے میں فرق ہوتا ہی ہے مگر اُس کا نام اطمینان ہے۔ اولیاء کو یقین کامل بدون اس کے بھی حاصل ہوتا

ہے اور انبیاء علیہم السلام اس میں سب سے زیادہ کامیاب ہیں (سمعتہ من سیدی حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہ وللہ درہ من حکیم)۔

ف۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ فتنہ سے ایمان قوی ہوتا ہے اس کی ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ سچی محبت ہر حال میں بڑھتی ہے خواہ اُس کی وجہ سے کتنی ہی تکلیف پہنچے اور سچی محبت ہی کا نام ایمان ہے والذین اٰمنوا اشد حبا للہ۔ جس نے عشاق کو دیکھا ہے وہ جانتا ہے کہ تکالیف ومحن سے عشق کی آگ زیادہ بھڑکتی ہے ؎

نہ سازد عشق را کنج سلامت
خوشا رسوائی کوئے ملامت

عاشق کا مذاق یہ ہوتا ہے ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

؎
ہاں بلا سے جان نکلے تو مگر نکلے نہ آہ
ہوشیار اے دل کہ وہ صبر آزما ہونے کو ہے

دوسری وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی علامات تفصیل کے ساتھ بیان فرمادی ہیں۔ جب مومن کے سامنے وہ فتنے آتے ہیں جن کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے تو اُس کے ایمان میں ترقی ہوتی ہے وہ ان کو دیکھ کر بے ساختہ پکار اُٹھتا ہے لقد صدق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ بے شک ہمارے رسول نے سچ فرمایا تھا۔ جس وقت میں نے اپنے رسالہ العطر الوردی فی ذکر المسیح والمہدی میں یہ حدیث لکھی ہے ویفشو القلم والتجارۃ کہ قیامت کے قریب قلم اور تجارت بہت پھیل جائے گی۔ یعنی لکھنے پڑھنے کا رواج زیادہ ہوگا۔ تجارتیں ترقی کریں گی۔ تو میں نہیں بیان نہیں کہ مجھ پر کیسی وجدی کیفیت طاری ہُوئی۔ واقعی حضورؐ نے سچ فرمایا۔ تم دیکھ رہے ہو کہ آجکل ہر قوم کو ترقی تعلیم اور ترقی تجارت کی کس قدر فکر ہے۔ گاؤں گاؤں میں اسکول کھولے جا

سبے ہیں سلطنتوں کی بنیاد تجارت پر قائم ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی دیکھو کہ باوجود اس قدر ترقی تعلیم کے علم ناپید ہے اور جہل ترقی پر ہے۔ علامت قیامت میں حضورؐ نے یہ بھی فرمایا ہے یقبض العلم و یکثر الجهل و یکثر الهرج یعنی القتل۔ علم سمٹ جائے گا اور جہل غالب ہوگا اور گڑبڑ یعنی خون ریزی زیادہ ہوگی۔ سو واقعی اس زمانے میں لکھنے پڑھنے کی تو ترقی ہے مگر علم کو تنزل ہے کیونکہ لکھنے پڑھنے کا رواج زیادہ تر محض دُنیا اور مادی منفعت کے لیے ہے خداشناسی یا مذہب سے واقف ہونے کے لیے نہیں اور ایسے لکھنے پڑھنے کا نام علم نہیں بلکہ سراسر جہل ہے اس کی جس قدر ترقی ہوگی جہل ہی بڑھتا جائے گا ؎

علمے کہ رہ بحق نہ نماید جہالت ست

یہی وجہ ہے کہ اس طرح عِلم کو جتنی ترقی ہو رہی ہے اسی قدر دُنیا میں فساد اور خون ریزی بڑھ رہی ہے۔ یہ فساد کرنے والے اَن پڑھ جاہل نہیں بلکہ تعلیم یافتہ گریجویٹ ہیں وہی کسانوں مزدوروں کو سبز باغ دکھلا کر دُنیا میں فساد پھیلا رہے ہیں۔ ان واقعات کو دیکھ کر مومن کا ایمان پختہ ہوتا اور تصدیق رسول میں برابر ترقی ہوتی ہے کہ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا تھا ویسا ہو بہو پُورا ہو رہا ہے۔

اللّٰھم صلّ وسلم وبارک علیٰ ھذا النبی الکریم افضل صلواۃ و ازکی تسلیم والحمد للہ رب العٰلمین۔

(۲۲۲) تقدیر کا بیان حدیث میں قدرت الٰہی کا بھی بیان ہے کہ جس کے لیے گمراہی مقدر ہو چکی ہے اُس کو عبرتیں اور نصیحتیں کچھ بھی نفع نہیں دیتیں۔ دیکھو دجال دعوے کرے گا کہ میرے خدا ہونے کی دلیل یہ ہے کہ مَیں اس شخص کو مار کر پھر زندہ کر دوں گا۔ سو ایک دفعہ وہ ایسا کر دے گا پھر (جب وہ شخص زندہ ہو کر کہے گا کہ اب تو مجھے پہلے سے بھی زیادہ بصیرت کے ساتھ معلوم ہو گیا کہ تُو دجال کذاب ہے) وہ دوبارہ اُسے قتل کرنا

چاہے گا مگر بدون کسی ظاہری سبب کے اس کے قتل پر قادر نہ ہوگا۔ اب اُس پر اور اُس کے پیروؤں پر حق کو مان لینا لازم تھا کیونکہ اُس کے دعوے اور دلیل کو باطل کرنے والی چیز کُھلم کُھلا سب کے سامنے آگئی جس کا کوئی جواب اُن کے پاس نہ ہوگا۔ مگر بات یہ ہے کہ دلائل اور مواعظ سعادت کے ساتھ ہی نفع دیتے ہیں اور فتنے اور امتحانات شقاوت کے ساتھ ہی ضرر پہنچاتے ہیں۔ ہم اللہ عزوجل مالک عرشِ عظیم سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں شقاوت اور محرومی اور فتنوں اور آزمائشوں سے دونوں جہان میں بچائیں اور اپنے فضل سے دارین کی سعادت سے سرفراز فرمائیں۔ اللہ کے سوا کوئی رب نہیں۔ وصلی اللہ علٰی محمد و آلہ۔ قولہ وفیہ دلیل علی اظھار قدرتہ اللہ عزوجل الیٰ قولہ محمد و آلہ۔

ف۔ یہی وہ مقام ہے جس نے عارفین کو لرزا رکھا ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ اُس کی تقدیر میں کیا ہے گو ظاہر حال سے انجام کا پتہ چل جاتا ہے مگر قطعی فیصلہ مرنے سے پہلے نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے فرماتے ہیں ؎

غافل مرو کہ مرکب مردان مرد را | در سنگلاخ بادیہ پیہا بریدہ اند
نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش | ناگاہ بیک خروش بمنزل رسیدہ اند

؎
گہ رشک کند فرشتہ بر پاکئ ما
گہ خندہ زند دیو ز ناپاکئ ما
ایمان چو سلامت بہ لب گور بریم
احسنت بریں چستی و چالاکئ ما

ہر شخص کو حسنِ خاتمہ کا اہتمام کرنا اور اُس کے لیے دل سے دُعا کرتے رہنا چاہیئے۔ رزقنا اللہ وایاکم حسن الختام بحرمۃ النبی وآلہ واصحابہ الکرام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیہم الیٰ یوم القیام۔ والحمد للہ رب العٰلمین۔

⁂

حدیث

حراسة مكة والمدينة من الدجال

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (دُنیا کا) کوئی شہر ایسا نہیں جس میں دجال نہ پہنچے بجز مکہ اور مدینہ کے کہ ان کے راستوں میں سے کوئی راستہ ایسا نہ ہوگا جس پر فرشتے صف باندھے ہوئے اُن کی حفاظت نہ کرتے ہوں۔ پھر مدینہ میں تین دفعہ زلزلہ آئے گا تو ہر کافر اور منافق (مدینہ سے نکل کر) دجال کی طرف چلا آئے گا۔

شرح حدیث کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ دجال زمین کے تمام بلاد میں پہنچے گا بجز مکہ اور مدینہ کے اس پر چند وجوہ سے کلام ہے ایک تو یہ کہ اس میں دجال کے ظہور کی تحقیق ہے (کہ وہ ظاہر ہوگا اور تمام روئے زمین کا دورہ کرے گا۔ مکہ مدینہ کے پاس بھی پہنچے گا مگر فرشتے کھلم کھلا صف باندھے ہوئے ان دونوں مقدس شہروں کی حفاظت کرتے ہوں گے اس لیے اندر نہ پہنچ سکے گا مدینہ کو تین بار زلزلہ آئیگا۔ کافر و منافق اس زلزلہ کو دجال کا تصرف سمجھیں گے اور اس کے پاس پہنچ جائیں گے۔ اسی لیے ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ مدینہ کی ایسی مثال ہے جیسے بھٹی کہ جس طرح اس میں سونے چاندی کا میل کچیل نکل جاتا ہے اسی طرح مدینہ خبیثوں کو اپنے اندر سے نکال دیتا ہے۔

(۲۲۳) مکّہ اور مدینہ فضیلت میں برابر ہیں ظاہر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فضیلت میں مکّہ اور مدینہ[ع] دونوں برابر ہیں کیونکہ دجال تمام زمین کو پامال کرے گا مگر ان دو (مقدس شہروں میں نہ پہنچ سکے گا تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں فضیلت میں برابر ہیں اس کی تائید دوسرے دلائل قیاس سے بھی ہوتی ہے کیونکہ اگر مدینہ میں یہ خصوصیت ہے کہ وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف اور مسجد مبارک ہے اور حضورؐ نے وہاں قیام فرمایا ہے تو مکّہ میں یہ خصوصیت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باکرامت مکہ میں ہوئی وہاں آپ نبوت سے سرفراز ہوئے اور وہیں آپؐ کا قبلہ ہے اور نبوت کے بعد حضورؐ کا قیام مکہ میں بھی مدینہ کے برابر ہی ہوا (بلکہ کچھ زیادہ) مشہور قول یہی ہے (کیونکہ آپؐ نے نبوت کے بعد مکہ میں تیرہ سال قیام فرمایا اور مدینہ میں دس سال) پس آفتاب رسالت کا مطلع مکہ ہے اور مغرب مدینہ ہے۔ قوله وظاهر هذا الحديث يعطى التسوية بينهما فى الفضل الى قوله ومغربها بالمدينة -

ف- ہر چند کہ یہ مسئلہ تصوف کا نہیں مگر صوفیہ نے اس سے بحث کی ہے اس لیے ترجمہ کر دیا گیا۔ اس باب میں ہمارے اکابر کا فیصلہ یہ ہے کہ جینا مکہ میں اچھا اور مرنا مدینہ میں اچھا۔ کیونکہ مکہ میں اعمالِ صالحہ کا ثواب مدینہ سے زیادہ ہے کہ مسجد احرام کی ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہوتی ہے اور مسجدِ نبویؐ میں ایک نماز پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے۔ پس زندگی مکّہ کی افضل ہے اور جب قرب موت کا احساس ہونے لگے اُس وقت مدینہ پہنچ جانا افضل ہے کیونکہ حدیث میں ہے:

[ع] فقہاء نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے کہ امام مالک اور اُن کے مقلدین مدینہ کو مکہ سے افضل فرماتے ہیں۔ امام شافعی اور اُن کے مقلدین مکّہ کو مدینہ سے افضل کہتے ہیں مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جو زمین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسمِ اطہر سے قبر شریف میں مس کئے ہوئے ہیں۔ وہ زمین کے تمام حصّوں سے افضل ہے اور ابن عقیل حنبلی نے تو اُس کو عرش و کرسی سے بھی افضل کیا ہے کذا فی الشرح مع الحاشیہ ۱۲۔

من استطاع منکم ان یموت بالمدینۃ فلیفعل اوکما قال "جس سے یہ ہوسکے کہ مدینہ میں اُس کو موت آئے اُس کو ایسا کرنا چاہیئے"۔

دُوسری حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پہلے وہ لوگ ہوں گے جو بقیع الغرقد (قبرستان مدینہ) میں مدفون ہیں۔ پھر آپؐ مکہ والوں کا انتظار فرمائیں گے اور ان سب کو ساتھ لے کر میدانِ محشر میں تشریف لائیں گے۔ اور ظاہر ہے کہ جو لوگ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ قریب ہوں گے وہ آپؐ کی شفاعت سے زیادہ کامیاب ہوں گے۔ اللھم ارزقنی شھادۃ فی سبیلک واجعل موتی ببلد رسولک صلی اللہ علیہ وسلم آمین۔

(۲۲۴) دجال کو خوارق بہت دیئے جائیں گے پس خوارق کو علامت قبول نہ سمجھا جائے جب تک اتباع سُنّت نہ ہو

حدیث سے معلوم ہُوا کہ اس لعین (مردود دجال) کو خوارق عادات بہت دی جائیں گی جن میں سے ایک تو یہی ہے کہ وہ تمام روئے زمین کا دَورہ کرے گا حالانکہ (دعویٰ الوہیت کے بعد) اُس کا قیام زمین میں صرف چالیس دن ہوگا اس سے زیادہ نہیں البتہ ان ایام میں پہلا دن سال بھر کے برابر ہوگا اور دُوسرا مہینہ کے برابر اور تیسرا ایک ہفتہ کے برابر اور بقیہ ایام عام دنوں کے برابر چھوٹے بڑے ہوں گے۔ حضرات صحابہ نے سیّدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے دریافت کیا کہ ان لمبے دنوں میں ہمیں ایک ہی دن کی نماز کافی ہوگی؟ فرمایا نہیں بلکہ نمازوں کے لیے وقت کا اندازہ کر لیناؑ۔

ؑ یہاں سے حضرات صحابہ کی فکرِ دین کا اندازہ ہوگیا ہوگا کہ انھوں نے ان ایام کے متعلق دنیوی پریشانیوں کا حل دریافت نہیں کیا صرف دینی پریشانی کا حل دریافت کیا پھر یہ بھی نہ پوچھا کہ وقت کا اندازہ کیونکر کریں؟ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اندازہ کرنے کا حکم دیا ہے تو اس وقت کوئی صورت ایسی پیدا ہو جائے گی جس سے اندازہ کرنا آسان ہو

(اگلی صفحہ پر)

دوسری خرق عادت پہلی حدیث میں گزر چکی ہے کہ وہ ایک شخص کو قتل کرے گا پھر زندہ کرے گا۔ ایک یہ کہ وہ زمین میں دانہ ڈالے گا تو اُسی وقت اُگ بھی آئے گا، پک بھی جائے گا کٹ بھی جائے گا۔ ایک یہ کہ اُس کے ساتھ روٹیوں کے پہاڑ ہوں گے۔ ایک یہ کہ اُس کے ساتھ جنّت اور دوزخ کا نمونہ ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلا دیا کہ جو اُس کی جنّت میں داخل ہوگا وہ دوزخ میں ہوگا اور جو اُس کے دوزخ میں داخل ہوگا وہ جنت میں ہوگا۔ ایک یہ کہ وہ کسی سے کہے گا کہ میرا کہنا مان لے وہ انکار کرے گا تو اس شخص کا مال دجال کے ساتھ ہولے گا۔ اب وہ شخص بھی اپنے مال کی وجہ سے دجال کا پیرو ہو جائے گا۔ غرض دجال کے کفر کا اور اس کی وجہ سے لوگوں کے کافر ہونے کا بڑا سبب یہ خوارق عادات ہی ہوں گے جو اس لعین کو دیئے جائیں گے۔ اس کے ظہور سے پہلے سات سال ایسے گزریں گے جن میں نہ آسمان سے ایک قطرہ بارش کا نازل ہوگا نہ زمین سے کوئی دانہ اُگے گا مگر اُس وقت امام مہدی علیہ السلام موجود ہوں گی جن کی برکت سے مُسلمان بھُوکے نہ رہیں گے۔ اس وقت مُسلمانوں کے لیے ذکر اللہ اور تسبیح غذا کا کام دیگا۔ اُن کے نعرۂ تکبیر سے بڑے بڑے مُستحکم قلعے ایک دم گر پڑیں گے۔ دجال کے پاس تو شعبدے ہی ہوں گے۔ حضرت امام کے پاس اللہ تعالےٰ کی طرف سے بڑی بڑی کرامات ہوں گی جن سے مُسلمان کے دل مطمئن اور مضبوط ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی عادت یہی ہے کہ ہر فرعون کے ساتھ ایک موسیٰ اور ہر زہر کے ساتھ تریاق بھی پیدا فرما دیتے ہیں۔

جائے گا۔ چنانچہ اس وقت گھڑی گھنٹے موجود ہیں۔ گھڑی کے ذریعے سے اوقاتِ نماز کا پتہ چلتا ہے گا اور اسی سے ایام کی گنتی بھی رہے گی جس سے رمضان کا آنا معلوم ہوگا اُس میں روزہ بھی گھڑی کے اندازہ سے رکھ لیا جائے گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس وقت مُسلمانوں کو ایام کی شمار بڑے اہتمام سے کرنا ہوگی اور ہر مہینہ تیس دن کا شمار کرنا ہوگا۔ اسی سے رمضان کا علم روزہ کے لیے اور ذی الحجہ کا علم حج کے لیے ہوگا اور ممکن ہے کہ اُس وقت اللہ تعالےٰ مُسلمانوں کو علم اوقات کا کوئی اس سے بھی زیادہ آسان طریقہ بتلا دیں۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔ ۱۲۔ ظ۔

تاکہ طالبِ حق گمراہی سے محفوظ رہیں اور جو خود ہی گمراہ ہونا چاہے اس کا کوئی علاج نہیں) اسی لیے اہلِ تحقیق اُن خوارق عادات پر نظر نہیں فرماتے جو اُن کے ہاتھوں سے ظاہر ہو جاتی ہیں اگرچہ وہ کتنی ہی زیادہ ہوں (کیونکہ خوارق عادات دجال سے بھی ظاہر ہوں گی تو اُن پر نظر کرنا اور اُن کو مقبولیت کی علامت قرار دینا غلطی ہے جب تک ان خوارق کے ساتھ کمال اتباعِ سُنّت اور تقویٰ اور محبتِ حق موجود نہ ہو) بعض بزرگانِ دین تو ان خوارق سے ڈرتے اور اللہ تعالےٰ سے درخواست کرتے تھے کہ اُن کو اس سے معاف کیا جائے۔ چنانچہ ایک بزرگ سفر کر رہے تھے راستہ میں دریا آگیا جس سے پار ہونا بدون کشتی کے دشوار تھا اُن کے پاس کچھ تھا نہیں جو کشتی والے کا کرایہ دے دیتے یہ سوچ میں پڑ گئے کہ کیا کروں دفعتہً ان کی نظر دریا پر پڑی کہ اُس کے دونوں کنارے اس قدر قریب ہو گئے ہیں کہ ایک ہی قدم کا فاصلہ رہ گیا ہے یہ دیکھ کر گھبرا گئے اور عرض کیا خداوندا اگر یہ کرامت ہے تو اس کو آخرت کے لیے میرے واسطے ذخیرہ (کے طور پر محفوظ) کر لیجئے اور اگر شیطان مردود کی طرف سے (کوئی شعبدہ) ہے تو اس کو مجھ سے دفع کر دیجئے۔ دریا فوراً جیسا تھا ویسا ہی ہو گیا اور بزرگ نے اپنے کپڑوں میں سے ایک کپڑا کشتی والے کو دیا جس کے بعد (کرایہ دے کر) پار ہو گئے۔

بزرگوں سے اس قسم کی حکایات بہت ہیں (جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوارق عادات سے خوش نہ ہوتے تھے بلکہ ڈرتے تھے) بس اُن کو تو اپنے اعمال اور ایمان کی تحسین و تکمیل کا اہتمام تھا اور ان ہی کی برکات کی طلب تھی۔ جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص چالیس دن تک اللہ تعالےٰ کے لیے (اپنے اعمال میں) اخلاص (کا اہتمام) کرے حکمت کے چشمے اُس کے دل سے زبان پر ظاہر ہونے لگتے ہیں (یعنی اول اخلاص کی برکت سے دل میں علوم حکمت کا القاء ہوتا ہے پھر اُس کی زبان سے حکمت کی باتیں نکلنے لگتی ہیں۔ یہ حدیث صوفیاء کی چلہ کشی کی اصل ہے) نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ رقت (قلب) کو تین چیزوں میں

طلب کرو۔ نماز میں، تلاوتِ قرآن میں، ذکر اللہ میں۔ اگر ان میں رقت پاؤ (تو خیر) ورنہ جان لو کہ دروازہ بند ہے (پس ایمان اور اعمالِ صالحہ کی یہ برکات تو مطلوب ہیں، کرامات و خوارق عادات مطلوب نہیں) اسی طرح اور جو حقوق (شرعیہ) ہیں (وہ اُن کا اہتمام کرتے ہیں) اُن ہی سے اُن کا حال درست ہوتا ہے۔

قولہ وفیہ دلیل علی کثرۃ ما یعطی ھذا اللعین من خرق العادۃ

الی قولہ وبہا اصلاح حالھم۔

ف۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چیزوں میں رقت قلب کی طلب کا حکم دیا ہے مگر آج کل بعض مدعیانِ تصوف سماع اور قوالی میں رقت قلب کی تلاش کرتے ہیں مگر وہ یاد رکھیں کہ اہلِ سماع کو نماز اور تلاوتِ قرآن اور ذکر اللہ میں رقت حاصل نہیں ہوتی اور جس کو ان سے رقت حاصل نہ ہو اُس پر دروازہ بند ہے۔ جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ بزرگانِ دین نے جو سماع سُنا ہے وہ آجکل کا سا سماع مزامیر کے ساتھ نہیں تھا اور جیسا بھی تھا بطور غذا کے نہ تھا بلکہ دوا کے طور پر تھا۔ جب کسی پر قبض طاری ہوتا تھا اُس وقت بطور علاج کے اُس کو استعمال کرتے تھے۔ مگر آجکل لوگوں نے دوا کو غذا بنا لیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نماز اور تلاوت و ذکر میں ان کو رقت و حلاوت نصیب نہیں ہوتی جو حدیث کے موافق محرومی کی علامت ہے۔

ف۔ آج کل پنجاب میں ایک اور مدعی پیدا ہوئے ہیں جن کا دعویٰ یہ ہے کہ دجال اکبر پیدا ہو چکا ہے اور وہ مرزا غلام احمد قادیانی تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مرزا قادیانی بھی دجالوں میں سے ایک تھا مگر دجالِ اکبر نہ تھا۔ اُس میں دجالِ اکبر کی علامات موجود نہ تھیں۔ بڑی علامت تو یہ ہے کہ اُس کا ظہور زمانہ مہدی علیہ السلام میں ہوگا اور اب تک حضرت امام کا ظہور نہیں ہوا۔ دُوسری علامات وہ ہیں جو مختصراً اس مقام میں مذکور ہیں۔ مگر پنجاب کے مدعی نے ان خوارق میں عجیب بے تکی تاویلیں کی ہیں اور بعض کے راویوں کو بے وقوف بتایا ہے مگر اُس کو اتنا شعور نہیں کہ قرآن و

حدیث کے سمجھنے والے وہی لوگ تھے جو زمانۂ نزولِ وحی میں موجود یا اُسی کے قریب تھے۔ جس شخص کو فصاحت و بلاغت اور اعجازِ قرآن کی ہوا بھی نہ لگی ہو نہ قرآن و حدیث سے کافی ذوق ہو اُس کو فہم قرآن و حدیث کا دعویٰ جائز نہیں۔ اگر اس طرح حدیثوں میں بے تکی تاویلیں کی جائیں گی اور راویانِ حدیث کو بے وقوف بتایا جائے گا تو ایسا شخص خود ستر دجالوں میں سے ایک دجال ہوگا۔

رہا یہ کہنا کہ یہ باتیں عقل میں نہیں آتیں تو قیامت کی علامات کا تمہاری عقل میں آنا ضروری نہیں۔ صرف حدیث کا صحیح ہونا ضروری ہے۔ قیامت کی کیفیت خود عقل میں نہیں آسکتی تو اُس کی علامات کا عقل میں آنا کیا ضروری ہے؟ اور اب تو سائنس نے بہت سی بعید از قیاس باتوں کو قریب کر دیا ہے۔ پہلے کس کی عقل میں یہ بات آسکتی تھی کہ ریڈیو کے ذریعے لندن کی تقریر ہندوستان میں سُنی جاسکتی ہے۔ مگر آج سب سُن رہے ہیں۔ پس انتظار کرو انشاء اللہ عنقریب وہ وقت بھی آجائے گا جب علاماتِ قیامت سب کی سب تمہاری عقلوں سے قریب ہو جائیں گی۔ اس مدعی نے ایک کمال تو یہ کیا ہے کہ ظہور مہدی کا تو اقرار کیا ہے مگر نزولِ مسیح علیہ السلام سے انکار ہے حالانکہ سلف میں بعض ایسے تو گزرے ہیں جنہوں نے ظہور مہدی سے انکار کیا ہے اور حدیث ابن ماجہ لا مہدی الا عیسےٰ کی وجہ سے مہدی اور مسیح کا مصداق عیسیٰ علیہ السلام ہی کو قرار دیا ہے مگر ایسا کوئی نہیں ہوُا جس نے نزولِ مسیح سے انکار کیا ہو۔

امتِ مسلمہ کا متفق علیہ قول یہ ہے کہ مہدی اور عیسےٰ علیہ السلام الگ الگ دو شخصیتیں ہیں اور حدیث ابن ماجہ کو ضعیف کہا ہے جو احادیث صحیحہ متواترہ کو رد نہیں کر سکتی۔ عیسیٰ علیہ السلام زمانہ مہدی میں آسمان سے نازل ہوں گے اور دجال اکبر کو اپنے ہاتھ سے قتل کریں گے۔ اس وقت چونکہ دجال کا مقابلہ ہوگا جس کے پاس خوارق عادات بہت کچھ ہوں گے اس لیے عیسیٰ علیہ السلام سے بھی بہت خوارق عادات ظاہر ہوں گے۔ پس یہ شُبہ لغو ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام سے ایسے معجزات اپنی نبوت کے زمانے میں تو ظاہر نہیں ہوئے اب زمانۂ مجددیت میں کیوں ظاہر ہوں گے؟ جواب

واضح ہے کہ اس وقت دجال اکبر کا مقابلہ ہوگا جس کے برابر اہلِ باطل میں کوئی بھی صاحب خوارق نہیں ہوُا۔ ایک شُبہ یہ کیا ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کے سانس سے سارے کافر ہلاک ہو جائیں گے تو وہ تجدیدِ دین کے لیے تبلیغ و اصلاح کس کی کریں گے؟ جواب یہ ہے کہ یہ خاصیت اُن کے سانس میں لشکر دجال سے مقابلے کے وقت ہوگی کہ اُس کے ساتھ ٹڈی دل کافر ہوں گے اور ممکن ہے اُس کے پاس میدانِ جنگ میں چھوڑنے کیلئے گیس وغیرہ بھی ہوں اُن کے گیس کا جواب عیسیٰ علیہ السلام کا سانس دے گا۔ اُن کا گیس تو دوست دُشمن سب ہی کو ہلاک کرنے والا ہوگا مگر عیسیٰ علیہ السلام کا سانس صرف کافروں کو ہلاک کرے گا۔ مُسلمانوں کو قوت و فرحت بخشے گا۔ اس طرح دجال کے قتل تک بہت سے کافر ہلاک اور بہت سے فرار ہو جائیں گے اور میدان مُسلمانوں کے ہاتھ رہے گا، تو اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کے سانس سے کفار ہلاک نہ ہوں گے۔ چنانچہ خروج یاجوج و ماجوج کے وقت عیسےٰ علیہ السلام کو حکم ہوگا کہ مُسلمانوں کو لے کر کوہِ طور پر چلے جائیں۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام کے سانس میں یہ خاصیت دائمی ہوتی تو اُن کو کوہِ طور پر جانے کا حکم کیوں ہوتا؟ بلکہ یہ حکم دیا جاتا کہ اپنے سانس سے یاجوج و ماجوج کو بھی ہلاک کر دیں۔ اس سے معلوم ہُوا کہ اُن کے سانس میں یہ خاصیت صرف اُسی ایک میدان میں ہوگی جہاں دجال سے مقابلہ ہوگا۔ اسی طرح اُس نے اور بھی شبہات نکالے ہیں جن کا منشاء محض قلتِ فہم اور قلتِ ایمان ہے جس کو اللہ کی قدرت پر پُورا ایمان ہے وہ ایسے شبہات نہیں کر سکتا خوب سمجھ لو۔

(۲۲۵) حرمت مکان سے ایمان ہی کے ساتھ نفع ہوتا ہے

معلوم ہُوا کہ مکان کی حُرمت ایمان کے ساتھ ہی نفع دیتی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ دجال کی طرف (مدینہ سے) ہر کافر اور منافق نکل کھڑا ہوگا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت مدینہ میں کفار اور منافق بھی ہوں گے حالانکہ اس وقت وہاں نفاق ظاہر نہیں۔ نہ مدینہ میں کوئی کافر مقیم ہے نہ وہاں جاسکتا ہے تو اُس وقت عالم

میں فساد بہت ہی زیادہ ہوگا (کہ کفار و منافقین مدینہ میں آباد ہوں گے) حضورؐ نے عاصی اور فاسق نہیں فرمایا (بلکہ کافر و منافق فرمایا ہے تو یہ لوگ باوجود مدینہ میں رہنے کے فتنۂ دجال سے محفوظ نہ رہیں گے کیونکہ بدون ایمان کے حرمت مکان سے کچھ نفع نہیں ہوتا۔ مدینہ کے مومن تو سب اُس کے فتنہ سے محفوظ رہیں گے خواہ متقی ہوں یا غیر متقی۔ کیونکہ ایمان کے ساتھ برکت مکان سے سب کو نفع ہوتا ہے) اسی لیے امام مالکؒ نے اپنے ایک دوست کو لکھا (صحیح یہ ہے کہ حضرت ابوالدرداءؓ نے حضرت سلمان فارسیؓ کو لکھا) تھا جبکہ اُنھوں نے بیت المقدس کی طرف جانے کا ارادہ کیا کہ زمین کسی کو پاک نہیں کرتی بلکہ انسان کو اُس کا عمل پاک کرتا ہے۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ اپنے لیے ایسی چیز کو تلاش کرلو جو تم کو پاک کردے خواہ حُسن علم ہو یا حُسن عمل کیونکہ بخدا معاملہ بہت نازک ہے۔

وفیہ دلیل علی ان حرمۃ البقع لاتنفع الا مع الایمان الی قولہ فالامر واللہ خطر۔

ف ۔ حضرت شارح کے زمانے میں تو یہ بات کسی مسلمان کی عقل میں نہ آسکتی تھی کہ مدینہ میں کفار و منافقین بھی رہ سکتے ہیں۔ مگر آجکل ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ امریکہ کی کمپنی کو حجاز کے معادن اور پٹرول کا ٹھیکہ دے دیا گیا ہے اور یہ لوگ بے تکلّف مکّہ مدینہ کے آس پاس موٹریں لیے پھرتے ہیں۔ کیا عجب ہے کسی وقت اُن کو مدینہ میں مکان بنا کر رہنے کی بھی اجازت دے دی جائے۔ سُلطان نجد و حجاز کا یہ فعل تمام مُسلمانوں کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے کہ اُنھوں نے کفار کو اس قسم کا ٹھیکہ دے کر حجاز میں رہنے کا موقعہ کیوں دیا؟ اگر معادن کی تلاش ہے تو پہلے اپنے آدمیوں کو یورپ و امریکہ بھیج کر اس کام کی تعلیم دی ہوتی پھر اُن تعلیم یافتہ مسلمانوں سے یہ کام لیا ہوتا۔ مگر آجکل ہمارے سلاطین کو جو سوجھتی ہے اُلٹی ہی سُوجھتی ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود تو سب کے سب دجال کے ساتھ ہوں گے وہ تو اُس کو اپنا بادشاہ اور خُدا کہیں گے۔ ممکن ہے کہ کچھ نصاریٰ یہود کی عداوت کے سبب دجال کو نہ

مانیں اور مُسلمانوں سے یہ سُن کر کہ مکّہ اور مدینہ میں دجال نہ پہنچ سکے گا، مدینہ میں پناہ لیں اور کچھ منافقانہ اسلام بھی لے آئیں مگر چُونکہ دل میں ایمان نہ ہوگا اس لیے زلزلوں سے گھبرا کر دجال کے پاس پہنچ جائیں گے۔

ف ۔ یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو محض قیام اجمیر یا پیرانِ کلیر یا قیام چوک قلندر ہی پر قناعت کئے ہُوئے ہیں۔ اعمال کا اہتمام نہیں کرتے نہ ایمان کی حفاظت کرتے ہیں اُن کو سمجھ لینا چاہیئے کہ مکان مقدس سے اُس کو نفع ہوتا ہے جو اُس کے تقدس کی رعایت کرکے اپنے اعمال اور ایمان کو مقدّس کرنے کی کوشش کرے ورنہ قیام مدینہ بھی نفع نہیں دے سکتا۔

(۲۲۶) دعویٰ کی حقیقت امتحان کے وقت کُھلتی ہے

یہاں سے معلوم ہُوا کہ دعوے کی حقیقت امتحان ہی کے وقت کُھلتی ہے۔ دجال کے قصہ میں دیکھو کہ بہت لوگ ایمان کی آڑ لیتے اسلام کا دعوے کرتے ہوں گے مگر دجال کے آنے پر یہ دعویٰ کچھ بھی نہ ٹھہرے گا۔ ہاں جس کا ایمان واقعی (سچا) ہوگا اور ایمان کے مقتضاء پر عمل بھی کرتا ہوگا (وہ ثابت قدم رہے گا) اسی لیے جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان فتنوں کا ذکر فرمایا اور صحابہ نے آپؐ سے دریافت کیا کہ اگر یہ زمانہ ہمارے سامنے آجائے تو آپ اُس وقت کے لیے ہم کو کیا حکم دیتے ہیں؟

آپؐ نے فرمایا الجاء والی الایمان والاعمال الصلحت۔ "ایمان اور اعمال صالح کی پناہ حاصل کرو۔"

حالانکہ یہ حضرات سب مؤمن تھے پھر بھی ایمان و اعمال صالح کی پناہ لینے کو فرمایا تو مطلب یہ ہے کہ ایمان کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتے رہو۔ اور اعمالِ صالح بھی ایمان کو قوت دینے والے ہیں کہ اسی سے ایمان میں کمی اور زیادتی ہوتی ہے۔

ہر شخص کو اپنی حالت میں غور کرنا چاہیئے

اور اس میں ہر شخص کو متنبہ کیا گیا ہے کہ ہر زمانے میں

اپنے نفس کی دیکھ بھال کرتا رہے۔ کیونکہ کوئی زمانہ بھی دجالوں سے خالی نہیں ہوتا۔ (حدیث[عہ] میں ہے کہ میرے اور دجالِ اکبر کے درمیان کچھ اُوپر ستر دجال ہوں گے) پس ہر شخص کو اپنی حالت میں نظر کرنا چاہیئے۔ مبادا وہ دجال کے متبعین میں سے ہو یا خود ہی (ستر دجالوں میں سے ایک) دجال ہو۔

معیارِ امتحان کتاب وسُنّت کی میزان ہے بشرطیکہ تفسیر سلف صالح کے موافق ہو

اور اس کی پہچان کا ایک ہی معیار ہے کہ اپنے کو کتاب وسُنت کی میزان سے تول کر دیکھتا رہے اور کتاب وسنت کی تفسیر سلف صالح کے موافق کرتا رہے (سبحان اللہ! کیا بات فرمائی ہے جس نے ہر دجل دفریب کا رخنہ بند کر دیا کیونکہ بعض لوگ اپنی حالت کو کتاب وسُنت کے موافق تو ظاہر کرتے ہیں مگر کتاب وسُنت کی تفسیر اپنی رائے سے کرتے ہیں اس طرح اپنے کو بھی دھوکہ دیتے ہیں اور مخلوق کو بھی۔ اگر کتاب وسُنت کی تفسیر سلف صالح کے موافق کر کے اپنی حالت کو اُس کے موافق نہ پائے (اور پھر بھی کمال کا مدعی ہو) تو یہ شخص مستدرج ہے اور اُس کو پتہ بھی نہیں۔ وہ اللہ تعالےٰ کے اس ارشاد کا مصداق ہے سنستدرجھم من حیث لا یعلمون۔ ہم اُن کو آہستہ آہستہ پکڑیں گے کہ اُن کو خبر بھی نہ ہوگی۔ اسی معنیٰ کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے۔ حاسبوا قبل ان تحاسبوا۔ اپنا محاسبہ خُود کرتے رہو اس سے پہلے کہ (قیامت میں) تم سے حساب لیا جائے گا اور (ہر وقت) ادب اور خوف کو اپنے اُوپر لازم سمجھے کیونکہ بخدا معاملہ سنگین ہے اور آج ہم ایسے زمانے میں ہیں جس میں بھلائی کے نشان بدل گئے اور راستے مختلف ہو گئے ہیں۔ بھلائی کی طرف بُلانے والے اور چلنے والے کم ہیں (زیادہ شر کی طرف بلانے والے اور شر کے راستہ پر چلنے والے

عہ ذکرہ الشارح فی شرح ھذا الحدیث ۱۲ ظ

ہیں) اللہ تعالےٰ اپنے فضل سے لطف کے ساتھ ہماری دستگیری فرمائیں (آمین وصلی اللہ علیٰ خاتم النبیین سیدنا محمد والہ واصحابہ اجمعین)۔

ف ۔ حق بات کو چھپایا نہیں جاسکتا ہر زمانے میں صدی کے شروع پر اللہ تعالےٰ اس اُمت میں مجدد پیدا فرماتے ہیں جو دین کی اصلی صُورت کو مُسلمانوں کے سامنے واضح کر دیتے اور حق کو باطل سے جُدا کر دیتے ہیں اور اہلِ قلوب کو اعتراف ہے کہ اس صدی کے مجدد حضرت حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہٗ تھے۔ پس مُسلمانوں کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تالیفات ومواعظ ورسائل کا مطالعہ کرنا اور حق وباطل کو اُن کے ارشادات سے معلوم کرنا چاہیئے۔

حضرتؒ کے وہ خدام ابھی تک زندہ ہیں جن کے سامنے حضرت اقدس نے ایک دو بار نہیں بلکہ بار بار فرمایا ہے کہ مسٹر گاندھی اس زمانے کا دجال ہے اسی لیے حضرتؒ کو کانگرس سے نفرت تھی اور اُس میں شرکت سے مُسلمانوں کو منع کرتے تھے۔ اب بعض عقلمندوں کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ جوازِ شرکت کانگرس کے لیے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ تعالےٰ علیہ کا وہ فتویٰ پیش کرتے ہیں جو (بہ تقدیر صحت نسبت کہ ہنوز اُسی میں کلام ہے) ۱۸۸۶ء کا لکھا ہُوا ہے جب کہ کانگرس میں گاندھی کا وجود بھی نہ تھا اثر تو کیا خاک ہوتا۔ اور حضرت حکیم الامتؒ نے شرکتِ کانگرس سے اُس وقت منع فرمایا ہے جب مسٹر گاندھی کا نام کانگرس اور کانگرس کا نام گاندھی ہو گیا اور وہ مسٹر گاندھی سے مہاتما گاندھی بن گیا تھا۔ اہلِ عقل سیاست دان طبقہ نے تجربہ کے بعد حضرت حکیم الامتؒ کے ارشاد کے موافق کھُلی آنکھوں دیکھ لیا کہ واقعی یہ شخص دجال ہے جس کا ظاہر صلح کل اور باطن دشمنِ اسلام ہے۔ دل کی دشمنی چھپی نہیں رہتی کبھی نہ کبھی ظاہر ہو ہی جاتی ہے۔ قد بدت البغضاء من افواھھم وما تخفی صدورھم اکبر قد بینا لکم الآیات ان کنتم تعقلون ٥

زیادہ افسوس اُن عُلماء پر ہے جو اب تک کانگرس کا دُم چھلّہ بنے ہُوئے

اور مُسلمانوں کو اُس کے ساتھ وابستہ رہنے کی تعلیم دے رہے ہیں حالانکہ کانگرس کی اسلام دُشمنی اب بالکل عیاں ہو چُکی ہے۔ واقعہ بہار و گڑھ مکتیشر میں اُس نے اپنی دُشمنی کا ایسا خونیں مظاہرہ کیا ہے جس کی نظیر ہندوستان کی تاریخ میں ہندو مُسلمانوں کے درمیان نہیں مل سکتی۔ مُسلمانوں کو ان نام نہاد علماء کی باتوں میں نہ آنا چاہیئے اور حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کے ارشادِ گرامی کو مشعلِ راہ بنا کر اس دجال سے اور اُس کی جماعت سے دُور ہی رہنا چاہیئے۔

دُوسرا دجال اس زمانے میں مرزا غلام احمد قادیانی تھا جو بہت سال ہوئے گزر چُکا مگر اُس کی جماعت باقی ہے مُسلمانوں کو اس جماعت سے بھی دُور رہنا اور اُس کے دجل و فریب سے بچتے رہنا چاہیئے۔

باب ہشت و ہفتم

حدیث

من استطاع منكم الباءة فليتزوج

عبداللہ (بن مسعود) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دن) ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ آپ نے فرمایا جو تم میں سے بیوی کے نان و نفقہ کا متحمل ہو اُس کو نکاح کرنا چاہیئے کہ وہ نگاہ کو زیادہ محفوظ کرتا اور شرمگاہ کو زیادہ پاک دامن بنا دیتا ہے اور جو اس کا متحمل نہ ہو سکے وہ روزہ کو اپنے اوپر لازم کر لے کہ وہ مادۂ شہوت کو کم کرنے والا ہے۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ اس میں نکاح کا امر ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلیتزوج فرمایا ہے جو امر کا صیغہ ہے اور یہ بھی معلوم ہُوا کہ روزہ مادۂ شہوت کو کمزور کر دیتا ہے۔ اسی لیے دُوسری روایت میں روزے کا حکم جوانوں کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ بوڑھوں میں یہ مادہ خود ہی کمزور ہو جاتا ہے اور وہ آسانی سے اُس کے تقاضے کو دفع کر سکتے ہیں۔ جوان آدمی اُس کے تقاضے کو آسانی سے دفع نہیں کر سکتا تو اُس کو روزہ کا حکم دیا گیا، اگرچہ وہ ہمت کرے تو بدون روزہ کے بھی یہ تقاضا دفع ہو سکتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اغض للبصر و احصن للفرج فرمایا ہے کہ روزہ نگاہ اور شرمگاہ کو زیادہ محفوظ کرتا ہے یعنی حفاظت کا ایک درجہ بغیر اُس کے بھی قدرت میں رہتا ہے۔ اسی لیے ہر شخص کو ہر حالت میں نگاہ اور شرمگاہ کی حفاظت کا شرعاً امر ہے خواہ اُس میں کتنی ہی زیادہ

شہوت ہو۔ کیونکہ آنکھیں نیچی کرلینا اور شرمگاہ کو حرام سے بچانا قدرت سے باہر کسی وقت بھی نہیں اگرچہ جوان کو اس میں بڑا مجاہدہ کرنا پڑتا ہے اور جب تک وہ دین میں مضبوط نہ ہو اس قدرت کو کام میں نہیں لاسکتا (مگر مجاہدہ اور مشقت لازم آنے سے قدرت سے خارج ہونا لازم نہیں آتا) یہ اور بات ہے کہ اسباب سہولت پر عمل کرنے کے بعد زیادہ آسانی ہو جاتی ہے۔ اسی لیے جوانوں کو روزے کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ زیادہ روزہ رکھنے سے اس مادّے کا تقاضا شدید نہیں رہتا (ھذا خلاصۃ ماذکرہ الشارح رحمہ اللہ)

(۲۲۷) انسان اسباب سے کام لینے کا مامور ہے

یہاں سے معلوم ہُوا کہ انسان اسباب سے کام لینے کا مامور ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرارت (شہوت) دفع کرنے کے لیے سبب سے کام لینے کا حکم فرمایا ہے کہ شادی کرلے اگر اس کی قدرت نہ ہو تو روزہ رکھے۔ اسی طرح جو بھی نفع اور ضرر ہو انسان کو اُس کے دفع یا تحصیل کے اسباب کو کام میں لانا چاہیئے۔ جس طرح بھی شریعت کے موافق اُسے قدرت ہو (یہ تو اس حدیث کا مدلول تھا) لیکن دُوسری حدیث اس کے معارض (بھی) ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ میں جوان ہوں اور مجھے اپنے اوپر زنا میں مُبتلا ہونے کا خطرہ ہے اور عورتوں سے شادی کرنے کی قدرت نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سُن کر خاموش رہے تو انہوں نے کئی مرتبہ اسی بات کو دُہرایا۔ تیسری دفعہ آپؐ نے فرمایا جو کچھ تم کو پیش آنے والا ہے قلم (تقدیر) اُس کو لکھ کر خشک ہو چکا ہے اب چاہے اسی پر اکتفا کرو یا (پریشانی) بڑھاتے رہو۔

یہاں حضورؐ نے ترک اسباب اور رضا بر قضا کا حکم فرمایا اور جس حدیث کی ہم شرح کر رہے ہیں اُس میں اس حالت کے زوال کی تدبیر اور اسباب زوال میں کوشش کرنے کا حکم ہے۔ دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ ابوہریرہؓ اصحاب صفہ میں سے تھے جن کو اکثر فاقہ کی نوبت پیش آتی تھی اور حضرت ابوہریرہؓ تو بھوک کی شدت

سے بے ہوش بھی ہو جاتے تھے پھر بھی اُن کی حرارتِ شہوت کم نہ ہوتی تھی۔ اس لیے اُن کو روزے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ توکل اور رضا بر قضاء کی تعلیم دی گئی (جواب کا حاصل یہ ہُوا کہ جب تک تدبیر نافع ہو تدبیر کرنے کا حکم ہے اور جب تدبیر بیکار ہو جائے اُس وقت تقدیر پر راضی رہنے کا حکم ہے۔ پس تعارض نہ رہا) چنانچہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اُونٹنی کو کُھلا چھوڑ کر اللہ تعالےٰ پر بھروسہ کروں (یا باندھ کر توکل کروں) فرمایا اعقلہا وتوکل اس کو باندھ دو اور اللہ پر بھروسہ کرو (اگر باندھنے کے بعد بھی کسی طرح بھاگ جائے (اور تلاش سے نہ ملے) تو اب تقدیر پر راضی ہو) غرض حضورؐ نے اس حدیث میں تو حکمِ شریعت بیان فرمایا ہے اور ابوہریرہؓ کے واقعہ میں حکمِ حقیقت بیان فرمایا ہے یعنی تسلیم و رضا۔

پس انسان کو چاہیئے کہ اسبابِ شرعیہ میں اپنی سی کوشش پُوری کرے جن کے اختیار کرنے پر عادۃ الٰہیہ یوں ہی جاری ہے کہ اُن سے نفع حاصل ہوتا یا ضرر دفع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اسباب پر نظر نہ کرے۔ یہ نہ سمجھے کہ ان ہی سے نجات ہوگی۔ بلکہ قضاء الٰہی کے سامنے گردن جُھکا دے اور سمجھ لے کہ نجات محض فضل سے ہوگی اس کے عمل سے نہ ہوگی۔ جیسا ابراہیم علیہ السلام نے اوّل تو ایمان کی تحقیق میں پُوری کوشش صرف کی (اپنی قوم کی کٹ حجتی کا پُوری طرح جواب دیا) مگر اس پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ (ساتھ ساتھ) یہ بھی فرمایا (ولا اخاف ما تشرکون بہ الا ان یشاء ربی شیئا وسع ربی کل شیئ علما۔ میں تمہارے ان جُھوٹے معبودوں سے اصلا نہیں ڈرتا (یہ میرا کچُھ نہیں بگاڑ سکتے) ہاں میرا پروردگار ہی کچُھ چاہے (تو اور بات ہے) میرا رب ہر چیز کو اپنی وسعتِ علم سے محیط ہے یعنی ابراہیم علیہ السلام مشیت پر بھروسہ کرنے والے تھے (اسباب پر نظر کرنے والے نہ تھے) اسی طرح ایک دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے تھے کہ شیطان ملعون آپ کے سامنے آیا اور کہنے لگا اے عیسیٰ! تمہارا قول یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالےٰ نے تقدیر میں لکھ دیا ہے وہی سامنے آتا ہے (تقدیر کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا) تو اپنے کو اس پہاڑ

کی چوٹی سے گرادو (جو تقدیر میں ہے وہی سامنے آئے گا) حضرت عیسٰی علیہ السلام نے فرمایا کہ آقا کو تو غلاموں کے امتحان کا حق ہے مگر غلام کو آقا کے امتحان کا حق نہیں۔ اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے باغ میں کام کر رہے تھے کہ ایک شخص نے کہا آپ لوگ تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ ہی رزق دیتا ہے وہی رزق کو بند کرتا ہے پھر آپ کی اس تدبیر اور محنت سے کیا فائدہ ؟ حضرت عثمانؓ نے فرمایا ہاں بات تو وہی ہے جو لوگ کہتے ہیں۔ یہ فرما کر پھر اپنے شغل میں لگ گئے (مطلب یہ تھا کہ ہماری تدبیر اور عمل کے بعد بھی وہی ملے گا جو مقدر میں ہے مگر جب تک تدبیر سے نفع کی امید ہو تدبیر کرنا چاہیے کہ عادت اللہ یہی ہے کہ اسباب اور تدبیر کے پردہ میں تقدیر کو ظاہر کیا جاتا ہے۔ جب تدبیر بیکار ہو جائے اس وقت تسلیم و رضا کے ساتھ تقدیر پر قانع ہونا چاہیئے)۔

انبیاء علیہم السلام اور سلف صالحین رضی اللہ عنہم کا طریقہ ہمیشہ سے یہی رہا ہے جو اس سے باہر ہُوا وہ راستہ سے بھٹک گیا جب وہ یہ سمجھے گا کہ میرا عمل سببِ نجات ہے تباہ ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ قدرتِ (الہٰی) کو پابند کر رہا ہے (جیسا معتزلہ کا قول ہے کہ نیک عمل پر ثواب دینا اور گناہوں پر سزا دینا خدا تعالیٰ پر لازم ہے یہ لوگ اللہ تعالےٰ کو مقید اور پابند کرنا چاہتے ہیں) اور یہ (صریح) گمراہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کسی کو اُس کا عمل جنت میں نہ پہنچائے گا۔ صحابہ نے کہا۔ یارسول اللہ! اور نہ آپ کو ؟ فرمایا مجھے بھی نہیں۔ مگر یہ کہ اللہ تعالےٰ کا فضل و رحم مجھے ڈھانپ لے اور حق تعالےٰ فرماتے ہیں من یضلل اللہ فلاھادی لہ جس کو اللہ گمراہ کر دے اُس کو ہدایت کرنے والا کوئی نہیں۔ جب اللہ تعالےٰ یہ چاہیں کہ کسی (نیک) عمل کرنے والے کا خاتمہ شقاوت پر ہو اور وہ گمراہوں میں داخل ہو تو اُس کے خلاف پر کسے قدرت ہے ؟ جیسے بلغم[ع] بن باعورا وغیرہ (کا حشر

ع بہت سے مفسرین ابن جریر اور قرطبی و سیوطی رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ یہ شخص اسم اعظم کا عالم تھا جس سے دعا کی جاتی تو قبول ہوتی ہے کچھ مانگا جاتا تو سوال پورا ہوتا ہے اس نے اسم اعظم کیساتھ موسیٰؑ پر اور ایک روایت میں ہے کہ یوشعؑ پر) بددعا کرنا چاہی تو اسم اعظم سلب کر لیا گیا۔ نعوذ باللہ من الحور بعد الکور ولمن نعمہ بعد الھدیٰ) ۱۲

ہُوا) اللہ کے حکم کو رد کرنے والا کوئی نہیں وہ جو چاہیں کریں اُن سے باز پُرس کرنے والا کوئی نہیں (مگر اس سے انسان کا مجبورِ محض ہونا لازم نہیں آتا۔ کیونکہ اُسں کو اپنی تقدیر کا علم نہیں۔ اس کو جن اعمال کا مکلف کیا گیا ہے وہ اُس کی قدرت سے باہر نہیں۔ جن اعمال سے اُس کا خاتمہ اچھا ہو سکتا ہے وہ بھی قدرت میں ہیں اور جن سے خاتمہ بُرا ہوتا ہے وہ بھی قدرت میں ہیں۔ اگر کسی کا خاتمہ بُرا ہوتا ہے وہ اپنے قصد و اختیار سے ایسے اعمال کا ارتکاب کرتا ہے جن کو خاتمہ خراب کرنے میں دخل ہے جیسے بلعم بن باعورا نے رسولِ وقت کے مقابلہ میں اسمِ اعظم سے بددُعا کرنے کا قصد کیا جس میں وہ ہرگز مجبور نہ تھا اس کے انجام کو جانتا تھا اسی لیے بار بار اپنی قوم کی درخواست کو رد کرتا رہا بالآخر بیوی کے بہکانے سے اس پر آمادہ ہُوا جس کا نتیجۂ بد سامنے آگیا کہ اسم اعظم کے ساتھ ایمان بھی سلب ہو گیا۔ نعوذ باللہ من ذالک

اسی طرح ابلیس نے قصداً سجدۂ آدم سے انکار کیا اور اپنے انکار کی منطقی وجہ بھی بیان کی کہ میں آدم سے افضل ہوں۔ وہ مٹی سے بنائے گئے ہیں میں آگ سے بنایا گیا ہوں اور اس انکار کے نتیجہ سے بھی وہ واقف تھا مگر تکبّر و غرور سے جان بوجھکر شقاوت کو اپنے سر لیا۔ چنانچہ کسی نے اُس کی حالت کو اس طرح بیان کیا ہے ؎

در لوحِ بُد نوشتہ کہ ملعون شود یکے
بر دم گمان بہر کس و بر خود گماں نبود
آدم ز خاک بود و من از نور پاک او
گفتم منم یگانہ و او خود یگانہ بود

پھر جو شخص اپنے عمل کو موجبِ نجات سمجھے گا وہ یقیناً اپنے کو نیک سمجھے گا اور یہ بڑی گمراہی ہے کیونکہ وہ اپنا تزکیہ کرتا ہے (اپنی حالت کو اچھا سمجھتا ہے) اور حق تعالےٰ فرماتے ہیں فلا تزکوا انفسکم ھو اعلم بمن اتقیٰ۔ اپنی تعریف خود مت کرو۔ اللہ تعالےٰ ہی خوب جانتے ہیں کہ متقی کون ہے۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ کے ذمے کسی کا تزکیہ نہ کرو (یعنی یہ نہ

کہو کہ یہ شخص اللہ کے نزدیک مقبول اور مقرب ہے، تم کو اس کی کیا خبر۔ ہاں جن کے متعلق اللہ تعالےٰ نے خبر دے دی ہے اُن کا تزکیہ کر سکتے ہو) اس حدیث کا شانِ بیان یہ ہے کہ ایک شخص کا انتقال ہوگیا تو صحابہ نے اس کی تعریف کی (کہ اے فلاں تجھ کو جنت مبارک ہو، تجھ کو خُدا کا قرب مبارک ہو۔ اس وقت آپ نے فرمایا کہ اللہ کے ذمے کسی کا تزکیہ نہ کرو) پھر فرمایا ہاں یوں کہو (کہ میرا گمان یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے تجھ کو مقامِ قرب عطا فرمایا ہوگا۔ میرے خیال میں تو شہادت سے کامیاب ہُوا ہے مثلاً) اور یہ حدیث اُس حدیث کے معارض نہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اذا رأیتم الرجل یواظب المسجد فاشهدوا له بالایمان۔ جب تم کسی کو دیکھو کہ مسجد کو لگا لپٹا رہتا ہے تو اس کے متعلق مومن ہونے کی شہادت دو۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو حالت تمہارے سامنے ہے اُس کی شہادت دو۔ رہا باطن اور انجام کا حال تو اُس کو تم کیا جانو؟ یہ معاملہ اللہ کے سپرد ہے وہی جس کو چاہیں گے اپنے فضل سے اچھا کر دیں گے اور جس کو چاہیں گے اپنے عدل سے عذاب دیں گے۔ حق تعالےٰ نے اپنے رسول کی طرف سے ارشاد فرمایا ہے وما ادری مایفعل بی ولا بکم۔ مجھے کیا خبر کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟ اور تمہارے ساتھ کیا؟ (آیت میں معاملۂ آخرت مراد نہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا آخرت میں کامیاب ہونا یقینی ہے جس کا علم خود انبیاء کو بھی یقین کے ساتھ ہوتا ہے بلکہ مراد دنیوی معاملہ ہے کہ مجھے معلوم نہیں کہ دُنیا میں مجھے غلبہ ہوگا یا تم کو اور مجھے غلبہ ہوگا تو جلدی ہوگا یا دیر میں اور مکہ میں رہتے ہوئے ہوگا یا باہر جاکر ہوگا وغیرہ وغیرہ)۔

نیز حق تعالیٰ کا ارشاد ہے لا یسئل عما یفعل۔ اللہ تعالےٰ سے اُن کے افعال کے متعلق کوئی بازپُرس کرنے والا نہیں۔ اس آیت کے سامنے گردنیں جُھک گئیں اور بڑے بڑے اعمال والے اخلاص والے اس آیت کے خوف سے پست ہو گئے۔ پس نجات اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم ہی پر موقوف ہے عمل یا کثرتِ عمل پر مدار نہیں

ہاں یہ ضرور ہے کہ عمل سے مومن کو بشارت (اور خوشی) ہوتی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنی مراد کی توفیق دی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے فسنیسرہ للیسری (جو شخص نیک اعمال ایمان کے ساتھ بجالاتا ہے) ہم اُس کو آسان راستہ کی (یعنی حصولِ جنت کی) توفیق دیتے ہیں نیز ارشاد ہے وسنیسرہ للعسری اور (جو شخص بُرے اعمال کرتا اور اچھی بات کو جُھٹلاتا ہے یعنی کُفر اختیار کرتا ہے) ہم اُس کو مصیبت کے راستہ کی (یعنی دخولِ جہنم کی) توفیق دیتے ہیں۔ تو جس شخص کو نیک اعمال کی توفیق ہو رہی ہے اُس کو خوشی ہوتی ہے اور اللہ کے فضل کی قوی اُمید ہو جاتی ہے جو اس آیت میں مذکور ہے۔ حق تعالےٰ شانہٗ اُن لوگوں کا ذکر فرما کر جن کو نیک اعمال کی توفیق دی گئی ہے ارشاد فرماتے ہیں اولئک یرجون رحمة الله۔ یہی لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں جس میں رجا کو اُن لوگوں کا حصہ قرار دیا گیا ہے جن میں اعمالِ مذکورہ موجود ہوں اور یہ اوصاف اُن ہی کے ہیں جن کو اعمالِ جنت کی توفیق دی گئی ہے۔ اور جس شخص کے لیے اہلِ شقاوت کے اعمال آسان کر دیئے گئے اُس کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اُسے جہنم کی طرف آہستہ آہستہ لے جایا جا رہا ہے۔ اُس پر لازم ہے کہ اس راستہ سے جلدی ہٹے اپنے رب کی طرف رجوع کرے۔ توبہ استغفار کی کثرت کرے اور اللہ تعالےٰ سے مدد چاہے اُمید ہے کہ وہ اس کو قبول فرمالیں گے اور شقاوت کے راستہ سے ہٹا دیں گے اور اپنے فضل و کرم سے نیک اعمال کی توفیق دے دیں گے۔

اس تقریر سے دونوں حدیثیں جمع ہوگئیں (اور کوئی تعارض باقی نہ رہا) مطلب یہ ہے کہ اسباب سے کام لینا چاہیئے مگر اُن پر بھروسہ نہ کیا جائے۔ اعمال کے بعد بھی اللہ تعالےٰ کے فضل و احسان پر نظر رکھے جس سے ان اعمال کی توفیق ہوئی اور ساتھ ساتھ تکالیف کے دفع اور نعمت کے تمام و کامل ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف التجا و دُعا و استغاثہ بھی کرتا رہے اور تقدیرِ الٰہی کے سامنے گردن تسلیم خم کیے رہے خیر ہو یا شر، شیریں ہو یا تلخ (سب پر راضی رہے) لیکن یہاں تسلیم و رضا میں (ایک قید

رکھانے کی ضرورت ہے (وہ یہ کہ تکوینیات میں تو خیر و شر دونوں سے راضی رہے اور تشریعیات میں نیک اعمال سے خوش اور گناہوں سے رنجیدہ ہونا چاہیئے) کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں المؤمن تسرہ حسناتہ وتسوءہ سیئاتہ. مومن کو اپنی نیکیوں سے خوشی ہوتی ہے اور گناہوں سے رنج ہوتا ہے (مگر یہ رنج اپنے سے ہوتا ہے. اللہ تعالےٰ سے نہیں ہوتا. کیونکہ اللہ تعالےٰ نے کسی کو گناہوں پر مجبور تو نہیں کیا. ہر شخص اپنے ارادہ و اختیار سے گناہ کرتا ہے اور جس سے بلا ارادہ کسی کی زبردستی سے یا اپنی بھول چوک سے گناہ ہو جائے وہ معاف ہے لما فی الحدیث رفع عن امتی الخطاء والنسیان وما استکرھوا علیہ) پس مومن (تکوینیات میں) ہمیشہ قضا و قدر کے سامنے گردن جھکائے جو کچھ بھی پیش آئے اُس پر راضی رہتا ہے اور جس حالت میں اللہ تعالےٰ ٹھہرا دیں اُس کے سوا کا طالب نہیں ہوتا نہ اُس کو بدلنا چاہتا ہے یہاں تک کہ حق تعالےٰ خود ہی اُس کو بدل دیں.

ایک صوفی سے کسی نے پوچھا کہ تم نے یہ درجہ کیسے پایا؟ کہا اللہ تعالےٰ نے مجھے جس مقام پر پہنچا دیا میں نے اُس سے منتقل ہونا پسند نہ کیا یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ ہی نے مجھے اُس سے (آگے) منتقل کر دیا. اسی حقیقت پر نظر کر کے کام بنانے والے کامیاب ہو گئے اور نفع حاصل کرنے والے سُود مند ہو گئے. پھر (یہ بھی ضروری ہے کہ) ہمیشہ اپنی حالت کا تفقد رکھے (اُس پر نظر کرتا رہے کہ) اگر کسی معصیت یا بدعت میں اس کو مبتلا کر دیا گیا ہو تو اُس سے راضی نہ ہو کیونکہ مومن کی علامت یہ ہے کہ اُس کو گناہ یا بدعت سے خوشی نہ ہو اُس وقت اس کو اللہ تعالےٰ سے فریاد کرنا چاہیئے اور اس راستہ سے ہٹنا چاہیئے جس پر چل رہا ہے اور پُوری کوشش کے ساتھ اس سے خلاصی پانے کی تدبیر کرے. اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرنے کے لیے کیونکہ حق سبحانہٗ فرماتے ہیں ولا یرضیٰ لعبادہ الکفر اللہ تعالےٰ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتے (اور ہر معصیت و مخالفت کفر ہی کی شاخ ہے اُس کو بھی اللہ تعالےٰ پسند نہیں فرماتے) اور جس چیز کو آقا اپنے

بندہ کے لیے پسند نہیں کرتا بندہ بھی اُس کو اپنے لیے پسند نہیں کر سکتا.

قولہ وفی ھذا دلیل علی ان المرء مامور بعمل الاسباب الیٰ قولہ فلا یرضاہ العبد لنفسہ.

ف ۔ یہاں سے اُن لوگوں کی غلطی واضح ہو گئی جو کہتے ہیں کہ مسئلہ تقدیر نے مسلمانوں کی ہمتیں پست کر دی ہیں. وہ اعتقاد تقدیر کی وجہ سے تدبیر سے کام نہیں لیتے اُن کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلام نے اعتقاد تقدیر کے ساتھ تدبیر کا بھی حکم دیا ہے. اب جو لوگ تدبیر کو چھوڑتے ہیں اپنی جہالت کی وجہ سے چھوڑتے ہیں اسلام کی یہ تعلیم نہیں. مسئلہ تقدیر پر سب سے زیادہ پختہ اعتقاد حضرات صحابہؓ کا تھا. پھر کیا کسی نے اُن کے برابر بلند ہمت کوئی قوم دیکھی ہے یا اُن سے بڑھ کر مدبر اور منتظم کوئی جماعت بھی دیکھی گئی ہے؟ عقیدۂ تقدیر کا فائدہ یہ ہے کہ اگر کسی وقت تدبیر کارگر نہ ہو، اسباب بے کار ہو جائیں تو انسان پریشانی سے بدحواس نہ ہو یہ سمجھ کر تسلی کر لے کہ مقدر یہی تھا اسی طرح کامیابی کے بعد تکبر و غرور میں مُبتلا نہ ہو بلکہ اس کامیابی کو اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم کا نتیجہ سمجھے. انسان کی حالت میں اعتدال یوں ہی پیدا ہو سکتا ہے.

ف ۔ یہ تو یقینی بات ہے کہ اللہ تعالےٰ کی رحمت غضب پر غالب ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ اللہ تعالےٰ اپنے وعدے کے خلاف نہ کریں گے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ اللہ تعالےٰ کی رحمت اختیاری ہے جبری نہیں اور وعدہ کر لینے سے اُن کی قُدرت سلب نہیں ہو گئی. اگر وہ کسی نیک کو عذاب کرنا چاہیں یا بد کو بخشنا چاہیں تو کسی کی مجال نہیں کہ اللہ تعالےٰ سے باز پُرس کر سکے. یہی شانِ قُدرت ہے جس کے سامنے جملہ انبیاء و اولیاء کی گردنیں جُھکی ہوئی ہیں گو اُن کو اس کا بھی یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نیک کو بلا وجہ عذاب نہ کریں گے لیکن کسی نے اُن کو مجبور بھی نہیں کیا نہ کر سکتا ہے. یہی حقیقت ہے اس مسئلہ کی جس کو امکانِ کذب کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے. یہ عنوان اچھا نہیں مگر مضمون بالکل صحیح ہے ورنہ اللہ تعالےٰ کا مجبور اور پابند ہونا لازم آئے گا جو شان الوہیت کے منافی اور لا یسئل عما یفعل کے

خلاف ہے۔ اسی شانِ بے نیازی نے اچھے اچھوں کے پتے پانی کر دیئے ہیں جس پر جسقدر عظمت شان منکشف ہوتی ہے اسی قدر لرزاں ترساں رہتا ہے ؎

مقرباں رابیش بود حیرانی

(۲۲۸) سوال سے پہلے ہی مسئلہ بتلا دینا واجب ہے

یہاں سے معلوم ہوا کہ عالم پر واجب ہے کہ سوال سے پہلے ہی تعلیم کر دے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو اُن کے سوال سے پہلے ہی بتلا دیا کہ اُن کو کیا کرنا چاہیئے۔ لیکن اس کے معارض اعرابی کی مشہور حدیث ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی طلب سے پہلے تعلیم نہیں دی دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ مخاطب کی حالت میں نظر کی جائے۔ اگر یہ معلوم ہو کہ وہ بات نہ مانے گا یا اس وقت تو مان لے گا پھر چھوڑ دے گا یا بھول جائیگا تو اُس کی تعلیم لازم نہیں جب تک وہ خود سوال نہ کرے جیسا حضورؐ نے اعرابی کے ساتھ کیا اور اگر یہ معلوم ہو کہ جو کچھ اس سے کہا جائے گا قبول کرے گا اس کو سوال سے پہلے ہی تعلیم کر دی جائے۔ جیسا اس حدیث میں مذکور ہے۔ قولہ وفیہ دیل علیٰ ان العالم یجب علیہ ان یعلم قبل السوال الی قولہ کما فعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی ھذا الحدیث۔

ف۔ یہ توصحیح ہے کہ تعلیم کا قبل از سوال واجب ہونا یا نہ ہونا مخاطب کی حالت اور موقعہ و مقام پر موقوف ہے۔ مگر یہ دعویٰ امشکل ہے کہ حضورؐ نے اعرابی کو قبل از سوال اس لیے تعلیم نہیں دی کہ اُس کے قبول نہ کرنے یا چھوڑ دینے کا اندیشہ تھا کیونکہ اعرابی صحابی تھا اور صحابہ کی شان سے یہ بعید ہے کہ حضورؐ کی بات کو قبول نہ کریں یا سُن کر چھوڑ دیں فان الصحابۃ کلھم عدول۔ ظاہر یہ ہے کہ جب اُس نے نماز خُود شروع کر دی تو تعلیم کا یہ وقت نہ تھا کیونکہ ظاہر یہ ہے کہ جو شخص بدون سوال کے عمل شروع کرتا ہے وہ اُس کا طریقہ جانتا ہے مگر حضورؐ اس کی نماز کو دیکھتے رہے جب اُس نے بدون تعدیل ارکان کے نماز پڑھی حضورؐ نے اس کا انتظار کیا کہ نماز سے فارغ

ہو کر مجلس میں آئے تو تعلیم کی جائے تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ بدون تعدیل ارکان کے نماز ناقص رہتی ہے۔ چنانچہ وہ مجلس میں آیا اور سلام کیا تو آپؐ نے فرمایا ارجع فصل فانك لم تصل۔ واپس جاؤ نماز پھر پڑھو کیونکہ تُم نے نماز نہیں پڑھی۔ حضورؐ نے اس مختصر اشارہ پر اکتفا کیا تاکہ وہ خود سمجھے کہ مَیں نے کیا غلطی کی؟ جب دو تین دفعہ نماز کا اعادہ کر کے بھی وہ اپنی غلطی کو نہ سمجھا تو اُس نے دریافت کیا کہ مجھے بتلایا جائے۔ اُس وقت آپؐ نے تفصیل سے بتلایا کہ نماز اس طرح پڑھنا چاہیئے اس واقعہ میں اجمالی تعلیم تو اس کے سوال سے پہلے ہی کر دی گئی تھی۔ تفصیلی تعلیم طلب کے بعد ہوئی کیونکہ اجمال کے بعد تفصیل زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ تعلیم کا یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ اولاً اجمالی تعلیم ہو پھر تفصیلی تاکہ اجمال سے مخاطب خود سمجھنے کی کوشش کرے۔

چونکہ نماز ایسا عمل ہے جو رات دن میں پانچ دفعہ فرض ہے اُس کے طریقہ سے ناواقف ہونا معمولی بات نہیں بہت سخت بات تھی اس لیے پہلی بار تفصیل کی حاجت نہیں سمجھی گئی بلکہ اجمال پر اکتفا کیا گیا کہ ایسے عمل کی کوتاہی کو ادنیٰ اشارہ سے انسان سمجھ سکتا ہے جب تین دفعہ کے اشارہ سے بھی وہ نہ سمجھا اُس وقت تفصیل کے ساتھ تعلیم دی گئی اور جس مسئلہ کا اس حدیث میں ذکر ہے جس کی ہم شرح کر رہے ہیں وہ نماز کے برابر کثیر الوقوع نہیں۔ نہ ہر شخص کو اُس کی حاجت اس لیے اُس کو پہلی ہی بار تفصیل سے بیان کر دیا گیا۔ ھذا ما عندی والعلم عند اللہ سبحانہ وتعالیٰ۔

(۲۲۹) انسان کو اپنے تمام افعال پر نظر کر کے ان اعمال کو اختیار کرنا چاہیئے جن کو قرب میں زیادہ دخل ہو

یہاں سے معلوم ہوا کہ انسان کو اپنے تمام افعال میں نظر کر کے اُس عمل کی طرف سبقت کرنا چاہیئے جس کو قربت میں زیادہ دخل ہو۔ ادنیٰ کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (جوانوں کو) اوّل نکاح

کا حکم دیا ہے جو ثواب و قرب میں روزہ سے بڑھا ہوا ہے۔ پہلے روزہ کا حکم نہیں دیا جب تک بیوی کے نان و نفقہ کی طاقت مفقود نہ ہو کیونکہ نکاح میں بڑا ثواب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تناکحوا تناسلوا ایامی بکم الامم یوم القیمۃ۔ نکاح کرو نسل کو بڑھاؤ میں قیامت کے دن تمہاری (کثرت) سے دوسری اُمتوں پر فخر کروں گا (کہ میری اُمت سب سے زیادہ ہے) اگر نکاح اس نیت سے ہو (کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت بڑھے گی اور آپ خوش ہوں گے) تو اُس کی فضیلت میں کیا شبہ ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لا رھبانیۃ فی الاسلام اسلام میں رہبانیت نہیں کہ عورتوں سے الگ رہا جائے۔ اگر عورتوں سے الگ رہنے (اور نکاح نہ کرنے) میں فضیلت ہوتی تو شریعتِ اسلام میں اُس کا ضرور حکم ہوتا۔ کیونکہ جملہ ادیان سماویہ میں اسلام ہی سب سے بہتر دین ہے (جب اسلام میں رہبانیت نہیں تو معلوم ہوا کہ نکاح ہی افضل ہے)۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ میں عورتوں سے نکاح کرتا ہوں حالانکہ مجھے ان کی حاجت نہیں اور اُن سے ہم بستر بھی ہوتا ہوں حالانکہ مجھے اُن کی شہوت نہیں۔ لوگوں نے دریافت کیا یا امیر المؤمنین! پھر آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ فرمایا۔ محض اس اُمید پر کہ شاید اللہ تعالےٰ میری پُشت سے کوئی بچہ پیدا کر دیں جس سے قیامت کے دن محمد صلی اللہ علیہ وسلم دُوسری اُمتوں پر فخر کریں (اور جب اس نیت سے ہمبستری کی جائے گی تو وہ شہوت بھی پیدا ہو جائے گی جس پر ہمبستری موقوف ہے مگر وہ شہوت حیوانی نہ ہوگی بلکہ انسانی اور روحانی ہوگی) بہرحال چونکہ نکاح کو دوسرے اعمال (مستحبہ) پر فضیلت ہے اس لیے حضورؐ نے اُس کو پہلے بیان کیا اور روزہ پر مقدم فرمایا اور یہاں سے معلوم ہوا کہ انسان اُسی عمل کا مکلف ہے جس پر اُسے قدرت ہو اور تعمیل کر سکے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن لوگوں کو جو نکاح پر قادر نہ ہوں روزہ کا حکم دیا ہے یہ نہیں فرمایا کہ نکاح کی تدبیر کرے اور جس طرح بھی ہو اس کی کوشش کرے کیونکہ نکاح افضل ہے بلکہ آپ نے اس صورت میں صرف روزہ

کا حکم دیا ہے۔

قولہ وفیہ دلیل علی ان المرأ ما مور ان ینظر فی کل افعالہ ما ھو اقرب الی ربہ الی قولہ وانی امرع بالصوم۔

ف۔ ایک عالم نے خوب فرمایا کہ ہمارے اعمال صالحہ میں کوئی عمل ایسا نہیں جس پر دل کو یہ اطمینان ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس سے خوش ہوں گے کیونکہ ہر عمل میں اخلاص کے کم ہونے یا نہ ہونے کا شبہ اور نفس کی آمیزش کا احتمال رہتا ہے۔ بس نکاح ہی ایک ایسا عمل ہے جس کے بعد اولاد نصیب ہو جائے تو دل کو اطمینان ہو سکتا ہے کہ اس سے یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوں گے۔ اسی لیے محققین صوفیاء کو نکاح کا ہمیشہ اہتمام رہا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش کرنے کا یہ آسان طریقہ ہے کہ مسلمانوں کا سلسلۂ پیدائش زیادہ ہو اور اولاد مسلمان اور سچی مسلمان ہو اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ مسلمان خود بھی نماز روزہ وغیرہ کی پابندی کریں اور اپنی اولاد کو بھی پابند بنائیں۔

ف۔ بیوی سے ہمبستری میں یہ نیت تو بڑے درجہ کے لوگوں کا حصّہ ہے کہ اگر یہ نیت نہ ہو بلکہ قضاءِ شہوت ہی کی نیت ہو پھر بھی معرفت کو ترقی ہو سکتی ہے کیونکہ اس میں انسان کو اپنے عجز کا مشاہدہ ہوتا ہے اور اپنے عجز کے مشاہدہ سے بھی معرفت بڑھتی ہے (قالہ سیدی حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہٗ)

ف۔ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ جس شخص کو بدون نکاح کے زنا میں مُبتلا ہونے کا اندیشہ ہو اُس پر نکاح واجب ہے جبکہ نان و نفقہ کی قدرت ہو اور جس کو یہ اندیشہ نہ ہو اُس کے بارے میں اختلاف ہے کہ اُس کو نوافل میں مشغول ہونا افضل ہے یا نکاح کرنا افضل ہے؟ حنفیہ کے نزدیک نکاح کرنا افضل ہے کہ اس کی وجہ سے نوافل طاعات میں کمی ہو جائے اور شافعیہ کے نزدیک نوافل طاعات میں مشغول ہونا نکاح سے افضل ہے مگر یہ حدیث حنفیہ کی دلیل ہے جیسا حضرت شارح کی تقریر سے ظاہر ہے۔

(۲۳۰) اعمالِ مستحبہ کی فضیلت نفسِ عمل کی جہت سے نہیں بلکہ عامل کی جہت سے ہے

یہاں سے معلوم ہُوا کہ اعمالِ (مستحبہ) کی فضیلت (نفس) عمل پر نظر کرکے نہیں بلکہ عامل کی جہت سے ہوتی ہے۔ دیکھو جس کو نکاح کی قدرت نہ ہو اُسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ کا امر فرمایا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر شخص کو اسی عمل کا امر فرماتے ہیں جو اُس کے حق میں زیادہ موجبِ قرب ہو اور اس شخص کے حق میں روزہ کا افضل ہونا بالکل ظاہر ہے جس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ کیونکہ جب وہ افلاس کی وجہ سے نکاح کی قدرت نہیں رکھتا تو روزہ اُس کے مقصود میں معین ہوگا۔ روزہ میں کچھ خرچ بھی نہیں اور مادۂ شہوت اسی سے کم ہوجاتا ہے اب وہ سکونِ خاطر کے ساتھ وساوس (شہوانیہ) سے نجات پاکر دل سے آخرت کے کاموں میں مشغول ہوگا پوری طرح اللہ تعالےٰ کی طرف متوجہ ہوگا اور یہی مطلوب ہے اور اگر اُس کو (اس حالت میں) نکاح کا حکم کیا جاتا تو پریشانی میں پڑجاتا۔ اللہ تعالےٰ کی طرف متوجہ نہ ہوسکتا کیونکہ وہ کمانے اور روپیہ جمع کرنے میں مشغول ہوگا حالانکہ مفلس ہے اور افلاس کی حالت میں روپیہ جمع کرنے کی تدبیر کرنا آسان کام نہیں) تو وساوس کی کثرت ہوگی اُس کا دل دُنیا ہی کے بکھیڑوں میں اُلجھ جائے گا اور آخرت کی تدبیر سے کورا ہوجائے گا۔

کسی عمل کو افضل و مفضول اُس وقت کہا جائے گا جب دونوں پر قدرت ہو ورنہ جس پر قدرت ہو وہی افضل ہے

غرض شارح علیہ السلام نے جن اعمال کی فضیلت بیان فرمائی ہے اُن میں افضل اور مفضول کو اُس وقت دیکھا جائے گا جب دونوں پر قدرت ہو اور اگر کسی عمل پر قدرت نہ ہو تو جس پر جس کو قدرت ہے اُس کے حق میں وہی افضل ہوگا چنانچہ جو شخص نکاح پر قادر نہ ہو اُس کے لیے روزہ افضل ہے اور جو نکاح پر قادر ہو (روزہ پر قادر نہ ہو) اُس کے لیے نکاح افضل ہے (اور جو دونوں پر قادر ہو اُس کے حق میں نکاح افضل ہے) اسی طرح تمام افعال میں غور کرنا چاہیئے خواہ دنیوی اعمال ہوں یا اخروی اور اگر تحقیق سے کام لیا جائے تو تمام اعمال (مباحہ) ہیں۔ کوئی عمل بھی دنیوی نظر نہ آئے گا اگر اس میں نیت اچھی ہو۔ ہیشں بریں نیست کہ وہ خالص دُنیا کمانے کا شغل ہو گا تو وہ بھی دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو شخص صاحبِ عیال ہے یا مجرد ہے۔ اگر مجرد ہے اور نیت یہ ہے کہ شغلِ معاش سے اللہ تعالےٰ کی طاعت میں مدد ملے گا تو اُس میں بھی بڑا ثواب ملے گا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں من بات تعبا نا من طلب الحلال بات مغفو داله۔ جو شخص حلال روزی کمانے کی وجہ سے رات کو تھکا ماندہ رہے وہ بخشا بخشایا رات گزارے گا۔ اب سوچو کہ شبِ قدر کا انتظار سال بھر مغفرت کی ہی اُمید پر تو کیا جاتا ہے اور وہ اس شخص کو طلب حلال کے شغل سے حاصل ہوجاتی ہے تو یقیناً یہ عمل آخرت کا ہُوا (دُنیا کا کام نہ ہُوا کیونکہ جس کام سے مغفرت حاصل ہو وہ آخرت ہی کا کام ہے) اور اگر صاحب عیال ہے تو اس کو تو مجرد آدمی سے بھی زیادہ بھلائی (اور ثواب) ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ گناہوں میں بعض گناہ ایسے ہیں جن کا کفارہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بال بچوں کے لیے مشقت برداشت کی جائے (طبرانی اور ابونعیم نے اس حدیث کو ان الفاظ سے روایت کیا ہے ان من الذنوب ذنوبا لا یکفرھا الصلاۃ ولا الصوم ولا الحج و یکفرھا الھم فی طلب المعیشۃ۔ گناہوں میں بعض گناہ ایسے ہیں جن کا کفارہ نہ نماز سے ہوتا ہے نہ روزہ سے نہ حج سے ان کا کفارہ طلبِ معاش کی فکر سے ہوتا ہے) بشرطیکہ طلبِ معاش شریعت کے موافق (جائز طریقے سے) ہو۔

دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خبر دے رہے ہیں کہ بعضے گناہ ایسے بھی ہیں جن کا کفارہ نہ وقوفِ عرفہ سے ہوتا ہے نہ قیام لیلۃ القدر سے نہ کسی اور عمل سے (بجز فکرِ معاش کے) کیونکہ آپؐ نے نفی اور استثناء کے ساتھ کلام فرمایا ہے (جو حصر کے لیے ہے) جس

سے بجز مستثنیٰ کے اور سب کی نفی ہو رہی ہے (یہ گفتگو اُن الفاظ کی بنا پر ہے جو حضرت شارح نے روایت کئے ہیں۔ مگر طبرانی اور ابونعیم کے الفاظ میں تو صاف تصریح ہے کہ اُن کا کفارہ نہ نماز سے ہوتا ہے نہ روزہ سے نہ حج سے) تو اب (مؤمن کے) سب کام آخرت ہی کے لیے ہو گئے دُنیا کے لیے نہ رہے جبکہ اُن شروط کی رعایت کی جائے جن کا اُوپر ذکر ہوا (کہ اعمالِ دنیویہ شریعت کے موافق جائز ہوں اور ان میں نیّت صحیح ہو کہ دُنیا کا کام اس لیے کیا جائے کہ اس سے دین میں مدد ملتی ہے) اس حقیقت پر نظر کر کے اور نیت کو درست کر کے ہی صوفیاء کرام بزرگی کے درجہ کو پہنچ گئے اور (دُوسروں سے) ممتاز ہو گئے۔ بلند درجات اور فضیلت میں سبقت لے گئے، اگرچہ (ظاہر میں) وہ اور دوسرے لوگ اعمال میں برابر نظر آتے ہیں مگر اُن کی ہر حرکت اللہ کے لیے اور اللہ کے (حکم کے) ساتھ ہوتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ جو بات بھی زبان سے نکالتے ہیں قربِ الٰہی کا سبب ہوتی ہے کیونکہ وہ ان چیزوں پر نظر رکھتے ہیں جن پر ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اُن کے واقعات اس پر شاہد ہیں۔

چنانچہ ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ شدّت قحط کی وجہ سے لوگوں کو استسقاء کی ضرورت ہوئی تو اُن کے پاس ایک دوست کا پیغام آیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر خاص وسیلہ سے دُعا کریں شاید مخلوق پر رحمت ہو جائے۔ پیغام لانے والے نے دیکھا کہ یہ حضرت اپنے دنیوی کاروبار میں مشغول ہیں رات کو گھر آتے ہیں اور دن کو کاروبار میں لگ جاتے ہیں اس کو تعجب ہُوا کہ جو شخص دنیوی کاروبار میں مشغول ہے وہ اس لائق کہاں کہ اُس سے بارش کے لیے دُعا کرائی جائے۔ یہ شخص تین دن اُن کے پاس رہا۔ پھر لوٹنے کا ارادہ کیا تو پیغام کا جواب لینا چاہا۔ فرمایا میرے دوست سے کہہ دینا کہ اگر تم کو یہ معلوم ہو کہ میرا کوئی سانس بھی اللہ (کی یاد) کے بغیر نکلتا ہے تو میں اُسی وقت اپنے کو جان سے مار ڈالوں گا۔

اللہ کے ساتھ اُن کا معاملہ یہ تھا مگر عام لوگ اُن کی حالت دیکھ کر یہ گمان کرتے تھے کہ بس دُنیا میں منہمک ہیں، حالانکہ وہ دُنیا سے الگ تھے دل دُنیا کے خیالات سے فارغ تھا۔

اُن کا جسم مخلوق کے ساتھ تھا اور روح و قلب اللہ کے ساتھ اور اُس کی تمام تر بنیاد وہی نیت تھی اور نیت کی درستی اور نیت پر جمارہنا اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ اور دوسرے لوگ ثواب وغیرہ میں برابر ہی ہوتے (مگر تصحیح نیت نے دونوں میں زمین آسمان کا فرق کر دیا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں انما الاعمال بالنیات وانما لکل امرء مانوی۔ بس اعمال کا مدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کو وہی ملتا ہے جو اُس کی نیت ہوتی ہے۔ اس حقیقت کی وجہ سے یہ حضرات حق تعالیٰ کے اس ارشاد کا مصداق بن گئے وتری الجبال تحسبها جامدة وهي تمر مر السحاب صنع الله الذي اتقن كل شيئ۔ اور تم (قیامت میں) پہاڑوں کو دیکھ کر یہ گمان کروگے کہ وہ اپنی جگہ پر جمے ہوئے ہیں حالانکہ وہ بادلوں کی طرح چلتے ہوں گے۔ یہ کارنامہ ہے اُس خُدا کا جس نے ہر چیز کو اچھی طرح بنایا ہے۔

اسی طرح عامی شخص ان بزرگوں کو دنیوی کاروبار میں مشغول یا اس سے محبت کی باتیں کرتے ہوئے اور اندرونی و بیرونی معاملات میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھ کر یہ گمان کرتا ہے کہ وہ ہمہ تن اُس کے ساتھ ہیں حالانکہ واقعہ یہ نہیں بلکہ صرف اُن کا جسم اُس کے ساتھ ہے اور قلب و روح ملکوت کی سیر میں مشغول ہیں۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے دوستوں سے باتیں کرتے اور دل لگی کرتے ہوئے بہت مقامات طے کر لیتے ہیں جو اللہ تعالےٰ نے اُن کے واسطے مقرر فرمائے ہیں۔ مگر یہ بات اہلِ ہمّت اور اصحابِ تمکین کو حاصل ہوتی ہے جو اپنے حالات میں پختہ ہو چکے ہیں جس نے اُن کی عقل و فہم کے پردے اُٹھا دیئے ہیں۔ اب وہ اللہ تعالےٰ کی ہر بات کو سمجھتے ہیں جو اللہ تعالےٰ اُن سے کہنا چاہتے ہیں پھر اُس کی تعمیل پر سبقت کرتے ہیں۔ یہی ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث (باطنی) سے پُورا حصّہ ملا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی شان تھی چنانچہ آپؐ کے متعلق اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔ ما زاغ البصر وما طغیٰ۔ آپؐ کی نگاہ نہ (مقصد سے) مائل ہوئی نہ حد سے آگے بڑھی اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تنام عینای ولا ینام قلبی

(نیند کی وجہ سے) میری آنکھیں تو سوتی ہیں مگر دل بیدار رہتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیند میں بھی غافل نہ ہوتے تھے اور حبیب اللہ تعالے آپؐ کو اُن چیزوں پر مطلع فرماتے جن پر مطلع فرمایا ہے (یعنی ملکوت وجنّت وغیرہ) تو آپ کو یہ چیزیں (اللہ تعالےٰ سے) غافل نہ کرنے پاتیں نہ آدابِ عبودیت (و بندگی) سے ہٹا سکتیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم بیبیوں بچّوں سے مزاح بھی فرماتے ان کا دل بہلاتے دلجوئی فرماتے اُن کے ساتھ مل کر اُن کے کاموں میں حصّہ بھی لیتے تھے مگر آپ کا باطن سیرِ ملکوت میں مشغول ہوتا تھا جہاں اللہ تعالےٰ پہنچانا چاہتے۔ ان بزرگوں نے جن کا ذکر ابھی ہُوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حالت سے پُورا حصّہ لیا تھا۔ مگر حضورؐ کے مقامِ خاص تک کسی کی رسائی نہیں ہوسکتی (بس اتباع کی برکت سے اس مقام کی تجلی اور فیض کا ورود اُن پر ہوتا ہے) چنانچہ ایک بزرگ سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ مراقبہ میں اُن کی رُوح مقام قوب قوسین تک پہنچ گئی تو ایک آواز سُنائی دی کہ اس مقام پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدّس کو پہنچایا گیا تھا جہاں تمہاری رُوح کو پہنچایا گیا ہے اور زبانِ حال پُکار رہی تھی کہ تابع اور متبوع میں وہی فرق ہے جو اتباع کی وجہ سے تابع اور متبوع میں ہُوا کرتا ہے (کہ تابع تو صرف روح و قلب کے ذریعہ اس مقام کی سیر کرسکتا ہے وہاں قرار نہیں پاسکتا اور سیّدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات سے اُس مقام پر پہنچے اور آپ کو رسوخ و ثبات حاصل ہُوا)

اسی کے مشابہ یہ واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ علیہ مسجد میں سو رہے تھے اور اُن کا ایک مرید کھڑا ہُوا نماز پڑھ رہا تھا ایک بزرگ نے جو وہاں موجود تھے دو شیطانوں کو مسجد سے باہر دیکھا کہ ایک دُوسرے سے کہہ رہا ہے مسجد میں چلو تاکہ اس نمازی کے دل میں وسوسہ ڈالیں۔ دُوسرے نے کہا مجھے اس سونے والے کا سانس جلائے ڈالتا ہے۔ دیکھو اُس نے اس نمازی کی پرواہ نہیں کی بلکہ حضرت ابراہیم کے سانس کے خوف سے مسجد میں نہ آسکا کہ وہ اس کو پھُونک دے گا۔ اس کا سبب اس کے سوا کیا تھا کہ یہ حضرات ہر حالت اور ہر وقت میں حضورِ الٰہی سے کامیاب ہوتے ہیں۔

ہم اللہ تعالےٰ کے فضل و احسان کے واسطہ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہم کو ان بزرگوں کی برکتوں سے محروم نہ فرمائیں اور جو کچھ اپنے فضل سے اُن کو عطا فرمایا ہے ہمیں بھی عطا فرمائیں آمین۔ وفی ھٰذا دلیل علی ان الفضیلۃ فی الاعمال لا تنظر من جھتھا الا من جھتہ عاملھا الی قولہ وان یمن علینا بما من بہ علیھم۔

ف ۔ یہ تحقیق آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ کسی عمل کو افضل یا مفضول اس وقت کہا جائے گا جب دونوں پر قدرت ہو ورنہ جس پر قدرت ہو وہی افضل ہے۔ بہت لوگ اہلِ سلوک میں سے اس کو نہیں جانتے اور پریشان ہوتے ہیں یا بدگمانی میں مُبتلا ہوتے ہیں مثلاً اپنے کو شیخ کی طرح متوکل تارک اسباب بنانا چاہتے ہیں اور یہ اُن کی قدرت سے باہر ہے تو پریشان ہوتے ہیں کہ ہائے ہمیں باطنی دولت نصیب نہ ہوئی وہ اسی کو باطنی دولت سمجھتے ہیں کہ ترکِ اسباب کرکے بیٹھ جائے۔ یا شیخ کے اصحاب میں جس کو تارکِ اسباب نہیں دیکھتے اس سے بدگمان ہوتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ تصحیحِ نیت کے ساتھ اعمال دنیویہ مباحہ بھی دین ہوجاتے ہیں جس کو وہ دُنیا میں مشغول دیکھتے ہیں کیا عجب ہے اُس نے نیت کو درست کرکے ان اعمال دنیویہ کو دین بنالیا ہو اور اس کا تجربہ پاس رہ کر ہی ہوسکتا ہے دُور رہ کر نہیں ہوسکتا۔ پس جب تک پاس رہ کر کسی کا طالب دُنیا ہونا محقق نہ ہو بدگمانی جائز نہیں۔

ف ۔ یہ حدیث اہلِ حرفہ و اہلِ اسباب کے لیے بڑی بشارت ہے کہ بعض گُناہ ایسے ہیں جن کا کفارہ نہ نماز سے ہوسکتا ہے نہ حج سے نہ روزے سے اُن کا کفارہ طلبِ معاش کی فکر ہی سے ہوتا ہے بشرطیکہ حرفہ اور شغل معاش شریعت کے موافق جائز ہو۔

ف ۔ ہر حالت اور ہر زمانہ میں حضورِ حق سے کامیاب ہونے کا طریقہ کثرتِ ذکر قلبی اور شغل پاس انفاس ہے۔ اس شغل میں رسوخ کے بعد سوتے ہوئے بھی سانس سے ذکر ہوتا رہتا ہے بشرطیکہ اس کا شیخ متبع سُنت اور خود بھی پابند ذکر ہو۔ ورنہ محض

مشق ہی مشق ہوگی ذکر حقیقی حاصل نہ ہوگا۔

(۲۳۱) یہاں سے معلوم ہوا کہ نظر (بد) کا سبب قوتِ شہوتِ جماع ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ نگاہ کو پست کرنے والا ہے (اور ظاہر ہے کہ نکاح سے قوت شہوت بھی معتدل ہو جاتی ہے۔ اُسی سے نگاہ پست ہو جاتی ہے) اس کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے وزنا العین النظر والفرج یصدق ذلک او یکذبہ آنکھ کا زنا نظر (بد) ہے اور شرمگاہ اس کی تصدیق کر دیتی ہے یا تکذیب (یعنی اگر نظر کا منشا فرج ہے تو وہ زنا میں شمار ہے ورنہ نہیں یا مطلب یہ ہے کہ یہ سب مقدمات زناء کے ہیں۔ اگر اس کے بعد فرج سے زنا ہو گیا تو یہ مقدمات واقعی زنا کے مقدمات تھے (اور اگر فرج سے زنا ہُوا بلکہ خوفِ خدا سے بچ گیا تو یہ مقدمات بھی معاف ہو جاتے ہیں بشرطیکہ مانع صرف خوفِ خدا ہو کوئی حسی مانع نہ ہو۔

حدیث سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ نگاہ کا پست کرنا آیاتِ قرآنی سے مامور ہے تو جو شخص اُس کی حفاظت پر قادر نہ ہو اُس کو وہ اسباب اختیار کرنے چاہئیں جن سے یہ قدرت حاصل ہو جائے۔ اس جگہ ایک سوال ہے وہ یہ کہ نگاہ کی حفاظت ان ہی دو طریقوں میں منحصر ہے (نکاح یا روزہ) اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں؟ جواب یہ ہے کہ اور طریقوں سے بھی ہو سکتا ہے مگر یہ دو اعلیٰ درجہ کے ذریعے ہیں مثلاً کوئی اپنے چہرہ پر نقاب ڈال لے تو کسی کو بھی نہ دیکھ سکے گا یا شدت خوف کا غلبہ ہو یا سخت تکلیف نفس کو دی جائے تو اس سے بھی نگاہ کی حفاظت ہو جاتی ہے۔

امام سفیان ثوریؒ سے منقول ہے کہ جب اُن کے دل میں غیر حق کا خطرہ آتا وہ اپنے آپ کو ایک لکڑی سے مارتے تھے۔ بعض دفعہ ایک دن میں کتنی کتنی لکڑیاں اپنے اُوپر توڑ ڈالتے تھے۔ اس کے سوا اور بھی طریقے ہو سکتے ہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے طریقے ہم کو بتلا دیئے جو سب سے اعلیٰ اور آسان ہیں تو حدیث میں اعلیٰ سے ادنیٰ پر تنبیہ ہے (یہ مطلب نہیں کہ اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں) ہم نے

اس بات پر اس لیے تنبیہ کر دی کہ شاید کوئی شخص ان دو طریقوں سے عاجز ہو یا دونوں پر عمل کر کے بھی اُس کو حفاظت نگاہ میں کامیابی نہ ہو تو وہ یہ کہنے لگے کہ میں نے حدیث پر عمل کر لیا (پھر بھی نگاہ محفوظ نہیں ہوئی تو) میرے ذمہ اس سے زیادہ کچھ نہیں اب وہ اپنے نفس کو آزاد چھوڑ دے (اور یہ تاویل کرے کہ نگاہ کی حفاظت میری قدرت سے باہر ہے میں اس کا مکلف نہیں رہا) یہ ہرگز جائز نہیں (اگر کسی کو ان دو طریقوں سے کامیابی نہ ہو یا ان دونوں پر عمل نہ کر سکے کہ نکاح پر قدرت ہو نہ روزہ کی طاقت ہو تو وہ اور طریقوں سے نفس کا علاج کرے اس کو مہمل اور آزاد نہ چھوڑے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ بندہ کو حکمِ الٰہی کے بجا لانا کا سامان کرنا چاہیئے وہ اس کا مامور ہے (اور مثال کے طور پر دو طریقے بتلا دیئے یہ مطلب نہیں کہ جو اُن دونوں پر قادر نہ ہو یا اُن سے کامیابی نہ ہو تو وہ حکمِ الٰہی کا مکلف نہیں رہا)۔ قولہ وفیہ دلیل علیٰ ان الموجب للنظر ھو قوۃ شھوۃ الجماع الیٰ قولہ وانما ھذا منہ صلی اللہ علیہ وسلم تنبیہ علی التسبب فی توفیۃ ما امر بہ العبد۔

ف۔ سبحان اللہ! بڑی قیمتی تحقیق ہے ورنہ اہلِ ظاہر تو عام طور پر یہی سمجھتے ہیں کہ حفاظت نگاہ ان ہی دو طریقوں میں منحصر ہے۔ اگر ان سے کامیابی نہ ہو تو انسان معذور ہے۔ حضرت حکیم الامۃ نور اللہ مرقدہٗ نے بعض دفعہ یہ علاج تجویز فرمایا ہے کہ ہر نگاہ بد کے بعد نفس کو مالی یا بدنی سزا دی جائے اور نفس سے کہہ دیا جائے کہ جب نظرِ بد کا ارتکاب کرے گا یہی سزا دی جائے گی۔ بدنی سزا تو یہ ہے کہ ہر نظر بد کے بعد بیس رکعت نفل پڑھے جائیں اور مالی سزا یہ ہے کہ آٹھ آنہ یا ایک روپیہ یا جتنی مقدار سے نفس پر گرانی ہو صدقہ کر دیا جائے جب ہر نگاہِ بد پر نفس کو یہ سزا دیجائیگی چند روز میں درست ہو جائے گا۔

(۲۳۲) روزہ اور نکاح اس مرض کا علاج بھی ہے اور فی نفسہ طاعت بھی ہے تو جس شخص کو اس پر قدرت ہو کہ طاعت کے ذریعہ علاج کر سکے یہ سب سے

اچھا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے داووا مرضاکم بالصدقۃ وادفعوا البلاء بالصدقۃ۔ "اپنے بیماروں کا علاج صدقہ سے کرو بلا کو صدقہ سے ٹالو"

یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ حفاظت کا حکم ان ہی دو اعضاء کے ساتھ خاص نہیں (نگاہ اور شرمگاہ) بلکہ تمام اعضاء کی حفاظت مطلوب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسئولا ہ کان اور آنکھ اور دل ان سب کے متعلق بازپرس کی جائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو پر اس لیے تنبیہ فرمادی ہے کہ جس کے یہ دو عضو محفوظ اور مستقیم ہو جاتے ہیں تو غالب یہ ہے کہ بقیہ اعضاء بھی محفوظ ہو جاتے ہیں اور جس کے یہ دو عضو محفوظ نہ ہوں اُس کے بقیہ اعضاء کا محفوظ ہونا ممکن نہیں۔

قولہ وفیہ فائدۃ اخری انہ دواء وھو فی نفسہ قربۃ الی قولہ فلایمکن استقامۃ باقی الجوارح۔



باب ہشت و ہشتم ۸۹

حدیث

توقیت السحور

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے (رمضان میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھائی۔ پھر آپ نماز کے لیے کھڑے ہو گئے (راوی کہتا ہے) میں نے پُوچھا کہ اذان اور سحری کے درمیان کتنا (وقفہ) تھا فرمایا بقدر پچاس آیت (پڑھنے) کے (یعنی تقریباً چار منٹ)۔

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ سحری آخر وقت میں کھانا سُنّت ہے کیونکہ سید نا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سحری کھائی اور فجر کے طلوع ہونے میں بقدر پچاس آیت پڑھنے کے وقت ہُوا (جس کی مقدار چار پانچ منٹ۔ سے زیادہ نہیں تو ثابت ہُوا کہ حضورؐ نے بالکل صُبح کے قریب سحری کھائی تھی) حضورؐ کے اس فعل میں حکمت یہ تھی کہ آپ ہمیشہ اُمّت پر آسانی کرنا چاہتے تھے چنانچہ خود سحری کھانا بھی اُمت پر لُطف ہی تھا اگر آپ سحری نہ کھاتے تو اہلِ فضل آپ کی اتباع میں کبھی سحری نہ کھاتے اور بعض کو اس سے مشقت لاحق ہوتی کیونکہ ہر شخص بدون سحری کے روزہ رکھنے پر قادر نہیں ہوتا۔ پھر حضورؐ کا صُبح کے قریب سحری کھانا یہ مزید لُطف ہے کیونکہ رات کے درمیان میں سحری کھانے سے اُمت کو ایک دُوسری پریشانی ہوتی وہ یہ کہ عادۃً کھانے کے بعد نیند کا غلبہ ہوتا ہے۔ ہر شخص کو کھانے کے بعد بیدار رہنا آسان نہیں اور کھانا کھاتے ہی سو رہنا بدن کے لیے مضر ہے۔ کیونکہ اس سے

بخارات دماغ پر چڑھتے ہیں جس سے بیماری پیدا ہونے کا خطرہ ہے اور اگر رات کے درمیان سحری کھا کر صبح تک بیدار رہے تو بڑا مجاہدہ کرنا پڑے گا کیونکہ کھانے پینے کے بعد نیند کا تقاضا ہوتا ہے۔ اب اگر یہ صبح تک بیدار رہا تو عبادت کے وقت یعنی صبح کی نماز میں نیند کا غلبہ ہوگا (جس سے نماز میں حضورِ قلب نہ ہو سکے گا) اور زیادہ تو یہ ہوگا کہ رات کے بیچ سحری کھانے والے پر نیند ہی غالب ہوگی اور یہ صبح کی نماز سے رہ جائے گا کہ (یا تو) جماعت فوت ہوگی اور تنہا وقت مستحب کے بعد نماز پڑھے گا (یا آفتاب طلوع ہونے کے بعد نماز قضا پڑھے گا) اور اگر آدھی رات کے بعد جاگتا رہا تو نمازِ صبح میں حضورِ قلب حاصل نہ ہوگا۔ ان وجوہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سحری کو صبح کے قریب تک مؤخر فرمایا کہ اس وقت سحری کھانے سے نمازِ صبح فوت نہ ہوگی۔ کیونکہ اب سحری اور نماز میں اتنا ہی وقفہ ہوگا کہ آدمی نماز کے لیے تیاری کر لے۔ اس صورت میں صبح کی نماز حضورِ قلب سے ادا ہوگی کیونکہ کھانے کے بعد نیند کا غلبہ فوراً نہیں ہوتا بلکہ کچھ دیر کے بعد ہوتا ہے جبکہ بخارات معدے سے دماغ کی طرف چڑھنے لگیں اور اب اتنا وقفہ نہ ہوگا (دوسرے کھانے کے بعد بخارات کا صعود چلنے پھرنے سے موقوف ہو جاتا ہے تو جب سحری کے بعد فوراً استنجا اور وضو اور مسجد میں جانے کے لیے چلنا پھرنا ہوگا دماغ بخارات سے محفوظ رہے گا) پھر نماز سے فارغ ہونے کے بعد دن نکل آئے گا تو انسان اپنی ضروریات اور وظائف وغیرہ میں لگ کر نیند سے بچا رہے گا جس سے عمر بڑھتی ہے کیونکہ نیند بھی ایک قسم کی موت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وھو الذی یتوفاکم باللیل وہی ہے جو تم کو رات میں وفات دیتا ہے اس میں نیند کو وفات کہا گیا ہے تو نیند کا کم ہونا عمر میں زیادتی کا سبب ہے (بشرطیکہ مقدارِ صحت سے کم نہ ہو) اور عاقل اپنی عمر کو بڑھانے کی کوشش کرتا ہے چاہے ایک سانس ہی کیوں نہ ہو کیونکہ تاجر کو اُس وقت تک لوگ تاجر نہیں کہتے جب تک وہ راس المال کی حفاظت نہ کرے اور تجارت کے طریقہ سے واقف نہ ہو اور حقیقی تاجر مومن ہی ہے۔ کیونکہ وہ باقی رہنے والے فائدہ کے لیے تجارت کرتا ہے اور دُنیا کے تاجر فنا ہونے والے

نفع کے لیے تجارت کرتے ہیں اور مومن کا راس المال عمر ہے تو اُس کو حفاظتِ عمر کی بہت ضرورت ہے کہ اسی طرح وہ زیادہ نفع حاصل کر سکتا ہے تو مومن زیادہ سونے اور غفلت کا شکار ہونے سے بہت بچتا ہے اور جب اُس سے بچے گا تو اعمالِ صالحہ بجالانے کی طرف سبقت کرے گا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا ہے کہ یہی لوگ اصلی تاجر ہیں۔ فرماتے ہیں :-

یا ایھا الذین اٰمنوا ھل ادلکم علی تجارۃ تنجیکم من عذاب الیم۔ تؤمنون باللہ ورسولہ وتجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم وانفسکم ذٰلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون یغفرلکم ذنوبکم ویدخلکم جنٰت تجری من تحتھا الانھار ومساکن طیبۃ فی جنٰت عدن ذٰلک الفوز العظیم)۔

اے ایمان والو! کیا میں تم کو ایسی تجارت بتلاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دے؟ (سنو!) وہ یہ ہے کہ تم اللہ پر اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کے راستہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو یہ (تجارت) تمہارے لیے سب سے بہتر ہے اگر تم سمجھو (کیونکہ اس سے) اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف کردیں گے اور ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی اور اچھے گھر دیں گے ہمیشہ رہنے والے باغوں میں یہی ہے بڑی کامیابی)۔

اور یقیناً جو شخص جنت سے کامیاب ہو گیا جہنم سے نجات پا گیا اور عزیز غفار کی طرف سے اُس کو مغفرت حاصل ہو گئی۔ وہ سب سے زیادہ نفع پانے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زبور میں داؤد علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ اے داؤد! جو میرے ساتھ تجارت کرے وہ سب سے زیادہ نفع پانے والا ہے۔ تو جو شخص اپنی بیداری میں غفلتوں سے احتراز نہ کرے وہ سونے والے کے برابر ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

مثل الذی یذکر ربہ والذی لا یذکر مثل الحی والمیت۔

جو شخص اپنے رب کو ذات کو یاد کرتا ہے اور جو یاد نہیں کرتا ان دونوں کی مثال زندہ اور مُردہ جیسی ہے۔

تو آپ نے غافل کو مُردہ سے تشبیہ دی ہے اگرچہ وہ بیدار ہی ہو۔ کیونکہ اُس کا وقت اللہ تعالےٰ کی عبادت سے خالی جا رہا ہے راس المال برباد ہو رہا ہے اور اس کو پتہ بھی نہیں یہاں تک کہ جب عمر ختم ہو جائے گی اُس وقت چونکے گا اور کہے گا (رب ارجعون لعلی اعمل صالحا فیما ترکت کلا) مجھے دُنیا میں واپس کر دو تا کہ مَیں کچھ نیک کام کروں تو جواب دیا جائے گا ہرگز نہیں اور جو شخص رات کے پہلے حصّہ میں ضرورت کی وجہ سے سوتا ہے جس سے انسان کو چارہ نہیں اُس کی نیند عبادت ہے اور سراسر خیر ہے اُس کا سونا اور نماز پڑھنا اور ذکر کرنا ثواب میں ایک ہی درجہ پر ہے جس پر حضرت معاذ اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کا واقعہ دلیل ہے کہ ان دونوں صاحبوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی تعلیم دینے اور احکام اسلام کے موافق فیصلہ کرنے کے لیے (یمن کی طرف) بھیجا تھا دونوں اپنے اپنے کام پر روانہ ہو گئے پھر ایک (دن کسی) مقام پر جمع ہوئے تو ایک نے دُوسرے کا حال پُوچھا۔ ابو موسیٰ اشعریؓ نے فرمایا کہ مَیں تو (رات بھر) کھڑے بیٹھے اور ٹہلتے ہوئے اور لیٹ کر قرآن پڑھتا رہتا ہوں بالکل نہیں سوتا۔ حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ مَیں تو رات کے پہلے حصّہ میں سوتا ہوں پچھلے حصّہ میں اُٹھتا ہوں اور سونے میں بھی ویسا ہی ثواب سمجھتا ہوں جیسا جاگنے اور نماز پڑھنے میں سمجھتا ہوں۔

جب دونوں حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس آئے تو آپؐ کے سامنے ہر ایک نے اپنا اپنا طریقہ بیان کیا۔ حضورؐ نے ابو موسیٰ اشعریؓ سے فرمایا کہ وہ تم سے زیادہ فقیہ ہیں یعنی حضرت معاذؓ۔ اور ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو زیادہ فقیہ اُسی وقت فرما سکتے ہیں جبکہ اس کا طریقہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک زیادہ پسند اور زیادہ موجب قرب ہو یہ تو اُس نیند کا حکم ہے جو ضرورت بشریہ کی وجہ سے ہو جس سے چارہ نہیں اس کے سوا جو نیند ہے وہ عمر کو نقصان پہنچانے والی ہے۔

اب سمجھ میں آگیا ہو گا اس وقت (یعنی صُبح کے قریب) سحری کھانے میں بہت

بڑی خوبی ہے۔ دُوسرے اس وقت سحری کھانے سے دن کو روزہ رکھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ کیونکہ صُبح کے وقت معدہ غذا سے پُر ہو گا۔ کھانے کا تقاضا دن کے آخری حصّہ میں ہو گا جبکہ افطار کا وقت قریب ہو گا سو تھوڑی دیر کا انتظار آسان ہے دشوار نہیں۔ یہ شخص دن بھر عبادات میں حضورِ قلب سے کامیاب ہو گا۔ کھانے پینے کے وسوسے اور اشتہاء اور تمنا سے محفوظ ہو گا۔ بخلاف اُس کے جو سحری نہیں کھاتا یا رات کے درمیان میں کھاتا ہے، وہ تو دن بھر مشقت اور مجاہدۂ نفس میں مشغول رہتا ہے۔ کیونکہ صُبح کو اس کا معدہ خالی ہوتا ہے اور بھوک کے آدمی کو کھانے کی خواہش بار بار ستاتی ہے اور شیطان کو وسوسے ڈالنے کا بھی زیادہ موقع ملتا ہے اور بعض پر صفراء غالب ہو جاتا ہے تو بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے کیونکہ صفراوی مزاج کو بُھوک کا تحمل نہیں ہوتا تو اُس کو رمضان میں روزہ افطار کرنے کی نوبت آجاتی ہے (غرض سحری کھانے سے روزہ میں مدد ملتی ہے اور وسوسے دُور ہو جاتے ہیں) اور اسی حقیقت کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں فرمایا ہے:۔

من رأى منكم امرأة تعجبه	اگر کوئی کسی اجنبی عورت کو (اچانک) دیکھ لے اور وہ
فليأت اهله فان الذى معها	اسکو پسند آجائے تو اُسی وقت اپنی بیوی کے پاس پہنچ
مثل الذى معها او كما قال۔	جائے (اور اُس سے ہمبستری کرے) کیونکہ اسکے پاس بھی ویسی ہی چیز ہے جیسی اُس کے پاس ہے۔

کیونکہ اجنبی عورت کو دیکھ کر شہوت کو جوش ہوتا ہے جو اُس کو دل میں گُناہ کے وسوسے ڈالتی ہے۔ اب اگر یہ اپنی بیوی کے پاس چلا جائے تو وہ جوش فرو ہو جائے گا اگرچہ وہ اجنبی عورت حسن و جمال میں اس کی بیوی سے زیادہ ہی ہو پھر بھی بیوی سے ہمبستری کے بعد نفس میں وہ ہیجان نہ رہے گا جو پہلے تھا اور تھوڑا سا جو رہے گا اُس کو آسانی سے دفع کر سکے گا۔

اسی طرح صُبح کے قریب سحری کھانے سے اُس کو غذا کی زیادہ خواہش دن بھر نہ ہو گی اور تھوڑی سی ہو گی تو اُس کو آسانی سے دفع کر سکے گا اور اگر سحری نہ کھائے گا

تو وہ حال ہوگا جو اُوپر بیان کیا گیا اور یہ بڑا نقصان ہے خصوصاً رمضان میں جسکی فضیلت معلوم ہے (اس ناقص حالت سے بچنا چاہیئے) انسان کو رمضان میں سکونِ خاطر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف دل سے متوجہ ہونا چاہیئے۔ مبادا اس کا ایک دن ضائع ہو جائے جس کی مانند دُوسرا دن میسر نہ ہو۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے اصحاب کے ساتھ سحری کھانا آپ کی تواضع پر دلیل ہے۔ کیونکہ آپؐ کی جو شانِ رفیع ہے، معلوم ہے، مگر پھر بھی آپ تو اضعاً صحابہ کے ساتھ کھانا کھاتے تاکہ اُن کی دلجوئی ہو جائے۔

(تنبیہ) شرح حدیث کا مضمون عجیب تھا اس لیے پورا ترجمہ کر دیا گیا اگر غور کیا جائے گا تو اس میں تصوف کے بہت سے مسائل پر تنبیہ معلوم ہوگی۔ میں نے حضرت سیّدی مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کو (اسی) حدیث کے موافق عمل کرتے ہُوئے دیکھا ہے۔ حضرت بالکل صُبح کے قریب طلوعِ فجر سے چار پانچ منٹ پہلے سحری سے فارغ ہوتے تھے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سحری کھانے کے بعد فوراً نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ بظاہر اس سے صُبح کی نماز مراد ہے تہجد مراد نہیں۔ کیونکہ راوی حدیث بتلاتے ہیں کہ سحری سے فراغت اور صُبح کی اذان میں چار پانچ منٹ کا وقفہ تھا اور یقیناً حضورؐ کا تہجد اس سے بہت طویل ہوتا تھا خصوصاً رمضان میں تو آپ بہت زیادہ مجاہدہ فرماتے تھے۔

پس میرے نزدیک رمضان میں حنفیہ کو نمازِ فجر اس حدیث کے موافق غلس میں پڑھنی چاہیے۔ اسفار نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ رمضان میں اسفار کرنے سے سحری کے بعد لوگ سو جائیں گے اور صُبح کی نماز باجماعت فوت ہوگی اور سحری آخر وقت میں کھانے سے سب نمازی صُبح کی اذان کے وقت بیدار ہوں گے تو اذان کے بعد جلدی نماز پڑھنے سے کسی کی نماز یا جماعت فوت نہ ہوگی۔ میرے خیال میں احادیثِ غلس اور احادیثِ اسفار میں تطبیق کی بہترین صُورت یہ ہے کہ احادیثِ غلس کو رمضان پر اور احادیثِ اسفار کو غیر رمضان پر محمول کیا جائے کیونکہ غیر رمضان المبارک میں اسفار کے افضل ہونے کی جو علت بیان کی جاتی ہے کہ اس میں تکثیرِ جماعت ہے وہ علت رمضان میں اسفار پر صادق نہیں آتی بلکہ غلس پر صادق آتی ہے جیسا اُوپر بتلا دیا گیا ہے۔

(۲۲۳) حضرت صحابہ کا زمانہ کی مقدار کو پچاس آیتوں (کی تلاوت) سے اندازہ کرنا یہ بتلاتا ہے کہ ان حضرات کے اوقات عبادت ہی میں مستغرق تھے۔ اگر (تلاوتِ قرآن اور) عبادت کے سوا کوئی اور عادت ان پر غالب ہوتی تو اُسی سے زمانے کا انداز بتلاتے مگر چونکہ ان کے اوقات انواع و اقسام کی عبادات سے گھرے ہُوئے تھے۔ اُن کے دلوں کو اسی سے لگاؤ تھا تو اُنھوں نے تلاوتِ قرآن سے وقت کی مقدار بتلائی۔

اس سے معلوم ہُوا کہ یہ حضرات ہمیشہ عبادت ہی میں رہتے تھے اگر وہ کسی اور شغل میں بھی مشغول ہوتے تو دل عبادت ہی میں اٹکا ہُوا رہتا تھا اس شغل سے نہیں۔ قاعدہ یہی ہے کہ جو شغل انسان پر غالب ہوتا ہے جس سے دل کا لگاؤ ہوتا ہے زمانے کی مقدار کا اُسی سے اندازہ کرتا ہے کہ یہی اُس کو آسان بھی ہوتا ہے۔

جو لوگ قرآن نہیں پڑھتے اگر اُن کے سامنے زمانے کا انداز قرأت قرآن سے بیان کیا جائے اُن کو اُس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا کیونکہ وہ اس سے کچھ بھی اندازہ نہ کر سکیں گے۔ ہر شخص سے اُس کی سمجھ کے موافق ہی گفتگو کی جاتی ہے تاکہ اُس کو فائدہ پہنچ سکے۔ سب سے ایک طرح کا معاملہ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ طریقہ غلط ہے۔ مثلاً اگر ہم کو یہ معلوم ہو کہ مخاطب درزی کا کام کرتا ہے۔ یا بڑھئی ہے تو اُس سے یہ کہا جائے گا کہ جتنی دیر میں تم فلاں کپڑا (کرتہ یا ٹوپی) سی لیتے ہو یا جتنی دیر میں تم اتنی مقدار لکڑی چیر لیتے ہو (اتنی دیر میں یہ واقعہ ہو گیا، یا اگر وہ کپڑا بُننے والا ہے تو اُس سے کہا جائے گا کہ جتنی دیر میں تم اتنا کپڑا بُن لیتے ہو (اتنی دیر میں یہ کام ہُوا) اسی طرح یہاں سمجھو (کہ حضرات صحابہ کے زمانہ

جن لوگوں پر عبادت غالب تھی تو وہ کسی کام کے وقت کا اندازہ اسی سے بتلاتے تھے کہ اتنی آیت پڑھنے یا اتنی رکعتیں پڑھنے کی مقدار وقفہ ہوا) ۔

قولہ وتقدیرھم الزمان بخمسین آیۃ فیہ دلیل علی ان الصحابۃ رضی اللہ عنہم کانت اوقاتہم مستغرقۃ فی التعبد الی قولہ او تنسج کذا ان کان قزازا ۔

ف ۔ بات تو ظاہر ہے مگر اس لفظ سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سحری اور اذان میں بقدر پچاس آیتوں کی تلاوت کے وقفہ تھا اس مسئلہ کی طرف ذہن کا منتقل ہونا صوفیاء ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ علماء ظاہر کو یہ استنباطات دشوار ہیں ۔ و ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء ۔



باب ہشت ونہم ۸۹

حدیث

من افطر یوما فی رمضان من غیر عذر

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص رمضان المبارک میں ایک دن بلا عذر اور بدون مرض کے روزہ نہ رکھے اُس کی قضاء زمانہ بھر کے روزہ سے بھی نہیں ہو سکتی اگرچہ وہ عمر بھر روزہ رکھے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہی قول ہے ۔

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ جو شخص رمضان میں عمداً بلا عذر کے افطار کرے اُس کے گناہ کا کفارہ کچھ نہیں ۔ کیونکہ حضورؐ فرماتے ہیں کہ اُس کی تلافی سارے زمانہ کے روزوں سے بھی نہیں ہو سکتی اگرچہ وہ عُمر بھر روزہ رکھ دے اور ظاہر ہے کہ عُمر بھر کا روزہ تو بڑی قضا ہے اس سے بڑھ کر قضا کیا ہوگی جب یہ بھی اس ایک دن کی تلافی نہ کر سکا تو اور کفارے کیا فائدہ دیں گے ؟ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ کھانے پینے سے اگر رمضان کا روزہ افطار کیا جائے (جماع سے نہیں تو) اس پر کفارہ ہے یا نہیں ؟

امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ اس پر کفارہ نہیں اور یہ حدیث اُن کے قول کی مؤید ہے۔ مگر وہ قضاء کو واجب کہتے ہیں اور یہ حدیث اُن کی اس بات کو رد کر رہی ہے کیونکہ آپ فرماتے ہیں لم یقضہ صیام الدھر کہ ساری عُمر کے روزے اُس کی قضاء نہیں کر سکتے ۔ پھر ایک دن کی قضاء سے کیا ہوگا ؟ اور امام

مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کفارہ (اور قضا) واجب ہے اُنہوں نے اس افطار کو جماع سے افطار پر قیاس کیا اور اُس میں شارع علیہ السلام نے تصریحًا کفارہ کو واجب فرمایا ہے تو کھانے (پینے) میں بدرجۂ اولیٰ کفارہ ہونا چاہیئے اور ظاہر یہ ہے واللہ اعلم کہ یہ حدیث ان دونوں حضرات کو نہیں پہنچی۔ اگر پہنچی ہوتی تو ضرور اسی کو اپنا مذہب بناتے یا اس میں کچھ تاویل فرماتے۔ جب ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہیں تو غالب گمان یہی ہے کہ ان کو حدیث نہیں پہنچی۔ بالخصوص امام مالکؒ کا طریقہ تو یہ ہے کہ وہ بہت سی حدیثوں کو روایت کرتے ہیں اور عمل متواتر کی وجہ سے اُن پر عمل نہیں کرتے تو اس حدیث کا نقل کرنا اُن پر بہت زیادہ ضروری تھا کیونکہ یہ اُن کے مذہب کے معارض اور خلاف ہے (پس غالب یہ ہے کہ حدیث اُن کو نہیں پہنچی) اور ظاہر قیاس یہ چاہتا ہے کہ رمضان میں عمدًا بلا عُذر افطار کرنے کا کفارہ نہ ہو۔ جیسے یمین غموس کا (یعنی جھوٹی قسم کا جو زمانہ ماضی کے متعلق قصدًا جان بُوجھ کر کھائی جائے) کفارہ نہیں ہے اور یہ حدیث اس قیاس کی مؤید ہے۔

مگر راوی کا یہ کہنا کہ عبد اللہ بن مسعود کا یہی قول ہے، بتلاتا ہے کہ اُن کے سوا بقیہ اصحاب کا یہ قول نہیں اگر کسی اور کا قول بھی حدیث کے موافق ہوتا تو راوی صرف اُن کا نام تنہا نہ لیتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث مشہور تھی اور سب کو معلوم تھی مگر اس کے ظاہر پر بجز ابنِ مسعود کے اور کسی نے عمل نہیں کیا اُن کو دُوسری حدیث کی ترجیح واضح ہوگئی تھی (جس میں جماع کے ساتھ افطار کرنے پر کفارہ واجب کیا گیا ہے) تو اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ حدیث ائمہ فقہاء کو بھی پہنچی ہوگی مگر اُنہوں نے کسی مصلحت سے اس کو روایت نہیں کیا نہ اُس پر کچھ کلام کیا۔ یا تو اس لیے کہ یہ حدیث متروک العمل ہے (کہ صحابہ میں سے بجز ایک صحابی کے کسی نے بھی اس کے ظاہری مفہوم پر عمل نہیں کیا) یا اور کوئی وجہ ہو اور ممکن ہے اُن کے نزدیک اس حدیث کا مطلب یہ ہو کہ صیام الدہر اس دن کی فضیلت کی قضاء نہیں کر سکتا۔ زمانہ بھر کے روزہ سے اس دن کی فضیلت جو فوت ہوگئی ہے حاصل نہیں ہوسکتی اگرچہ کفارہ

(اور قضا) سے گناہ معاف ہو جائے گا مگر اس خسارہ کی تلافی نہ ہوسکے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس کام میں جو فضیلت رکھ دی ہے بندہ اُس کی جگہ اُس کے بدلہ میں کتنا ہی کام کرے گو اُس کا ثواب کتنا ہی زیادہ ہو وہ خاص فضیلت حاصل نہ ہوسکے گی۔ مثلًا کوئی شخص قربانی کے دن میں قربانی نہ کرے اور ہزار درہم یا ہزار دینار اُس کے بدلہ میں صدقہ کرے تو اُس سے کہا جائے گا کہ قربانی کی فضیلت اور اُس کا ثواب تم کو حاصل نہیں ہوا اگرچہ تم نے ہزار دینار صدقہ کرنے میں قربانی کے عوض کا قصد کیا مگر اس عوض سے قربانی کا ثواب نہ ہوگا اور اگر تم ایک دینار سے ایک بکری خرید کر ذبح کر دیتے وہ اُن ہزار دینار کے صدقہ سے افضل تھی۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قربانی کے دن میں انسان کا کوئی عمل بھی قربانی سے افضل نہیں۔ اور تم اپنی رائے سے) اُس چیز کو فضیلت دینا چاہتے ہو جس کو شارع علیہ السلام نے فضیلت نہیں دی۔ سو یہ معاملہ تمہارے خیال کے موافق نہیں ایسا کبھی نہ ہوگا (کہ تم اپنی رائے سے شارع کی بتلائی ہوئی فضیلت کے مقابل دوسری شئے میں فضیلت ثابت کر سکو) اسی لیے امام مالک رحمہ اللہ علیہ مسافر کو سفر میں روزہ کی ترغیب دیا کرتے تھے اگرچہ شرعًا اُس کو افطار جائز ہے، اور امام مالک بھی اس کو جائز فرماتے ہیں مگر وہ بھی یہ فرماتے ہیں کہ ایامِ رمضان کی فضیلت دُوسرے ایام میں نہیں پائی جاتی۔ اُنہوں نے غالبًا اسی حدیث پر نظر کر کے ایسا فرمایا ہے اور زیادہ احتیاط اسی میں ہے۔

ف ۔ یہاں سے اُس فتنہ کا حال معلوم ہوگیا ہوگا جو ایک زمانہ میں ہندوستان میں برپا ہوا تھا کہ بعض علماء نے سلطنت ترکی کی امداد کے لیے فتویٰ دیدیا تھا کہ اس سال مسلمانانِ ہند قربانی موقوف کر کے اس کی رقم سلطنتِ ترکی کو بھیج دیں۔ ان لوگوں نے صدقہ کو قربانی کا قائم مقام قرار دیا۔ مگر ہمارے اکابر نے اس کی سخت مخالفت کی اور فرمایا کہ اپنی رائے سے کسی عمل کو قربانی کا قائم مقام بنانا غلط ہے۔ الحمد للہ ہمارے اکابر کے علوم سلف صالح کے علوم سے موافق ہیں۔ یہی حضرات ہیں جن کے متعلق حدیث میں وارد ہے لایزال طائفۃ من امتی ظاھرین علی الحق میری اُمت میں

ایک جماعت ہمیشہ حق پر رہے گی اور غالب رہے گی ۔

(۲۳۴) عبادات میں سب سے افضل اتباع سُنّت ہے زیادہ مشقت مطلوب نہیں

حدیث سے معلوم ہُوا کہ عبادات میں سب سے افضل اتباع ہے زیادہ مشقت میں فضیلت نہیں۔ دیکھو عمر بھر روزہ رکھنا بہت مشقت طلب ہے مگر وہ رمضان کے ایک روزہ کے بھی برابر نہیں (اور وہ جو ایک حدیث میں آیا ہے۔ افضل الاعمال احمزھا ادا شقھا۔ کہ اعمال میں زیادہ افضل وہ ہے جو نفس پر زیادہ شاق ہو۔ یہ اس مقام پر ہے جہاں عمل کے ہر پہلو میں اتباع (سُنّت) موجود ہو جیسے رمضان کے سفر میں روزہ رکھنا اور افطار کرنا دونوں میں اتباع سنت ہے مگر روزہ رکھنا زیادہ شاق ہے تو وہی افضل ہے اور جہاں کسی عمل کے ایک پہلو میں اتباع ہو دوسرے میں اتباع نہ ہو گو مشقت زیادہ ہو وہاں اتباع ہی افضل ہے۔ جیسے ساری رات جاگ کر نماز پڑھنا اور رات کے پہلے حصہ میں سونا پچھلے حصہ میں اُٹھ کر نماز پڑھنا۔ یہاں دُوسری صُورت افضل ہے کیونکہ اسی میں اتباع سُنّت ہے۔ پہلی صُورت میں گو مشقت زیادہ ہے مگر افضل نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تمام رات جاگنا ثابت نہیں فافہم)۔ اس میں صُوفیاء کی بھی دلیل ہے جو فرماتے ہیں کہ عارف کی طاعت تو حکم کی تعمیل ہے اور جاہل کی طاعت شہوت (کے تابع) ہے (مطلب یہ ہے کہ عارف صرف تعمیلِ حکم کے لیے عبادت کرتا ہے کسی کیفیت یا کرامت و کشف یا لذات باطنی کے لیے نہیں کرتا اور جاہل تعمیل حکم کے سوا دُوسری اغراض کے لیے بھی عبادت کرتا ہے اس لیے جب کوئی کیفیت اور لذت نہ ہو ذکر و شغل وغیرہ چھوڑ دیتا ہے)۔ دیکھو شہوت ہی نو روزہ میں عمدہ کھانے پر برانگیختہ کرتی ہے (تو جاہل شہوتِ نفس کا اتباع کر کے روزہ توڑ دیتا ہے) پھر اُس کے بدلہ میں کفارہ دیتا ہے جو نفس پر شاق ہے اور عارف کو تعمیل حکم (کا اہتمام) ادب کے التزام پر برانگیختہ کرتا ہے کہ حکم کو پوری طرح بجا لانا چاہیئے اُس کا اور کچھ مقصود نہیں۔ **قولہ وفیہ دلیل علی ان افضل العبادات ھو الاتباع الی قولہ**

علی التزام الادب فی توفیق الامر لاغیر ۔

ف ۔ یہی وہ بات ہے جس کے فقدان سے اہلِ سلوک پریشان ہوتے ہیں۔ بہت لوگ اوراد و وظائف سے دنیوی اغراض یا باطنی کیفیات کے طالب ہوتے ہیں جب وہ حاصل نہیں ہوتیں سب کام چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ یہ لوگ اصل حقیقت سے جاہل ہیں۔ عارف وہ ہے جو صرف تعمیلِ حکم کے لیے کام کرے اور کوئی غرض نہ ہو اسی کا نام اخلاص ہے۔ اور صاحبِ اخلاص کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین ۔

(۲۳۵) توبہ سے اُس گناہ کی تلافی نہیں ہوسکتی جو گناہ اُس سے ہو چُکا ہے گو وہ معاف ہو جاتا ہے

یہاں سے معلوم ہُوا کہ حقیقی مخالفت[ع] (یعنی صریح گناہ) کرنے والا گو اُس میں کتنی ہی فضیلت موجود ہو اُس نقصان کی تلافی نہیں کر سکتا جو معصیت سے ہو چُکا ہے اگرچہ وہ توبہ بھی کر لے۔ اس کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے وان صامہ (اگرچہ وہ عمر بھر روزہ رکھے) کیونکہ ظاہر ہے کہ عمر بھر روزہ رکھنے والا توبہ ضرور کرے گا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس شخص کے ذمے توبہ ہے اور ایک دن کا روزہ۔ غرض یہ توبہ اور ایک دن کا یا عمر بھر کا روزہ بہت سے بہت عذاب (اور گناہ) کو دفع کر سکتا ہے۔ لیکن گناہ سے بچنے کا جو نفع ہے وہ حاصل نہ ہو گا (اور گناہ سے جو نقصان پہنچا ہے اُس کی تلافی نہ ہو سکے گی) ہاں حق تعالےٰ کا فضل ہو جائے تو اور بات ہے ورنہ ظاہر (قانون) پر وہ نفع نہیں لوٹ سکتا۔ اور یہ حدیث میں آیا ہے التوبۃ تجب ماقبلھا کہ توبہ پہلی حالت کو ختم کر دیتی ہے۔ اُس کا مطلب یہ ہو گا کہ گناہ اور عذاب کو توبہ ختم کر۔

ع یہ قید اس لیے لگا دی تاکہ خطاءِ اجتہادی سے احتراز ہو جائے نیز اُن گناہوں سے بھی جن کا گناہ ہونا مختلف فیہ ہے قطعی نہیں کہ صورت اولیٰ میں تو نقصان ہی نہیں ہوتا اور دوسری صورت میں نقصان ہوتا ہے مگر اسکی تلافی اعمال صالحہ سے ہو جاتی ہے۔ ان تجتنبوا کبائر ما تنہون عنہ نکفر عنکم سیاٰتکم و ان الحسنٰت یذھبن السیاٰت - ۱۲ ظ

دیتی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ گناہ سے جو خیر فوت ہو چکی ہے اُس کی تلافی ہو جائے گی۔ اسی لیے اصحاب معاملات (یعنی صوفیائے کرام) نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مولیٰ کے دروازے پر عمر بھر کھڑا رہے اور ایک ساعت غفلت کر جائے تو اس ایک ساعت میں جو خیر اُس سے فوت ہو گئی وہ اس سے بڑھ کر ہے جو عمر بھر میں اُس نے حاصل کی۔ کیونکہ ممکن ہے وہ ساعت نفحۃ الٰہیہ (اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت) کی ساعت ہو اور جس سے یہ عنایت فوت ہو جائے دوسری اُس کے قائم مقام نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ اس کو دوسری ساعت ان کو بھی نصیب ہو جائے۔ کیونکہ جو ساعت عنایت فوت ہو گئی اُس سے تو حصہ نہ ملا۔ واویلاہ من تخلف عن باب مولاہ اُس شخص کی بڑی مصیبت ہے جو اپنے مولیٰ کے دروازے سے ہٹ گیا۔ قولہ وفیہ دلیل علی ان ما یقع من المخالفۃ حقیقۃ الی قولہ من تخلف عن مولاہ۔

ف ۔ مگر ایک حدیث میں آیا ہے التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسا اُس سے گناہ ہوا ہی نہیں اور قرآن میں ہے الا من تاب و اٰمن وعمل عملا صالحا فاولئک یبدل اللہ سیئاتہم حسنات مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کرے گا اللہ تعالیٰ اُس کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیں گے۔ پھر احادیث میں توبہ اور اسلام کا ایک ہی درجہ بتلایا گیا ہے کہ جس طرح اسلام سے کفر و شرک سابق کا اثر بالکل زائل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح توبہ سے گناہ کا اثر بالکل زائل ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ بعض دفعہ وہ لوگ جو پہلے کفر و شرک میں مبتلا تھے بعد میں ایمان لائے اُن لوگوں سے بڑھ جاتے ہیں جنہوں نے کبھی کفر و شرک نہیں کیا۔ چنانچہ بالاجماع حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علیؓ اور حضرات حسنینؓ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم سے افضل ہیں حالانکہ ان حضرات نے کسی وقت بھی کفر و شرک نہیں کیا اور حضرت عمرؓ بعد شرک کے اسلام لائے ہیں۔ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک شخص گناہ سے توبہ کر کے اتنے بلند درجے پر پہنچ جائے جہاں وہ لوگ نہیں پہنچ سکے جنہوں نے کبھی گناہ نہیں کیا ۔

روزہا گر رفت گو رو باک نیست
تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

اس میں شک نہیں کہ یہ بھی فی نفسہ ایک بڑی فضیلت ہے کہ انسان سے عمر بھر گناہ کا ارتکاب بالکل نہ ہو مگر یہ لازم نہیں کہ گناہ کر کے توبہ کرنے والا اُس سے پیچھے ہی رہے آگے نہ بڑھ سکے۔ حضرات صحابہ میں بعض وہ بھی ہیں جن سے زنا اور شرب خمر کا ارتکاب ہوا ہے مگر توبہ کے بعد وہ اُس مقام پر ہیں جہاں کوئی ولی اور غوث و قطب نہیں پہنچ سکتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انسان اس نقصان کی تلافی خود نہیں کر سکتا جو معصیت سے اُس کو پہنچ چکا ہے۔ لیکن توبہ خالص کے بعد اللہ تعالیٰ تلافی فرما دیتے اور ایسے بلند مقام پر پہنچا دیتے ہیں جہاں اس گناہ سے پہلے نہیں پہنچا تھا۔ پس حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ رمضان کے ایام کی برابر دوسرے ایام نہیں ہیں۔ رمضان کے ایک دن کا روزہ بلا عذر کے عمداً توڑنا اتنا سنگین جرم ہے کہ انسان عمر بھر کے روزوں سے بھی اُس کی تلافی نہیں کر سکتا۔ رہا یہ کہ توبہ کے بعد اللہ تعالیٰ اس نقصان کی تلافی کر دیتا ہے یا نہیں؟ یہ حدیث اس سے ساکت ہے اور دوسرے نصوص امید دلاتی ہیں۔ واللہ اعلم فز لا من غفور الرحیم و انا عند ظن عبدی بی فلیظن بی ما شاء والسلام ۔



باب ۶۰

حدیث

وصیۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم لابی ھریرۃ بثلاثۃ اعمال من البر

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ مجھے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے تین کاموں کی وصیت فرمائی ہے۔ ہر مہینہ میں تین روزہ نفل رکھنا اور چاشت کی دو رکعتیں پڑھنا اور سونے سے پہلے وتر پڑھنا۔

شرح ظاہر حدیث ہر مہینہ تین روزہ رکھنا اور چاشت کی دو رکعت پڑھنے اور سونے سے پہلے وتر ادا کرنے کی ترغیب دے رہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو ان کی وصیت فرمائی ہے اور جس بات کی آپ وصیت فرمائیں اُس میں تاکیدی امر ہوتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ حضورؐ نے ابوہریرہؓ کو خصوصیت کے ساتھ یہ وصیت کیوں فرمائی؟ حضرات شیخین وغیرہ خلفاء راشدین کو کیوں نہ فرمائی؟ تو بات یہ ہے کہ حضرات خلفاء راشدین کو وصیت کی ضرورت نہ تھی وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث کامل اور آپؐ کے بعد نبوت کے کام کو سنبھالنے والے تھے اور جن کا یہ درجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہو وہ تو اس قابل ہیں کہ لوگ اُن سے وصیت حاصل کریں اُن کو کسی وصیت کی حاجت نہ تھی کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم بقدم آپؐ کے راستہ پر رسیدھے چلنے والے اور قرب الٰہی کے اسباب کی طرف سبقت کرنے والے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہے یبتغون الی ربھم الوسیلۃ ایھم اقرب۔ وہ اپنے ربّ کی طرف زینہ قرب کے طالب

رہتے ہیں کہ کون زیادہ قریب ہے۔ وہ ہر دم حکم کی بجا آوری میں لگے رہتے تھے مثلاً یہ حضرات چاشت کی رکعتیں نہیں پڑھتے تھے مگر وہ اس وقت مسلمانوں کی خدمت اور اُن کی مصالح پر نظر کرنے میں مشغول رہتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت باتیں ہیں جو اُن کی فضیلت پر دلالت کرتی ہیں۔

(۲۲۶) ہر شخص کو اُس کی حالت کے مناسب وصیت کی جاتی ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر شخص کو اُس کی حالت کے مناسب وصیت فرمایا کرتے تھے چنانچہ ایک شخص کو اُس کی درخواست کے بعد یہ وصیت فرمائی کہ والدین کی خدمت کیا کرو۔ ایک شخص کو یہ وصیت فرمائی کہ نماز یہ سمجھ کر پڑھا کرو کہ بس یہ آخری نماز ہے (شاید اس کے بعد پھر نماز کی مہلت نہ ملے اور موت آجائے) اور لوگوں کے پاس جو کچھ بھی ہے اُس سے امید قطع کردو (کسی سے کچھ توقع نہ رکھو) اور عبداللہ بن عمرؓ کے بارہ میں فرمایا وہ بہت اچھے آدمی ہے اگر رات کو اُٹھا کریں) اور بہت واقعات ہیں جن میں حضورؐ نے ہر شخص کو اُس کے مناسب حال وصیت فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے وصیت کی درخواست کی تو فرمایا غصہ نہ کیا کرو) اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ کو اُن کی حالت کے مناسب وصیت فرمائی۔ کیونکہ وہ عبادت کے لیے (سارے کام چھوڑ کر) یکسو ہو چکے تھے تو آپ نے اُن کو ایسے اعمال کی وصیت کی جو عابدین کا ہمیشہ سے شعار ہیں (یعنی نماز، نفل اور روزہ اور تہجد کا اہتمام) مگر ان کاموں میں آپؐ نے کم سے کم درجہ کی وصیت فرمائی۔ اگر آپ زیادہ کی وصیت فرماتے تو وہ اسی کا التزام کرتے جیسا اس وصیت کا التزام کر لیا تھا۔

چنانچہ ایک روایت میں اُن کا یہ قول وارد ہے کہ مجھے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے تین باتوں کی وصیت فرمائی ہے میں اُن کو نہیں چھوڑوں گا یہاں تک کہ آپؐ سے مل جاؤں۔ پھر ان تین باتوں کا ذکر فرمایا جو یہاں مذکور ہیں۔ اگر زیادہ کی وصیت کی جاتی وہ اُس کا بھی التزام کرتے پھر شاید کسی وقت مشقت ہوتی اس لیے حضورؐ نے

اعمال کی نوع کو بیان فرمادیا جو اُن کے لیے زیادہ موجب قرب ہیں اور زیادہ کو اُن کی ہمت و قدرت پر چھوڑ دیا - آپ نے کم سے کم درجہ بتلا دیا ۔ زیادہ سے سکوت فرمایا (رہا یہ کہ ہر شخص کے لیے قرب کا ذریعہ مختلف کیوں ہے؟ سب کے لیے ایک ہی راستہ کیوں نہیں تو) بات یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ میں سب کی حالت یکساں نہیں ہے ۔ ایک شخص کے لیے عبادت میں مشغول ہونا مناسب ہوتا ہے دوسرے کے لیے علماء کی صحبت میں رہ کر پڑھنا پڑھانا بہتر ہوتا ہے ۔ کسی کے لیے سفر کرنا اور جہاد کرنا اولیٰ ہے وغیرہ وغیرہ ۔

جس کو علم سے مناسبت ہو اُس کے حق میں شغلِ علم ہی بہتر ہے ۔ کیونکہ علم تمام اعمال سے افضل ہے ۔ جیسا شارع علیہ السلام کے ارشادات سے معلوم ہو چکا ہے ۔ تو اُس کے لیے عبادت میں مشغول ہو کر شغل علمی کو چھوڑ دینا موجبِ نقصان ہے خصوصاً اس زمانے میں تو جس کو علم سے مناسبت اور اہلیت حاصل ہو اُس پر علم میں مشغول ہونا واجب ہے ۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "جب دین میں بدعتیں داخل ہونے لگیں دین پر آفت آجائے گی ۔ اُس وقت معالمِ دین کو مضبوط پکڑلو اور اللہ سے رزق طلب کرو"

صحابہ نے کہا یا رسول اللہ! معالمِ دین سے کیا مُراد ہے ؟ فرمایا حلال و حرام (بیان کرنے) کی مجلسیں تو اس زمانہ میں علم (شرعی) تمام اعمال سے زیادہ موجب قربِ الٰہی ہے بلکہ ہم کہتے ہیں کہ (جس کو علم سے مناسبت ہو اُس پر) اُسی میں مشغول ہونا واجب ہے ۔ دلیل یہی حدیث ہے جو ہم نے بیان کی ۔ ہاں جس شخص میں علم کی اہلیت نہ ہو اُس کو عبادت میں مشغول ہونے کا امر کیا جائے گا کیونکہ اُمید ہے کہ وہ عبادت میں مشغول ہو کر اپنے کو بھی نفع دے اور دُوسرے بھی اُس کی دُعا سے نفع حاصل کریں ۔ اسی طرح تمام اعمال میں غور کیا جائے جس شخص کے مناسب جو عمل ہو اُسے دُوسرے اعمال پر مقدم کیا جائے ۔ نفسِ عمل کی فضیلت کو نہ دیکھا جائے بلکہ عمل کرنے والے کی حالت کو دیکھنا چاہیئے (ثواب کے کام تو بہت ہیں جس عمل کے بھی ثواب کو دیکھو وہی اپنی طرف

کھینچتا ہے ۔ مگر تمام مستحبات و فضائل کا احاطہ دشوار ہے ۔ اس لیے عمل کرنے والے کی حالت کے مناسب کسی عمل کو ترجیح دی جائے گی) کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو ایک ہی عمل کی وصیت نہیں کی بلکہ ہر ایک کے لیے جُدا عمل تجویز فرماتے تھے ۔ جس کی اس میں (زیادہ) اہلیت تھی (اور مطلب یہ ہوتا تھا کہ اعمالِ مستحبہ اور فضائل میں اس کا اہتمام زیادہ کیا جائے ۔ یہ مطلب نہ تھا کہ اس کے سوا اور اعمالِ مستحبہ کو بالکل نہ کیا جائے) ۔

وصیت تو اوّل درجہ کی کرنا چاہیئے اور زیادہ کی ترغیب دی جائے

رہا یہ کہ حضورؐ نے ان اعمال میں اوّل درجہ کی وصیت کیوں کی (زیادہ کی کیوں نہ کی ؟) تو اس کی وجہ ہم بتلا چکے ہیں کہ اگر زیادہ کی وصیت کی جاتی تو اندیشہ تھا کہ وہ اُس کا التزام کر لیتے (اور کسی وقت دشواری پیش آتی اس لیے زیادہ کو اُن کی ہمت اور قدرت پر چھوڑ دیا گیا ۔ دُوسرے ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت یہی تھی کہ تاکید تو اوّل درجہ کی ہی فرماتے پھر زیادہ کی ترغیب دیا کرتے تھے ۔ چنانچہ آپؐ کا ارشاد ہے کہ جو شخص سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتوں کے ساتھ قیام کرے (یعنی عشاء کے بعد دو رکعتوں میں اُن کو پڑھ لیا کرے) تو یہ اُسے کافی ہیں پھر اس کے بعد زیادہ کی ترغیب دی اور ہر اک مقدار کا الگ الگ ثواب بیان کیا ۔ یہاں تک کہ (آخر میں) فرمایا کہ جو شخص ہزار آیتیں قیام لیل میں پڑھے اُس کا لقب آسمانوں میں مقنطر ہوگا (یعنی بڑے خزانے والا) اور رات کے آخری تہائی حصہ کی بہت فضیلت بتلائی (تاکہ لوگ قیام لیل پر ہی اکتفا نہ کریں جو عشاء کے بعد سے شروع ہو جاتا ہے بلکہ تہجد کا اہتمام کریں جس کا بہترین وقت رات کا پچھلا حصہ ہے) اور خود آپؐ رات کو اتنی لمبی نماز پڑھتے تھے کہ پیروں پر ورم آجاتا تھا (ظلمت سنة من احی الظلام الی ان اشتکت قدماہ الضر من ورم ۱۲) اسی طرح آپؐ نے اس وصیت میں عمل کیا (چاشت کی) دو رکعتوں

کی وصیت فرمائی۔ پھر خود آٹھ رکعتیں پڑھیں۔ ایک روایت میں بارہ رکعت بھی وارد ہے اور فرمایا جو شخص چاشت کے وقت بارہ رکعتیں پڑھے اللہ تعالےٰ اُس کے لیے جنت میں عالی شان محل تیار کردیں گے۔ اس طرز کا منشاء اُمت پر شفقت اور مہربانی تھی کہ مبادا وصیت کے التزام میں مشقت لاحق ہو وہاں بدون وصیت کے آپ زیادہ عمل کی ترغیب دیا کرتے اور ثواب بیان کیا کرتے تھے اس کی تائید سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہوتی ہے واعلموا ان خیر اعمالکم الصلوٰۃ۔ (اور جان لو کہ تمہارے اعمال میں سب سے افضل نماز ہے) مطلب یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ پر جمے رہو اُن کو گنتی سے یا تخمینہ سے محدود نہ کرو بلکہ جس قدر بھی ہو سکے زیادہ کام کرو۔ زیادہ کی رغبت کرو (مجھے معاف کیا جائے کہ یہ تفسیر حدیث کی صحیح نہیں حدیث میں ولا تحصوا ہوتا تو یہ معنی بن سکتے تھے۔ مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ اُس میں ولن تحصوا وارد ہُوا ہے۔ اس کا مطلب وہی ہے جو احقر نے بین القوسین ترجمہ میں واضح کر دیا ہے کہ استقامت کے ساتھ کام کئے جاؤ تم سے سب اعمال کا احاطہ ہرگز نہ ہو سکے گا۔ یعنی فرائض و واجبات کے بعد اعمال مستحبہ میں اعتدال سے کام لو اتنا عمل کرو جس کو ہمیشہ نباہ سکو کہ یہی استقامت ہے۔ اس حدیث میں تکثیرِ عمل کا امر نہیں ہے بلکہ استقامت اور مداومت کا امر ہے)۔ مفسرین نے ولا اقسم بالنفس اللوامۃ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ (یہاں قیامت کا ذکر ہے اور نفس لوامہ سے قیامت میں اپنے کو ملامت کرنے والا نفس مراد ہے اور) قیامت میں ہر شخص ہی اپنے کو ملامت کرے گا۔ خواہ مومن ہو یا کافر کیونکہ کافر جب کفر کا عذاب دیکھے گا اپنے کو ملامت کرے گا کہ میں مومن کیوں نہ ہُوا؟ اور مومن گنہگار گناہوں کی سزا دیکھ کر اپنے کو ملامت کرے گا کہ میں نے دُنیا میں یہ اعمال کیوں کئے تھے اور مومن نیکوکار نیک اعمال کا ثواب دیکھ کر اپنے کو ملامت کرے گا کہ میں نے زیادہ کام کیوں نہ کیا تاکہ ثواب زیادہ ملتا دمگر زیادہ عمل کرنے کا طریقہ استقامت اور مداومت ہی ہے طاقت سے زیادہ

اتنا کام کرنا جس پر دوام نہ ہو سکے تعطل کا سبب ہو جاتا ہے اور تھوڑا کام بقدر ہمت ہمیشہ ہوتا رہے تو آخر میں اُس کی مقدار بہت ہو جاتی ہے۔ قطرہ قطرہ بہم شود دریا۔

قولہ وایضاً فقد کان علیہ السلام یوصی لکل شخص بحسب مایقتضیہ حالہ الیٰ قولہ حتی یکون لہ الثواب اکثر۔

ف۔ محققین مشائخ کا یہی طریقہ ہے کہ سب کو ایک لاٹھی نہیں ہانکتے ہر شخص کو اُس کے مناسب حال کام بتلاتے ہیں۔ اگر طالب کو شیخ پر اعتماد ہے وہ اُس کے بتلاتے ہوئے کام پر دل جمعی سے مداومت کر لیتا اور سمجھ لیتا ہے کہ میری کامیابی کا یہی راستہ ہے کتابیں دیکھنے سے جو مختلف اعمال کی طرف دل چلتا تھا کہ یہ کروں یا وہ کروں یا سب کروں تو کیسے کروں اس اُلجھن سے اُس کو نجات مل جاتی ہے اور حصولِ قرب میں دلجمعی کی بڑی ضرورت ہے اور طریق میں اتباع شیخ پر اسی لیے زیادہ زور دیا جاتا ہے کہ اُس کی تعلیم سے اُلجھن دُور ہو جاتی اور جمعیت قلب کی دولت نصیب ہو جاتی ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ شیخ محقق متبع سنت ہو ورنہ اُلجھن دُور نہ ہوگی بلکہ پریشانی بڑھے گی ؎

کارِ مرداں روشنی و گرمی است
کار دوناں حیلہ و بے شرمی ست

روشنی سے مُراد طمانینت و نورانیت قلب ہے اور گرمی سے محبت و عشق یہ دولت مرداں کامل ہی کے پاس ملتی ہے۔

ف۔ حضرت شارح کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہؓ کے لیے طریقِ عبادت اور شعار عابدین کو اختیار فرمایا تھا۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ حضورؐ نے اُن کے لیے طریقِ علم کو اختیار فرمایا تھا۔ اُن کا کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام باتوں کو سُننا اور یاد کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن سے زیادہ روایت حدیث کرنے والا اصحابہ میں کوئی نہیں مگر اس کے ساتھ ہی حضورؐ نے یہ بھی بتلا دیا کہ علمی شغل والوں کو کسی قدر عبادت نافلہ کا بھی اہتمام کرنا چاہیئے

صرف فرائض و واجبات وسنن پر ہی کفایت نہ کرنا چاہیئے اسی لیے چاشت کی دو رکعتیں بتلائیں اور ہر مہینہ میں تین روزے اور یہ کہ سونے سے پہلے تہجد پڑھ لیا کریں۔ وتر سے مراد صرف نماز وتر نہیں بلکہ تہجد مع الوتر ہے کیونکہ تنہا وتر پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اکتفا نہیں فرمایا۔ بلکہ اُس سے پہلے یا پیچھے کچھ نوافل بھی ہوتے ہیں۔ صحابہ عام طور پر وتر کا اطلاق نماز تہجد پر کرتے ہیں کہ وتر سے مل کر سب ہی وتر ہو جاتی ہے۔ چونکہ حضرت ابو ہریرہؓ عشاء کے بعد دن بھر کی سُنی ہوئی حدیثوں کو یاد کرتے تھے جس کی وجہ سے دیر میں سونا ہوتا تھا۔ اس لیے حضورؐ نے اُن کو یہ وصیت فرمائی کہ سونے سے پہلے تہجد پڑھ لیا کرو۔

پس اہلِ علم کو ان وصیتوں پر پابندی سے کاربند ہونا چاہیئے کہ اس سے زیادہ کی اُن کو فرصت نہیں مل سکتی واللہ تعالیٰ اعلم ۱۲ (اس حدیث میں امام مالکؒ (اور امام ابوحنیفہؒ) کے مذہب کی دلیل بھی ہے کہ نفل دو رکعت سے کم نہیں ہو سکتے (اگر اس سے کم ہو سکتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام پر اُسی کو بیان فرماتے کیونکہ آپ نے کم سے کم مقدار یہاں بتلائی۔ مگر اس پر اشکال یہ ہے کہ روزہ نفل بالاجماع تین سے کم ہو سکتا ہے اور یہاں تین سے کم نہیں بتلایا نہیں گیا تو ماننا پڑے گا کہ حضورؐ نے قلت کے ساتھ فضیلت پر بھی نظر فرمائی ہے اور جو لوگ ایک رکعت نفل کو جائز کہتے ہیں وہ بھی دو کی افضلیت کے قائل ہیں)۔

(۲۳۷) منقطع الدُنیا کو زیادہ عمل کی ضرورت نہیں قدرِ ضروری اور قدرِ قلیل مستحبات پر قناعت کی اجازت ہے

یہاں ایک اور بھی عجیب بات ہے جس پر عاقل کو اچھی طرح غور کرنا چاہیئے، وہ یہ کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس دُنیا کا کوئی سامان نہ تھا نہ وہ دُنیا کمانے میں مشغول تھے (بلکہ اصحاب صفہ میں شامل تھے جن کا مقصد صرف حضورؐ کی خدمت میں رہنا آپ کی باتوں کو سُننا اور علم حاصل کرنا تھا) تو اُن سے قلیل عمل کا مطالبہ کیا گیا۔ کیونکہ انھوں نے دُنیا کے قلیل حصہ پر ہی قناعت کی تھی۔ اسی سے صوفیاء نے یہ قاعدہ اختیار کیا ہے کہ جو شخص سب سے یکسو ہو کر اُن کے یہاں آپڑے، وہ اُس کی یکسوئی اور انقطاع ہی پر قناعت کرتے ہیں اور تھوڑا سا کام بتلا دیتے ہیں۔ اور جو دنیوی اسباب میں مُبتلا ہو اُس کو بہت کام بتلاتے اور نیک اعمال کی طرف سبقت کرنے کی تاکید کرتے ہیں یہاں تک کہ جو شخص معمول سے زیادہ کھاتا ہو اُسے رات کو زیادہ بیدار رہنے کا امر کرتے ہیں جس کا سبب یہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے کیونکہ جو شخص عبادت کے لیے اپنے کو فارغ کر لیتا ہے اُس کا دل دُنیا کمانے کی فکر سے خالی ہوتا ہے اور پُوری طرح اللہ تعالےٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور انسان سے اسی چیز کا مطالبہ ہے کہ اکثر اوقات میں اُس کو حضورِ حق حاصل رہے۔ چنانچہ ایک بزرگ سے ہاتف (غیب) نے کہا گھر کو خالی کرو تاکہ اُس کا مالک اُس میں رہے۔ مطلب یہ کہ اپنے دل کو ماسوائے اللہ سے خالی کرو اسی وقت خالق (جل وعلا) اس میں رہے گا (یعنی حضورِ حق اُسی وقت قلب کو حاصل ہوگا) اور جب دل میں خالق کے سوا کوئی نہ ہو تو یہی غایت ہے۔ مطلوب ہے یہی غنیمت کبریٰ ہے، بخلاف اس کے جو اسباب میں مشغول ہوتا ہے اُس کا دل کسبِ معاش میں ضرور مشغول ہوگا خواہ تھوڑی ہی دیر کے لیے ہو اسی لیے اُس کو اعمالِ صالحہ کی کثرت کا حکم کیا جاتا ہے۔

یہی حال اُس کا ہے جو پیٹ بھر کر کھاتا ہے کیونکہ اُس کا بدن عبادت میں سُستی کرتا ہے وہ پیٹ بھر کر آرام کرنا چاہتا ہے تو اُس کو اس کی ضد کا حکم دیا جاتا ہے کہ شب بیداری زیادہ کرے تاکہ کھانے کا ثقل دُور ہو جائے اور عبادت میں نشاط حاصل ہو۔ کیونکہ دل کی حالت یہ ہے کہ ہاتھ پیروں سے جو کام کیا جاتا ہے اسی کا طرف اُس کا میلان زیادہ ہوتا ہے اور صوفیاء کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ دل کی تعمیر کا اہتمام کرتے ہیں تو جو لوگ اسباب میں مشغول ہوتے ہیں اُن کو زیادہ عبادت بتلاتے ہیں تاکہ کسبِ معاش کے شغل سے

عبادت بڑھ جائے اور قلب کا میلان اعمالِ صالحہ کی طرف زیادہ ہو جبکہ ہاتھ پیروں سے عبادت زیادہ ہو جائے گی دل کا میلان بھی اس کی طرف زیادہ ہوگا اور جو شخص عبادت کے لیے فارغ ہو چکا اُس کو شغلِ اسباب سے کچھ واسطہ نہ ہوگا (تو اُس کو زیادہ اعمال کی ضرورت نہیں)۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک شخص کو صبح کے قریب سوتا ہُوا پایا فرمایا اے شخص کھڑا ہو جا کہ عابدین تجھ سے آگے بڑھ گئے۔ اُس نے کہا اے روح اللہ! مجھے (اسی حال میں) چھوڑ دیجئے کیونکہ میں اللہ تعالےٰ کی عبادت اس طرح کر رہا ہوں کہ جو سب سے زیادہ اُس کو محبوب ہے۔ پُوچھا وہ کیا طریقہ ہے؟ اُس نے کہا میں دُنیا سے بے رغبت ہو چکا ہوں۔ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا سوتا رہ تو عابدین سے بڑھ گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دُنیا سے بے رغبتی قلب اور بدن دونوں کو راحت دیتی ہے۔ اس میں بھی اُس مضمون پر اشارہ ہے جو ہم بیان کر رہے ہیں۔ قلب کو راحت دینے کا مطلب یہ ہے کہ زاہد کے دل کو اسبابِ دُنیا میں فکر و تدبیر سے راحت ملتی ہے اور جب دل اس سے خالی ہوگا تو وہ (اللہ تعالےٰ کی طرف متوجہ ہو کر آباد ہو جائے گا۔ کیونکہ دل (کسی خیال سے) خالی کبھی نہ ہوگا ایک نہ ایک خیال ضرور اُس میں ہوگا (خواہ دُنیا کا یا آخرت کا) ایک نہ ہوگا تو دُوسرا ضرور ہوگا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دونوں کا خیال ساتھ ساتھ ہو مگر ایسا نادر ہے۔

قولہ دفیہ معنی دانق الی قولہ لکن ذلک النادر۔

ف ۔ یہاں سے ناظرین کو مقصدِ تصوف معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس طریق کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ دل میں اللہ کے سوا کچھ نہ ہو۔ یہی وہ نسبت صوفیاء ہے جس کو غنیمت کبریٰ کہا جاتا ہے۔ جملہ اذکار و اشغال و نوافل اسی کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں لیکن اگر یہ مقصد اتباعِ سنت کے ساتھ حاصل ہو تو نسبت مقبولہ منورہ ہے بدعات کے ذریعے حاصل ہو تو نسبت غیر مقبولہ مظلمہ ہے ؎

دل ہو وہ جس میں کچھ نہ ہو جلوۂ یار کے سوا
میری نظر میں خاک بھی جام جہاں نما نہیں

ف ۔ جو لوگ مشائخ کی خدمت میں دُنیا کے افکار سے فارغ ہو کر جا پڑتے ہیں اُن کو زیادہ محنت و مشقت کی ضرورت نہیں ہوتی صحبت شیخ کی برکت ہی سے یہ نسبت اُن کو جلد حاصل ہو جاتی ہے بشرطیکہ صحبت سے مقصود خلوصِ قلب کے ساتھ صرف یہی ہو کہ تعلق مع اللہ حاصل ہو جائے۔ کوئی دنیوی مقصد حصولِ جاہ وغیرہ نہ ہو۔ زہد فی الدنیا یعنی دُنیا کی محبت سے دل کا خالی ہو جانا تصوف کا پہلا قدم ہے اگر یہ حاصل نہیں تو صحبتِ شیخ نافع نہیں۔

(۲۳۸) انسان اپنے دوست کے طریقے پر ہوتا ہے جو طریقہ پر نہ ہو وہ دوستی کا دعویٰ نہیں کر سکتا

یہاں ایک اور بات بھی ہے وہ یہ کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھوک اور فاقہ کو اپنے اختیار سے پسند کیا۔ اسباب (معاش میں اشتغال) کو ترک کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہ پڑے کسی وقت آپ سے جُدا نہ ہوتے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے بھوک اور فاقہ پر صابر ہو گئے۔ یہاں تک کہ بعض دفعہ بھوک کی شدت سے بے ہوش ہو جاتے اور کسی کو اُن کے حال کی خبر نہ ہوتی۔ اس حالت میں اُن کو (ایک گونہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہت حاصل تھی۔ کیونکہ حضورؐ نے بھی غنا پر فقر کو ترجیح دی تھی اور آپؐ بعض دفعہ بھوک کی شدت میں اپنے پیٹ پر تین تین پتھر باندھتے تھے (تاکہ کمر سیدھی رہے اور کسی کو فاقہ کی خبر نہ ہو) اور فرماتے تھے الا رب مکرم نفسہ وھو لہا مھین ۔ سُن لو! بعض آدمی اپنے نفس کا اکرام کرتا ہے حالانکہ حقیقت میں وہ اس کو ذلیل کرتا ہے او کما قال علیہ السلام (غالباً مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ فقر و افلاس کے وقت لوگوں سے سوال کر کے اپنی بھوک پیاس بُجھا کر نفس کی خواہش کو پُورا

اب یہ بات باقی رہی کہ حضورؐ

(۲۳۹) زندگی کی لمبی اُمیدیں نہ باندھنا چاہیئے

نے (اعمالِ مستحبہ) میں اُن کو چاشت کی دو رکعت اور ہر مہینہ میں تین روزے اور سونے سے پہلے وتر پڑھنے کی وصیت پر کیوں اکتفا کیا؟ تو چاشت کی دو رکعت تو اس لیے کہ اس سے کم ممکن نہیں۔ آپؐ نے اوّل درجہ پر کفایت کی اور ہر ماہ میں تین روزے اس لیے کہ یہ بھی اوّل درجہ ہے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر نیکی دس نیکیوں کے برابر ہوتی ہے اور مہینے کے تیس دن ہوتے ہیں تو انسان کو چاہیئے کہ ہر مہینے میں (کم از کم) تین روزے رکھ لے تاکہ پُورے مہینہ کے روزوں کا ثواب مل جائے اور یہ شخص صائم الدہر کے حکم میں ہو جائے (اور ظاہر ہے کہ اس سے مُراد رمضان کے علاوہ گیارہ مہینے ہیں کیونکہ رمضان میں تو پورے مہینہ کے روزے فرض ہیں اور یہاں فرائض کی وصیت مقصود نہیں بلکہ فرائض واجبات وسنن کے علاوہ چند مستحبات کی وصیت مطلوب ہے) رہا سونے سے پہلے وتر پڑھ لینے کی وصیت اُس کی وجہ یہ ہے کہ آپؐ اُن کو اعمال میں سبقت کی تاکید فرما رہے ہیں مبادا موت آجائے (اور کام رہ جائے) کیونکہ اگر وتر کے بغیر سوگئے تو شاید سوتے ہی میں رات کو موت آجائے (نیند بھی تو ایک قسم کی موت ہے) تو وتر کا ثواب رہ جائیگا۔

اگر کوئی یہ کہے کہ آپؐ نے سونے سے پہلے وتر کی وصیت اس لیے کی ہے کہ وتر قضاء نہ ہو جائے مبادا صبح تک آنکھ نہ کھلے اور صبح کے بعد وتر پڑھا جائے حالانکہ وتر کا رات میں پڑھنا افضل (اور حنفیہ کے نزدیک واجب) ہے تو جواب میں کہا جائے گا کہ یہ بات نہیں ہے کیونکہ حضورؐ کا ارشاد ہے رفع القلم عن ثلاث فذکر النائم حتی یستیقظ کہ تین شخصوں سے قلم مرفوع ہو چکا ہے جن میں سے ایک سونے والا ہے یہاں تک کہ بیدار ہو۔ تو اگر نیند کی وجہ سے وتر قضاء ہو جائے کچھ گناہ نہ ہوگا (اور صبح کے بعد وتر پڑھنے سے[ع] وہی ثواب ہوگا جو رات میں پڑھنے سے ہوتا) بلکہ علت

ع بشرطیکہ اُس نے جاگنے کا اہتمام بھی کیا ہو۔ ۱۲ ظ۔

کرتے ہیں جو بظاہر نفس کا اکرام ہے مگر واقعہ میں اُس کو ذلیل کرنا ہے) غرض چونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جم کر رہ پڑے تھے اور اُسی حالت کو اختیار کئے ہوئے تھے جو حضورؐ نے اپنے واسطے اختیار کی تھی۔ اس لیے حضورؐ نے خصوصیت کے ساتھ اُن کو یہ وصیت کی۔ اور اسی بناء پر ابوہریرہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا خلیل کہا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہر شخص اپنے دوست کے طریقہ پر ہوتا ہے۔ پس دیکھ لو تم کس سے دوستی کر رہے ہو؟ (اس لیے) ابوہریرہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا خلیل کہا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دوستی (اور محبت) کا دعوے کرنے کا حق حاصل ہوگیا۔ یہ اشکال نہ کیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو فرماتے ہیں کہ اگر میں کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا کیونکہ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ابوہریرہؓ کو اپنا خلیل بنایا تھا۔ مگر آپؐ کے خلیل نہ بنانے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ صحابہ کو بھی حضورؐ سے تعلقِ خلت نہ ہو کیونکہ خلت کے لیے یہ لازم نہیں کہ اعلیٰ بھی ادنیٰ کو خلیل بنائے بلکہ کبھی یہ تعلق طرفین سے ہوتا ہے کبھی ایک ہی طرف سے ہوتا ہے کہ ادنیٰ کو اعلیٰ سے خلت ہو (گو اعلیٰ کو ادنیٰ سے نہ ہو) خلت کی شرط وہی ہے جو اُوپر بیان کی گئی کہ انسان اپنے خلیل کے طریقہ پر ہو اور یہ شرط حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ میں موجود تھی تو اُن کو دعوے خلت جائز تھا۔

قولہ وفیہ معنی آخر الی قولہ فساغ لہ ادعاء الخلۃ لاجل ذلک

ف ۔ خلیل کا ترجمہ عام طور سے دوست کیا جاتا ہے حالانکہ خلیل وہ ہے جسکی محبت سویدا قلب میں جاگزین ہو۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا تعلق تو صرف اللہ تعالے سے تھا ویسے محبت کا تعلق خلفاء راشدین اہل بیت حضرت فاطمہ حضرات حسنینؓ ازواج مطہرات خصوصاً حضرت عائشہ صدیقہ کے ساتھ بہت تھا لیکن یہ سب محبتیں اطراف قلب میں تھیں قلب کے اندر اللہ کے سوا کچھ نہ تھا ؎

عذل العواذل حول قلب التائہ وھوی الاحبۃ منہ فی سودائۃ ۱۲ مترجم

وہی ہے کہ شاید موت آجائے اور وِتر بالکل ہی فوت ہو جائے اس کی تائید دُوسری حدیث سے ہوتی ہے کہ ایک شخص نے حضورؐ سے وصیت کی درخواست کی تو فرمایا صلِّ صلاۃ مودع نماز اس طرح پڑھو جیسے دُنیا کو الوداع کہنے والے پڑھتا ہے۔ آپؐ نے اس شخص کو قصر امل کی ترغیب دی (کہ زندگی کی لمبی اُمید نہ باندھو بلکہ یہ بات پیشِ نظر رکھو شاید ہمیں نفس واپسیں بود۔ اسی حقیقت پر متنبہ کرنے کے لیے آپؐ نے حضرت ابوہریرہؓ کو سونے سے پہلے وِتر کی وصیت فرمائی کہ یہ اُمید نہ باندھو کہ صبح تک زندہ رہو گے) اس کی تائید ایک دُوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ سے پُوچھا کیف اصبحت۔ تم نے کس حال میں صبح کی؟ انہوں نے کہا اصبحت مؤمنا حقا۔ کہ میں نے سچے مومن کی طرح صبح کی۔ حضورؐ نے فرمایا ہر حق کی ایک حقیقت ہوتی ہے تو تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ (بیان کرو) کہا یا رسول اللہ! میں نے اس حال میں صبح کی ہے کہ ہر قدم پر یہ گمان ہوتا ہے شاید دُوسرا قدم نہ اُٹھا سکوں (اور موت آجائے) اور گویا قیامت میرے سامنے کھڑی ہے۔ ہر اُمت کو اُس کے نامۂ اعمال کی طرف پکارا جا رہا ہے جنتی جنت میں راحت کر رہے ہیں دوزخی دوزخ میں عذاب دیئے جا رہے ہیں حضورؐ نے فرمایا ھنیئا لک العلم تم کو یہ علم مبارک ہو۔ قولہ لکن یتفق بحث الیٰ قولہ ھنیئا لک العلم۔

(۲۴۰) صُوفیا کے یہاں اپنی ذات کے لیے کوئی وقت نہیں اُن کا ہر وقت عبادت میں گزرتا ہے

ان ہی احادیث کے معنی اور مقتضا پر نظر کر کے حضرات صوفیاء کے یہاں اپنی ذات کے لیے کوئی وقت نہیں رہا بلکہ اُن کی عمریں ہمیشہ قسم قسم کی عبادات میں مشغول رہ کر ختم ہوتی ہیں کیونکہ اُن کو (عمل کے) فوت ہو جانے اور موت آجانے کا اندیشہ لگا رہتا ہے اس لیے وہ اعمال کی طرف سبقت کرتے اور یہ گمان کرتے ہیں کہ شاید یہی عمل آخری عمل ہو اس لیے جب دُوسرے اُن کی عبادات کو سنتے ہیں اُن کو

بڑا تعجب ہوتا ہے۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ انسان کی قدرت سے اتنی عبادت باہر ہے اور اگر یہ مسکین اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے جو اُن کے پیشِ نظر ہے تو اُن کے پاس بھی ویسے ہی اعمال ہوتے جیسے صوفیاء کے پاس ہیں۔ کیونکہ یہ بات معلوم ہے کہ جس کو ہر سانس پر یہ گمان ہو کہ شاید یہی آخری سانس ہے تو یقیناً اُس کو غفلت نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہ حال قائم و دائم ہے۔ ان کو حیرت اس لیے ہوتی ہے کہ یہ لوگ طول امل کی وجہ سے دُنیا کی تدبیر اور کسبِ معاش میں مشغول ہیں۔ ایسا شخص اگرچہ کتنی ہی قوت اور تمکین والا ہو ضرور اپنے رب سے کسی قدر غافل ہو کر اپنے کاموں کی تدبیر کرے گا۔ کیونکہ طول امل کا قطعی تقاضا ہے اور حضرات صوفیاء کی حالت اُس کی ضد ہے وہ تو جب کوئی لباس پہنتے ہیں گمان ہوتا ہے کہ شاید یہی آخری لباس ہو جس کو لے کر قبر میں جائیں۔ جب کوئی لقمہ کھاتے ہیں گمان ہوتا ہے کہ شاید یہی آخری رزق ہے جو دُنیا میں اُن کے لیے مقدر کیا گیا ہے۔ جس شخص کا یہ حال ہو اگرچہ وہ سب سے زیادہ کمزور ہو۔ غفلت اور سستی اُس کے پاس بھی نہیں آسکتی۔ اس لیے ان جیسوں کے بارے میں کہا گیا ہے الوقت سیف۔ وقت ایک تلوار ہے (جو کاٹ کر رہتا ہے اس کا وار خالی نہیں جاتا یا تمہارے واسطے وار کرے گا۔ اگر اس کو نیکی میں گزار دیا یا تمہارے اُوپر وار کرے گا اگر معصیت یا غفلت میں گزار دیا)۔

مطلب یہ ہے کہ اپنے وقت کی ہر ساعت پر نظر رکھو کہ اس وقت تم پر کیا لازم ہے اس کو بجا لاؤ اور وقت کو عمل میں گزارو تاکہ عمل سے پہلے دفعۃً موت نہ آجائے یا (اگر ایسا نہ کیا تو) تاخیر کی وجہ سے وقت تم کو کاٹ دے گا۔ اگر موت نہ بھی آئی کیونکہ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ انسان کی عمر کا جو دن بھی گزرتا ہے اُس کی جگہ دُوسرا دن نہیں لے سکتا اور گئے وقت کو لوٹانا بھی ممکن نہیں۔ اب اگر وقت اس حال میں گزرا کہ تم نے اس میں کوئی نیک عمل کر لیا ہے تو کامیابی ہے اور اگر نیک عمل سے خالی گزر گیا تو خسارہ۔ ہم اس کی جگہ دُوسرا وقت

نہیں دے سکتا۔ احمق اور مسکین وہ ہے جو اپنے اوقات کو امروز و فردا میں گزارتا ہے کہ آج کام کروں گا آج نہیں تو کل کروں گا اور اس ٹال مٹول کے ساتھ بھی وہ اپنے کو صاحبِ فلاح سمجھتا ہے۔ حالانکہ وہ (سراسر) خسارہ میں ہے۔ کیا جس دن میں وہ پچھلی کوتاہی کی تلافی کرنا چاہتا ہے اگر (اس میں اور پہلے میں) دونوں میں برابر عمل ہوتا تو زیادہ بہتر اور کامیابی کا سبب نہ ہوتا؟ اللہ تعالےٰ نے زبور میں داؤد علیہ السلام پر وحی نازل کی ہے کہ اے داؤد! تم کو لعل اور سوف اور الیٰ عمل سے نہ روک دے (کہ امید ہے کل تک یہ کام ہو جائے گا۔ عنقریب ایسا کروں گا۔ فلاں دن تک ضرور یہ کام کر لوں گا وغیرہ وغیرہ)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے اور یہ آخری کلام ہے جو اُن کی زبان سے نکلا "اے شخص! کل کی فکر آج نہ کر۔ کیونکہ دو حال سے خالی نہیں یا تو کل کو پائیگا یا نہ پائے گا۔ اگر پا لیا تو اللہ تعالےٰ اُس میں نیا رزق دے گا اور اگر نہ پایا تو ایسے دن کی فکر سے کیا فائدہ جس کو تم نہیں پا سکتے"

شارح علیہ السلام کے ارشادات اور بزرگانِ سلف کے اقوال و افعال اس معنی میں بکثرت وارد ہیں۔ بس جس کو فلاح (اور کامیابی) و ترقی مطلوب ہو وہ ان احادیث و اقوال میں غور کرتا رہے جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اور اُن پر عمل کرتا رہے اس کے بعد ترقی اور کمال میں اللہ تعالےٰ پر بھروسہ رکھے اُس کی طرف عاجزانہ متوجہ رہے۔ انشاء اللہ تعالےٰ وہ مطلوب تک پہنچ جائے گا۔

قوله ولاجل النظر الیٰ معنی ھذہ الاحادیث الیٰ قوله یصل عند ذلك انشاء الله الی المرغوب۔

(۲۴۱) اہلِ اللہ کی صحبت حاصل ہونے پر فخر کرنا جائز ہے جبکہ بطور شکر کے ہو تکبّر کے لیے نہ ہو ۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اہلِ برکت

کی صحبت (حاصل ہونے) پر فخر کرنا جائز ہے بشرطیکہ اُن سے نسبت (اور تعلّق) بھی حاصل ہو جائے خواہ کسی درجہ کا ہو (بدون نسبت اور تعلّقِ خاص کے نری صحبت سے کچھ نہیں ہوتا) اور فخر بھی شکر کی نیت سے ہے۔ مباہات اور رفعت (اور تکبر) کی بنا پر نہ ہو۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ذکر النعم شکر نعمتوں کا تذکرہ بھی شکر ہے۔ یہ اس سے مفہوم ہوا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے اوصانی خلیلی۔ مجھے میرے خلیل نے وصیت کی (جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی خلت و محبت کو ثابت کر کے صحبت رسول پر فخر کا اظہار ہے)۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان اپنے اور اہلِ فضل کے درمیان کوئی رشتہ (اور تعلّق) ثابت کر سکتا ہے اور اُن کی طرف اس تعلق سے اپنی نسبت بھی کر سکتا ہے اگرچہ اُنھوں نے اس کے لیے اس تعلّق کا نام نہ لیا ہو۔ کیونکہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا خلیل کہا حالانکہ حضورؐ نے اپنی ذاتِ مقدسہ سے تمام انسانوں کی خلت کی نفی کر دی ہے (چنانچہ اُوپر یہ حدیث گزر چکی کہ اگر میں اللہ تعالےٰ کے سوا کسی کو دوست بناتا تو ابو بکرؓ کو بناتا جس سے صاف معلوم ہوا کہ اللہ تعالےٰ کے سوا آپؐ کا کوئی خلیل نہیں ہے) اور کہا گیا ہے ؎

ان التشبہ بالکرام فلاح   بزرگوں کے ساتھ مشابہت حاصل کرنا بھی فلاح ہے۔

قوله وفیه انه یجوز الافتخار بصحبة المبارکین الیٰ قوله فلاح۔

ف ۔ شاید کسی کے دل میں اس مقام پر یہ سوال پیدا ہو کہ حدیث میں تو آیا ہے ان لنفسك علیك حقا کہ تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے۔ پھر یہ کیسے کہا گیا کہ صوفیاء کے یہاں اپنے نفس کے لیے کوئی وقت نہیں۔ جس ساعت میں نفس کا حق ادا کیا جائے گا وہ تو نفس کا وقت ہوگا۔ جواب یہ ہے کہ وہ نفس کا

حق بھی اس نیت سے ادا کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے اُس کا حق واجب کیا ہے تو یہ بھی نفس کا ذوق نہ ہُوا بلکہ حکم الٰہی کی تعمیل کا وقت ہُوا جو عین عبادت ہے اسی طرح بیوی بچوں کا حق بھی اسی نیت سے ادا کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے اُن کا حق واجب کیا ہے۔ تجارت اور ملازمت اور زراعت بھی اس نیت سے کرتے ہیں کہ کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ۔ حلال روزی حاصل کرنا بھی فرائض کے بعد ایک فریضہ ہے جو اللہ تعالےٰ نے فرض کیا ہے تو اُن کا یہ وقت بھی حکم الٰہی کی تعمیل میں گزرتا ہے جو کہ عبادت ہے۔

اور یہاں سے معلوم ہُوا کہ انسان کو زیادہ خسارہ نیت سے غفلت کی بناء پر ہوتا ہے اگر وہ تمام مباحات میں اپنی نیت کو دُرست رکھے تو اُس کے سارے اوقات عبادت میں مشغول ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ مباحات کو بھی کسی نہ کسی درجے میں دین سے تعلق ہوتا ہے۔



باب ۹۱

حدیث

الامر بترك مالم يسم عليه من الصيد

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں اپنے (شکاری) کُتّے کو چھوڑتا ہوں اور بسم اللہ کہتا ہوں۔ پھر اُس کے ساتھ شکار پر دُوسرا کتا پاتا ہوں جس پر میں نے بسم اللہ نہیں کہی اور مجھے معلوم نہیں کہ دونوں میں سے کس نے شکار کو پکڑا ہے۔ فرمایا (اس شکار کو) نہ کھاؤ کیونکہ تم نے اپنے کُتّے کو بسم اللہ کے ساتھ چھوڑا ہے دوسرے پر تو بسم اللہ نہیں کہی۔

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ شکار پر بسم اللہ کہنا واجب ہے۔ اگر بسم اللہ نہ کہی جائے تو شکار کے کھانے کی کوئی صُورت نہیں۔ کیونکہ جب صحابی نے حضورؐ سے عرض کیا کہ مجھے معلوم نہیں کس کُتّے نے شکار کو پکڑا تو آپ نے باوجود شک کے اُن کو اس شکار کے چھوڑ دینے کا حکم دیا (اور کھانے سے منع فرمایا) تو جس پر بالیقین بسم اللہ نہیں کہی گئی بلکہ عمداً بسم اللہ کو ترک کیا گیا ہو اُس کا حرام ہونا بدرجہ اولیٰ معلوم ہو گیا۔

ف - یہی امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے کہ جس شکار یا جانور پر بسم اللہ ترک کر دی گئی اُس کا کھانا جائز نہیں۔ امام شافعیؒ سے روایت ہے کہ اُس کا کھانا جائز ہے کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ بسم اللہ ہر مسلمان کے دل میں ہے مگر یہ حدیث ضعیف ہے

اور جس ذبیحہ پر بسم اللہ نہ کہی گئی ہو اُس کا حرام ہونا قرآن میں منصوص ہے ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ وانہ لفسق ط۔

اور یہ حدیث صحیح بھی اُس کی حُرمت کو بتلا رہی ہے اس لیے اس بات میں حنفیہ اور مالکیہ کا مذہب قوی ہے۔

ف۔ اس حدیث سے شارح نے کوئی مسئلہ تصوف کا استنباط نہیں کیا میرے خیال میں وہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اسبابِ معاش کا اختیار کرنا توکل کے خلاف نہیں۔ کیونکہ صحابہ سے بڑھ کر متوکل کون ہوگا؟ اور اکثر صحابہ نے اسبابِ معاش کو اختیار کیا ہے۔ سب حضرت ابوہریرہؓ کی طرح تارکِ اسباب نہ تھے پس جو اولیاء اسبابِ معاش میں مشغول ہوں اُن پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔

باب ۹۲

حدیث

النہی عن الصرف الا یدًا بید

حضرت براء بن عازبؓ اور زید بن ارقم رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیع صرف کو دریافت کیا (بیع صرف چاندی سونے کی خرید فروخت کو کہتے ہیں) حضورؐ نے فرمایا اگر ہاتھ در ہاتھ ہو تو کچھ حرج نہیں اور اگر اُدھار ہو تو درست نہیں۔

شرح ظاہر حدیث سے بیع صرف کا جواز معلوم ہوا کہ جب ہاتھ در ہاتھ ہو اور ممانعت معلوم ہوئی جبکہ اُدھار ہو چاہے تھوڑی ہی دیر کا اُدھار ہو چنانچہ حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے اگر (بیع صرف میں) ایک شخص تم سے اتنی مہلت مانگے کہ گھر کے اندر جا کر چیز لے آئے تو اتنی مُہلت بھی نہ دو (بلکہ مجلس بیع ہی میں تبادلہ ہو جانا چاہیئے)۔

ف۔ شارح نے یہاں بھی کوئی مسئلہ تصوف کا استنباط نہیں کیا۔ میرے خیال میں اس سے بھی مقصود وہی ہے کہ اسبابِ معاش میں مشغول ہونا خلافِ توکل اور خلافِ ولایت نہیں۔ کیونکہ یہ دونوں صحابی چاندی سونے کا کاروبار کرتے تھے اور حضورؐ نے اُن کو منع نہیں کیا اور صحابہ سے بڑھ کر متوکل اور صاحبِ ولایت کون ہو سکتا ہے؟

باب ۹۳

حدیث

الحث علی العمل وفضل عمل الید

حضرت مقداد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی نے اس شخص سے بہتر (حلال) کھانا نہیں کھایا جو اپنے ہاتھ کے عمل سے (کما کر) کھاتا ہو اور اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کے عمل سے (کما کر) کھاتے تھے (وہ لوہے کی زرہ بہت عمدہ بناتے تھے جو لڑائی کے وقت فوجی پہنتے ہیں) اور اسی کو بیچ کر اپنی گزر کرتے تھے (باوجود عظیم الشان سلطنت کے شاہی خزانہ سے کچھ نہ لیتے تھے وہ سب کا سب رعایا پر خرچ ہوتا تھا ۱۲ مترجم)۔

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ بہترین غذا وہ ہے جو انسان اپنے ہاتھ کے عمل سے کماتا ہے اور اسی کے ضمن میں کسب پر ترغیب بھی ہے جس کی چند شرطیں ہیں (جو آگے بیان ہوں گی)۔

(۲۴۲) اسبابِ معاشں کا اختیار کرنا سُنّت ہے اور اس میں حکمت ہے

اس خیریت (اور بہتری) سے کیا مراد ہے؟ اور یہ فضیلت مومن و کافر سب کو عام ہے یا مومن کے ساتھ خاص ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف داؤد علیہ السلام کی مثال کیوں بیان فرائی حالانکہ اکثر انبیاء علیہم السلام اپنے ہاتھ سے کام کرتے تھے؟ جواب یہ ہے کہ اگر بہتری کی علت یہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے کام کرنے

والا دوسروں سے مستغنی ہوتا ہے اور کسب کی وجہ سے کسی پر اس کا بار نہیں ہوتا کیونکہ (مثل مشہور ہے کہ) جس کی طرف تم کو احتیاج ہو وہ تمہارا سردار ہے اور جس سے تم مستغنی ہو تم اس کے سردار ہو۔ اگر خیر ہونے کا یہ مطلب ہے تو اس میں مومن اور کافر سب داخل ہیں اور یہ جو ہم نے کہا ہے کہ اس میں کسب کی ترغیب بھی ہے درست ہے لیکن اس کے لیے چند شرطیں ہیں۔

ایک یہ کہ ذریعۂ کسب شرعاً جائز ہو۔ دوسرے یہ کہ اس کا عمل بھی شریعت کے موافق ہو کیونکہ بعض دفعہ ذریعۂ کسب تو جائز ہوتا ہے مگر عمل شریعت کے خلاف ہوتا ہے (مثلاً سُنار کا پیشہ شرعاً جائز ہے مگر عمل کے وقت سنار خالص سونے میں کھوٹ ملانے لگے تو اس کا عمل شریعت کے خلاف ہوگا۔ اسی طرح درزی کے پیشے کو اور ہر پیشے کو سمجھ لیا جائے ۱۲)۔

اور اگر خیر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ذریعۂ معاش میں کام کرنے پر ثواب ہوتا ہے اور اس کی خیر متعدی ہوتی ہے (کہ دوسروں کی بھی مدد کرتا ہے غریبوں محتاجوں پر صدقہ کرتا ہے) جیسا ایک حدیث میں ہے من بات تعبانا من طلب الحلال بات مغفورا له واصبح والله راض عنه۔ جو شخص کسبِ حلال سے تھک کر رات گزارے اُس کی مغفرت ہو جاتی ہے اور صبح کو اس حال میں اُٹھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس سے راضی ہوتے ہیں۔ اس صورت میں یہ فضیلت مُسلمانوں کے ساتھ خاص ہوگی اور مُسلمانوں کو کسبِ معاش پر ترغیب دینے کا مطلب یہ ہے کہ شریعت کے موافق کمانے کا ذریعہ اختیار کریں۔

یہ بھی احتمال ہے کہ خیر ہونے کا یہ مطلب ہو کہ پیشہ ور کا رزق بواسطہ اُس کے عمل کے غیب سے آتا ہے۔ یہ بات اُسی پیشہ کے ساتھ خاص ہے جو ہاتھ سے کیا جاتا ہے دوسرے اسبابِ کسب اس میں داخل نہ ہوں گے۔ اسی وجہ سے حضرت داؤد علیہ السلام کی مثال بیان کی گئی۔ دُوسرے انبیاء کی نہیں۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ صنعت (و حرفت) اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے جس سے صاحب

صنعت پر خرچ کرتا رہتا ہے۔ اس صورت میں یہ حدیث تعلیمِ صنعت کی ترغیب دے رہی ہے کہ یہی سنت ہے اس میں کچھ عار نہیں کیونکہ جس کام کو انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی نے کیا ہو اس میں عار نہیں ہو سکتا۔

یہ بھی احتمال ہے کہ خیر ہونے کی علت یہ ہو کہ ہاتھ سے پیشہ کرنے میں اللہ تعالیٰ کا کوئی حق واجب نہیں ہوتا۔ دُوسرے اسبابِ معاش میں حق اللہ واجب ہوتا ہے جو کبھی پورا ادا ہو جاتا ہے اور کبھی قصداً یا بلا قصد کچھ ادا ہونے سے رہ جاتا ہے تو اور اسبابِ معاش میں زکوٰۃ اور دیگر حقوق واجب ہوتے ہیں اور احتمال رہتا ہے کہ وہ ادا ہوئے یا نہیں؟ اور ہاتھ سے جو پیسے کئے جاتے ہیں اگر شریعت کے موافق کام کیا جائے تو اُس میں کوئی حق اللہ یقینی طریقہ پر واجب نہیں ہوتا (تو اس میں کوتاہی کا بھی احتمال نہیں) اور جس میں کوتاہی کا احتمال نہ ہو وہ اس سے بہتر ہے جس میں احتمال ہو۔

یہ بھی احتمال ہے کہ خیر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہاتھ کی صنعت وحرفت میں دُوسرے ذرائع معاش سے زیادہ برکت ہوتی ہے۔ پھر یہ برکت کبھی حسی ہوتی ہے کبھی معنوی۔ برکتِ حسیہ تو یہ ہے کہ کھانے میں تھوڑی مقدار زیادہ مقدار کے قائم مقام ہو جائے اور برکت معنویہ یہ ہے کہ اس کھانے سے قوت ونشاط دوسرے کھانوں سے زیادہ حاصل ہو۔

اور یہ بھی احتمال ہے کہ خیر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ معاش کے لیے کوئی ذریعہ اختیار کرنا سُنت ہے اس میں سنت کا اتباع ہے کیونکہ اس میں حکمت (الٰہیہ) کا ایک نشان ہے۔ اسی لیے جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ بنا دیئے گئے لوگوں نے اُن کو تلاش کیا تو بازار میں تجارت کرتے ہوئے ملے۔ لوگوں نے کہا کہ خلیفہ ہونے کے بعد بھی تجارت؟ فرمایا تو کیا میں اپنے اہل وعیال کے ذریعۂ معاش کو چھوڑ دوں؟ (اس کے بعد اُن کی تنخواہ بیت المال سے مقرر کی گئی جو آجکل کے حساب سے سوا سو روپیہ ماہوار کے قریب تھی)۔

اس بنا پر مطلقاً اسباب معاش کا اختیار کرنا باعثِ برکت ہے بشرطیکہ شریعت کے موافق ہو خواہ صنعت ہو یا زراعت یا تجارت وغیرہ سب ہی میں برکت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی طرح اس دُنیا کی آبادی کا ارادہ کیا ہے۔ (حکمتِ الٰہیہ کا یہی تقاضا ہے کہ لوگ اسباب کے ذریعہ معاش طلب کریں بغیر اسباب کے شاذ ونادر ہی کسی کو روزی ملتی ہے) اسی لیے میرے ایک شیخ جو زہد وعلم دونوں کے جامع تھے درس وتدریس سے فارغ ہو کر اپنے ہاتھ سے اپنے باغ میں کام کرتے تھے۔ بعض دفعہ تدریس کے ساتھ مجاہدہ (و ریاضت) بھی کرتے۔ پھر بھی پھاوڑہ سے کام کرنا نہ چھوڑتے اور فرماتے تھے کہ دُوسروں نے بویا تھا ہم نے کھایا ہم بوئیں گے تو دُوسرے کھائیں گے تاکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ظاہر ہو۔ جس وقت اُن کا باغ تیار ہو گیا انتقال فرما گئے (رحمہ اللہ تعالیٰ)۔

اب ہم اُن اعتراضات کو بیان کرتے ہیں جو اس مقام پر وارد ہوتے ہیں اور اُن کا جواب بھی دیں گے۔ اُوپر کہا گیا ہے کہ کسبِ معاش کے ذریعہ لوگوں سے استغنا ہو جاتا ہے۔ اس پر قرآن وحدیث سے اعتراض وارد ہوتا ہے۔ قرآن کی تو یہ آیت ہے رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله واقام الصلوٰة وايتاء الزكوٰة۔ وہ ایسے لوگ ہیں جن کو تجارت اور بیع اللہ کی یاد سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے سے غافل نہیں کرتی۔

اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت اور اہلِ صفہ کی حالت وارد ہے (کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسبِ معاش کا کوئی ذریعہ اختیار نہیں کیا بلکہ تارکِ اسباب تھے اور یہی حالت اہلِ صفہ کی تھی) اور حضورؐ نے اہلِ صفہ کو اُن کے حال پر قائم رہنے دیا بلکہ بعض دفعہ اُن کو دُوسروں پر ترجیح دیتے تھے۔ قرآن کی آیت کا تو یہ جواب ہے (کہ اُس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ لوگ تجارت اور بیع وشراء نہیں کرتے بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ کام اُن کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہیں کرتے وہ بدن سے کسبِ معاش کرتے ہیں اور دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ رہتا ہے۔ چنانچہ

اس آیت کے شانِ نزول میں بیان کیا گیا ہے کہ صحابہ میں ایک درزی کی عادت تھی کہ اذان کے وقت اگر کپڑے میں سوئی ہوتی اُس کو نکالتا نہ تھا اور نکال چکتا تو پھر کپڑے میں نہ لگاتا بلکہ فوراً کھڑا ہو جاتا اور فرض ادا کرنے چلا جاتا۔ اسی طرح لوہار کی یہ حالت تھی کہ اگر ہتھوڑا اُٹھا لیتا اور اذان کی آواز کان میں آجاتی تو اُس کو لوہے پر نہ مارتا بلکہ ہاتھ سے پھینک دیتا اور اگر مار چکنے کے بعد اذان سُنتا تو پھر نہ اُٹھاتا بلکہ فوراً عمل آخرت (نماز وغیرہ) کے لیے کھڑا ہو جاتا، یہاں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ بندہ سے (شریعت کو) مطلوب یہ ہے کہ اس کا دل اسی کے ساتھ وابستہ رہے جس کے پاس جانے والا اور پہنچنے والا ہے۔ اگرچہ ہاتھ پاؤں کسبِ معاش وغیرہ میں لگے ہوں۔

مجھ سے ایک بزرگ نے بیان کیا کہ افریقہ میں ایک گھاس کھودنے والا حماموں کے لیے گھاس لاتا تھا اور وہ اپنے وقت کے بڑے اولیاء میں سے تھا۔ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر دوپہر کے قریب تک یہ کام کرتا۔ پھر وہ کپڑے (جن میں گھاس کھودتا) اُتار دیتا اور حمام میں جا کر غسل کرتا دُوسرے کپڑے پہنتا اور جو کچھ مزدوری ملتی اس میں سے تھوڑی مقدار اپنے واسطے رکھ کر فقراء، عابدین اور مساکین کو باقی رقم تقسیم کر دیتا۔ خود دن بھر روزہ رکھتا اور مغرب کے وقت اس قلیل مقدار سے افطار کرتا جو اپنے واسطے رکھ لی تھی۔ یہ شخص صاحبِ احوالِ رفیعہ تھا اس کو بڑے بڑے بزرگ ہی پہچانتے تھے کیونکہ وہ اپنے حال کو لوگوں سے چھپاتا تھا۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ صفہ کی حالت سے جو اعتراض کیا گیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت سب سے بڑھ کر ہے۔ آپؐ کے نفس کو دُنیا کی طرف اصلاً توجہ نہ تھی (تو جس کی یہ حالت ہو اُس کے لیے حضور کی طرح تارکِ اسباب ہونا ہی بہتر ہے لیکن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ (دُوسروں کے ساتھ) نرمی کرنا ہے۔ کیونکہ بعض بلکہ اکثر لوگ ضعیف ہیں (وہ حضورؐ کی اس حالت کا اتباع نہیں کر سکتے۔ تو اُن کے لیے آپؐ نے اسباب معاش کو اختیار کرنا مشروع کیا) جیسا مجذوم کے بارہ میں (دوسروں کو تو آپؐ نے یہ فرمایا فر من المجذوم

کما تفر من الاسد۔ کوڑھی سے ایسا بھاگو جیسا شیر سے بھاگتے ہو۔

اور خود آپؐ نے مجذوم کے ساتھ ایک برتن میں کھانا کھایا اور یہ دُعا پڑھی بسم اللہ قل لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا۔ اللہ کے نام سے کھاتا ہوں کہدو کہ ہم کو ہرگز کوئی مصیبت نہ آسکتی۔ سوا اس کے جو اللہ تعالےٰ نے ہمارے واسطے مقدر کی ہے تو آپؐ نے (دُوسروں کے لیے) آسان اور سہل طریقہ مشروع فرمایا کیونکہ حق تعالےٰ کا ارشاد ہے ما جعل علیکم فی الدین من حرج۔ اللہ نے تمہارے اُوپر دین میں ذرا بھی تنگی نہیں کی اور اپنی حالت (اور عمل) سے اہلِ قوت کے لیے (جن کے دل تعلق مع اللہ سے مضبوط ہو چکے ہیں) اعلیٰ درجہ کے اختیار کرنے کا اشارہ بھی فرما دیا۔ مثلاً مجذوم ہی کے مسئلہ میں دو راستے ہیں جس کا نفس ضعیف ہو اُس کو سنت کا اتباع کر کے مجذوم سے بھاگنا چاہیئے اس میں اس پر کوئی گناہ نہ ہوگا اور اگر نفس قوی ہو تو اُس سے ملے اور اُس کے ساتھ کھائے اور اس میں وہ آپؐ کے حال کا متبع ہوگا۔ چونکہ اہلِ صفہ نے (اور اُن کے بعد صُوفیاء نے) بلند حالت کو اختیار کیا (وہ حضورؐ کی طرح تارکِ اسباب ہو گئے اور توکل کا اعلیٰ درجہ لے لیا) تو حضورؐ اُن کو دُوسروں پر ترجیح دیتے تھے۔

اُوپر کہا گیا ہے کہ کسبِ معاش (کے ذرائع و اسباب اختیار کرنے) میں ثواب ہے اس پر ایک حدیث سے (بظاہر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ہے:

لو انکم توکلتم علی اللہ حق توکلہ لرزقکم کما یرزق الطیر تغدو خماصا و تروح بطانا۔ اگر تم اللہ تعالےٰ پر پُوری طرح توکل کرتے جیسا توکل کا حق ہے تو اللہ تعالےٰ تم کو اس طرح روزی دیتے جس طرح پرندوں کو روزی دیتے ہیں کہ وہ صُبح کو بھوکے جاتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے واپس ہوتے ہیں (جس سے معلوم ہوتا ہے کہ توکل کا اعلیٰ درجہ ترک اسباب ہے اور جب اعلیٰ درجہ یہ ہے تو ثواب بھی اسی میں زیادہ ہے کیونکہ اعمال میں فضیلت ثواب ہی کی قلت و کثرت سے ہے) جواب یہ ہے کہ دونوں میں کچھ تعارض نہیں، تطبیق

یہ ہے کہ جس کو توکل حقیقی حاصل ہو (اس کے لیے ترک اسباب ہی افضل ہے) اور توکل حقیقی کی شان یہ ہے کہ اس شخص کا دل کسی مخلوق سے وابستہ نہ ہو اور اگر اس کو کسی کے ہاتھ سے کوئی خیر حاصل ہو تو اُس کا دل اللہ تعالےٰ ہی سے وابستہ رہے۔ کسی دُوسرے سے وابستہ نہ ہو۔ اور جو چیز بغیر انتظار نفس کے اس کے پاس آئے اول شریعت پر اُس کو جانچے۔ اگر شریعت کے لحاظ سے درست ہو تو پھر طریقت کی رُو سے دیکھے۔ اگر اس پر بھی ٹھیک اُترے اب اللہ تعالےٰ سے دُعا کرے کہ اس کو بہترین صُورت کی ہدایت کریں کہ اس کو لے یا چھوڑ دے (یہ ہدیہ قبول کرے یا نہ کرے) جب اُس کو بہترین صورت کی توفیق ہو جائے تو اگر لینے میں خیر ہو لے لے اور اس شان سے لے (کہ دل اللہ تعالےٰ ہی کے ساتھ وابستہ ہو) اس کے بعد اس کی ضرورت ہے (کہ حق تعالےٰ سے دُعا کرے) کہ اس کو اچھی جگہ صرف کرنے کی توفیق ہو اور تمام حالات میں کسی کے ساتھ دل کو تعلق نہ ہو۔ ویکون ذلک بمعرفۃ غیرہ فی التصرف فی ذلک بما یزیدہ الی اللہ قربا وفی حالہ حسنا (اس عبارت کے ترجمہ و مطلب میں شرح صدر نہیں ہُوا) پھر اس تمام معاملہ میں اللہ تعالےٰ کے احسان کا مشاہدہ کرے اور اتباع سنت کی بنا پر اس شخص (کے احسان کا بدلہ دے اگر یہ نہ ہو سکے تو اُس) کے لیے دُعا کرے جس کو حق تعالےٰ نے اس کے لیے مسخر کیا (اور اس کے ہاتھ سے خیر پہنچائی) ہے اور دعا (وغیرہ) بھی محض اتباع امر کے لیے ہو اس سے زیادہ کچھ نہ ہو۔

حدیث میں ہے من والاک معروفا فکافئہ فان لم تجد فادع اللہ لہ حتی تعلم انک قد کافأتہ (جو شخص تم پر کوئی احسان کرے اس کا بدلہ دو اگر یہ نہ ہو سکے تو اللہ تعالیٰ سے اس کے لیے دُعا کرو یہاں تک کہ دل گواہی دیدے کہ تم نے اُس کا بدلہ کر دیا) نیز ایک حدیث میں دُعا کی حد یہ بتلا دی گئی کہ جب تم نے احسان کرنے والے سے یہ کہہ دیا جزاک اللہ خیرا۔ اللہ تجھے جزائے خیر دے۔ تو تم نے اُس کی تعریف میں مبالغہ کر دیا۔

اور اگر (اس شخص کو کسی کے ذریعہ سے خیر نہیں پہنچتی بلکہ) یہ اُن لوگوں میں سے ہے جن کو خرق عادت (اور کرامت) کے طور پر (بلا واسطہ غیبی) فتوحات پہنچتی ہیں اس کو چاہیئے کہ ان فتوحات کو اللہ تعالےٰ کی طرف محتاج بن کر شکر کے ساتھ لے اور اپنے کو اس کا اہل نہ سمجھے ادب کو ملحوظ رکھے اور اپنے دل کو اس کرامت سے وابستہ نہ کرے اگرچہ وہ کرامت ربانی ہو (اللہ ہی کی طرف سے ہو اُس کے تصرّف کو اس میں اصلاً دخل نہ ہو پھر بھی اُس پر توجہ نہ کرے) کیونکہ یہ بھی شغلِ خاطر کا سبب ہو گا۔

نیز تصرف کے وقت اپنی احتیاج کو پیشِ نظر رکھے اور اللہ تعالےٰ سے دعا کرے کہ اس کو ایسی جگہ خرچ کرنے کی ہدایت فرمائیں جو اُس کی مرضی کے موافق ہو اور اپنے حال کو چھپائے کسی سے (غیبی فتوحات کا) تذکرہ نہ کرے۔ مگر یہ کہ اُس کو اظہار کا حکم ہو تو حکم کے موافق ظاہر کرے اور (کوئی دریافت کرے تو) فتوحات کا انکار نہ کرے کیونکہ یہ بھی منجملہ نعمتوں کے (بڑی نعمت) ہے (اور نعمت کا انکار مناسب نہیں کہ ناشکری ہے) اور اگر کوئی دریافت نہ کرے تو اس کا تذکرہ نہ کرے اور جب کوئی دریافت کرے تو صراحۃً خبر نہ کرے سوا اس کے جس سے (صراحۃً) ذکر کرنے کا حکم کیا گیا ہو۔ کیونکہ یہ (غیبی فتوحات) قدرت کے اسرار میں سے ہیں اور جو شخص اسرارِ قدرت کو بغیر اجازت اور ضرورت کے ظاہر کرتا ہے وہ بہت کم اُس کے پاس رہتی ہیں اور بہت کم باقی رہتی ہیں۔ ضرورت کی صُورت یہ ہے کہ اظہار پر مجبور ہو جائے چھپانے پر قادر نہ ہو۔

مجھ سے ایک ثقہ نے بیان کیا کہ ایک معلّم کے اہل و عیال بہت تھے اور اُس کے پیشہ کی آمدنی کافی نہ تھی (پڑھنے والے بچے جو کچھ لاتے وہ اُس کے خرچ کیلئے کافی نہ ہوتا) اس کا ایک بھائی بڑا مالدار تھا مگر وہ اس کی خدمت نہ کرتا تھا اور اس نے اپنے بھائی سے یا اور کسی سے اپنا حال ظاہر نہیں کیا تھا تو اللہ تعالےٰ نے خرق عادت (یعنی کرامت) کے طور پر یہ صُورت جاری کر دی کہ روزانہ جب

وہ مکتب کھولتا بچوں کے آنے سے پہلے اپنی دوات میں اتنی رقم موجود پاتا جو اس دن کے لیے کافی ہوتی اس طرح اس کی حالت درست ہوگئی (تنگی اور افلاس سے نجات مل گئی) ایک مدت اسی حال میں گزر گئی تو اُس کے بھائی کو تعجب ہوا کہ مکتب کی آمدنی تو اس کو کافی نہ ہوتی تھی (پھر یہ خوشحالی کہاں سے آئی ؟) بالآخر اُس نے دریافت کیا کہ تیری آمدنی کہاں سے ہونے لگی تو اُس نے اُس سے ساری حقیقت بیان کردی۔ اس کے بعد یہ فتوحات بند ہوگئیں (یہ تو اُس کا حکم ہے جس کا توکل قوی ہے اور ایسے ہی لوگوں کے بارہ میں وہ حدیث وارد ہے لو انکم توکلتم علی اللہ حق توکلہ الخ)

اور جس کا توکل ضعیف ہو اُس کو اسبابِ معاش کا اختیار کرنا ہی بہتر ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ جس کا توکل قوی ہے اُس کا ایمان قوی ہے وہ ہر حال میں اپنے رب سے راضی رہتا ہے بندگی پر جما رہتا اور (کسی وقت بھی) اللہ تعالیٰ پر (اور اُس کی تقدیر پر) اعتراض نہیں کرتا نہ کسی چیز کی طرف نظر اُٹھاتا ہے اور جس کا توکل ضعیف ہے اُس کا ایمان ضعیف ہے۔ اس کا دل (ہر حال میں) اللہ تعالےٰ سے خوش نہیں رہتا گو زبان سے کچھ نہ کہے اُس کا نفس اِدھر اُدھر نظر رکھتا ہے۔ بعض چیزوں کی تمنا بھی کرتا ہے اور کبھی بعض باتوں پر (دل میں) اعتراض بھی آتا ہے (گو عمداً نہ ہو وسوسہ ہی کے طور پر ہو) اور یہ عین ہلاکت ہے تو اُس کے لیے اسباب میں مشغول ہونا ہی رحمت ہے۔ کیونکہ اس کا دل اسباب میں غور و فکر کرکے اللہ تعالےٰ سے راضی رہتا ہے۔ اگر اس کی مراد کے پورا ہونے میں کچھ نقصان بھی ہوا تو اُس کو یہ فکر ہوتی ہے کہ کس طرح کام کرے جس سے امید بر آئے (نقصان کو اپنی تدبیر کے ناقص ہونے کی طرف منسوب کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کرتا) اس صورت میں اس کے لیے بھلائی کی امید کی جاسکتی ہے کیونکہ اُس نے اپنے مولیٰ کے خوف سے اپنے نفس کی تجویز پر مقدم کیا ہے (جبکہ شریعت کی پابندی کے ساتھ اسبابِ معاش میں کام کر رہا ہے خلافِ شریعت سے بچنے کا اہتمام کرتا ہے)

اور اگر یہ ذریعۂ معاش اس نیت سے اختیار کیا ہو کہ اس سے طاعت میں مدد لے تو اس صورت میں خیر زیادہ ہو جائے گی اور اپنے صدقِ یقین کی بنا پر اس کے دل میں تواضع و انکسار پیدا ہوگا اور (سمجھے گا کہ میں تو دُنیا دار ہوں) یقین والے مجھ سے آگے بڑھ گئے ہیں تو اُس کا ثواب بڑھتا رہے گا (کم نہ ہوگا) اور خبردار دل میں یہ خیال نہ آنے پائے کہ میں اُن لوگوں سے افضل ہوں جو اپنے مولیٰ کے ساتھ معاملہ رکھتے اور اُس کے وعدہ کو جو رزق کی ضمانت میں کیا ہے سچا سمجھتے اور اُس کی عبادت میں جس کا حکم دیا گیا ہے اسبابِ معاش کو چھوڑ کر مشغول ہوگئے ہیں (کہ یہ تو اپاہج ہیں تدبیر کو چھوڑ کر تقدیر پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں۔ دُوسروں کے محتاج ہیں ہم دُوسروں کے محتاج نہیں بلکہ اپنا بھی خرچ اُٹھاتے ہیں اور دُوسروں کی بھی مدد کرتے ہیں۔ اگر ایسا خیال دل میں لایا گیا تو) یہ بدترین حالت ہوگی کیونکہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔ فلا تزکوا انفسکم ھو اعلم بمن اتقی (اپنے منہ سے) اپنی تعریف نہ کرو اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ متقی کون ہے ؟ اور یہاں سے معلوم ہوا کہ ہر شخص کے مناسبِ حال صورت پر نظر کرنا چاہیئے (سب کو ایک لاٹھی نہ ہانکنا چاہیئے) اسی کو فقہ حال کہتے ہیں اسی سے نفع زیادہ ہوتا ہے اور چونکہ اکثر لوگوں پر ضعف ہی غالب ہے تو حکم وہی دیا گیا جو اکثر کے مناسبِ حال ہے۔

قولہ والکلام علیہ من وجوہ منہا ما معنی ھذہ الخیریۃ الی قولہ جاء الحکم علی الاغلب من حکم الناس۔

ف ۔ (البتہ حضورؐ نے خود اپنے لیے اعلیٰ حال کو اختیار فرمایا کہ ترکِ اسباب کے ساتھ توکل کیا، یہاں سے ان لوگوں کا جواب ہوگیا جو صوفیا تارکینِ اسباب پر اعتراض کیا کرتے اور کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے اسلام میں رہبانیت داخل کردی۔ حالانکہ اسلام میں رہبانیت نہیں۔ میں کہتا ہوں اگر ترکِ اسبابِ معاش کا نام رہبانیت ہے تو وہ بتلائیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کون سا ذریعۂ معاش اختیار فرمایا تھا ؟ اگر آپ کا ذریعۂ معاش کچھ نہ تھا بجز اللہ تعالےٰ پر توکل کرنے کے تو گویا سب سے پہلے

آپؐ ہی نے اسلام میں رہبانیت کو داخل فرمایا ہے اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے اور اگر یہ رہبانیت نہیں بلکہ نکاح نہ کرنے اور اہل وعیال نہ رکھنے کا نام رہبانیت ہے تو صُوفیاء نے یہ طریقہ کب اختیار کیا ہے؟ جس قدر صوفیاء تارکینِ اسباب ہوئے ہیں سب بیوی بچوں والے تھے۔

رہا یہ اعتراض کہ صوفیاء متوکلین دُوسروں کے سہارے پر رہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے صوفیاء کو نہیں دیکھا۔ مکاروں کو دیکھا ہوگا جو تصوّف کا جھوٹا دعوےٰ کرنے والے ہیں تو ایسے مکار ہر جماعت کے اندر موجود ہیں۔ علماء میں بھی اور علماء و طلباء اور فارغین اور اساتذہ میں بھی۔ امراء و رؤسا اور وزراء میں بھی۔ سلاطین وخلفاء میں بھی۔ اگر ان مکاروں کی وجہ سے کسی جماعت کو بدنام کیا جاسکتا ہے تو کوئی جماعت بھی اچھی نہیں کہی جاسکتی اور اس کا عین حماقت ہونا ظاہر ہے۔ جس نے سچے صوفیاء کو دیکھا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ حضرات دُوسروں کے سہارے پر نہیں ہوتے بلکہ سلاطین وامراء سے زیادہ مستغنی ہوتے ہیں بڑے بڑے ہدایا کو جو شریعت اور طریقت کی کسوٹی پر پُورے نہ اُتریں ٹھکرا دیتے اور واپس کر دیتے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں روپیوں کا واپس کر دینا کچھ آسان کام نہیں جو علماء یا روشن خیال لوگ صوفیاء پر اعتراض کرتے ہیں اگر اُن کے سامنے بڑی بڑی رقمیں پیش کی جائیں تو کسی نہ کسی تاویل سے فوراً قبول کرلیں گو وہ ہدیۂ شریعت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو ۱۲ مترجم۔

ف۔ کرامت کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس میں صاحبِ کرامت کے قصد وارادہ اور تصرف کو اصلاً دخل نہ ہو یہ ربانی ہے ایک وہ جس میں اس کے ارادہ و تصرف کو دخل ہو وہ روحانی ہے۔ مگر تصرف بدون اذنِ الٰہی کے نہ کرنا چاہیئے کہ خلافِ توحید اور خلافِ کمالِ معرفت ہے اور جس کو آج کل دستِ غیب کہا جاتا ہے، وہ کرامت میں داخل نہیں نہ وہ ربانی ہے نہ روحانی بلکہ شیطانی ہے کیونکہ اُس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی عمل یا نقش کے ذریعے سے جنات کو تابع کیا جاتا اور اُن سے روپیہ منگایا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جنات خوشی سے تابع نہیں ہوتے بلکہ جبر وقہر سے تابع ہوتے

ہیں اور بغیر حق تعالےٰ کے حکم کے کسی پر جبر وقہر کرنا جائز نہیں۔ پس عاملوں کا اپنے اس عملِ تسخیر کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی تسخیر پر قیاس کرنا غلط ہے کہ وہاں جنات کو اللہ تعالےٰ نے اُن کے تابع کیا تھا تم کو کس نے اجازت دی کہ اس طرح اُن کو تابع بناؤ۔ اللھم الا ان یکون الجن کافرا من المحاربین فیجوز تسخیرہ کما یجوز تسخیر الکافر الحربی من الانس لمن ادعی ص یجاد ولکنہ مقتضیٰ القواعد ولا یجوز اخذ الخراج منہ الا بعد التیقن بانہ لا یاخذہ من اموال المسلمین ولا من اموال اہل الذمۃ فافہم ۱۲ مترجم۔

بقیہ اعتراضات کا جواب جو اس مقام پر وارد ہوتے ہیں

اُوپر کہا گیا ہے کہ صنعت وحرفت کے بہتر ہونے کی یہی وجہ ہے کہ یہ شخص بواسطہ صنعت کے غیب سے روزی لیتا ہے۔ اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا واقعہ وارد ہوگا کہ اُنہوں نے آسمان سے مائدہ (خوان) نازل کرنے کی دُعا کی تھی اور یہ بلا واسطہ غیب سے روزی تھی (اگر یہ صُورت افضل نہ ہوتی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اُس کے لیے کیوں دُعا کرتے۔ جواب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے یہ دُعا از خود نہیں کی بلکہ اپنی قوم کی درخواست پر کی تھی جو اُنہوں نے بطور معجزہ تصدیقِ رسول کے واسطے کی تھی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ صُورت افضل تھی) نیز یہ واقعہ بھی وارد ہوتا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو گھر سے نکلے حضرت علیؓ بھی آپؐ کے پاس پہنچے۔ پوچھا تم کو اس وقت گھر سے نکلنے کی کیا ضرورت پیش آئی کہا بھُوک کی وجہ سے نکلا ہوں، حسنؓ اور حسینؓ بھی بھُوک کی وجہ سے مضطر رہے ہیں۔ رضی اللہ تعالےٰ عنہم۔ فرمایا جس چیز نے تم کو گھر سے نکالا اُس نے مجھے نکالا ہے (میں بھی بھوکا ہوں) پھر آپؐ کے پاس چند صحابہ اور بھی آئے وہ بھی بھوک کی شکایت کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ دیکھو اُس کھجور کے درخت کے پاس جاؤ (اور یہ زمانہ کھجور آنے کا نہ تھا، موسم ختم ہوچکا تھا) اور اُس سے کہو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تازہ کھجور ہم کو دو۔ اُسی وقت کھجور پر تازہ پھل آگیا اور حضرت علیؓ (بہت مقدار) کھجور (کی) لائے جو سب حضرات نے کھائی اور ہر شخص اپنے گھر والوں کے واسطے بھی بقدر کفایت بلکہ کچھ زیادہ لے گیا۔ (جواب یہ ہے کہ یہ بھی بطور معجزہ کے ہوا جو کبھی کبھی ہوتا تھا ہمیشہ نہ ہوتا تھا دوسرا جواب حضرت موسےٰ علیہ السلام و حضرت خضر علیہ السلام کے قصہ سے ظاہر ہوگا کہ یہ دونوں حضرات جب باہم ملے اور ساتھ ساتھ چلے جیسا اللہ تعالےٰ نے قرآن میں بیان فرمایا ہے تو (بعض روایات میں ہے کہ) دونوں کو بھوک لگی تو اُن کے پاس (غیب سے) بکری کا بچہ آیا جس کا آدھا حصہ تو بھنا ہوا تھا اور آدھا حصہ کچا گوشت تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھنا ہوا گوشت کھانا چاہا تو خضر علیہ السلام نے فرمایا یہ آپ کے طریق کے مناسب نہیں کیونکہ آپ اسباب سے کام لیتے ہیں اور میرا طریقہ تفویض ہے (میں تارک اسباب ہوں) تو آپ جائیے لکڑیاں جمع کیجئے آگ جلائیے اور کچے گوشت کو بھون کر کھائیے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے ایسا ہی کیا اور خضر علیہ السلام نے بھنا ہوا کھایا (یہ روایت نظر سے نہیں گزری اور غالباً ضعیف ہے۔ قرآن میں جو قصہ مذکور ہے وہ تو یہ ہے کہ دونوں حضرات ایک بستی میں پہنچے اور بستی والوں سے ضیافت کا کھانا طلب کیا اُنھوں نے مہمانداری سے انکار کیا وہاں ایک دیوار جھکی ہوئی بوسیدہ کھڑی تھی جو گرنے کے قریب تھی خضر علیہ السلام نے اُس پر ہاتھ پھیر دیا تو سیدھی ہوگئی۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر تم چاہتے اس پر مزدوری لے سکتے تھے۔ ایسے بے ہودہ لوگوں کی دیوار کو مُفت سیدھا کرنا کیا ضرور تھا اور اگر یہ روایت تسلیم کر لی جائے تو اس سے یہ معلوم ہوگا کہ ترک اسباب افضل نہیں بلکہ اسباب کا اختیار کرنا افضل ہے کیونکہ اوّل طریقہ خضر ہے اور دوم طریقہ موسیٰ علیہ السلام اور یقیناً موسیٰ علیہ السلام خضر علیہ السلام سے افضل و اعلیٰ ہیں تو ان کا طریقہ بھی افضل ہوگا و اللہ تعالیٰ اعلم)۔

اور حقیقت یہ ہے کہ یہاں کسی صُورت کی افضلیت عام نہیں۔ فضیلت تو اُسی میں ہے جو شریعت نے مشروع کیا ہے۔ کیونکہ یہ حالت رفیعہ (یعنی بلا واسطہ غیبی فتوحات جس کو حاصل ہوتی ہے بعض دفعہ یہ سمجھتا ہے کہ میں نے اُس کی شرطیں پُوری کر دی ہیں

حالانکہ اُس نے سب شرطیں پُوری نہیں کیں۔ اب اگر کسی وقت اُس کو کوئی ناگوار صُورت پیش آتی ہے اللہ تعالےٰ پر (الزام اور) تہمت رکھتا ہے (گو عمداً نہ ہو بطور وسوسہ کے ہی ہو) اور یہ بڑی خطرناک حالت ہے یا مراد پُوری ہوگئی تو دھوکہ میں پڑ جاتا ہے (اپنے کو ولی اور قطب و غوث سمجھنے لگتا ہے) اور یہ بھی بڑا خطرناک حال ہے پس ایسے لوگوں کے لیے صنعت و حرفت ہی افضل ہے کہ اس طریق میں سلامتی افضل ہے۔ جیسا نماز کے بارے میں حضورؐ کا ارشاد ہے کہ انسان کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا افضل ہے سوائے فرض نماز کے (کہ وہ مسجد میں افضل ہے) کیونکہ گھر کی نماز میں ریاء وغیرہ کی آمیزش سے سلامتی زیادہ ہے اور سلامتی کا طریق ہی افضل ہے اگرچہ دُوسرے طریق کا فائدہ بڑا ہے۔ مگر اُس فائدہ کے ساتھ خطرات بھی لگے ہوئے ہیں جن سے بہت کم لوگ بچ کر نکلتے ہیں۔ اسی لیے بعض بزرگوں کا ارشاد ہے کہ مَیں سلامتی کے برابر کسی حالت کو نہیں سمجھتا۔ مقاماتِ عالیہ کے لیے دُوسرے حضرات ہیں جو اُن ہی کے لیے پیدا کئے گئے اور اُن ہی کے موافق عمل کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اولیاء کاملین کے لیے جن کا ایمان اور توکل قوی ہو ترکِ اسباب افضل ہے اور ناقصین کے لیے اسباب کا اختیار کرنا افضل ہے اور بعض دفعہ اولیاء کاملین بھی خطرات سے سلامتی کے لیے اسباب کو اختیار کرتے ہیں۔ جیسا اکثر صحابہ کے حالات سے ظاہر ہے اور چونکہ انبیاء علیہم السلام خطرات سے محفوظ ہیں اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض انبیاء تارک اسباب تھے ۱۲ مترجم)۔

اُوپر کہا گیا ہے کہ صنعت و حرفت میں کوئی حق اللہ متعین نہیں اس لیے وہ دُوسرے اسباب معاش سے جن میں حق اللہ واجب ہے افضل ہے۔ کیونکہ احتمال ہے کہ حق اللہ کے ادا کرنے میں کچھ کمی رہ گئی ہو۔ اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ بعض دفعہ دُوسرے اسبابِ معاش میں بھی کوتاہی کا احتمال نہیں رہتا۔ جیسا ایک تاجر کی حکایت ہے کہ وہ سمندر میں (مالِ تجارت لے کر) جا رہا تھا کہ جہاز ٹوٹ گیا یہ بھی دُوسرے مسافروں کے ساتھ پانی سے باہر آیا تو ایک شخص نے کہا آؤ اس آبادی میں

چلیں جو یہاں سے قریب (نظر آ رہی) ہے کہا میں تو (کنارہ) سے نہ ہٹوں گا جب تک میرا مال باہر نہ آئے۔ ساتھی نے اس کو بے وقوف بنایا (کہ بھلا سمندر کے اندر سے بھی کہیں مال خود بخود باہر آیا ہے) پھر وہ اس کے ساتھ کچھ دیر تک کنارے پر بیٹھا رہا کہ دفعتہً سمندر کی موجوں نے ایک گٹھڑی باہر پھینکی دیکھا تو اس پر اس کا نام لکھا ہوا تھا اسی طرح ایک ایک کر کے اس کا تمام سامان باہر آ گیا سمندر میں کچھ بھی نہ رہا تو ساتھی نے پوچھا۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تیرا کیا معاملہ ہے جو تمام مسافروں میں سے تجھے ہی اس کرامت کے ساتھ خاص کیا۔ کہا اللہ تعالیٰ نے مجھے جو بھی حکم دیا میں اس کو بجا لایا پھر مجھ سے وہ چیز کیونکر لے سکتا ہے جو مجھے عطا فرما چکا ہے حالانکہ اس نے مجھے اپنے احکام بجا لانے کی توفیق عطا فرمائی ہے ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ جواب یہ ہے کہ (دیگر اسبابِ معاش میں) ایسی صورت شاذ و نادر ہے اور حکم غالبِ حال پر مبنی ہوتا ہے (غالب حال یہی ہے کہ صنعت و حرفت میں کوتاہی کا احتمال نہیں اور دوسرے اسبابِ معاش میں کوتاہی کا احتمال رہتا ہے)۔ جیسا بعض اہلِ صنعت بھی اپنے پیشہ میں خیانت کرتے ہیں جس سے وہ بدترین پیشہ ہو جاتا ہے مگر صنعت و حرفت میں ایسا شاذ و نادر ہے اور اگر کوئی کھوٹ ملاتا بھی ہے تو چھپا نہیں رہتا جیسا دوسرے ذرائع معاش میں چھپا رہتا ہے کیونکہ اموال میں زکوٰۃ واجب ہے اور اس کے سوا دوسرے حقوق بھی ہیں جیسے بیع میں خیر خواہی واجب ہے، دھوکہ بازی اور خیانت سے احتراز لازم ہے اور بہت سی باتیں ہیں جو کتبِ فقہ میں مذکور ہیں جن کو بہت سے تجار جانتے بھی نہیں اُن پر عمل تو کیا کریں گے۔ اسی لیے صنعت و حرفت اُن سے بہتر ہے کہ اس میں ایک ہی احتمال ہے کہ صنعت میں کاری گری کا حق پورا نہ کرے۔ اگر ایسا کرے گا تو اُس کا عیب ظاہر ہو جائے گا جو پسند نہ کرے گا رد کر دے گا۔

اسی لیے ایک عالم باعمل زیتون کے تیل کا کاروبار کرتے تھے پھر یا تو میں نے

پوچھا یا خود ہی فرمایا کہ میں نے یہ کاروبار اس لیے اختیار کیا کہ اس میں نفس کو دھوکہ دینے کا موقع نہیں ملتا۔ اگر ایک مٹکے میں عمدہ تیل ہو اور اس میں تھوڑا سا خراب تیل ملا دیا جائے تو سارا مٹکا خراب ہو جاتا ہے۔ بخلاف اور چیزوں کے کہ اُن میں دھوکہ چل جاتا ہے جب میں نے دیکھا کہ زیتون کے تیل میں دھوکہ نہیں چل سکتا اور اس سے مال میں نقصان ہو جاتا ہے تو میں نے اسی کا کاروبار اختیار کیا۔ کیونکہ اہلِ توفیق نفس کے غوائل اور شرارت سے بے فکر نہیں رہتے اگرچہ اُن کے نفوس با برکت (اور پاکیزہ) ہوتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے (یوسف علیہ السلام کی طرف سے) ارشاد فرمایا ہے وما ابرئ نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء الا ما رحم ربی اور میں اپنے نفس کو بری نہیں کہتا کیونکہ نفس تو (اپنی فطرت سے) برائی کا حکم دینے والا ہے۔ ہاں جس پر میرا پروردگار رحمت نازل فرمائے (وہ اس کی شرارت سے بچا رہتا ہے)۔

اوپر کہا گیا ہے کہ صنعت و حرفت کی روزی میں دیگر ذرائع معاش سے زیادہ برکت ہے تو اگر یہ بات قیاسی نہیں محض نقلی ہے جس کی علت معلوم نہیں تو بحث کی ضرورت نہیں اور اگر علت یہ ہے کہ اس میں حکمتِ الٰہی کا اظہار ہے تو یہاں وہی گفتگو ہے جو اُوپر گزر چکی اور اعتراض کا جواب بھی وہی ہے جو اُوپر دیا گیا۔

پہلے کہا گیا ہے کہ اسبابِ معاش کا اختیار کرنا سنت (انبیاء) ہے اس کے اختیار کرنے میں سنت کا اتباع ہے کیونکہ شریعت نے اسبابِ معاش اختیار کرنے ہی کو بتلایا ہے تاکہ کسی کو یہ گمان پیدا نہ ہو کہ کسبِ معاش کے ساتھ عبادت نہیں ہو سکتی۔ شریعت نے اسی قسم کے خیالات کو باطل کرنے کے لیے صنعت و حرفت (اور دیگر اسبابِ معاش) کی ترغیب دی ہے اور بتلا دیا ہے کہ عابد بننا ترکِ اسباب پر موقوف نہیں۔ اگر عابد بننے کے لیے ترکِ اسباب ضروری ہوتا تو کوئی نبی بھی سببِ معاش اختیار نہ کرتا اور بالاتفاق انبیاء علیہم السلام سب سے بڑھ کر عابد تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی علت کو دُور کرنے کے لیے داؤد علیہ السلام کی مثال بیان فرمائی (کہ بالاتفاق وہ بہت بڑے عابد تھے اور اُن کے عابد ہونے

پر تمام اہلِ کتاب کا اتفاق ہے اس پر وہ اسبابِ معاش میں بھی مشغول تھے بادشاہت کے فرائض بھی ادا کرتے تھے)۔

یہاں سے ایک علمی مسئلہ یہ معلوم ہُوا کہ عالم جب احکام بیان کرے تو اپنے قول کو واضح دلائل شرعیہ سے موئید کردے اگرچہ اس کے علم و معرفت میں کسی کو شک بھی نہ ہو کیونکہ اس سے نفوس (سامعین) پر بات زیادہ واضح ہو جاتی اور احکام کو پختگی حاصل ہوتی ہے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صنعت وحرفت کی فضیلت بیان کرکے داؤد علیہ السلام کی حالت کو بطور حجت کے پیش فرمایا۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ پہلی شریعتوں کے جو احکام منسوخ نہیں ہوئے وہ ہماری شریعت میں داخل ہیں (جبکہ رسولؐ اللہ نے ان کو بلا انکار کے بیان فرمایا ہو محض تورات و انجیل میں مذکور ہونا کافی نہیں کہ اُن میں تحریف ہوچکی ہے، قرآن وحدیث میں کسی بات کے مذکور ہونے سے اطمینان ہو جائے گا کہ اس حکم میں تحریف نہیں ہوئی)۔

یہ حدیث ان لوگوں پر جو اسبابِ معاش میں مشغول ہیں حجت ہے کہ وہ اس شغل کی وجہ سے عبادت چھوڑنے کا بہانہ نہ کریں، جیسا بہت لوگوں کو یہ کہتے ہوئے دیکھا گیا ہے کہ شغلِ معاش عبادت سے مانع ہے اور قرآن کی یہ آیت ولقد ارسلنا رسلنا من قبلك وجعلنا لهم ازواجا وذرية (ہم نے آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول بھیجے ہیں سب کے بیویاں بھی تھیں اور بچے، عیالداروں پر حجت ہے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اہل وعیال اور اُن کے لیے کسبِ معاش عبادت سے اور کسب میں تقوٰی کی رعایت سے مانع ہے۔

بعض لوگوں کو جب نصیحت کی جاتی اور عبادت کی ترغیب دی جاتی ہے صاف کہہ دیتے ہیں کہ اگر تمہارے بھی بال بچے ہوتے تو ہم سے اس قسم کی باتیں نہ کرتے اور نہ تم ویسے ہوتے جیسے اب ہو (بلکہ ہم جیسے ہی ہوتے) ان لوگوں کی حجتیں اس آیت سے ختم ہوگئیں کیونکہ (انبیاء علیہم السلام جو) سب سے افضل اور سب سے بڑھ کر عابد تھے عیالدار بھی تھے تو اب کسی کو بہانہ کرنے کا کیا موقع ہے؟ (اللہ تعالٰے نے رسولوں کو

نمونہ بنا کر ہی تو بھیجا ہے لقد كان لكم في رسول الله اسوة حسنة۔ تو اب یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ صاحب رسولوں کی کیا بات ہے اُن کی رِیس کون کرسکتا ہے؟ اگر رسول اللہ کی ریس نہ کی جائے گی تو پھر کس کی ریس کی جائے گی؟ کیا خُدا تعالٰی نے اُن کو فضول ہی بھیجا ہے؟ ہرگز نہیں اُن کو اسی لیے بھیجا ہے تاکہ مخلوق کے سامنے ایک نمونہ ہو جس کے موافق اپنے کو بنانے کی کوشش کریں وما ارسلنا من رسول الا ليطاع باذن الله) اس تقریر کے بعد (نصوص واحادیث میں) کوئی بھی تعارض باقی نہیں رہا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ حکم سب کے لیے عام نہیں بلکہ ہر شخص کی حالت کے مناسب جُدا حکم ہے نکاح ہی کو لے لو کہ نہ ہر شخص کے لیے ترکِ نکاح سُنت ہے نہ ہر ایک کے لیے نکاح کرنا سنت ہے۔ جب تک قدرت نہ ہو اور اس سے اللہ تعالٰے کی عبادت واطاعت میں مدد اور جمعیت قلب حاصل نہ ہو (اگر کسی کو بیوی کے نان ونفقہ اور مہر پر قدرت نہ ہو اور نکاح سے عبادت میں جمعیت قلب حاصل ہونے کی امید نہ ہو بلکہ پریشانی کا خطرہ ہو اُس کے لیے نکاح سُنت نہیں بلکہ کثرت سے روزہ رکھنا سنت ہے تاکہ شہوت قابو میں رہے)۔

چنانچہ ایک صحابی سے روایت ہے وہ فرماتے تھے مجھے یہ پسند نہیں کہ مسجد کے دروازے پر میری دکان ہو جس میں تجارت کرنے سے جماعت کی نماز بھی فوت نہ ہو اور ہر دن مجھے ایک دینار کا نفع ہو جسے اللہ تعالٰے کے راستے میں صدقہ کردیا کروں میں اس حالت کو فقر سے بہتر نہیں سمجھتا۔ یہی فقہ حال ہے (کہ ہر شخص کو اُس کے حال کے مناسب کام بتلایا جائے) تو ممکن ہے ان صحابی کو لوگوں سے اختلاط کرنے میں جمعیۃ قلب حاصل نہ ہوتی ہو یہ خاص دولت اختلاط میں فوت ہو جاتی ہو اگرچہ (دکان کرنے اور صدقہ کرنے سے) نفع متعدی حاصل ہوجائے کیونکہ نفع خاص مقدم ہے جیسے جان بچانا پہلے اپنی لازم ہے حق تعالٰے فرماتے ہیں ومن احياها فكانما احيا الناس جميعا (اور جس نے ایک جان کو بچایا گویا اُس نے تمام آدمیوں کو زندہ کردیا) تم کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ دُوسروں کے بچانے

اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کا قصد کرو۔ جہاد کے سوا کسی وقت اس کی اجازت نہیں اگر ایسا کرو گے گنہگار ہو گے (البتہ جہاد میں یہ جائز ہے کہ دُوسرے مُسلمانوں کو بچانے کے لیے تم دشمن کے مقابلے میں آگے بڑھ جاؤ یا دُوسروں کی پیاس بجھانے کے لیے خود پانی نہ پیؤ پیاسے رہو اور اُن کی جان بچاؤ جیسا بعض صحابہؓ سے منقول ہے) یہی حکم نفقہ کا ہے کہ پہلے تم اپنے نفقہ کے مکلف ہو پھر بیٹے کے پھر زوجہ کے۔ اگر تمہارے پاس ایک روٹی ہو تو تم پر کسی کا نفقہ واجب نہیں۔ اگر دو روٹیاں ہوں تو اہل وعیال میں سے ایک کا نفقہ لازم ہو گا جن میں مقدم وہ ہے جس کا نفقہ (نص سے) ثابت ہے کہ تمہارے اختیار سے ساقط نہیں ہو سکتا یعنی اولاد پھر زوجہ کا لازم ہو گا پھر جس قدر عیال زیادہ ہوں اسی ترتیب پر اہم کو مقدم کیا جائے گا (غرض انسان کو سب سے پہلے اپنی خاص حالت کا لحاظ ضروری ہے۔ اپنی تکمیل واصلاح کے بعد دوسروں کی فکر جائز ہے نفع لازم نفع متعدی سے مقدم ہے۔

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کو ایک بزرگ نے وصیت کی تھی کہ دُوسروں کی اشرفیوں کی حفاظت میں اپنی گٹھڑی کو ضائع نہ کر دینا اُن کا یہی مطلب تھا کہ اپنی تکمیل کی فکر دوسروں سے پہلے کرنا چاہیئے۔) پس اگر کوئی شخص صنعت (وحرفت) اور اسبابِ معاش میں مشغول (رہو کر جمعیتِ قلب حاصل نہ کر سکتا ہو اور یہ خاص حال اُسے اس طرح میسر) نہ ہو سکتا ہو تو اُس کے حق میں اس قسم کی کوشش مناسب نہ ہو گی۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ قدرت کے ساتھ ترکِ اسباب کا طریقہ اختیار نہ کرے بلکہ عبادت کے ساتھ شغلِ معاش کو بھی جمع کرے لیکن وہ راستہ اختیار کرے جو شریعت کے موافق قربِ الٰہی حاصل کرنے میں اس کے لیے زیادہ بہتر ہو۔ اگر قدرت ہی نہ ہو تو اس وقت اُس کے حق میں شغلِ معاش کا اختیار کرنا ممنوع ہو گا۔ مَیں نے دیکھا ہے کہ شیخ جلیل ابوالعباس بن عجلان کی خدمت میں ایک عابد حاضر ہوُا جس کے اہل وعیال بہت تھے جن کے لیے وہ کچھ شغلِ معاش بھی کرتا تھا جو اس کے خرچ کو کافی نہ ہوتا اور یہ خود بھی کمزور تھا (کہ شغلِ معاش اور عبادت دونوں کو جمع کرنے سے عاجز تھا) عیال کثیر تھی جن کی وجہ سے تشویش

بھی زیادہ تھی تو شیخ ابوالعباسؒ نے جو علم اور حال دونوں طریق کے جامع تھے اُس سے فرمایا کہ تم کو شغلِ معاش کا اختیار کرنا حرام ہے۔ بس تم علم ہی میں مشغول رہو تم اور تمہارے اہل وعیال اللہ تعالےٰ کے ذمہ ہیں۔ چنانچہ اُس نے ایسا ہی کیا۔ پھر تو اُس کی یہ حالت ہوئی کہ مہینہ میں دو اروب گیہوں کا آٹا اس کے گھر میں خرچ ہوتا تھا اور اس وقت ایک قفیز گیہوں کی قیمت دس دینار یا اس سے بھی زیادہ تھی اس کے علاوہ کپڑے وغیرہ کا اور اہل وعیال کا اور بھی خرچ تھا (سب غیب سے پورا ہوتا اور) وہ کسی سے کچھ نہ مانگتا، علم اور عبادت ہی میں مشغول رہتا تھا۔ یہ فقہ حال ہے جس کو وہی سمجھ سکتا ہے جو ان بزرگ جیسا ہو (کہ کس کے لیے کون سا طریق مناسب ہے چنانچہ) ایک درویش نے علماء وقت کے سامنے ایک فتویٰ پیش کیا (جس کا مضمون یہ تھا) کیا فرماتے ہیں حضرات علماء دین اُس درویش کے بارے میں جو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہے اُس پر شغلِ معاش کا اختیار کرنا واجب ہے یا نہیں؟ افتونا یرحمکم اللہ۔ تمام علماء نے اس کے جواب سے پہلوتہی کی صرف ایک فقیہہ نے جواب دیا جس کو اللہ تعالےٰ نے نورِ بصیرت عطا فرمایا تھا۔ اُس بابرکت بزرگ نے لکھا کہ اگر یہ شخص ہر وقت اللہ تعالےٰ کی طرف متوجہ رہتا ہے جس میں کسی وقت فتور نہیں آتا تو اُس پر شغلِ معاش کا اختیار کرنا حرام ہے اور اگر کسی وقت اس میں فتور بھی ہوتا ہو تو کسبِ معاش واجب ہے۔

اس جواب کی خوبی میں غور کرو کیسا عجیب جواب ہے اس کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ہو رہی ہے ان اللہ تکفل برزق طالب العلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو سمجھو اس میں ایک راز ہے جس کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کا فتویٰ ان بزرگ جیسا ہو جن کا اُوپر ذکر ہوُا۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے تو ساری مخلوق کے رزق کا ذمہ لیا ہے چنانچہ ارشاد ہے وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا۔ زمین میں جتنے بھی جاندار ہیں سب کی روزی اللہ کے ذمے ہے۔ نیز ارشاد ہے لا نسألک رزقا نحن نرزقک والعاقبۃ للتقوٰی

(اے مخاطب! ہم تجھ سے روزی نہیں مانگتے - ہم خود تجھ کو روزی دیتے ہیں اور اچھا انجام تقویٰ کا ہے) اور جب ابراہیم علیہ السلام نے حق تعالےٰ سے عرض کیا رب اجعل ھٰذا البلد امنا وارزق اھلہ (اے پروردگار! اس شہر کو پُرامن بنادے اور اُس کے باشندوں میں جو اللہ تعالےٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھے اُس کو ہر قسم کے پھل اور غلّے مرحمت فرما - تو حق تعالےٰ نے جواب میں فرمایا ومن کفر فامتعہ قلیلا - کہ میں تو کافروں کو بھی (دُنیا کی) قلیل مُدت تک راحت و آرام دوں گا پھر ان کو زبردستی جہنم کے عذاب میں داخل کروں گا - جب اللہ تعالےٰ نے تمام جانداروں کی روزی کا ذمّہ لیا ہے تو وہ کون سی صورت ہے جس کی طالب علم (دین) کے لیے اللہ تعالےٰ نے اس سے زیادہ کفالت فرمائی ہے ؟ اگرچہ ہم اشارۃً اس کو بتلا چکے ہیں کہ لیکن حالت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اس کو دوبارہ تفصیل سے بیان کردیا جائے تو سنو! کہ جس رزق کو اللہ تعالےٰ نے اپنے ذمّہ لیا اور بندوں کے لیے مقدر فرمایا ہے اُس کی دو قسمیں ہیں -

ایک وہ جو سبب کے ذریعے حاصل ہوتا ہے جس کو بندہ سبب ہی سے حاصل کرسکتا ہے اور ایک وہ جو بلا سبب کے حاصل ہوتا ہے جیسے کسی نے کوئی چیز ہبہ کردی (یا ہدیہ کردی) یا میراث میں مال (جائداد مکان وغیرہ) مل گیا - پھر ہبہ کی بھی مختلف قسمیں ہیں (کبھی کوئی تعلق قرابت کی وجہ سے کچھ دیتا ہے کبھی دوستی یا محبت و عقیدت سے ہدیہ دیتا ہے) اور ہم نہیں جانتے کہ کس کو سبب سے رزق حاصل ہوگا اور کس کو بلا سبب - تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں اس کو بتلادیا اذا ابتدع فی الدین بدعۃ کید الدین فعلیکم بمعالم الدین واطلبوا من اللہ الرزق قالوا وما معالم الدین قال مجالس الحلال والحرام - جب دین میں بدعت داخل ہوجائے دین پر آفت آجائے گی تو (اُس وقت) دین کے) نشانات کو چمٹے رہیئے اور روزی اللہ تعالےٰ سے طلب کرو - صحابہ نے عرض کیا دین کے نشانات کیا ہیں ؟ فرمایا حلال و حرام کی مجلسیں (جہاں احکامِ شرعیہ

کا تذکرہ ہوتا ہو (حدیث کا مطلب یہ ہے کہ رزق کے لیے کسبِ معاش میں مشغول ہو نا تم کو طلب علم سے نہ روکے ورنہ دین بدعات و جہل کی وجہ سے مٹ جائے گا - اس وقت علم (دین) میں مشغول رہو (پڑھتے پڑھاتے رہو) اور اللہ تم کو رزق دے گا - جب وہ عالم جس نے اللہ کا علم حاصل کیا ہے (یعنی علم دین) آخرت کے اسباب میں مشغول ہے کہ اسبابِ آخرت میں سب سے بڑا وسیلہ علم ہے جبکہ وہ اللہ کے لیے (اور اللہ تعالےٰ کی ذات و صفات و احکام سے متعلق) ہو اور قاعدہ کے موافق ہو (بے قاعدہ نہ ہو) تو اللہ تعالےٰ اسکے - لیے بلا واسطہ اسباب کے رزق کو آسان کر دیتے ہیں اور اس کو (مخلوق) میں سے کسی کا بھی محتاج نہیں بناتے (بلکہ مخلوق اُس کی محتاج ہوتی ہے) اس سے صاحبِ علم کا رزق بہت آسان ہوجاتا ہے - اگر وہ آخرت کا طالب ہو اور قاعدہ کے موافق شغل علم میں لگا ہوا ہو کیونکہ یہ شخص اپنے تمام اوقات اور پُوری عمر کو علم میں مشغول کر دیتا ہے تو اللہ تعالےٰ اُس کو طلب رزق اور اسبابِ معاش کی فکر سے مستغنی کر دیتے ہیں اور اس قسم کی احادیث پر قلت اعتماد کی وجہ سے ہی بعض علماء اور طلباء پریشانی میں مبتلا ہیں اُن کی عمریں خسارہ میں ہیں نہ وہ دُنیا کے رہے نہ آخرت کے ہوئے - ہم اللہ جل جلالہٗ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہم کو اپنی سمجھ عطا فرمائے اور اُس پر عمل کی سعادت و توفیق دے - اس کے سوا کوئی پروردگار نہیں -

قولہ واما الاعتراض علی الوجہ الثالث الذی الخیریۃ فیہ لکونہ یاتی من الغیب بواسطۃ الصنعۃ الی قولہ لا رب سواہ -

ف - کاش ہمارے زمانہ کے علماء و طلباء ان احادیث پر وثوق و اعتماد کر کے اہلِ دُنیا سے مستغنی اور اللہ پر متوکل ہوجائیں تو اُن کی تمام پریشانیاں دُور ہو جائیں - مجھے معلوم ہوا ہے کہ تقسیم ہند کے بعد سے مدارس ہندوستان کی حالت ناگفتہ بہ ہے آمدنی کم اور خرچ زیادہ ہے حضرات علماء مدارس کو ان احادیث

پراعتماد کرنا اور اپنے دلوں میں خلوص پیدا کرنا چاہیئے۔ اگر وہ خالصاً لِوجہ اللہ خدمت دینی میں مشغول رہیں گے۔ اللہ تعالےٰ غیب سے اُن کی امداد فرمائیں گے۔ ادھر مسلمانانِ ہندوستان اور پاکستان کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ہندوستان میں اسلام کی بقاء کا دارومدار مدارس اسلامیہ عربیہ کی بقاء پر ہے۔ اگر یہ مدارس مٹ گئے تو اسلام کے مٹ جانے کا خطرہ ہے۔ خدارا سب مُسلمانوں کو پہلے سے زیادہ ان مدارس کی خدمت پر توجہّ کرنا چاہیئے ورنہ آخرت میں بازپُرس کا اندیشہ ہے۔ حکومتِ پاکستان کو بھی یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اکثر مدارس ہندوستان کی امداد اسلامی ریاستوں کے وظائف سے ہوتی تھی جواب غالباً بند ہوگئی ہیں تو ان وظائف کو حکومت پاکستان جاری کردے اور مدارس کو مٹنے نہ دے تاکہ اسلام ہندوستان میں فناء نہ ہو۔ فافھم واللہ یتولی ھداک۔

(۲۴۳) کسبِ معاش اور عبادت دونوں کے لیے علمِ دین کا حاصل کرنا ضروری ہے

اس حدیث کا فائدہ یہ بھی ہے کہ کسبِ معاش اور عبادت دونوں کے لیے شریعت کا علم ضروری ہے بغیر اُس کے نہ کسب معاش درست ہے نہ عبادت۔ جس میں علم کی صلاحیت ہو وہ عالم بننے کی کوشش کرے اور جس میں اس کی صلاحیت نہ ہو وہ احکامِ شرعیہ (مطالعہ کتب اور) علماء کی صحبت میں رہ کر اُن سے دریافت کر کے معلوم کرے اور اُن کا اتباع کرے بشرطیکہ وہ علماء واقعی علماء ہوں محض دعویٰ ہی دعویٰ نہ ہو۔ کیونکہ دعویٰ سے بہت لوگ تباہ ہوگئے اور اپنے ساتھ ایک بڑی جماعت کو بھی برباد کیا۔

جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے (کہ آخر زمانہ میں) بہت لوگ جہنّم کی طرف بُلانے والے ہوں گے جو اُن کی بات مانے گا اُس کو جہنم میں جھونک دیں گے۔ بعض لوگ علوم میں کمال کا دعوےٰ کرتے ہیں حالانکہ وہ علوم اُن کے

حق میں بھی اور اُن کے متبعین کے حق میں بھی وبال ہی ہیں۔ کیونکہ اُن کے علوم کی بنیاد طلبِ دُنیا اور طلبِ جاہ پر ہے (یہی اُن کا اصلی مقصد ہے اور اس حالت میں بجز علم لفظی کے حقیقی علم حاصل نہیں ہوسکتا اور جس کو علم حقیقی حاصل نہ ہو وہ شریعت کے مقاصد و مطالب کو پُوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔ اب وہ خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور دُوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے) اور یہی اصلی خسارہ ہے اور بڑی بدنصیبی بھی۔ اللہ تعالےٰ ہم کو اپنے فضل و کرم سے اتباعِ سنت بلکہ تمام سنتوں کے اتباع کی توفیق دیں اور خسارہ سے بچائیں ایک بابرکت بزرگ نے کہا ہے ؎

حب دنیا و حب اخرٰی حبیبان فی القلب لایجتمعان

دُنیا سے بھی محبت کرتے ہو اور آخرت کی محبت بھی چاہتے ہو۔ دو محبوب ایک دل میں جمع نہیں رہ سکتے۔

ایک فارسی شاعر نے اس کا ترجمہ یُوں کیا ہے ؎

ہم خدا خواہی وہم دُنیائے دوں
ایں خیال ست ومحال است وجنوں

قولہ وفائدۃ ھٰذا الحدیث انہ لایصح کسب ولاتعبد الا بمعرفۃ السنۃ الی قولہ فی القلب لایجتمعان۔

ف ۔ آج کل علم کے مدعی بہت پیدا ہوگئے ہیں۔ اسی طرح تصوّف کا دعوےٰ کرنے والے بھی بہت ہیں اور ان مدعیوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر رکھا ہے۔ عوام پر لازم ہے کہ جس طرح وہ اچھے طبیب اور ڈاکٹر کو علاج کے واسطے تلاش کرتے ہیں اور ہر مدعی کا علاج نہیں کرتے اسی طرح سچے علماء اور صوفیاء کو تلاش کریں۔

سچا عالم وہ ہے جو باعمل متبع سنت ہو۔ باقاعدہ محقق علماء سے علم حاصل کیا ہو۔ دُنیا کا حریص نہ ہو۔ مولود اور وعظ کہہ کر روپیہ نہ لیتا ہو۔ روپیئے گر فتوے نہ دیتا ہو اور سچا صُوفی وہ ہے جس کی تعلیم اور صحبت سے اللہ تعالےٰ کی یاد دل

میں بڑھتی ہو۔ دل کو سکون و اطمینان ہوتا ہو۔ بقدرِ ضرورت علم شریعت اُسے حاصل ہو، متبع سُنت ہو اور کسی محقق صوفی کی خدمت میں مدت تک رہا ہو۔ صوفیاء زمانہ اُس کی ولایت کو تسلیم کرتے ہوں۔ یعنی وہ صوفیاء جن کو کسی وجہ سے اُس کے ساتھ حسد نہیں ہے اسے مانتے ہوں اور اس کی طرف زیادہ تر دین داروں کا رجوع ہو دُنیاداروں کا رجوع زیادہ نہ ہو۔

خوب سمجھ لو کہ محض کسی مدرسہ کی سند اور دستار مل جانے سے آدمی عالم نہیں بن جاتا نہ چند جاہلوں کو مُرید کرنے اور شعبدے دکھلانے سے صوفی ہو جاتا ہے۔ علم اور تصوف کی علامات وہ ہیں جو اُوپر بیان کی گئیں۔ جو اس معیار پر پُورا نہ اترے اُس سے دور رہنا چاہیئے۔

والسلام



باب ۹۴

حدیث

البیعان بالخیار مالم یتفرقا

حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بائع مشتری (دونوں) کو اختیار ہے جب تک وہ متفرق نہ ہوں۔ پس اگر دونوں نے سچائی سے معاملہ کیا اور (مبیع وثمن کی اصلی حالت کو) بیان کر دیا تو اُن کی بیع (وشراء) میں برکت دی جائے گی اور اگر (اصلی حالت کو) چھپایا اور جھوٹ بولا تو بیع کی برکت مٹا دی جائے گی۔

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ بائع و مشتری دونوں کو افتراق سے پہلے اختیار ہے اور برکت سچائی کے ساتھ ہے۔ خیانت اور جھوٹ سے برکت جاتی رہتی ہے۔ یہاں افتراق سے کیا مراد ہے؟ بات چیت سے (فارغ ہونا اور ایجاب و قبول تمام کرنا) یا بدن سے الگ الگ ہو جانا (کہ مجلس بدل جائے تو اختیار نہ رہے گا مجلس نہ بدلنے سے پہلے دونوں میں ہر اک کو اختیار ہے کہ بیع کو باقی رکھے یا فسخ کر دے) کیونکہ لفظ افتراق کتاب اللہ میں دونوں معنی میں استعمال ہُوا ہے۔ افتراق بالابدان تو اس آیت میں ہے وان یتفرقا یغن اللہ کلا من سعتہ اگر میاں بی بی الگ ہو جائیں گے تو اللہ تعالےٰ ہر ایک کو اپنی وسعت (رزق) سے غنی کر دے گا اور افتراق بالاقوال اس آیت میں ہے ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاءھم البینات اور اُن لوگوں کی طرح نہ ہونا جو الگ الگ راستہ پر ہو گئے اور واضح

احکام آنے کے بعد اختلاف کرنے لگے (یہ افتراق جسمانی نہ تھا بلکہ عقائد و خیالات کا اختلاف تھا چنانچہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے افترقت بنو اسرائیل علی اثنین وسبعین وستفترق امتی علی ثلث وسبعین فرقہ۔ بنی اسرائیل بہتّر فرقوں میں متفرق ہو گئے اور میری اُمت تہتّر فرقوں میں بٹ جائے گی۔

علماء میں اختلاف ہے کہ حدیث البیعان بالخیار مالم یتفرقا میں افتراق بالابدان مراد ہے یا بالاقوال؟ امام شافعیؒ اور اُن کے متبعین پہلے کے قائل ہیں اور امام مالکؒ اُن کے متبعین افتراق بالاقوال کے قائل ہیں (امام ابو حنیفہؒ بھی امام مالکؒ کے موافق ہیں) اور یہی زیادہ ظاہر ہے کیونکہ عبداللہ بن عمرؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ اُنھوں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ ایک باغ فروخت کیا جو حضرت عثمانؓ کے گاؤں میں تھا (یا اُن کی زمین کے پاس تھا) عبداللہ بن عمر چاہتے تھے کہ بیع پختہ ہو جائے تو وہ اسی وقت (ایجاب و قبول کرتے ہی) کھڑے ہو گئے کیونکہ وہ بھی اسی حدیث کے ایک راوی ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ تم نے (مجلس سے اٹھ کر) بیع کو تمام کرنا چاہا ہے یہ سنت نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہُوا کہ (یا تو حدیث میں) افتراق بالابدان (مراد ہی نہیں یا وہ) منسوخ ہو چکا ہے۔ اور یہ بیع و شراء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہوئی تھی پھر عبداللہ بن عمر نے حضرت عثمانؓ کے قول کی طرف رجوع کیا (اور سمجھ گئے کہ بیع ایجاب و قبول سے تمام ہو جاتی ہے مجلس سے جُدا ہونے کی ضرورت نہیں) اور امام مالکؒ نے فرمایا ہے جب دو حدیثیں (ظاہر میں مختلف ہوں اور دونوں) صحیح ہوں اور ثابت ہو جائے کہ خلفاء (راشدین) نے یا اُن میں سے کسی ایک نے ایک پر عمل کیا اور دوسری کو چھوڑ دیا ہے تو یہ اُس کے منسوخ ہونے کی دلیل ہے اور جب ایک حدیث میں دو معنی کا احتمال ہو اور کسی خلیفہ (راشد) نے ایک معنی کے ساقط ہونے کی تصریح کر دی ہو تو بدرجہ اولیٰ وہی معنی مراد ہوں گے جو خلفاء نے یا کسی ایک خلیفہ نے سمجھے ہیں۔ بعض علماء زمانہ نے امام شافعیؒ کی حمایت میں حضرت عثمانؓ کی اس حدیث کا انکار کیا ہے (یعنی اُس کو

صحیح نہیں مانا) حالانکہ جس نے اُس کو نقل کیا ہے اُس کے ثقہ ہونے پر اتفاق ہے جس میں کچھ شُبہ نہیں اور وہ ابوالولید بن رشد الجد ہیں جو البیان والتفصیل کے مصنف ہیں انھوں نے اس حدیث کو مقدمات میں ذکر کیا ہے جو فقہ میں (اُن کی مشہور کتاب) ہے۔

ف۔ اگرچہ یہ مسئلہ تصوّف کا نہ تھا مگر فقہ کا معرکۃ الآراء مسئلہ ہے جس میں بڑا اختلاف ہے اور طرفین سے بکثرت دلائل پیش کئے جاتے ہیں اس لیے میں نے اس کا ترجمہ کر دیا کہ علماء کے کام کی بات ہے۔ ۱۲ مترجم

(۲۴۴) **مسلمان کی دُنیا بھی بغیر آخرت کے نہیں بنتی** حدیث سے معلوم ہُوا کہ (مسلمان کو) دُنیا بھی بغیر آخرت کے نہیں ملتی دیکھو بائع و مشتری کو برکت سچائی سے حاصل ہوتی ہے جو اعمالِ آخرت میں سے ہے جس میں انسان کو ثواب ملتا ہے جبکہ یہ تو ایمان کی کامل تر صفت ہے۔ (مومن جھوٹا نہیں ہوتا) اسی لیے اہلِ تحقیق (یعنی محقق علماء و صوفیاء) نے فرمایا ہے من صدق وصدق قرب لا محالۃ (جو اپنے ہر قول و فعل میں سچائی کا پابند ہو، وہ لامحالہ قربِ خداوندی حاصل کرے گا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اس کو واضح طور سے بیان فرمایا ہے لا ینال ما عند اللہ الا بطاعۃ اللہ اللہ کے پاس جو چیز ہے (یعنی خیر و برکت) وہ بغیر اللہ تعالےٰ کی اطاعت کے حاصل نہیں کی جا سکتی۔

گناہوں کی شامت سے دُنیا بھی برباد اور آخرت بھی برباد حدیث سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ گناہوں کی نحوست سے دُنیا و آخرت دونوں کی خیر جاتی رہتی ہے دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر وہ (عیب کو) چھپائیں گے اور جھوٹ بولیں گے تو بیع کی برکت مٹا دی جائے گی۔ جھوٹ بولنا گناہ کبیرہ ہے اور (عیب کو) چھپانا خیانت ہے۔ وہ بھی بڑا گناہ ہے۔ حدیث میں ہے من غشنا فلیس منا۔ جس نے ہم سے خیانت کی وہ ہم میں سے نہیں اور جھوٹ بولنے والے کے متعلق ایک حدیث اُوپر گزر چکی ہے کہ اس کی باچھیں لوہے کے کانٹے

سے چیری جائیں گی۔ قیامت تک اُس کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا رہے گا۔ تو دُنیا کا بھی خسارہ ہُوا کہ جب مال میں برکت نہ ہُوئی تو وہ ضائع ہوگیا اور آخرت کا بھی خسارہ ہُوا کہ عذاب کا مستحق ہوگیا اور اہلِ توفیق دُنیا و آخرت دونوں میں سود مند ہیں۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کے پاس اس قدر مال کیونکر آیا (وہ بڑے تاجر اور بڑے مالدار تھے) فرمایا میں نے تجارت میں کبھی جھوٹ نہیں بولا نہ (مال کا) عیب چھپایا نہ ادھار بیچا نہ نفع کو رد کیا چاہے کتنا ہی (قلیل) ہو۔ چنانچہ ایک واقعہ منقول ہے کہ ایک دفعہ اُنہوں نے بہت سے اونٹ خریدے تو لوگوں نے کہا (مال اچھا نہیں) آپ کو نفع میں صرف نکیلیں ملیں گی (جن سے اونٹ کو چلایا جاتا ہے) آپ نے اتنے ہی نفع پر اونٹوں کو بیچ دیا۔ جب خریدار اُونٹ خرید کر چلا گیا اب اس کو رسی کی تلاش ہوئی جس کی نکیلیں بنائے۔ تو (اتفاق سے) اس کو رسی نہ ملی۔ وہ پھر حضرت عبدالرحمٰن کے پاس واپس آیا اور نکیلیں (جو اُن کے پاس نفع میں رہ گئی تھیں) بہت مال دے کر خریدیں (اس طرح اُن کو ردی مال میں بھی بہت نفع مل گیا)۔ قوله فيه دليل على ان لا تحصل الدنيا الا بالآخرة الى قوله بجملة مال۔

ف ۔ مسلمان تاجروں کو ان اصول پر عمل کرنا چاہیئے جو عبدالرحمٰن بن عوف صحابی نے بیان فرمائے ہیں کہ ترقی تجارت اور برکت کی بُنیاد ان ہی پر ہے۔ آجکل اکثر تجار زیادہ نفع کے انتظار میں رہتے ہیں۔ یہ بہت بُری بات ہے جس سے مخلوق کو تکلیف ہوتی ہے اور ان کے مال میں برکت نہیں ہوتی۔ برکت اسی میں ہے کہ مال کو جلد نکال دو اور زیادہ نفع کا انتظار نہ کرو۔ پھر دُوسرا مال جلدی خریدلو اور اُس کو بھی تھوڑے سے نفع پر نکال دو پھر اور مال خریدلو۔ مال کا مُدت تک روکنا اچھا نہیں۔ ذخیرہ اندوزی کا آج کل عام مرض ہے لوگ ایک روپیہ کے مال پر دس گُنا نفع چاہتے ہیں اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ باوجود کثرت پیداوار کے مُلک میں سخت گرانی ہے اور عام طور سے سب لوگ پریشان ہیں۔ خریدار گرانی سے اور تجار ٹیکس کی بھرمار سے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو ہدایت دے۔

(۲۴۵) تجارتِ آخرت بھی سچائی اور صاف گوئی سے کامیاب ہوتی ہے

کیا یہ حکم بیع ہی کے ساتھ خاص ہے (جس میں مال کا مبادلہ مال سے ہوتا ہے) یا ہر معاملہ کو عام ہے جس پر بیع کا اطلاق آتا ہو (گو اُس میں مال کا مبادلہ نہ ہو) ظاہر لفظ کا مقتضے یہ ہے کہ ہر معاملہ کے لیے اُس کو عام کہا جائے کہ سب میں اُن عیوب سے پرہیز کیا جائے جو معاملہ کو بگاڑنے والے یا برکت کو برباد کرنے والے ہیں اور اُن خوبیوں میں رغبت کی جائے جو برکت کی موجب ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے (بیع و شراء کا اطلاق ایک اور جگہ بھی کیا ہے) فرمایا ان اللہ اشترىٰ من المؤمنين انفسهم واموالهم بان لهم الجنة يقاتلون فى سبيل الله فيقتلون ويقتلون وعدا عليه حقا۔ "بے شک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے اُن کی جان و مال کو خرید لیا ہے اس چیز کے عوض کہ اُن کے واسطے جنّت ہے وہ اللہ کے راستے میں قتال کریں پھر قتل کریں اور قتل کئے جائیں اللہ کا وعدہ سچا ہے" تو جو شخص اس بیع میں سچا (اور ثابت قدم) رہے۔ حق کو نہ چھپائے، اللہ اور رسول پر جھوٹ نہ لگائے نہ احکامِ دین میں گڑبڑ کرے کہ بدعت ایجاد کر کے اس کو دین بتلانے لگے اور اللہ و رسول کے ساتھ سچائی کا معاملہ رکھے جیسا واجب ہے اور احکامِ الٰہیہ کو قواعدِ شرعیہ کے موافق بیان کرے اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت سے نہ ڈرے اس کی بیع میں برکت دی جائے گی مگر اس بیع میں ایک زیادتی ہے جو پہلی میں نہیں، دونوں جگہ ثمن اور بیع میں جو برکت ہوتی ہے وہ تو بندہ ہی کے لیے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہم سے مستغنی ہیں۔ یہ دُوسری بیع بھی ہمارے ہی واسطے تجارت ہے چنانچہ ارشاد ہے هل ادلكم على تجارة تنجيكم من عذاب اليم تؤمنون بالله ورسوله وتجاهدون فى سبيل الله باموالكم وانفسكم ذلكم خير لكم ان كنتم تعلمون۔ کیا میں تم کو ایسی تجارت نہ بتلاؤں جو دردناک عذاب سے تم کو نجات دے (وہ یہ) کہ تم اللہ تعالیٰ پر اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں

اپنے مال اور جان سے جہاد کرو۔ یہ تمہارے واسطے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو اور خسارہ بھی دونوں پر عائد ہوتا ہے تو لازم ہے کہ اس دُوسری تجارت کو خسارہ سے بچانے کا زیادہ اہتمام کیا جائے (کیونکہ اس کا نفع اور خسارہ دائمی ہے اور دنیوی تجارت کا نفع اور خسارہ چند روزہ ہے) چنانچہ حضرات انصار نے جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تو دریافت کیا اگر ہم اس بیعت کو پُورا کریں تو ہمارے لیے کیا ہے؟ فرمایا جنت ہے۔ صحابہ نے عرض کیا ہم راضی ہیں اور اس بیعت کو (پورا کریں گے) توڑیں گے نہیں۔ پھر ان حضرات نے بیعت کو پُورا کیا تو اللہ تعالےٰ نے بھی اُن سے اپنا وعدہ پُورا کیا کہ اُن کے لیے وفارِ عہد کی شہادت دی جس کی حقیقت ایمان ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا ہے والذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ والذین آووا ونصروا اولٰئک ھم المؤمنون حقا۔ اور جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ تعالےٰ کے راستہ میں اُنھوں نے جہاد کیا اور جنہوں نے (مہاجروں کو) جگہ دی اور (دین کی) نصرت کی یہی سچے مومن ہیں لھم مغفرۃ و رزق کریم۔ اُن کے لیے مغفرت ہے اور عزت کی روزی) اسی لیے اہلِ توفیق نے اپنے لیے ایک ہی فکر کو اختیار کر لیا (یعنی فکرِ آخرت) اور ادھر ادھر التفات نہ کیا تو وہ کامیاب اور سودمند ہو گئے کسی نے (خوب) کہا ہے ؎

لما رأیت القوم قد ساروا وخلفوا مثقلا مثلی ولم یعرجوا

جھدت فی نوح والبکا لعلی اخلف ؎ ! !

من بعدھم توبۃ تجدنی من حیث عرجوا

واستأنف بیعۃ لعلی مثلھم لا اخلف

وعادی نوقی بقول وعد لک یا مولای لا یخلف

انا الضعیف ببابکم وھو خیر موقف وقفوا

فاحملوا الضعیف ببابکم فبحیاتکم لا ابغیر کم اقف

جب میں نے قوم کو دیکھا کہ (آگے) بڑھ گئی اور مجھ جیسے بوجھل کو پیچھے چھوڑ گئی اور

تیزی کے ساتھ چلی گئی، تو میں نے خوب گریہ وزاری کی کہ شاید اُن کے بعد مجھے توبہ نصیب ہو جائے جو اس مقام تک پہنچا دے جہاں وہ پہنچے ہیں اور بیعت کی تجدید کی تاکہ میں بھی اُن کی طرح (آگے بڑھ جاؤں) پیچھے نہ رہوں اور میری ناقہ کا چلانے والا کہہ رہا تھا۔ اے میرے مولا! تیرا وعدہ کبھی خلاف نہیں ہوتا۔ تمہارے دروازہ پر میں کمزور مسکین کھڑا ہوں اور یہی سب سے اچھی جگہ کھڑے ہونے کی ہے تو اس کمزور کو بھی اُٹھا لو جو تمہارے دروازہ پر ہے تمہاری زندگی کی قسم میں تمہارے سوا کسی پر توجہ نہ کروں گا۔ قولہ ھل یقتصر ھذا البیع الی قولہ لا بغیر کم اقف۔

ف۔ مطلب تو ظاہر ہے مگر یہ معلوم نہ ہُوا کہ یہ اشعار کس بحر میں ہیں اور یہ اشعار ہیں یا نثر مقفی مگر بزرگوں کے اس کلام میں اس چیز کے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ معنی اور مطلب کو دیکھنا چاہیئے ؎

قافیہ اندیشم و دلدار من گویدم مندیش جز دیدار من

واللہ اعلم ۱۲ مترجم

ف۔ مشائخ طریق سے جو بیعت کی جاتی ہے وہ بھی تجارتِ آخرت میں داخل ہے جس میں مرید کی طرف سے اپنے نفس کو شیخ کے حوالے کیا جاتا ہے اور شیخ اس کے عوض میں اُس کو اپنی باطنی دولت یعنی نسبت مع اللہ عطا کرتا ہے۔ وہاں بھی دونوں کو سچائی سے معاملہ کرنا واجب ہے۔ مرید کو اپنے نفس کے عیوب وامراض صاف صاف بیان کرنا چاہیئں ؎

ما حالِ دل را با یار گفتنیم نتواں نہفتن درد از طبیباں!

اور شیخ کو اگر مرید سے مناسبت نہ ہو اور اس سے فائدہ کی امید نہ ہو تو صاف کہہ دے کہ تمہارا حصہ میرے یہاں نہیں ہے تم کسی دوسرے شیخ سے رجوع کرو۔ مرید کو اگر شیخ سے کسی وقت اعتقاد نہ رہے تو اُس کو بھی ادب کے ساتھ اُس سے علیحدہ ہو جانا چاہیئے اور دھوکہ نہ رہے۔

⁂

باب ۹۵

حدیث

جواز اخذ الزوجۃ مایکفیہا من مال زوجہا اذا کان شحیحا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت معاویہ کی والدہ ہندہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ابوسفیان بخیل مرد ہے تو اگر میں اُن کے مال میں سے چھپا کر کچھ لے لوں تو کیا مجھ پر گناہ ہوگا؟ فرمایا تم اور تمہاری اولاد اتنا لے لو جو عام عادت کے موافق تمہیں کافی ہو جائے۔

شرح ظاہر حدیث یہ ہے کہ جس شخص پر کسی کا حق ہو اور وہ نہ دیتا ہو تو اُس کی غیبت میں اُس کے مال سے اپنا حق وصول کرنا جائز ہے اس کی تفصیل میں علماء کا اختلاف ہے کہ جنس حق سے ہی لینا جائز ہے یا غیر جنس سے بھی لے سکتے ہیں (اس کو کتب فقہ سے معلوم کر لیا جائے)۔

(۲۴۶) ضرورت شرعیہ کے موقعہ پر غیبت جائز ہے حضرت ہندہ کے اس قول سے کہ ابوسفیان بخیل آدمی ہے۔ معلوم ہوا کہ حاکم کے سامنے ضرورت کے وقت (مدعا علیہ کی) غیبت کرنا جائز ہے اور وہ حقیقت میں غیبت نہیں کیونکہ اس سے دوسرے کی تنقیص (یا عیب جوئی) کا قصد نہیں ہوتا۔ بلکہ حقیقتِ حال اور بیان واقعہ کا قصد ہوتا ہے (تاکہ حاکم واقعہ کی تفصیل وحقیقت سے واقف ہو کہ فیصلہ کرے) اور حضرت ہندہ نے جو کچھ کہا تھا وہ حقیقت میں غیبت نہیں تھی بلکہ عادتِ عرب کے موافق ابوسفیان کی

مدح تھی کیونکہ اُن کے یہاں اپنے اہل وعیال کے ساتھ انسان اس لیے بخل کرتا تھا کہ اُس کو مہمانوں کی خاطر تواضع کا اہتمام زیادہ ہوتا تھا جس سے اہل وعیال کو تنگی پیش آتی تھی تو یہ ایسا لفظ ہے جس کا باطن ظاہر کے خلاف تھا (ظاہر میں مذمت تھی مگر حقیقت میں بڑی مدح تھی کہ وہ بہت مہمان نواز ہیں۔ مہمانوں کی خاطر تواضع میں اتنا خرچ کر دیتے ہیں کہ گھر والوں کو تنگی سے پریشانی ہوتی ہے)۔ قولہ ظاھر الفظ یعطے جواز الغیبۃ عندالحاکم الی قولہ فھی لفظۃ باطنھا خلاف ظاھر۔

ف ۔ علامہ ابن ابی جمرہؒ نے عجیب بات کہی ہے جو واقع میں صحیح ہے کیونکہ اہل عرب کے یہاں سردار میں چار اوصاف کا ہونا اور اُن میں دوسروں سے ممتاز ہونا شرط تھا۔ نجابت، سخاوت، فصاحت، شجاعت اور ابوسفیان سردار مکہ تھے تو وہ بخیل کیسے ہو سکتے تھے۔ اگر وہ بخیل ہوتے تو سردار نہیں بن سکتے تھے۔ پس یقیناً ہندہ کا مطلب وہی تھا جو علامہ نے بیان فرمایا کہ وہ اپنی سخاوت اور مہمان نوازی کی وجہ سے گھر والوں کو تنگی دیتے تھے حضورؐ نے اُن کو اجازت دیدی کہ قاعدہ کے موافق چھپا کر اپنے حقوق وصول کر سکتی ہو حق سے زیادہ نہیں۔ پس حدیث سے یہ مسئلہ مستنبط نہیں ہو سکتا کہ ضرورت کے وقت حاکم کے سامنے مدعی علیہ کی غیبت جائز ہے۔ اس کے لیے دوسرے دلائل ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ لایحب اللہ الجھر بالسوء من القول الا من ظلم۔ اللہ تعالیٰ بُری بات کا اعلان پسند نہیں کرتا مگر جو مظلوم ہو (وہ ظالم کی بُرائی کر سکتا اور اُس کے ظلم کا اعلان کر سکتا ہے)۔

⁂

باب ۹۶

حدیث

النھی عن التصویر

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ جو شخص کوئی صُورت (جان دار کی) بنادے تو اللہ تعالےٰ اُس کو عذاب دیں گے۔ یہاں تک کہ اُس میں رُوح پھونک دے اور وہ اُس میں کبھی بھی رُوح نہیں پھونک سکتا۔

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ جو شخص (جان دار کی) تصویر بنادے گا اُس کو ہمیشہ عذاب ہونا رہے گا اور ظاہر لفظ سے واضح ہو رہا ہے کہ مراد جاندار کی تصویر ہے۔ کیونکہ رُوح پھونکنے کا مطالبہ اُسی میں ہو سکتا ہے اور (عبداللہ بن عباس اور) عبداللہ بن عمر سے اس کی تصریح بھی منقول ہے کہ بے جان کی تصریح جائز ہے جیسے درختوں اور مکانات وغیرہ کی۔ واللہ اعلم۔

ف ۔ فوٹو لینا بھی تصویر بنانے کے حکم میں ہے۔ بعض علماء مصر و ہندوستان نے اس کو تصویر میں داخل نہیں کیا۔ کیونکہ تصویر ہاتھ سے بنائی جاتی ہے اور فوٹو کیمرہ کے آئینہ سے لیا جاتا ہے مگر طریق کے اختلاف سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔ اگر پہلے زمانے میں شراب ہاتھ سے بنائی جاتی تھی اور آج کل مشین سے کشید کی جانے لگی تو حکم نہیں بدلے گا۔ کیونکہ حقیقت دونوں جگہ متحد ہے۔ اسی طرح فوٹو اور تصویر کو سمجھنا چاہیئے۔

ف ۔ ظاہر حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ تصویر بنانے والے کو ہمیشہ عذاب ہوتا رہے گا مگر اللہ تعالےٰ کا یہ ارشاد ان اللّٰہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر مادون ذٰلک لمن یشاء اللہ تعالیٰ اس کو تو معاف نہ کریں گے کہ اُن کے ساتھ دُوسرے کو شریک کیا جائے اور اُس کے سوا (اور گناہوں) کو جسے چاہیں گے معاف کر دیں گے۔ اس کے معارض ہے کیونکہ یہ گُناہ شرک و کفر سے کم ہے تو وہ بھی مشیت کے تحت میں ہے۔ اگر اللہ تعالےٰ چاہیں گے معاف فرماویں گے اور یہ وعید ویسی ہی ہے جیسی عمداً مسلمان کو قتل کرنے کی وعید ہے فجزاءہ جھنم خالداً فیھا وغضب اللّٰہ علیہ کہ اُس کی سزا جہنم ہے جس میں ہمیشہ رہے گا اور اُس پر اللہ کا غضب ہے۔ اہلِ سُنّت نے اُس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اُس کی سزا تو یہی ہے اگر اللہ تعالےٰ سزا دینا چاہیں مگر آخر میں ارحم الراحمین کی شفاعت سے یہ لوگ جنت میں پہنچ جائیں گے۔ جیسا حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالےٰ فرمائیں گے فرشتوں نے شفاعت کر لی رسولوں اور نبیوں نے بھی شفاعت کر لی اب ارحم الراحمین کی شفاعت رہ گئی۔ پھر اللہ تعالےٰ (دو تین بار) جہنم میں سے مٹھی بھر کر اُن لوگوں کو نکالیں گے جن کو قرآن (کے قانون) نے جہنم میں محبوس کر رکھا تھا اور قانون قرآن دو قسم کے لوگوں کو جہنم میں محبوس کرے گا۔ ایک تو کفار کو دُوسرے ان گنہگاروں کو جن کے بارہ میں عدل کا تقاضا یہ ہے کہ اُن کی مغفرت نہ کی جائے تو کفار کی تو مغفرت نہ ہوگی کیونکہ اللہ تعالےٰ صاف فرما چکے ہیں کہ یہ لوگ مغفرت کے مستحق نہیں ہیں۔ آیات و احادیث اس کے متعلق بکثرت وارد ہیں اور امت کا اجماع بھی اس پر منعقد ہو چُکا ہے۔ اب دُوسری ہی جماعت رہ گئی جن کو رحمت الٰہیہ سے حصّہ مل گیا اور مراحم خسروانہ سے اُن کو جنت میں پہنچا دیا جائیگا یہ ایسی توجیہ ہے جس سے تمام آیات و احادیث میں تطبیق ہو جاتی ہے اور کوئی تعارض باقی نہیں رہتا۔ علامہ ابن ابی جمرہ نے اسی مضمون کو شرح میں بیان فرمایا ہے مگر چونکہ مسئلہ تصوف کا نہ تھا اس لیے فوائد میں داخل کیا گیا کہ علماء کے کام کی بات ہے۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں علماء بعض اسلامی فرقوں کی تکفیر کا فتوے دینا چاہتے تھے اور مولانا اُن کے اقوال کی تاویل فرما رہے تھے۔ علماء اُس تاویل میں کلام کر رہے تھے جب دیر تک بحث ہوتی رہی تو فرمایا کہ تم لوگ کس خیال میں ہو۔ خدا کی قسم! قیامت میں جب رحمت کو جوش ہوگا بہت سے ایسوں کو بخشش دینگے جن کو ملائکہ اور انبیاء نے بھی کافر سمجھ کر جہنم میں چھوڑ دیا ہوگا۔ اُن کا ایمان اسقدر ضعیف تھا کہ ملائکہ وانبیاء ورسل اور سیدالرسل صلی اللہ علیہ وسلم بھی اُس کو پہچان سکیں گے تو جن کے ایمان کو وہ نہ پہچان سکے تم تو اُن کو قطعی کافر کہو گے اس لیے تم جن لوگوں کی تکفیر کرنا چاہتے ہو قیامت میں دیکھو گے کہ اُن کی مغفرت ہو رہی ہے۔ ہاں انتظام شریعت کے لیے اُن کو دھمکانے کے طور پر کفر کا فتوے دیدو تو مضائقہ نہیں مگر واقع میں کافر نہ سمجھو۔ سمعتہٗ من سیدی حکیم الامۃ قدس سرہٗ۔

(۲۴۷) دعویٰ کرنا بُرا ہے گو سچا ہی کیوں نہ ہو اس میں صوفیاء کے اس مسئلہ کی دلیل ہے کہ وہ دعوے کو بُرا سمجھتے ہیں گو سچا ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ یہ اندیشہ (ہر وقت) ہے کہ مدعی کے اندر کچھ نقص ہو جس کی اُسے خبر نہ ہو تو دعوے اُس کی محرومی کا سبب ہوگا۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تصویر بنانے والوں سے کہا جائیگا اس میں روح پھونکو اور وہ کبھی روح نہ پھونک سکیں گے۔

دُوسری حدیث میں ہے کہ اُن سے کہا جائے گا تم نے جو صُورت بنائی تھی اس کو زندہ کر دو یعنی اُن سے مطالبہ کیا جائے گا کہ اپنے دعوے کو پُورا کرو۔ وہ اس کو پُورا نہ کر سکیں گے تو جھوٹے دعوے پر عذاب دیا جائے گا۔ کیونکہ جب اُنہوں نے اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی مخلوق کی تصویر بنائی تو زبانِ حال سے اپنے خالق ہونے کا دعوے کیا۔ اُن سے کہا جائے گا کہ پُورا دعویٰ تو یہ ہے کہ اس تصویر میں جان بھی ڈال دو ورنہ تم اپنے دعوے میں جھوٹے ہو جس کی سزا دردناک ہے۔

حدیث سے صدر اوّل (صحابہؓ اور تابعینؒ) کے طریق کی بھی تائید ہو رہی ہے

اور وہی حق ہے کہ وہ حضرات انسان کے حال کو دیکھتے تھے اقوال کو نہ دیکھتے تھے۔ دیکھو تصویر بنانے والا زبان سے تو اپنے خالق ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا مگر اُس کا عمل (زبانِ حال سے) اس دعویٰ کو بتلا رہا ہے تو اُس کی بات کا لحاظ نہیں کیا گیا اگرچہ وہ عمر بھر یہ کہتا رہے کہ یہ حقیقی تصویر نہیں ہے (محض دیکھنے کی تصویر ہے) اس بات سے اُس کو کچھ نفع نہ ہوگا بلکہ زبانِ حال سے جو دعوے ظاہر ہو رہا تھا اُس پر مواخذہ کیا جائے گا۔

اس تقریر سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جو اللہ والوں سے ملنا چاہے وہ اُن کا اتباع کرتا رہے اپنی طرف سے (راستہ) ایجاد نہ کرے وہیں پہنچ جائے گا، جہاں وہ پہنچے ہیں اگرچہ دعویٰ نہ کرے اور اگر دعوے کرتا رہا اور اتباع نہ کیا اس کو خسارہ اور دھکی نصیب ہوگی۔ اہلِ توفیق نے فرمایا ہے کہ جو اُس چیز کا دعوے کرے جو اُس میں نہیں ہے امتحان کے وقت رسوا ہو جاتا ہے کسی نے (خوب) کہا ہے ؎

نفسک علی الدعوی فحاسبہا ولا تدع ذالک فتضیعہا

جب تمہارا نفس کوئی دعوے کرے اُس کا محاسبہ کرو اور دعوے کر کے اپنے کو برباد نہ کرو۔ قولہ فیہ دلیل لطریق اہل الصوفیۃ فی ذمہم الدعوی الی قولہ فتضیعہا۔

⁂

باب ۹۷

حدیث

جواز اخذ الاجر علی کتاب اللہ عزّ وجل

حضرت (عبداللہ) بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جن چیزوں پر تم معاوضہ لیتے ہو اُن میں سب سے زیادہ اس کی مستحق کتاب اللہ ہے۔

شرح ظاہر حدیث سے معلوم ہُوا کہ کتاب اللہ (کی تعلیم) پر اُجرت لینا جائز ہے اور وہ سب سے زیادہ حلال ہے۔ اس کے معارض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری حدیث ہے کہ ایک شخص نے کسی کو کچھ قرآن پڑھایا اُس نے اس کو ایک کمان ہدیہ میں دی کہ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد کرنا۔ اس شخص نے جس کو یہ ہدیہ دیا گیا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا یہ دوزخ کا ایک ٹکڑا ہے یا فرمایا دو ٹکڑے ہیں۔

اس حدیث سے بظاہر (کتاب اللہ کی تعلیم پر معاوضہ لینے کی) ممانعت معلوم ہوتی ہے اسی لیے علماء میں اختلاف ہوگیا۔ بعض تو اُس حدیث کی وجہ سے جس کی ہم شرح کر رہے ہیں مطلقاً جواز کے قائل ہو گئے اور بعض علماء دوسری حدیث کی وجہ سے مطلقاً ممانعت کے قائل ہو گئے اور بعض نے دونوں کو جمع کر دیا (کہ بعض حالات میں جواز کے اور بعض حالات میں ممانعت کے قائل ہوئے ہیں) یا امام مالکؒ کا مذہب ہے وہ فرماتے ہیں کہ جو عمل فرض ہے اُس پر اُجرت لینا جائز نہیں اور جو فرض نہیں اُس پر اُجرت لینا جائز ہے مثلاً کوئی شخص سورۃ فاتحہ سیکھنا چاہے تو اُس پر اجرت لینا جائز نہیں جبکہ وہ بالغ ہو کیونکہ سورۃ فاتحہ کا سیکھنا اُس پر فرض ہے کہ اسکے بغیر نماز صحیح نہیں (تو اس کا سکھلانا

بھی فرض کفایہ ہے) اور فاتحہ کے سوا کچھ اور بھی پڑھنا چاہے تو اُس سے اُجرت لینا جائز ہے۔ اسی پر تمام احکامِ دین کو سمجھ لو کہ جو عمل اس وقت طالب کے ذمہ فرض ہو اُس پر مطلوب کو اُجرت لینا جائز نہیں اور جو (اس وقت) فرض نہیں اُس میں اختیار ہے اور تعلیمِ قرآن پر اُجرت لینے کے جواز میں دین کا بڑا فائدہ ہے جس کی حقیقت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی جانتے ہیں یا وہ (علماء و فقہاء) جن پر اس حقیقت کا کچھ حصہ منکشف ہو گیا ہے کیونکہ اُجرت تعلیم قرآن کے جواز سے قرآن کی تعلیم مسلمانوں میں پھیل جائے گی۔ اگر یہ اُجرت جائز نہ ہوتی تو کوئی شاذ و نادر ہی پڑھاتا کیونکہ ایسے لوگ بہت کم ہیں جو بچوں کی تعلیم کی مشقت (اور اُن کی تربیت کی مصیبت) کو بلا معاوضہ برداشت کر سکیں۔ پھر اُس کو بھی تو انسانی ضرورتیں درپیش ہیں (اُن سب کو بالائے طاق رکھ کر) تعلیمِ قرآن کی پابندی ہر شخص سے نہیں ہو سکتی۔ دیکھو باوجود اُجرت لینے اور اس کے علاوہ مزید احسان کے بھی تم کسی کو تعلیم کا حق ادا کرتا ہُوا نہ پاؤ گے سوا اُن کے جو اہلِ توفیق (اور صاحبِ دل) ہیں (اب اگر تعلیم قرآن پر معاوضہ لینے کو حرام کر دیا جاتا تو کون تعلیم دیتا اور اس طرح یقیناً قرآن کی اشاعت بلادِ اسلام میں بند ہو جاتی)۔

غرض شریعت میں بہت چیزیں ایسی ہیں جو اصول و قواعد کی رُو سے ممنوع ہیں مگر کسی منفعت کی وجہ سے اُن کو جائز کر دیا گیا ہے حالانکہ وہ منفعت اس سے بدرجہا کم درجہ کی ہے۔ اللہ تعالےٰ کی طرف سے رحمت اور وسعت ہے ما جعل علیکم فی الدین من حرج۔ اللہ تعالےٰ نے تمہارے اُوپر دین میں ذرا تنگی نہیں کی۔ حدیث سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حد سے زیادہ اُمت کے خیر خواہ ہیں کیونکہ حضورؐ نے یہ حکم اور اس جیسے بہت سے احکام از خود بیان فرمائے ہیں۔ کسی کے پُوچھنے پر نہیں۔ اللہ تعالےٰ حضورؐ کو سب سے بہتر جزا عطا فرمائے جو کسی نبی کو اس کی اُمت کی طرف سے دی گئی ہو۔ اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں اس کی تصریح بھی فرمائی ہے لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمؤمنین

رؤف رحیم ۔ بے شک تمہارے پاس تمہارے ہی میں سے رسول آئے ہیں جن پر تمہاری پریشانی شاق ہے اور وہ تم پر (یعنی تمہاری راحت) پر حریص ہیں، مسلمانوں پر بہت مہربان ہمدردی کرنے والے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ اس نعمتِ عظیمہ کے شکر کی ہم کو توفیق دیں اور اس کو ہم پر کامل کر دیں ۔ آمین ۔

ف ۔ اس حدیث میں بظاہر تصوف کا کوئی مسئلہ نہیں مگر بہت سے اہل اللہ قرآن کی تعلیم اور بچوں کی تربیت و تادیب میں مشغول تھے اور بچوں کے والدین اُن کی خدمت کرتے تھے یہی اُن کا ذریعۂ معاش تھا تو غالباً شارح کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی طالب طریق کو ترکِ اسباب دشوار ہو تو وہ قرآن اور حدیث اور علمِ دین پڑھانے کا شغل اختیار کر لے کہ اس کی آمدنی سب سے زیادہ حلال ہے واللہ تعالیٰ اعلم اور اہلِ علم کے لیے تو اس سے بہتر کوئی شغل ہے ہی نہیں ۔ خصوصاً اس زمانے میں کہ لوگوں کو علمِ دین کی طرف توجہ بہت کم ہے اگر علماء و طلباء دوسرے مشاغل اختیار کریں گے تو دین کے مٹ جانے کا اندیشہ ہے اُن کو یہ کوشش کرنا چاہیئے کہ سلسلۂ تعلیم و درس برابر جاری رہے کہ اسی سے دین کی بقاء ہے ۔ والسلام

باب ۹۸

حدیث

جوازالرقی والاجر علیہا

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ایک جماعت کسی سفر میں گئی اور عرب کے ایک قبیلہ کی بستی میں ٹھہری اُن سے مہمانی کا حق طلب کیا ۔ اُنہوں نے مہمانداری سے انکار کیا تو اس قبیلہ کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا ۔ اُنہوں نے ہر قسم کی کوشش کی (تاکہ وہ اچھا ہو جائے) کسی تدبیر سے نفع نہ ہُوا تو ایک نے کہا ذرا ان لوگوں کے پاس بھی تو جاؤ جو ہماری بستی میں اُترے ہیں شاید اُن میں سے کسی کے پاس کوئی چیز ہو (جس سے سانپ کا زہر اُتر جائے) چنانچہ وہ ان کے پاس آئے اور کہا اے صاحبو ! ہمارے سردار کو سانپ نے ڈس لیا ہے ہم نے ہر قسم کی تدبیر کر لی مگر اُسے کسی چیز سے فائدہ نہ ہُوا تو کیا تم میں سے کسی کے پاس کوئی چیز ہے ؟ ایک صحابی نے کہا ہاں بخدا میں جھاڑنا جانتا ہوں، لیکن بخدا تم سے ہم نے مہمانی کا حق طلب کیا تھا تو تم نے انکار کر دیا اب جب تک کچھ معاوضہ نہ دو میں نہیں جھاڑوں گا ۔ تو اُنہوں نے بکریوں کے ایک گلہ پر صلح کی (کہ تم کو یہ گلہ بکریوں کا دیا جائے گا) وہ صحابی گئے اور اس پر دم کرنے اور تھتکارنے لگے اور الحمد للہ رب العالمین (سورۂ فاتحہ اخیر تک) پڑھنے لگے ۔ وہ تو ایسا ہو گیا جیسے اونٹ کو رسّی سے کھول دیا جائے ۔ بے تکلّف چلنے پھرنے لگا ۔ بیماری کا ذرا بھی اثر نہ رہا ۔ بستی والوں نے اپنا وعدہ پُورا کیا اور جو ٹھہرا تھا اُن کے حوالہ کیا ۔ صحابہ میں

سے بعض نے کہا کہ اس کو تقسیم کر لو۔ جھاڑ پھونک کرنے والے نے کہا ابھی ایسا نہ کرو پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا واقعہ بیان کریں پھر دیکھیں آپ کیا فرماتے ہیں (اگر اس کو جائز قرار دیا تقسیم کر لیں گے ناجائز قرار دیا تو واپس کر دیں گے)۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے واقعہ بیان کیا۔ حضور نے فرمایا تمہیں کس نے بتلایا کہ سورۂ فاتحہ سے جھاڑ پھونک بھی ہو سکتی ہے۔ پھر فرمایا تم نے ٹھیک کیا اس معاوضہ کو تقسیم کر لو اپنے ساتھ میرا بھی حصّہ لگالو پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہنسنے لگے۔

شرح ظاہر حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ جھاڑ پھونک پر معاوضہ لینا جائز ہے۔ بشرطیکہ اللہ تعالےٰ کی کتاب سے جھاڑ پھونک کی جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ کلام اللہ کے سوا اور کسی چیز سے بھی جھاڑ پھونک جائز ہے؟ اس حدیث میں تو اس پر دلالت نہیں مگر دوسری حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے علاوہ اور بھی پاکیزہ کلام دم کیا کرتے تھے جیسے اللھم انت الشافی لا شفاء الا شفاءک یارب العالمین اللھم اشف شفاء لا یغادر سقما اور اس جیسی اور بھی دعائیں ہیں۔ کتاب اللہ اور اسماء الٰہی اور پاکیزہ کلام کے سوا دیگر کلمات سے جھاڑ پھونک کی ممانعت بھی آتی ہے نیز اہل کتاب کی جھاڑ پھونک سے بھی منع کیا گیا ہے۔ اسی لیے علماء نے تعویذ کی اُن انگوٹھیوں سے منع کیا ہے جس میں عبرانی الفاظ منقوش ہوتے ہیں جن کے معنی معلوم نہیں۔ ایسے ہی ہر وہ زبان جس کے معنی معلوم نہ ہوں اس کا تعویذ پہننا ممنوع ہے کیونکہ ممکن ہے اس کے معنی میں شرعاً کوئی خرابی ہو تو تعویذ پہننے والا گناہ میں مبتلا ہو گا۔ (جھاڑ پھونک اور تعویذات پر معاوضہ لینا چند شرائط کے ساتھ جائز ہے۔ ایک یہ کہ اس شخص نے باقاعدہ اس فن کو حاصل کیا ہو اور محض کتابیں دیکھ کر تعویذ نہ لکھتا ہو۔ دوسرے اس کو تجربہ بھی ہو کہ اس سے نفع ہوتا ہے۔ تیسرے معاوضہ صاف طور سے طے کیا جائے۔ زکوٰۃ کہہ کر نہ لیا جائے جیسا عام طور سے رواج ہے بقیہ شرائط علماء کے کلام میں مذکور ہیں۔ ۱۲ مترجم)۔

(۲۴۸) **رزقِ مقدر کو کوئی نہیں روک سکتا** حدیث میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جو رزق تمہارے واسطے مقدر ہو چکا ہے اُسے کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ تم کو مل کر رہے گا خواہ روکنے والا چاہے یا نہ چاہے۔ دیکھو صحابہ نے جس بستی والوں سے ضیافت طلب کی اور انہوں نے انکار کیا تو سانپ نے (سردار کو) ڈس لیا اور اس طرح وہ رزق جو مقدر تھا صحابہ کے پاس پہنچ کر رہا۔ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ کی مدد کمزور کو جلد پہنچتی ہے۔ دیکھو جب بستی والوں نے اپنی قوت کی بنا پر اس جماعت کو قلیل اور کمزور سمجھ کر ضیافت سے انکار کیا تو اللہ کی مدد (سانپ کے ڈسنے کی صورت میں) بہت جلد پہنچ گئی۔ حدیث میں اس پر بھی اشارہ ہے کہ عادت (الٰہی) کا بدلنا بھی عذاب ہے۔ دیکھو بستی والوں نے صحابہ کی ضیافت سے انکار کیا جو اُن کا حق تھا تو اُن کی وہ تمام تدابیر ناکام ہو گئیں جن سے سانپ کے ڈسنے کا علاج کیا کرتے اور اچھے ہو جاتے تھے (ان تدابیر کے متعلق عادتِ اللٰہیہ جواب تک تھی وہ اس نازیبا حرکت کی وجہ سے بدل گئی) یہاں تک کہ انہوں نے وہ حق ادا کیا جس کو روک لیا تھا (تو پھر خدا نے مریض کو شفاء دے دی) ایک حدیث میں اس حقیقت کو ان الفاظ سے بیان فرمایا گیا ہے اذا ابغض اللہ قوما امطر صیفھم واصحی شتاءھم۔ جب اللہ تعالےٰ کسی قوم سے نفرت کرتے ہیں گرمی کے زمانے میں اُن پر بارش نازل کرتے ہیں اور سردی میں آسمان کو صاف کر دیتے ہیں (کہ بارش کا ایک قطرہ نازل نہیں ہوتا۔ یہ تو اُن ممالک کے واسطے ہے جن کو سردی میں بارش کی ضرورت ہوتی ہے اور جن کو گرمی اور برسات میں ضرورت ہوتی ہے اُن پر جب اللہ تعالےٰ کا غضب ہوتا ہے گرمی اور برسات میں بارش بند کر کے جاڑوں میں برسات کر دیتے ہیں) غرض عادۃ اللہ کا بدلنا غضب کی نشانی ہے۔ اسی لیے اہلِ سلوک جب اپنی کسی حالت محمودہ میں تغیر پاتے ہیں جس کے عادی تھے فوراً گریہ وزاری اور التجا میں مشغول ہو جاتے اور نفس کی پوشیدہ شرارتوں میں غور کرتے۔ یہاں تک کہ اس کوتاہی کا پتہ لگا لیتے جہاں سے یہ تغیر

آیا ہے تو اس کی تلافی کرتے۔ اس کی تائید اللہ تعالےٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم۔ اللہ تعالےٰ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک خود وہ اپنی حالت کو نہ بدلے۔

حدیث میں اللہ تعالےٰ کی ایک بہت بڑی حکمت پر بھی اشارہ ہے کہ بستی والوں میں سے عذاب اُسی پر آیا جس کا جُرم سنگین تھا۔ کیونکہ ضیافت سے انکار کرنے میں سردارِ قبیلہ اصل تھا۔ عرب کی عادت یہ ہے کہ وہ اپنے سردار کے اشارہ پر چلتے ہیں جب وہ اس حرکت میں اصل تھا تو عذاب بھی اُسی پر آیا کہ سانپ نے اُسی کو ڈسا، سزا جُرم کے موافق دی گئی۔ قولہ فیہ اشارۃ الی انہ ما قدر لک من الرزق لا یمنعہ عنک مانع الی قولہ جزاء وفاقا۔

ف۔ ان سب فوائد پر صوفیاءِ کرام کا عمل سب سے زیادہ ہے اُن میں جو مقتدا اور مشائخ ہیں وہ دُوسروں سے زیادہ ڈرتے اور غوائل نفس پر نظر رکھتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی کوتاہیوں کا دوسروں پر اثر پڑتا ہے اور غیب سے اُن کو زیادہ تنبیہ ہوتی ہے اسی طرح تقدیر پر اور نصرۃ الہٰی کے جلد آنے پر اُن کو زیادہ بھروسہ ہوتا ہے کہ یہی حضرات ہر زمانہ میں صحابہ کے نمونے ہیں۔

(۲۴۹) بزرگوں کو جب حق بات بتلائی جاتی ہے فوراً قبول کر لیتے ہیں

حدیث سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ اہلِ فضل دینداروں کو جب حق کی ہدایت کی جاتی ہے (فوراً) اس کو قبول کر لیتے ہیں۔ عزتِ نفس (اور تکبر و نخوت) ان پر غلبہ نہیں کرتی۔ دیکھو جھاڑ پھونک کرنے والے نے جب صحابہ سے کہا کہ ابھی تقسیم نہ کرو جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نہ پہنچ جاؤ۔ سب نے اس کی بات مان لی اور بحث نہیں کی۔ قولہ فیہ دلیل علی ان اھل الدین والفضل اذا ارشدوا الی الحق قبلوہ الی قولہ ولم یحاجوا۔

ف۔ حق بات کو فوراً مان لینا تصوف کے مقاصد میں داخل ہے۔ صوفیاء کو سب سے

زیادہ اس کا اہتمام ہے وہ علماءِ ظاہر کی طرح بحث و تکرار نہیں کرتے۔

(۲۵۰) محبوب کی توجّہ اور نظرِ لطف سے جذبات میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے

یہاں ایک اور بھی اشارہ ہے کہ محبوب کی توجّہ عاشق کے جذباتِ محبت کو بھڑکاتے اور اُس کے دل میں مسرت کی لہریں دوڑا دیتی ہے۔ دیکھو جب اللہ تعالےٰ نے حضورؐ کے اصحاب کی مدد کی (اُن کے حال پر توجّہ فرمائی) تو حضورؐ کو ہنسی آگئی اور فرمایا اس مال میں میرا بھی حصّہ لگا لو، حالانکہ آپؐ جانتے تھے کہ صحابہ خود ہی ایسے موقع پر آپ کو ہدیہ پیش کرتے ہیں مگر نصرتِ خداوندی پر اپنی مسرّت و فرحت ظاہر کرنے کے لیے آپؐ نے صحابہ سے فرمایا کہ میرا بھی حصّہ لگاؤ تاکہ وہ بھی خوش ہوں اور اللہ تعالےٰ کی مدد پر مسرّت و طرب کا اظہار کریں۔

قولہ وھنا اشارۃ وھی عطف الحبیب یھیج قلب المحب ویفرحہ ویطربہ ویضحکہ الی قولہ اظھارا لذلک لانہ مما یؤنسھم ویسرھم وفیہ تقدیم وتاخیر۔

(۲۵۱) دُنیا سے زیادہ آخرت کا اہتمام کرنا چاہیئے

حدیث میں اہل قلوب کے لیے ایک خاص اشارہ ہے کہ بستی والوں نے اپنے مردار کے لیے ہر ممکن کوشش کی صرف اس لیے کہ اُس کے بدن کو راحت مل جائے جو خود بھی فناء ہونے والا ہے اور یہ جہان بھی فنا ہونے والا ہے (جس کی یہ بدن پیداوار ہے) تو اُس شخص کی ہمّت کا کیا حال ہونا چاہیئے جو غیر فانی عالم کے لیے کوشش کر رہا ہو جس کی نعمتیں فنا نہ ہوں گی اور اس میں رہنے والا بھی نہ کمزور ہو گا نہ پُرانا ہو گا (ہمیشہ جوان ہی رہے گا) تو جہاں زیادہ چستی اور رغبت کی ضرورت ہے وہیں سستی اور کمزوری ہو (بڑے تعجب کی بات ہے اہلِ قلوب کو آخرت کے لیے دُنیا داروں سے زیادہ کام کرنا چاہیئے۔ وہ لوگ دُنیائے فانی مردار کے لیے ہر وقت مرتے کھپتے رہتے ہیں۔ طالبانِ آخرت کو اُن سے کم نہ رہنا چاہیئے اور جس طرح اہل

دُنیا اپنے سرداروں کی خدمت دل وجان سے کرتے اور اُن کی راحت کا اہتمام کرتے ہیں طالبانِ آخرت کو اپنے مشائخ کے لیے اُن سے زیادہ کرنا چاہیئے)۔

ایک مشہور بزرگ کو لوگوں نے کثرتِ مجاہدہ (و ریاضت) پر ملامت کی تو فرمایا مجھے (میرے حال پر) چھوڑ دو۔ کیونکہ میرے سامنے ایک سخت گھاٹی ہے جس سے وہی گھوڑے پار ہو سکتے ہیں جو دبلی پتلی کمر والے ہیں۔ ایک بزرگ کا ارشاد ہے: بالجد خذکلا بالکسل فان امامك عقابك واى عقاب۔ ہمت اور کوشش سے کام کرو سستی سے نہیں کیونکہ تمہارے سامنے عذاب بھی ہے اور کیسا عذاب؟ (جس سے بچنے کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ سستی اور غفلت کے ساتھ اُس سے نہیں بچ سکتے تم)۔

قوله وفى الحديث اشارة لاهل القلوب الى قوله واى عقاب۔

ف۔ اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ یہ تو تصوف وسلوک کا پہلا قدم ہے کہ آخرت کو دُنیا سے معظم ومقدم سمجھے۔ والسلام۔

⁂

باب ٩٩

حدیث

لاحمیٰ الا لله ولرسوله

صعب بن جثامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حمیٰ کسی کے لیے نہیں بجز اللہ کے اور اُس کے رسول کے۔

شرح ظاہر حدیث بتلا رہا ہے کہ حمیٰ سب کی سب اللہ اور رسول کے لیے ہے۔ اب رہا یہ کہ حمیٰ سے کیا مراد ہے؟ اور وہ بطریق وجوب کے ہے یا بطور استحباب کے؟ اور کون اس کا ذمہ دار ہے؟ اس کی شرطیں کیا ہیں؟ سو اس کو معلوم کرنا چاہیئے۔ پس سنو! کہ حمیٰ کے پانچ معنی (لغت میں) ہیں۔ ایک تو روک ٹوک کرنا۔ بعض امور سے روکن اور بعض کی اجازت دینا یہ تو احکام کا مقرر کرنا ہے۔ تو جسے اللہ نے روکنے کا حق دیا ہے وہ روک سکتا ہے اور جس کو حق نہیں دیا وہ نہیں روک سکتا۔ چنانچہ ارشاد ہے ان الحکم الا لله حکم (اور حکومت) صرف اللہ کے لیے ہے۔ دوسرے معنی عزت اور شوکت ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے ولله العزة ولرسوله وللمؤمنين عزت تو اللہ تعالےٰ ہی کے لیے ہے اور اُس کے رسول کے لیے اور مومنین کے لیے۔ اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے بالایمان اعتزنا ہم صرف ایمان کی وجہ سے معزز ہوئے ہیں۔ حمیٰ کے ایک معنی حفاظت اور بچاؤ کے ہیں تو جو شخص اپنی حفاظت اور بچاؤ کا طالب ہو اس کو حقیقی حفاظت اور بچاؤ اللہ اور رسول ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے یعنی اللہ اور رسول کے اتباع اور تعمیلِ احکام

سے۔ کیونکہ حق تعالٰے فرماتے ہیں ان تنصروا اللہ ینصرکم۔ اگر تم اللہ کی مدد کرو گے اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ اور اللہ کی مدد سے مراد اُس کے احکام کی بجاآوری اور منہیات سے اجتناب ہے اور سنتِ رسول کی پیروی۔ کیونکہ حق تعالٰے فرماتے ہیں من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی۔ نیز ارشاد ہے یاایھا النبی حسبک اللہ ومن اتبعک من المؤمنین اے نبی تم کو اللہ کافی ہے اور وہ مؤمنین جو آپ کے متبع ہیں۔

حمی کے ایک معنی تعصب (اور حمیت) اور مدافعت بھی ہیں۔ جیسے حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد کے بارے میں دریافت کیا کہ بعض لوگ محض حمیت کی بنا پر قتال کرتے ہیں۔ جیسا عرب کی عادت تھی (کہ اپنے قبیلہ کی طرفداری میں دُوسرے قبائل سے لڑتے تھے جس کا منشا بجز قومی تعصب اور حمیت کے کچھ نہ تھا)۔

اب حدیث کا مطلب یہ ہُوا کہ حمیت اور تعصب صرف اللہ اور رسول کے لیے ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ارشاد ہے کونوا انصار اللہ۔ تم اللہ کے مددگار بن جاؤ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کی مدد نہ کریں۔ اگر شریعت کے موافق ایک دوسرے کی مدد کریں وہ بھی اللہ ہی کے لیے ہے جیسا حدیث میں آیا ہے انصر اخاک ظالما او مظلوما۔ اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ مظلوم کی مدد تو ظاہر ہے کہ اللہ ہی کے لیے ہے اور ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کو اللہ کے لیے ظلم سے روک دو۔ یہ بھی اللہ کی مدد ہے (کیونکہ اس میں حکم شرعی کی تعمیل ہے اور اللہ کی مدد سے یہی مراد ہے کہ اس کے احکام کی تعمیل کرو)۔

حمی کے ایک معنی تقدیر اور قسمت کے ہیں تو حقیقت میں صاحبِ نصیب وہی ہے جس کو اللہ اور اس کا رسول اپنی پناہ میں لے لے۔ چنانچہ ارشاد ہے قل لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا۔ کہہ دیجیئے ہم کو ہرگز کوئی مصیبت نہیں آسکتی سوا اُس کے جو اللہ نے ہمارے واسطے مقدر کر دی ہے تو جس کو اللہ اور رسول نے اپنی پناہ میں

لے لیا اُس پر کوئی قابو نہیں پاسکتا اور دوسروں کی پناہ کوئی چیز نہیں اور اگر اتفاقاً کسی کی حمایت سے نفع بھی ہو جائے تو وہ ختم ہونے والی ہے اور اللہ کی حمایت منقطع نہیں ہو سکتی۔ (پس یہاں اُن معانی میں سے کوئی ایک مُراد ہے یا) ہو سکتا ہے کہ سب ہی مُراد ہوں اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔ جس جگہ ان معانی میں سے کسی ایک کا تحقق ہوا وہاں اصل استحقاق اللہ اور رسول کے لیے ہے (اُن ہی کی حمی اصل حمی ہے) چنانچہ اسی قبیل سے حق تعالٰے کا یہ قول ہے من کان یرید العزۃ فللہ العزۃ جمیعا جو کوئی عزت چاہتا ہو تو عزت سب کی سب اللہ کے لیے ہے وللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین ولکن المنافقین لا یعلمون۔ عزت اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور مومنین کے لیے ہے لیکن منافق نہیں جانتے۔ اس حدیث کے مناسب اسی کے معنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے ان اللہ اذھب عنکم عبادۃ الجاھلیۃ وافتخارھا بالانساب مؤمن تقی او فاجر شقی۔ سُن لو! اللہ تعالٰے نے تم سے جاہلیت کی حماقت اور نسب پر فخر کرنے کو دُور کر دیا (پس اب دو ہی قسم کے آدمی ہیں) یا مومن متقی ہے یا فاجر بدبخت۔ نیز اللہ تعالٰے کا یہ ارشاد بھی (اسی کے مناسب) ہے۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقکم کہ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز (و مکرم) وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو تو اس (بیہ علمی مسئلہ معلوم ہُوا کہ جاہلیت والے جو کچھ کرتے تھے خواہ نسب پر فخر ہو یا کسی کی حمایت یا قومی عصبیت اور نئے نئے احکام (و قوانین) بنانا اور ایک دوسرے کی مدد کرنا اور کسی کو پناہ دینا یا اپنی حفاظت کرنا۔ اس کے علاوہ دیگر امور جن میں نفس کے حظوظ (اور لذات) تھے۔ ایمان نے اُن میں سے کسی چیز کو باقی نہیں رکھا بجز اس کے جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہو۔

جو شخص بغیر کتاب اللہ اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے ان امور کو اختیار کرے اُس نے طریقۂ جاہلیت اختیار کیا اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے تحت میں ہو گا ثلاثۃ یبغضھم اللہ وعد فیھم من استن

فی الاسلام سنۃ الجاھلیۃ ۔ تین شخصوں سے اللہ تعالےٰ کو نفرت ہے ۔ اُن میں سے ایک وہ ہے جو اسلام میں جاہلیت کا طریقہ رائج کرے ۔ اور یہ حکم خاص و عام قریب و بعید سب کے لیے عام ہے جس کی تائید حق تعالےٰ کے اس قول سے ہوتی ہے قل ان کان اٰباءکم وابناءکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم ۔" فرما دیجئے اگر تمہارے باپ بیٹے بھائی اور بیبیاں اور خاندان اور وہ مال جو تم نے جمع کیا ہے اور وہ تجارت جس کے مندا ہونے کا تم کو اندیشہ ہے اور وہ گھر بار جو تم کو پسند ہیں ۔ اللہ سے اور رسول سے اور اللہ تعالےٰ کے راستہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہوں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ اپنا (دُوسرا) حکم بھیجیں ۔ اس میں عوام اور خواص سب مشترک ہیں (سب کو حکمِ الٰہی کا اپنی تجویز پر مقدم کرنا واجب ہے) ۔

(۲۵۲) خواطر میں صرف ربانی اور ملکوتی کی حمایت کی جائے گی (اس حدیث میں) ایک خاص بات ہے اور وہ خواطر (کی نگہداشت) ہے خواص کے لیے

کیونکہ خواطر (نفس) کی چار قسمیں ہیں ۔ ربّانی ، ملکوتی ، نفسانی ، شیطانی ہے ۔ ان میں دو کی تو حمایت کی جائے گی یعنی خاطر ربانی اور ملکوتی کی اور دوسرے جنگ کی جائے گی یعنی نفسانی اور شیطانی سے (پس حدیث کا مطلب یہ ہُوا کہ دل میں جو باتیں تقاضے کے ساتھ آتی ہیں اور ان کو اصطلاح صوفیاء میں خاطر کہا جاتا ہے ۔ اُن میں سے حمایت صرف اُن کی ہوگی جو اللہ و رسول کے ساتھ تعلق رکھتے ہوں (اور جن خواطر کو اللہ و رسول سے علاقہ نہ ہو بلکہ محض نفسانی تقاضا یا شیطانی دھوکہ ہو ان کی حمایت نہیں کی جا سکتی بلکہ اُن کو روکنا چاہیئے) اس طرح یہ شخص اس جماعت میں شامل ہوگا جس کے متعلق ارشاد ہے والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا ۔ جو لوگ ہمارے واسطے مجاہدہ کرتے ہیں اُن کو ہم اپنے راستوں پر ڈال دیتے (اور مقصود تک پہنچا دیتے) ہیں یہ تو منتہی کے لیے ہے جو نظر میں تمیز کر سکتا ہے اور مبتدی پر جب کوئی خاطر وارد ہو اُسے چاہیئے کہ قرآن و حدیث پر اُسے پیش کرے اُس وقت اسے معلوم

ہو جائے گا کہ یہ خاطر کس قسم میں داخل ہے تو کتاب و سُنّت کے موافق عمل کرے ۔ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم الشان فصاحت (و بلاغت) پر بھی دلالت ہے کہ ایک لفظ میں آپ نے شریعت و حقیقت کے تمام احکام کو جمع کر دیا ۔

قولہ ویحتص اھل الخصوص ۔ با امراحر دھوا لحنو اطرالی قولہ جمعت احکام الشرعیۃ والحقیقۃ کلھا بحذف بعض المسائل المتعلقۃ بالفقہ ۔

ف ۔ علامہ ابن ابی جمرہؒ نے اس مقام پر حمیٰ کے سب معنی بیان فرمائے مگر جو معنی فقہاء کے یہاں مشہور ہیں اُس کو چھوڑ دیا ۔ فقہاء نے حمیٰ کی تفسیر میں یہ بیان کیا ہے کہ کسی زمین کی خود رو گھاس کو روک دیا جائے کہ اس میں دوسروں کے جانور نہ چریں ۔ صرف سردار اور زمینداری کے جانور چرا کریں ۔ حدیث نے اس رواج کو باطل کیا ہے کہ زمین کی خود رو گھاس سب کے لیے مباح ہے کسی کو اُس کو روکنے کا حق نہیں ۔ صرف اللہ اور رسول کو حق ہے ۔ خلیفہ کو بھی اپنے ذاتی جانوروں کے لیے کسی زمین کی گھاس روکنے کا حق نہیں صرف بیت المال کے جانوروں کے لیے روکنے کا حق ہے کہ اس میں دراصل سب مُسلمانوں کا فائدہ ہے ۔ جیسا حضرت عمرؓ نے بیت المال کے اونٹ گھوڑوں کے لیے بعض دیہات کی زمین مخصوص کر دی تھی کہ اُس میں بیت المال کے جانوروں کے سوا دوسروں کے جانور نہ چریں ۔ پس لاحمی الا للہ و رسولہ کا مطلب یہ ہُوا کہ جو چیزیں سب کے لیے مباح ہیں اُن کو اپنے لیے کوئی نہیں روک سکتا ۔ ہاں خلیفۂ اسلام بیت المال کے لیے روک سکتا ہے کیونکہ بیت المال کو اللہ اور رسول سے تعلق ہے ۔ اس کی منفعت عام مسلمانوں کی منفعت ہے کسی خاص کی منفعت نہیں ۔ اگر بیت المال کے لیے کسی زمین کی گھاس وغیرہ کو نہ روکا جائے تو جہاد کے اُونٹ گھوڑے پرورش نہیں پا سکتے اور جہاد کا موقوف ہو جانا مسلمانوں کے حق میں سخت مضر ہے ۔ دُنیا میں وہی قوم زندہ رہ سکتی ہے جس کے پاس اپنی حفاظت کا پُورا سامان ہو ۔ کسی قوم کا کمزور ہونا دوسروں کو اپنے ہضم کرنے کی دعوت دینا ہے ۔ جیسے بکری کی کمزوری بھیڑیئے کو اُس پر حملہ کرنے کی دعوت دیتی ہے ۔ خوب سمجھ لو ۔

❖

باب ۱۰۰

حدیث

من لم یشرک باللہ دخل الجنۃ

ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک بار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ جب آپؐ نے جبلِ احد کو دیکھا فرمایا میں پسند نہیں کرتا کہ یہ پہاڑ میرے واسطے سونا بن جائے اور میرے پاس تین دن سے زیادہ اس میں سے ایک دینار بھی رہے سوائے اُس دینار کے جسے قرض (ادا کرنے) کے واسطے رکھ چھوڑوں پھر فرمایا زیادہ مال والے ہی زیادہ کمی والے ہیں مگر وہ جو مال کو اس طرف اور اُس طرف (خرچ) کرتا رہے ابوشہاب (راوی حدیث) نے (اس وقت) اپنے سامنے اور دائیں بائیں اشارہ کیا (حضورؐ نے فرمایا) اور ایسے لوگ کم ہیں (زیادہ وہی ہیں جو سرمایہ دار بن کر مال پر سانپ کی طرح جم جاتے ہیں غریبوں کو نہیں دیتے) پھر فرمایا (اے ابوذر!) جب تک میں نہ آؤں تم اسی جگہ رہنا اور (یہ فرما کر) آپ کچھ دُور آگے بڑھ گئے میں نے ایک (اجنبی) آواز سُنی تو حضورؐ کے پاس پہنچنے کا ارادہ کیا پھر مجھے آپؐ کی بات یاد آگئی کہ تم اسی جگہ رہنا (اس لیے میں اپنی جگہ سے نہ ہٹ سکا) جب آپ واپس تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ! (کیا چیز تھی یہ) جو میں نے سُنی یا یہ کیسی آواز تھی جو میں نے سُنی (راوی کو شک ہے کہ ان دو لفظوں میں سے کون سا لفظ صحابی نے کہا ہے) فرمایا کیا تم نے بھی (آواز) سنی؟ میں نے عرض کیا ہاں۔ فرمایا میرے پاس جبرائیل (علیہ السلام) آئے تھے اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ آپؐ کی اُمت میں سے جو شخص اس

حال میں مرے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک (خدائی) نہ کرتا ہو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ میں نے کہا اگرچہ اُس نے ایسے ویسے (گناہ کے) کام کئے ہوں۔ فرمایا ہاں (اگرچہ اُس نے کیسے ہی کام کئے ہوں)۔

شرح ظاہر حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ جو شخص اسلام پر مرے گا جنت میں پہنچ جائے گا اگرچہ اُس نے کیسے ہی کام کئے ہوں۔ اب رہا یہ سوال کہ جنت میں پہنچ جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اُس کو اصلاً عذاب نہ ہوگا یا یہ مطلب ہے کہ کسی نہ کسی وقت جنت میں ضرور جائے گا اگرچہ عذاب بھی دیا جائے تو جواب یہ ہے کہ ایک حدیث نے اُس کو صاف کر دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایمان دو طرح کا ہے ایک وہ جس کا صاحب جہنم میں (اصلاً) نہ جائے گا۔ دُوسرا وہ جس کا صاحب جہنم میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔

یہ دوسرا ایمان وہ ہے جس کے ساتھ گناہ بھی ہوں اور پہلا ایمان وہ ہے جو احکام کی تعمیل اور نواہی سے اجتناب کے ساتھ ہو۔ حدیثیں اس معنی میں بہت ہیں اور اہل توفیق گناہوں سے صرف اس لیے ڈرتے ہیں کہ گناہگار کی حالت بدل جانے کا اندیشہ رہتا ہے (کہیں ایسا نہ ہو کہ ایمان سلب ہو جائے) کیونکہ گناہ کفر کے قاصد ہیں (جیسے نیک اعمال ایمان کے قاصد ہیں یعنی نیکیوں کا سلسلہ ایمان سے وابستہ ہے اور گناہوں کا رشتہ کفر سے ملا ہُوا ہے)۔

(۲۵۳) مباح چیزوں پر نظر ڈالنا جائز ہے حدیث سے معلوم ہُوا کہ چلتے پھرتے مباحات میں نظر کرنا جائز ہے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبلِ احد کو دیکھا۔ اگر آپ چلتے ہوئے زمین کی عجائبات پر نظر نہ ڈالتے (بلکہ نگاہ نیچی کر کے چلا کرتے) تو احد پہاڑ کو نہ دیکھ سکتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر دوسروں کی طرح نہیں تھی۔ آپ کی ہر نظر عبادت تھی۔ کیونکہ وہ عبرت حاصل کرنے کے لیے ہوتی تھی اور جب اس نیت سے نظر ڈالی جائے تو کتاب وسنت کے بیان سے وہ اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے۔ کتاب اللہ

میں ہے اولم ینظروا فی ملکوت السموٰت والارض کیا ان لوگوں نے آسمان وزمین کے عجائبات (قدرت) میں نظر نہیں کی (جو اللہ تعالےٰ کی توحید اور عظمت ان پر منکشف ہو جاتی ۔اس سے معلوم ہُوا کہ اس نیّت سے زمین و آسمان کی طرف نظر کرنا شرعاً مطلوب ہے) نیز ارشاد ہے ویتفکرون فی خلق السموٰات والارض ربنا ما خلقت ھٰذا باطلا سبحٰنک اور (عقلمند لوگ) زمین و آسمان کی پیدائش میں فکر کرتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں اے پرودگار! تو نے اس کو بیکار نہیں بنایا تو اس سے پاک ہے اور حدیث میں ہے اللھم اجعل نظری عبرۃ۔ اے اللہ! میری نظر کو (مفید) عبرت بنا۔

رہی یہ بات کہ حضورؐ کی نظرِ عبرت حاصل کرنے کے لیے تھی اس کی دلیل یہ ہے کہ آپؐ نے جبلِ احد کو دیکھ کر ایک قاعدہ شرعیہ بیان فرمایا (بلکہ چند قواعد) اگر یہ نظر عبرت کے لیے نہ ہوتی تو کلام کا رنگ دُوسرا ہوتا۔ کیونکہ ہر کلام فکر کا نتیجہ ہے فکر کلام کا مقدمہ ہے اور مقدمہ کے موافق ہی نتیجہ ہُوا کرتا ہے (جب یہاں نتیجۂ فکر اعلیٰ درجہ کا ہے تو یقیناً آپ کی نظر بھی اعلیٰ درجہ کی تھی) حضورؐ نے اس مقام پر جو مقام شرعیہ بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ خیر کی (یعنی مال کی) تمنّا جائز ہے۔ دُوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے اشیاء میں انقلاب ہوسکتا ہے (پہاڑ سونا بن سکتا ہے آخر سونا چاندی پہاڑ ہی میں تو پیدا ہوتا ہے۔ یہی مٹی کسی جگہ سونا بن جاتی ہے کسی جگہ چاندی کسی جگہ یاقوت و زمرد وغیرہ) تیسرے یہ کہ قرض لینا جائز ہے اور تین دن یا اس سے کم مدت تک دنیا کا پاس رہنا دنیا جمع کرنے میں داخل نہیں اور جو رقم قرض ادا کرنے کے لیے رکھی جائے وہ بھی دنیا جمع کرنے میں داخل نہیں چاہے تین دن سے زیادہ عرصہ تک رہے اور دُنیا کو اس لیے حاصل کرنا کہ آخرت کے کاموں میں صرف کی جائے دنیا (داری) نہیں غرض حدیث میں زہد کی ہدایت ہے یہ سب فوائد حضورؐ کے اس ارشاد سے معلوم ہوئے مَیں پسند نہیں کرتا کہ یہ پہاڑ میرے واسطے سونا بن جائے اور میرے پاس تین دن سے زیادہ اس میں سے ایک دینار بھی رہے سوا اُس دینار کے جسے قرض کے واسطے رکھ چھوڑوں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ حضورؐ نے مال کی تمنا تو نہیں کی بلکہ اُس کی نفی کی ہے

تو کہا جائے گا کہ حضورؐ نے تین دن سے زیادہ رکھنے کی نفی کی ہے تمنا کی نفی نہیں کی جو لوگ معانی کلام کو سمجھتے ہیں وہ اس سے مطلقاً تمنا کی نفی نہیں سمجھ سکتے (کیونکہ جب کلام میں کوئی قید ہو حکم قیود کی طرف راجع ہوتا ہے نہ مقید کی طرف۔ علماء بلاغت نے اس کی تصریح کی ہے) حدیث سے اشارۃً یہ بھی معلوم ہُوا کہ قرض کم کرنا چاہیئے (زیادہ نہ چاہیئے) کیونکہ حضورؐ نے قرض ادا کرنے کے لیے ایک دینار رکھ چھوڑنے کا ذکر فرمایا۔ ایسا لفظ نہیں فرمایا جو قلیل و کثیر سب کو شامل ہو۔ جب آپؐ نے ایسا لفظ اختیار کیا ہے جو قلیل ہی کو شامل ہے اور لفظ عام اختیار نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ آپ کا مقصود وہی ہے جو ہم نے بیان کیا (کہ قرض زیادہ نہ کرنا چاہیئے) کسی نے کہا ہے اقلل من الدین تعش حرا (اپنے ذمہ قرض کم کرو آزاد جیو گے (زیادہ قرض کرو گے تو آزادی میں خلل پڑے گا) اور یہ جو آپؐ نے فرمایا کہ زیادہ مال والے ہی زیادہ کمی والے ہیں اس میں چند احتمالات ہیں، ایک یہ کہ ایسے لوگ (حساب و کتاب و عذاب سے) خلاصی پانے والے کم ہیں کیونکہ اُن کے ذمہ حقوق زیادہ ہوتے ہیں اور (حقوق کی وجہ سے) مناقشات (باز پرس وغیرہ) زیادہ ہوں گے اسی لیے کہا گیا ہے حلالھا حساب وحرامھا عذاب دُنیا کا حلال (حصّہ حساب (میں مُبتلا کرتا) ہے اور حرام عذاب (میں گرفتار کرتا) ہے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کے پاس نیکیاں کم ہوں گی اگرچہ وہ نیک کام زیادہ بھی کریں۔ مطالبات کی کثرت سے نیکیاں کم ہو جائیں گی۔ کیونکہ میل جول اور لین دین میں ناجائز باتوں اور ممنوعات کا ارتکاب زیادہ ہوتا ہے جن کی اس کو خبر بھی نہیں ہوتی۔

یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کو (نیک اعمال کی) توفیق کم ہوتی ہے کیونکہ بعض لوگوں کو مال عبادات سے اور نجات کے راستہ پر چلنے سے مانع ہو جاتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ سب معانی مراد ہوں۔ اسی لیے حضورؐ نے اس کے بعد فرمایا مگر وہ جو مال کو اس طرف اور اُس طرف خرچ کرتا رہے (یعنی ہر طرف جہاں محتاج نظر آئیں یا ضرورت معلوم ہو خرچ کرنے میں دریغ نہ کرے۔ ایسا شخص البتہ حساب و کتاب اور طلب سے خلاصی پائے گا اُس کی نیکیاں بھی کم نہ ہوں گی اس کو نیک اعمال کی توفیق

بھی زیادہ ہوگی۔ کیونکہ اس کا دل جب مال سے پاک ہوگا اور اعمالِ خیر سے مال مانع نہیں ہوتا بلکہ اس کی محبت مانع ہوتی ہے)۔

قوله فيه دليل على جواز النظر فى المباحات الى قوله ومن اجل هذا اعقبه بقوله عليه السلام الامن قال بالمال هكذا وهكذا۔

(۲۵۴) صُحبت کا ادب یہ ہے کہ ساتھی کو اطلاع کئے بغیر جُدا نہ ہو

حدیث سے معلوم ہُوا کہ صحبت کا ادب یہ ہے کہ اپنے ساتھی سے بغیر اطلاع کے جُدا نہ ہو۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوذر رضی اللہ عنہ سے یہ کہہ کر جُدا ہوئے کہ میرے آنے تک اسی جگہ پر رہنا (بغیر اطلاع کے جُدا نہیں ہوئے)۔

قوله فيه دليل على من ادب الصحبة ان لا يخلوا الصاحب الى قوله مكانك حتى آتيك۔

ف ۔ صوفیاء نے آدابِ صحبت میں اس کی تصریح کی ہے اور یہ مسئلہ آدابِ معاشرت میں سے ہے کیونکہ بغیر اطلاع کے ساتھی سے الگ ہو جانا اُس کو پریشانی میں ڈالنا ہے۔ اور مُسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمانوں کو ایذا نہ پہنچے۔

(۲۵۵) عاشق بدگمان ہوتا ہے اور حُکم کی بجا آوری سب سے بڑی اطاعت ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ عاشق بدگمان ہوتا ہے (عشق است و ہزار بدگمانی) دیکھو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوذر سے کچھ دُور آگے بڑھ گئے اور انہوں نے (اجنبی) آواز سُنی تو اُن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر (خطرہ کا) اندیشہ ہوا اور چاہا کہ فوراً آپ کے پاس پہنچیں مگر آپ کا حکم یاد کر کے رک گئے اور اس سے معلوم ہُوا کہ احکام کی بجا آوری سب سے بڑی طاعت ہے کیونکہ ابوذر رضی اللہ عنہ یہی سمجھ کر اپنی جگہ پر جمے رہے کہ حکم کی تعمیل سب سے زیادہ مقدم ہے۔ انہوں نے تعمیل حکم کو اپنے اس جذبہ پر ترجیح دی جو محبت کی وجہ سے پیدا ہوا تھا (کہ اجنبی آواز سنتے ہی حضور کے پاس

پہنچیں) یہ عارفین کا مقام ہے کہ اُن کی طاعت بجا آوری حکم کے لیے ہے اپنی خواہش سے نہیں اور جاہل کی حالت اُس کے برعکس ہے کہ وہ اپنی خواہش کے موافق طاعات بجا لاتا ہے اتباعِ حکم کی پابندی نہیں کرتا)۔

قوله فيه دليل على ان المحب بسوء الظن مولع الله قوله والجاهل بضد ذلك۔

(۲۵۶) بدوں تحقیق حال کے احکام نہ بیان کئے جائیں

حدیث سے معلوم ہُوا کہ جہاں تحقیق کی ضرورت ہو وہاں بغیر تحقیق حال کے احکامِ (شرعیہ) بیان نہ کئے جائیں۔ اگرچہ واقعہ معلوم بھی ہو۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذر سے اُن کے اس کہنے کے بعد کہ یہ کیا آواز تھی جو میں نے سُنی پھر دریافت فرمایا کیا تم نے یہ آواز سنی ؟ انہوں نے کہا ہاں۔ اس کے بعد آپ نے بتلایا کہ یہ آواز جبریل کی تھی وہ مجھ سے یہ کہہ گئے ہیں۔ آپ کا دوبارہ پُوچھنا حالانکہ آپ کو پہلے معلوم ہو چُکا تھا کہ ابوذر نے آواز سُنی ہے اس بات کو بتلا رہا ہے کہ احکام الٰہیہ کو اہتمام کرنا چاہیئے اور تقریر احکام کے وقت تحقیق سے کام لینا چاہیئے۔ اس وقت جبریل نے جو کچھ کہا تھا وہ احکام الٰہیہ میں سے ایک (عظیم الشان) حکم تھا (تو حضور نے اُس کو سرسری طور سے بیان نہیں کیا بلکہ اہتمام اور تحقیق کے ساتھ بیان فرمایا۔

قوله فيه دليل على ان الاحكام لا تذكر الا بعد التثبت الى قوله ارشاد الى الاهتمام بامر الاحكام۔

(۲۵۷) اللہ تعالیٰ کی قُدرت بہت بڑی ہے

حدیث سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت بہت بڑی ہے وہ جس کو چاہتے ہیں جس طرح چاہتے ہیں (فرشتوں کی آواز وغیرہ) سُنا دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں سُننے سے روک دیتے ہیں۔ دیکھو بہت احادیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صحابہ کے درمیان (بیٹھے ہوئے) وحی نازل ہوتی تھی پھر فرشتہ چلا جاتا اور صحابہ میں سے کوئی بھی کچھ نہ سُنتا اور ابوذر رضی اللہ عنہ کو

دُور سے آواز سُنا دی گئی تاکہ وہ جان لیں کہ اللہ تعالےٰ ہر چیز پر قادر ہیں۔

قولہ فیہ دلیل علیٰ عظیم قدرۃ القادر الیٰ قولہ لیعلم ان اللہ علیٰ کل شیئ قدیر۔

ف۔ یہ بھی تصوف کا بڑا مسئلہ ہے اگرچہ متکلمین بھی اس کو بیان کرتے ہیں اور یہ مسئلہ عقائد میں داخل ہے۔ مگر اس کا پُورا انکشاف صوفیاء کرام ہی کو نصیب ہے اسی لیے وہ نصوص میں تاویل کم کرتے ہیں اگرچہ بظاہر عقل سے بعید ہوں کیونکہ وہ قدرتِ خداوندی سے کسی چیز کو بعید نہیں سمجھتے۔ اللہ تعالےٰ ہم کو بھی بزرگوں کی اس دولت سے حصہ عطا فرمائیں۔ آمین۔

الحمدللہ! آج بروز شنبہ ۱۰ شوال المکرم ۱۳۶۸ھ کو رحمۃ القدوس ترجمۂ بہجۃ النفوس کا دوسرا حصہ ان التزامات کے ساتھ جو دیباچہ حصہ اول میں مذکور ہیں تمام ہوا۔ حالانکہ اس وقت اس کی کچھ اُمید نہ تھی کیونکہ ۹ ماہ کی مسلسل علالت نے مجھے تصنیف و تالیف سے روک دیا تھا۔ رمضان سے پہلے ضعف زیادہ تھا اور یہ اندیشہ تھا کہ رمضان میں روزہ و تراویح کی وجہ سے ضعف بڑھ جائے گا مگر الحمدللہ کہ رمضان و اعمالِ رمضان کی برکت سے صحت پہلے سے اچھی ہوگئی اور شوال میں اس قابل ہوگیا کہ ترجمہ حصہ دوم پُورا کر دوں۔

بہجۃ النفوس کے حصہ اوّل و دوم میں کل سو حدیثیں ہیں اور دیباچۂ مصنف سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بخاری کی تین سو حدیثوں کی شرح کی ہے۔ عزیزی مولوی محمد ادریس صاحب کاندھلوی سلمہ اللہ تعالےٰ محدث و مفسر دارالعلوم دیوبند سے معلوم ہُوا کہ بہجۃ النفوس کے دو حصے اور بھی طبع ہو گئے ہیں جو اُن کے پاس پہنچ گئے ہیں مگر میرے پاس اب تک نہیں پہنچے۔ اگر وہ دو حصے بھی مل گئے اور صحت و طاقت اور توفیق نے یاوری کی تو انشاءاللہ اُن کا ترجمہ بھی اسی طرز پر ناظرین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا ورنہ اسی قدر پر کفایت ہے اور کیا عجب ہے کہ کوئی اور صاحبِ دل بقیہ جلدوں کا ترجمہ اسی طرز پر مجھ سے اچھا کر دیں۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالےٰ سیّد الانبیاء والرسل و اصحابؓ و اہل بیتؓ کرام کے طفیل اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ ابن ابی جمرہ رحمۃ اللہ علیہ کے انفاس قدسیہ کی برکت سے اس خدمت کو قبول فرمائیں اور میرے اور جملہ احباب و اصحاب و برادرانِ

اسلام کے لیے اس کو نافع بنائیں اور میرے لیے یہ کتاب ذخیرۃ اور ذریعۂ نجات بن جائے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

ناشکری ہوگی اگر برادرِ مہربان مولوی شبیر علی صاحب تھانوی سلمہٗ کا شکریہ ادا نہ کروں کہ انھوں نے بہت محنت و اہتمام اور صرف زرِ کثیر سے اس کتاب کو طبع کرایا۔ اللہ تعالےٰ تمام دُعاؤں کو اُن کے بھی حق میں قبول فرمائیں اور ان کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔

ے نہ بہ نقش بستہ مشوشم نہ بحرف ساختہ سرخوشم
نفسے بیاد تو می کشم چہ عبارت و چہ معانیم

—— تمت بالخیر ——

والحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات وصلی اللہ تعالےٰ علی سید الکائنات واشرف المخلوقات سیدنا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ وذریتہ واھل بیتہ وازواجہ الطیبات الطاھرات وسلم تسلیما کثیرا کثیرا ؞

احقر ظفر احمد عثمانی تھانوی عفی اللہ عنہ
۱۰ شوال المکرم ۱۳۶۸ھ مطابق ۶ راگست ۱۹۴۹ء عیسوی
بمقام ڈھاکہ مشرقی پاکستان۔